فسانۂ آزاد

رتن ناتھ سرشار

تلخیص: ڈاکٹر قمر رئیس

مقدمہ: ڈاکٹر حسن اختر

فسانۂ آزاد

رتن ناتھ سرشار

— تلخیص —

ڈاکٹر قمر رئیس

— مقدّمہ —

ڈاکٹر ملک حسن اختر

ناشر

مکتبۂ عالیہ ○ لاہور

فسانۂ آزاد

تالیف: رتن ناتھ سرشار ○ تلخیص: ڈاکٹر قمر رئیس ○ مقدمہ: ڈاکٹر حسن اختر

ناشر : محمد جمیل النبی

طابع : گنج شکر پرنٹرز، لاہور

قیمت : -/۷۵

یکے از مطبوعات

مکتبہ عالیہ
آفس : ایبک روڈ (انارکلی) لاہور
شوروم : اردو بازار ○ لاہور

مقدمہ

ڈاکٹر ملک حسن اختر

فسانۂ آزاد اردو ناول کی تاریخ میں شہرتِ عام رکھتا ہے اور رتن ناتھ سرشار نے اسی کی بدولت بقائے دوام کے دربار میں جگہ پائی ہے مگر تعجب کا مقام ہے کہ بعض نقادوں نے سرشار کے دوسرے کم اہم ناولوں کو فسانۂ آزاد سے بہتر قرار دیا ہے۔ علی عباس حسینی فسانۂ آزاد کو باقاعدہ ناول تسلیم نہیں کرتے، ان کے خیال میں "سیر کہسار، جام سرشار اور کامنی کے باقاعدہ ناول ہونے میں کوئی شک نہیں[1]۔" ہمیں معلوم نہیں کہ باقاعدہ ناول اور بے قاعدہ ناول کیا ہوتے ہیں۔ ہمارے خیال میں کوئی تصنیف یا ناول ہوتی ہے یا ناول نہیں ہوتی۔ غالباً باقاعدہ ناول سے ان کی مراد ایسا ناول ہے جو خامیوں سے پاک ہو مگر سیر کہسار، کامنی اور جام سرشار میں بھی خامیاں موجود ہیں لیکن پھر بھی وہ علی عباس حسینی کے نزدیک باقاعدہ ناول ہیں۔ اس طرح ان کا بیان الجھن پیدا کرتا ہے مگر میرا خیال ہے کہ فسانۂ آزاد کو باقاعدہ ناول نہ مان کر وہ اس کا مرتبہ سرشار کے دوسرے ناولوں سے کم بتانا چاہتے ہیں۔ علی عباس حسینی نے جام سرشار کے بارے میں اپنی کتاب ناول کی تاریخ و تنقید میں لکھا ہے۔

"یہ ناول ہر طرح اس قابل ہے کہ اسے اردو ادب میں صفِ اول میں جگہ دی

---

[1] ناول کی تاریخ و تنقید ناشر لاہور اکیڈمی لاہور طبع اول ستمبر ۱۹۶۴ء صـ ۲۵۱

جائے۔[1] "اور ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب "رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری" میں فرماتے ہیں۔ "خالص فنی نقطۂ منظر سے فسانۂ آزاد جام سرشار کے مقابلے میں ایک عظیم کارنامہ نہیں ہے۔[2]"

مگر ہمارا خیال ہے کہ اس ناول کو بہترین ناولوں میں شمار کرنا مشکل ہے اور فسانۂ آزاد کے مقابلے میں اسے کسی طرح بھی عظیم کارنامہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ ناول بھی فسانۂ آزاد کی طرح سرشار نے اودھ اخبار میں قسط وار لکھا تھا لہٰذا اس میں بھی پلاٹ کی خامیاں در آئی ہیں۔ اس کا پلاٹ بھی کمزور ہے اور واقعات نواب امین الدین حیدر اور نصرت الدولہ کی کھونٹی سے لٹکے نظر آتے ہیں۔ دراصل یہ ان دونوں کی سرگزشت ہے جس میں ایسے واقعات بھی آگئے ہیں جو غیر ضروری سمجھے جاسکتے ہیں۔ سرشار نے اگرچہ تمہید میں لکھا ہے کہ انہوں نے یہ ناول شراب کے نقصانات بتانے کے لیے لکھا ہے مگر اس میں بھی لکھنؤ کے عہدِ زوال کے نوابوں اور جاگیرداروں کی زندگی کا مرقع دکھایا ہے جو فسانۂ آزاد کے مقابلے میں کم جاندار ہے۔ سرشار نے ظرافت کا رنگ جمانے کے لیے بے حد مبالغہ سے کام لیا ہے اور غیر فطری واقعات بیان کر دیے ہیں۔ نواب کا اتنا احمق اور بے خبر ہونا قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا کہ بات بات پر مصاحب اس سے ہزاروں روپے بٹور لیں اور نواب ان کو آخر تک اپنا ہمدرد سمجھتا رہے۔ ناول کا انجام بھی غیر فطری ہے کیونکہ جو نواب خون کے چند قطرے دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتا ہو وہ ایک عورت کا خون کیسے کرسکتا ہے پھر ظہورن کا اس لیے بازار حسن میں جا بیٹھنا بھی قرین قیاس نہیں کہ نواب نے ایک اور عورت کو گھر میں ڈال لیا ہے حالانکہ ظہورن سے پہلے نواب کی بیوی بھی موجود تھی۔ ناول کے خاتمہ کے لیے نواب کو مارنا کیا ضرور تھا۔ اس کے علاوہ نصرت الدولہ

---

[1] ایضاً صفحہ ۲۰۲۔ [2] رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری از ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب ناشر پاکستان انجمن ترقی اردو کراچی اشاعت اول ۱۹۶۱ء صد ۲۰۱۔

کے ہاں جو واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ بھی ناول کے پلاٹ میں پوری طرح فٹ نہیں بیٹھتے۔ ناول کے درمیان میں راوی بھی آٹپکتا ہے جس کے تبصرے بے محل اور غیر ضروری ہیں۔ ان خامیوں کے باوجود جام سرشار باقاعدہ ناول ہے تو پھر فسانۂ آزاد کو باقاعدہ ناول کیوں تسلیم نہ کیا جائے۔ یہ درست ہے کہ فسانۂ آزاد میں بھی پلاٹ کی خامیاں موجود ہیں اور واقعات آزاد کی کھونٹی سے لٹکائے گئے ہیں۔ اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ فسانۂ آزاد اودھ اخبار میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ فسانۂ آزاد کی تخلیق کی کہانی پنڈت برج نرائن چکبست کی زبانی سنیئے۔

"..... ایک روز پنڈت تربھون ناتھ ہجر نے کہا اگر کوئی ناول ایسا ہے کہ جس کا ایک صفحہ پڑھیے اور ممکن نہیں کہ بیس مرتبہ نہ ہنسیے تو وہ ڈان کوئک ذاٹ ہے اگر اردو میں اس طرز کا افسانہ لکھا جائے تو خوب ہے۔ حضرت سرشار کے دل پر اس وقت کی بات ایسی کارگر ہوئی کہ اردو میں ڈان کوئک ذاٹ کے انداز پر مضامین لکھنے کا شوق پیدا ہوا چنانچہ اودھ اخبار میں ظرافت کے عنوان سے مضامین شائع ہونے لگے۔ یہ مضامین عموماً لکھنؤ کے رسم و رواج کے متعلق ہوا کرتے تھے..... لوگوں کو یہ سلسلہ مضامین ایسا بھایا کہ اس کے قائم رکھنے کی کوشش کی گئی چنانچہ مختلف مضامین کی لڑیوں کو گوندھ کر افسانہ کا سلسلہ نکالا..... اور اصل تو یہ ہے کہ کامل سلسلہ پیدا نہ ہو سکا..... علاوہ ڈان کوئک ذاٹ کے مختلف انگریزی فسانوں کے حالات اس میں درج ہیں لیکن مصنف کے قلم کا جادو ہے کہ ہر بیان کو اپنا کر لیا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ فلاں داستان فسانۂ آزاد کی فلاں انگریزی ناول سے اخذ کی گئی ہے مگر ثابت نہیں کر سکتے..... غرضیکہ قدر دانوں کے نعرہ ہائے تحسین اور معترضین کے شور و غل میں یہ فسانہ شگرف اودھ اخبار کے ضمیمہ کے طور پر از ابتدائے دسمبر ۱۸۷۸ء لغایت دسمبر ۱۸۷۹ء برابر شائع ہوتا رہا۔ بعد ازیں ۱۸۸۰ء میں کتاب کی شکل میں شائع کیا گیا۔"[۱]

---

[۱] - جام سرشار مرتبہ بدر عالم مکتبۂ اسلوب کراچی ۱۹۶۱ء رتن ناتھ سرشار از چکبست صہ ۲۰ تا ۲۳ -

سرشار نے ایک مختصر کہانی کو اتنا طول دیا ہے کہ فسانۂ آزاد شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہوتا چلا گیا اور بعد میں ۲۰ × ۲۸ سنٹی میٹر کی تقطیع میں چار جلدوں میں شائع ہوا پہلی جلد ۱۰۶۲ صفحات، دوسری جلد ۱۲۴۴ صفحات، تیسری جلد ۱۱۴۸ صفحات اور چوتھی جلد ۱۰۷۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسرے ناولوں کے برعکس فسانۂ آزاد کی تلخیص کی ضرورت محسوس ہوتی ہے چنانچہ ڈاکٹر قمر رئیس نے فسانۂ آزاد کی تلخیص ان قارئین کے لیے کردی ہے جو اسکی چار ضخیم جلدوں کا مطالعہ نہیں کر سکتے مگر یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ کچھ زیادہ ہی مختصر ہے البتہ یہ بات اچھی لگی کہ انہوں نے رتن ناتھ سرشار کے اسلوب کو برقرار رکھا ہے۔

سرشار نے چوتھی جلد کے مقدمے میں خود اس بات کا اعلان کیا ہے کہ اس نے فسانۂ آزاد کو انگریزی ناولوں کی طرز پر لکھا ہے اور کوئی واقعہ خلافِ عقل بیان نہیں کیا۔

"اس ناول میں جدت یہ ہے کہ اُردو کے اور افسانوں کی طرح الیشیائی خیالات سے معرا ہے۔ گو مرزا رجب علی بیگ سرور یادگار زمانہ اور سخنور رنگین ترانہ استاد مسلم الثبوت تھے۔ گو اس خدائے سخن کا نام سن کر اچھے اچھے زبان دان متعصبوں کا ذکر نہیں اپنے کان پکڑتے ہیں مگر تحفہ محضرہ فسانۂ آزاد انگریزی ناولوں کے ڈھنگ پر لکھا گیا ہے جس میں کوئی امر حسبِ لیاقت یا حسب عقل محال نہیں۔ اُردو فسانوں سے اس کا رنگ نہیں ملتا۔

طرزِ دگراں وداع کردم   طرز دگر اختراع کردم

حاشا ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ اعجاز نیرنگ یا نسخۂ از رنگ ہے مگر یہ ضرور کہیں گے شاطرِ فکر نے اس عروس طناز نظر فریب اور شاہد رعنا کو طرزِ نوی سے آراستہ کیا ہے۔

سرشار نے یہاں اُردو کا پہلا ناول نگار ہونے کا دعوےٰ کیا ہے۔ وہ سرور کے مداح ہیں اور انہی کی تقلید میں دہلی والوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ چنانچہ وہ نذیر احمد کے ناولوں سے صرفِ نظر کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں مولوی نذیر احمد اُردو

کے پہلے ناول نگار ہیں اگرچہ وہ اپنے آپ کو ناول نگار کہنا پسند نہیں کرتے۔ سرشار کے ہاں نذیر احمد کی نسبت داستانی رنگ زیادہ ہے اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ سرشار کے ناولوں میں فنی خامیاں ملتی ہیں۔ اس کے باوجود ہم انہیں ناول ہی کہیں گے ڈاکٹر احسن فاروقی انگریزی ادب سے خاصے مرعوب ہیں اس لیے جب وہ دیکھتے ہیں کہ سرشار نے انگریزی ناولوں کو سامنے رکھا ہے تو انہیں ناول نگار ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں مگر ان کا سخت گیر مزاج جب خامیوں پر نگاہ ڈالتا ہے تو انہیں سرشار کو ناول نگار ماننے میں تامل ہوتا ہے۔ فاروقی صاحب سرشار پر لکھتے ہوئے عجب تضاد کا شکار رہے ہیں۔ ایک طرف تو وہ فیصلہ کن انداز میں کہتے ہیں۔

"وہ کتنے ہی خامکار سہی مگر ناول نگار ضرور کہلائے جا سکتے ہیں[1]۔" اور دوسری طرف بڑے تیقن سے فرماتے ہیں۔

"ان کو کسی طرح بھی فن ناول نگاری کا بانی نہیں کہا جا سکتا[2]۔"

آپ جانتے ہیں کہ فاروقی صاحب مولوی نذیر احمد کو ناول نگار نہیں مانتے لہذا اگر سرشار ناول نگار ہیں تو وہی فن ناول نگاری کے بانی کہلائیں گے چنانچہ اسی صفحہ پر وہ پہلے سے مختلف بات کہتے ہیں۔

"سرشار کا فن انسان کو لینا ہے اور اس میں کسی خاص انفرادی صفت کو خواہ وہ اخلاقی ہو یا محض نفسیاتی نمایاں کر دینا ہے۔ یہی ناول کا فن ہے اور اردو میں اس کے موجد سرشار ہیں[3]۔"

فاروقی صاحب کا ذہن ناول کی تاریخ کے بارے میں صاف نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ متضاد باتیں لکھ رہے ہیں۔ کبھی سرشار کو ناول نگاری کا موجد قرار دیتے ہیں اور کبھی اس سے انکار کر دیتے ہیں۔ درحقیقت مولوی نذیر احمد ہی ناول نگاری کے موجد ہیں

---

[1] ۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ از ڈاکٹر احسن فاروقی ناشر ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۶۲ء۔ صہ ۶۶۔ [2] ۔ ایضاً صہ ۹۸۔ [3] ۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ از ڈاکٹر احسن فاروقی صہ ۹۸

البتہ سرشار دوسرے اہم ناول نگار ہیں چونکہ ان کی تصنیفات بھی ناول کے ابتدائی نمونے ہیں اور سرشار کی طبیعت میں استقلال نہ تھا اس لیے ان کے ناولوں میں کئی خامیاں راہ پاگئی ہیں۔ ان کے ناول اخبار میں قسط وار شائع ہوتے تھے لہذا سرشار ہر قسط کو مزیدار بنانے پر توجہ صرف کرتے اور کل سے اس کے تعلق پر زیادہ توجہ نہ دیتے تھے چنانچہ ان کے ناولوں میں ایک مربوط پلاٹ نہیں ملتا۔ آزاد ادھر اُدھر گھومتا رہتا ہے اور اسے جو واقعات پیش آتے ہیں انہیں سرشار بیان کرتے چلے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ فسانۂ آزاد کا پلاٹ بڑا ناقص ہے۔ اسی ناقص پلاٹ کی وجہ سے سر عبدالقادر نے انہیں ناول نگار ماننے سے انکار کر دیا تھا مگر پلاٹ کا ناقص ہونا ناول کی نفی نہیں کرتا البتہ ناول کا ایک نقص قرار پا سکتا ہے۔ خود سرشار کو اس کا احساس ہو گیا تھا چنانچہ انہوں نے دبدبۂ آصفی میں جو مضمون ناول نگاری پر لکھا ہے اس میں ناول میں قصہ پن کی خوبی اور اس کے اختصار پر زور دیا ہے۔

"اس طرح کی معمولی کہانی یا بات نہ چھیڑے کہ دفتر ابوالفضل ہو جائے۔ ناول کے کسی ذکر کو جو شیطان کی آنت ہو جائے کوئی پسند نہ کرے گا۔ بڑا حسن ناول کا یہ ہے کہ جب ایک بات کو ختم کر دیں تو ناظرین بڑے شوق سے دوسرے باب کے مطالب جاننے کے منتظر رہیں۔ اسی کا لکھنا مشکل ہے کہ ایک نہایت ضروری اور تعجب خیز بات ختم کر کے ناظرین چھوڑے ہوئے ٹکڑے کو جب تک دریافت نہ کر لیں، تب تک کھانا پینا حرام ہو جائے۔"[1]

ظاہر ہے کہ فسانۂ آزاد اس معیار پر پورا نہیں اُترتا۔

فسانۂ آزاد میں آزاد کا کردار صرف اتنی اہمیت کا حامل ہے کہ ہم اس کی معیت میں لکھنؤ کی سیر کرتے ہیں۔ وہ جلد اول کے خاتمہ میں رقم طراز ہیں "میاں آزاد کا ہر شہر و دیار میں جانا اور وہاں بُری رسموں پر چلانا ناول کا عمدہ پلاٹ ہے" انہوں نے

---

[1] ۔ نقدِ سرشار مرتبہ تبسم کاشمیری ناشر سنگ میل پبلی کیشنز۔ لاہور۔ ص ۳۶۸

آزاد کے روپ میں نئے زمانے کے انسان کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو آزادہ روی کا شکار ہے اور پرانی پابندیوں سے آزادی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ ہر پرانی چیز کا مذاق اڑاتا ہے۔ سرشار کا مقصد بھی یہی تھا کہ پرانی قدروں کا مذاق اڑایا جائے۔ وہ جلد اول کے خاتمہ میں لکھتے ہیں۔

"اس جلد میں رسوم مذموم ہندوستان اور دقیانوسی خیالات کی ہجو ہے مگر مذاق کے ساتھ۔ دل لگی کی دل لگی اور لطف کا لطف۔ مذاق کا مذاق اور مطلب کا مطلب اور یہی تو ظرافت کے معنی ہیں۔"

مگر آزاد بری رسموں کا مذاق اڑاتے ہوئے خود بھی مذاق بن جاتا ہے کہیں سے بڑھ جاتا ہے اور کہیں سے گھٹ جاتا ہے۔ اور کہیں وہ ایک کارٹون نظر آنے لگتا ہے۔ کہیں وہ متین اور سنجیدہ ہے تو کہیں مسخرہ نظر آتا ہے۔ ایک نواب صاحب سے اس کی گفتگو کا نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

"تھوڑی دیر کے بعد ایک رئیس نے بلایا" "آزاد"

آزاد : خانہ احسان آباد

رئیس : اخاہ آپ ہیں

آزاد : جی اور نہیں تو کیا آپ کے باپ ہیں۔

رئیس : مت بک فضول

آزاد : چوچنچ سنبھال نامعقول۔

ایک اور شخص میرزا صاحب سے آزاد کی گفتگو ملاحظہ فرمائیں۔

آزاد : تسلیم کا چھر پھینکتا ہوں سن سے بچیے۔

میرزا : ہاں تو میں بھی آداب داغتا ہوں۔

آزاد : اللہ اللہ ابھی تک چشمہ لفاظی جاری ہے۔

میرزا : مگر یار چنل خردوں سے عقل عاری ہے۔

آزاد : کہیے اب کیا شغل کیا رنگ ڈھنگ ہیں۔

میرزا جی :۔ تینچے کل پر چڑھے ہی آمادہ جنگ ہیں ۔

یہ حاضر جوابی ، تک بندی ، قافیہ پیمائی اور خوش طبعی لکھنؤ والوں کا خاص مزاج ہے اور آزاد اسی کا نمائندہ ہے ۔ سرشار ایک جگہ رئیسوں کے مصاحبین کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں ۔

" رئیس کے مصاحبین سب حاضر جواب تیز طبیعت ، زباں دراز ، فقرہ باز ٹھٹھول ، ضلع جگت میں طاق ، پھبتی کہنے میں مشاق ، آوازہ کسنے میں شہرہ آفاق ۔ پھبتی نہ کہیں تو ذہن کند ہو جائے ۔ "

ایسے ماحول میں آزاد کا کردار وہی ہو سکتا ہے جو سرشار نے بیان کیا لیکن اگر وہ اس پر اور توجہ صرف کرتے اور اس کے کردار کے جھول نکال دیتے تو آزاد اس عہد کے نوجوان کا بے مثل کردار بن جاتا مگر موجودہ صورت میں بھی وہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ۔

آزاد کے ساتھ ہمیں خوجی نظر آتا ہے ۔ جو پست قامت کوتاہ گردن اور ہر وقت قرولی کا سہارا تلاش کرتا رہتا ہے اسے خود بھی اپنی صورت کے بھونڈا ہونے کا شدید احساس ہے جو اسے اس بات پر اکساتا رہتا ہے کہ وہ اپنی اہمیت اور عظمت کا سکہ لوگوں پر بٹھائے اور یوں اس سے حماقتیں سرزد ہوتی ہیں جن سے ہم محظوظ ہوتے ہیں ۔ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ سرشار پرانی قدروں کا مذاق اڑانا چاہتے تھے ۔ اس کے لیے انہوں نے خوجی کا کردار تراشا ہے ۔ خوجی لکھنوی تہذیب کا نشان ہے ۔ اور سرشار نے اس کے ذریعے ماضی کی لکھنوی تہذیب کو طنز کا نشانہ بنایا ہے ۔ سرشار نے جب ہوش سنبھالا تو لکھنؤ کی پرانی تہذیب دم توڑ

لے ۔ سرشار ۲۷ جنوری ۱۹۰۲ء کو فوت ہوئے ۔ چکبست نے ان کی عمر ۵۶ ۔ ۵۵ برس بتائی ہے ۔ اس طرح ان کا سال پیدائش ۴۷ ۔ ۱۸۴۶ء قرار پاتا ہے ۔ سلطنت اودھ کے خاتمہ کے بعد کیننگ کالج میں داخلہ لیا مگر کوئی ڈگری حاصل نہ کر سکے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

رہی تھی۔ اس کی صورت بگڑ چکی تھی اور انگریزوں نے اسے اور مضحکہ خیز بنا دیا تھا۔ وہ اس تہذیب سے لوگوں کو متنفر کرنا چاہتے تھے۔ اس بگڑی صورت کو سرشار نے خوجی کی صورت میں دیکھا اور اس کا مذاق اڑایا۔ خوجی بعض اوقات مسخرہ بن کر نوابوں کی دل لگی کا سامان مہیا کرتا ہے۔ دراصل خوجی کے کئی پہلو ہیں۔ اسے کسی ایک پیمانے میں بند نہیں کیا جا سکتا ہے۔ وہ خود بونا ہے مگر اس کی ظریفانہ شخصیت بلند و بالا ہے اس کو قابو میں لانا محال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اردو ادب کا لافانی کردار ہے۔ اگر وہ ہمارے قبضہ میں آجاتا تو اس کا دم گھٹ جاتا۔ نقادوں نے اسے مختلف پہلوؤں سے دیکھا ہے۔ اس کا ہر روپ سچا ہے اور اس کے ہر روپ میں کئی بہروپ ہیں۔ وہ لکھنوی تہذیب کا نمائندہ ہے جس کے کئی رنگ ہیں۔ سرشار نے لکھنوی تہذیب کی عکاسی کے لیے خوجی اور آزاد دونوں کو استعمال ہے۔ آزاد کی بے مقصد زندگی اس کی ذہانت اور گفتار کی تیزی، سیر سپاٹا، اچھل کود اور تفریحی مشاغل میں دلچسپی اسے خالص لکھنوی کردار بناتی ہے۔ اسی طرح خوجی کی

کچھ عرصہ اودھ اخبار کے ایڈیٹر رہے پھر الٰہ آباد آکر مترجم کی حیثیت سے ملازم ہو گئے ۹۷ء میں دبدبۂ آصفی ان کی ادارت میں شائع ہوا مگر ۱۸۹۹ء میں اسے بھی چھوڑ دیا۔ شراب کثرت سے پیتے تھے۔ یہی ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ ان کی تصانیف یہ ہیں۔ (۱) فسانۂ آزاد (۲) سیر کوہسار (۳) جام سرشار (۴) کامنی (۵) پی کہاں (۶) ہشو (۷) کڑم دھڑم (۸) بچھڑی دلہن (۹) طوفان بے تمیزی (۱۰) چنچل نار (اس ناول پر مہاراجہ کشن پرشاد کا نام بطور مصنف درج ہے۔ مگر ڈاکٹر قمر رئیس اسے سرشار کی تصنیف ثابت کرتے ہیں۔) (۱۱) شمس الضحیٰ (ترجمہ) (۱۲) الف لیلہ (ترجمہ) (۱۳) خدائی فوجدار (ترجمہ) (۱۴) اعمال نامۂ روس (ترجمہ) (۱۵) گور غریباں (نایاب) (۱۶) ملک الموت (نایاب) (۱۷) مثنوی پیر نابالغ (نایاب) (۱۸) مکاتیب (ڈفرینہ انڈیا آفس) (۱۹) تحفۂ سرشار۔

افیون سے محبت، ہر ہر بات پر اکڑنا، اپنی طاقت سے زیادہ قوت کا مظاہر، تنِ
آسانی، بٹیر بازی اور لاف زنی یہ سب بھی لکھنوی صفات ہیں خوجی کی زندگی کا
کھوکھلا پن لکھنوی تہذیب کے کھوکھلے پن کا غماز ہے۔

سرشار کا نقطۂ نظر ہمیشہ ظریفانہ ہوتا ہے۔ وہ ایک ہشاش بشاش اور غموں
سے لاپروا شخص تھے چنانچہ ان کے ہاں رونے رُلانے کی کیفیات بہت کم ہیں
اور جہاں کہیں وہ اس میدان میں اُترے ہیں ناکام رہے ہیں۔ ان کی شخصیت
کی تعمیر میں غم نہیں مزاج کی مٹی صرف ہوئی ہے چنانچہ وہ اصلاح کا سبق بھی
مذاق مذاق میں دینا چاہتے ہیں مگر وہ بعض مقامات پر طنز و ظرافت کی پست سطح پر
آ گئے ہیں چنانچہ خود کہتے ہیں۔ "راوی اپنے ناظرین اولی الابصار خصوصاً متین اور
مہذب بزرگوں کی خدمت میں ملتمس ہے کہ ذیل کے حصے کو بدتہذیبی پر محمول نہ
فرمائیں۔ ہم اپنے ملک کے رسوم بد اور عادات کے خلافِ تہذیب پہلو کو عمدہ طور
پر لکھ ہی نہیں سکتے تاوقتیکہ ہم کل رسوم مذموم کا خاکہ نہ اڑائیں۔ پس ہم مجبور ہیں۔" اُن
کی ظرافت کا ایک بڑا ستون ذہانت ہے۔ چنانچہ لفظوں کی شعبدہ گری اور قافیہ
سے قافیہ ملانا اسی وجہ سے ہے مگر اس کے ساتھ شگفتہ طبعی بھی ملتی ہے جو ان کی ظرافت
کو بلند مرتبہ عطا کرتی ہے۔ ان کے طنز میں شدت کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ ہنستے
ہنساتے رہتے ہیں اور ایسے واقعات بیان کرتے ہیں کہ سنجیدہ سے سنجیدہ شخص بھی
مسکرانے لگتا ہے۔ بعض اوقات یہ واقعات غیر فطری معلوم ہوتے ہیں یا ان میں
حد سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے مگر انہیں پڑھ کر کوئی شخص بھی مسکرائے بغیر نہیں
رہ سکتا۔ ایک نواب صاحب نے بٹیر پالے وہ اُڑ گئے تو مصاحب سخت خوفزدہ
ہوئے کہ نواب صاحب کو بٹیروں سے بھی بڑی محبت تھی۔ ان میں ایک بٹیر صف شکن بھی
تھا۔ اس سے نواب صاحب کو عشق تھا۔ اس کے غم میں سب نڈھال ہیں اور
جو گفتگو کر رہے ہیں وہ قاری کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتی ہے۔ نواب کے مصاحب
بٹیر کی تعریف میں ایسی ایسی باتیں کہتے ہیں کہ کسی اچھے انسان کے بارے میں بھی

بھی مبالغہ سمجھی جائیں۔ ایک نے کہا خداوندا سے قرآن کے کئی پارے یاد تھے دوسرے نے یہ خبر سنائی کہ اس نے رمضان شریف کے مہینے میں دانہ نہ چکھا اور روزے سے رہا اور خرچی کی توافیم ہی مجبوبہ ہے اس نے بتایا کہ اس نے دس پانچ دفعہ اسے افیم بھی پلا دی تھی مگر واللہ باللہ ثم باللہ جو ذرا بھی نشہ ہوا ہو۔ وہ تو حقانی باتیں کرتے ہیں ایک اور مصاحب نے انکشاف کیا کہ وہ منطق پڑھے ہیں چنانچہ ایک مولانا کو بلایا گیا کہ انہیں سمجھائیں اور انہیں بتایا گیا کہ وہ اسرار خدائی سے واقف، علم مناظرہ میں طاق، پابند روزہ و نماز، خوش تمیز، عارف، زاہد، عفت کوش، متقی، متشرع، منطقی، فلسفی، ہیئت داں، عربی خواں، روم تک مشہور ہے۔ پھر صف شکن کے ملنے کی خبر ملی تو نواب نے یوں اس کے استقبال کی تیاری کی۔

"نواب قمر رکاب نے کل رفقا اور مصاحبین اور حوالی موالی کو بلا کر حکم دیا کہ اصطبل کے سب تر کی عربی تازی گھوڑے اور فیل خانے کے دیو نژاد مستیوں کی وحت ہاتھی اور فلٹ اور بگھیاں اور خاص بردار اور جھنڈی بردار سپاہی جتنے ہماری سرکار میں ہیں سب سے کھولیس ہو رہیں اور شہر بھر کے امیروں اور رئیسوں سے جلوس طلب کرلو اور سجا کر جاؤ۔ صف شکن علی شاہ کو ساتھ ہی لے آؤ مگر انتظام ایسا ہو کہ لوگ دور دور تک تعریف کریں۔ سب چیزیں اپنے اپنے قرینے سے انگریزی باجا ضرور ہو۔"

اتنا مبالغہ کسی نے کاہے کو کیا ہوگا مگر اس میں بھی ایک حکمت نظر آتی ہے شاید سرشار یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایسے نوابوں کو حکمرانوں کو، حکومت کا کیا حق تھا۔ انہیں مٹ ہی جانا چاہیئے تھا جب معاشرہ اتنا زوال پذیر ہو جائے تو وہ قائم نہیں رہ سکتا۔

سرشار نے لکھنؤ کی تہذیب کو بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ اس میں بے شمار کردار ہیں اور بقول کسے یہ کرداروں کا جنگل ہے یہاں ہمیں ہر طرح کے کرداروں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ان میں شریف بھی ہیں اور بدمعاش بھی، اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والے بھی اور نچلے درجہ کے لوگ بھی، ان میں نواب بھی ہیں اور خادم بھی، ذہین بھی ہیں اور بے وقوف بھی، عوام بھی ہیں اور خواص بھی اور یہ ہمیں درباروں میں اور مرثیہ خوانی کی

مجالس ہی نظر آتے ہیں۔ سرشار ہمیشہ انسانوں کی بھیڑ میں رہنا پسند کرتے ہیں ان میں انسانوں کے اندر جھانکنے کی سکت نہیں ہے۔ یہ کام بعد میں رسوا نے امراؤ جان ادا کے ذریعے کیا۔

سرشار سے پہلے سرور نے بھی لکھنوی تہذیب کی عکاسی کی تھی اور سرشار سرور کو استاد بھی مانتے ہیں مگر سرور کے ہاں وہ گہما گہمی نہیں ہے جو سرشار کے ہاں ہے۔ پنڈت بشن نرائن در نے اپنے ایک انگریزی مضمون میں دونوں کا موازنہ اتنی عمدگی سے کیا ہے کہ اس پر اضافہ ممکن نہیں۔

" سرور کے یہاں الفاظ کی بندشوں کی چستی اور مضمون گھٹا ہوا ہوتا ہے۔ کہیں ڈھیل ڈھال نہیں۔ ان کی تصویریں ایسی سڈول اور جاذب نظر ہوتی ہیں کہ سرشار ان کے مقابلے میں گرد ہیں۔ سرور چیزوں اور منظروں کی نقاشی کرتے ہیں، زندگی کی نہیں ہم حلوائی کی دکان سے گزرتے ہیں اور اس کی مٹھائیاں دیکھتے ہیں تو منہ میں پانی آنے لگتا ہے۔ پان والے کی دکان پر اس کی گلوریاں طبیعت کو للچاتی ہیں اور لکھنؤ کی بالائی کا تو کیا کہنا ہے یقیناً اس کا کہیں جواب نہیں۔ چکن، جامدانی اور اودھی کی دکان کی زیب و زینت جوہریوں کی دکان کی سجاوٹ اور نمائش، عطر و تمباکو کی مہک اور خوشبوئیں یہ سب دل خوش کن ہیں۔ چوک اور دوسرے بازاروں اور عالی شان عمارتوں کے منظر بھی نظر سے گزرتے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی شہر خموشاں سے گزر رہے ہیں۔ بے چارے دکاندار ایسی گہری نیند سو رہے ہیں کہ اگر آپ دکان کا سب مال بھی اٹھا لے جائیں تو ان کو خبر نہ ہو ساقن اول درجے کی شوخ و چنچل ہے لیکن ایسے سکتے کے عالم میں تصویر بنی ہوئی ہے کہ کسی طرح آنکھیں چار نہیں ہوتیں۔ نظارہ بازی کا کچھ لطف نہیں۔ آپ بازاروں میں خلقت کا اژدہام دیکھتے ہیں لیکن کھوے سے کھوا نہیں چھلتا۔ کہیں بھی زندگی کے آثار نظر نہیں آتے۔ اراکین حکومت سپاہی اور سورما پہلوان، ناچنے والیاں اور گویے سب ہی نظر کے سامنے سے گزرتے ہیں مگر یہ محسوس ہوتا ہے کہ مصور نے ان سب کو کلوروفارم سنگھا کر تصویریں کھینچی ہیں۔ یہ تو ہیں سرور، بخلاف اس کے فسانۂ آزاد کے مصنف کے ہاں زندگی کے ہر پہلو کا رنگ اجاگر ہے۔ امارت و عسرت، اعلیٰ و ادنیٰ اچھی اور

بری سب ہی طرح کی زندگی کا عکس ان کے کینوس پر پڑتا ہے۔ ان کی دنیا جیتی جاگتی چلتی پھرتی، بولتی چالتی اور ہنستی کھیلتی زندگی سے بھرپور ہے۔ مصنف نے آپ کو چہلم، محرم اور عیش باغ کے میلے کی سیر کرائی ہے۔ آپ بھیڑ میں گھستے ہیں تو ہر وقت یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کوئی گرہ کٹ جیب کاٹ کر آپ کی گھڑی اور بٹوہ نہ نکال لے۔ آپ کہیں دھکا کھا کر نہ گر پڑیں۔ آپ کو اس اژدہام میں ہر طرح کی مخلوق ملے گی۔ ہر طرح کے تماشائی موجود ہیں۔ بٹیر باز، لنگوے باز، افیونی، چانڈو باز، طوائفیں فٹنوں اور پالکی گاڑیوں میں نکھری بیٹھی ہیں۔ ان کے شائقین منہ میں گلوری دبائے چاروں طرف منڈلاتے اور اشارہ بازی کر رہے ہیں۔ نواب اپنی عجیب وغریب وضع میں اپنے مصاحبوں میں گھرے ہوئے محو تماشا ہیں۔ گاڑیوں اور فٹنوں کے پیچھے فقیر فقرا دعائیں دیتے اور کبھی برا بھلا بھی کہتے بھاگتے چلے جا رہے ہیں۔ پولیس کے سپاہی اپنی وردی میں ریلوے، بالبر، چنگی کے محرر، ٹھاکر جو دیہات سے میلہ دیکھنے آئے ہیں یا نئی وضع کے جنٹل مین سر پر ترکی ٹوپی لگائے اور منہ میں سگریٹ دبائے دھواں اڑاتے چلے جا رہے ہیں۔ لالہ صاحب جنہوں نے اپنی فارسی دانی کے زعم میں اپنی اہلیہ محترمہ اور خدمت گار پر رعب جما رکھا ہے۔ ساقن کو بتا رہے ہیں کہ "در مادہ نیم ریک نشہ قند سیاہ معہ زوجہ سیاہ می نوشتم"۔ بنگالی بابو کی دھوتی اس بھیڑ میں ہوا سے باتیں کر رہی ہے اور جہاں کہیں انہیں دوسرا بنگالی چیختا اور ہنستا ہوا دکھائی دیا یہ بھی بلا وجہ چیختے یا کھلکھلا کر ہنسنے لگتے ہیں۔ نواب صاحب نے جہاں اپنی معشوقہ کو سامنے آتے دیکھا سینے پر ہاتھ رکھ کر آہ و بکا کرنے لگے اور بیمار کی رونی صورت بن گئے۔ یہ بھیڑ کی مخلوق کا عالم ہے اور ہر فرد اپنی خاص وضع قطع اور بول چال میں دکھایا گیا ہے اور یہ ہیں سرشار۔[1]

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں سرشار سرور کی نثر سے متاثر ہوئے ہیں۔ فارسی

---

[1] بحوالہ سرشار کا شاہکار از پنڈت کشن پرشاد کول مشمولہ نقد سرشار مرتبہ تبسم کاشمیری ناشر سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۶۸ء صہ ۱۷۷-۱۷۸

تراکیب کی بہتات اور مشکل عبارت اسی کا اثر ہے چنانچہ جگہ جگہ سرشار نے زبان دانی کے جوہر سرور کی تقلید میں دکھائے ہیں مگر یہ انداز زیادہ دیر برقرار نہیں رہتا اور اس کے بعد وہ میرامن اور سرور کے امتزاج سے اک نیا انداز تخلیق کرتے ہیں۔ جلد اول کے آغاز کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں سرور کا اثر نمایاں

سحر کاذب کے وقت مرغ بے ہنگام نے گربۂ مسکین کی جو آہٹ پائی، تو گھبرا کر گڑوں کوں کی ہانک لگائی، اور ہمارے حبیب لبیب وقیقہ رس صبح نفس جو سرِ شام لمبی تانے سو رہے تھے، یہ آواز خوش آیند سنتے ہی کلبلا کر اُٹھ بیٹھے ادھر آنکھ کھلی ادھر باچھیں کھل گئیں، دیکھتے کیا ہیں کہ ابرِ نوبہار نسیم مشکبار نے تمام شہر کو نمونۂ گلزارِ ارم بنا دیا ہے۔ یہ شاعر آدمی حسن پرست، وارفتہ مزاج، رنگین طبع، آزاد منش تاب کہاں کہ مکان کے قفس میں قید رہیں۔ بوئے گل کی طرح نکل کھڑے ہوئے۔"

لیکن سرشار سرور کی طرح خیالی پلاؤ نہیں پکاتے کام کی بات بتاتے ہیں۔ ان کے مکالمے اکثر کرداروں کے حسبِ حال اور عمدہ نثر کا نمونہ ہوتے ہیں لیکن جب انہیں ہوش آتا ہے مشکل فارسی الفاظ و تراکیب کو استعمال کرنے لگتے ہیں۔ دراصل انہیں اس وقت سرور یاد آجاتے ہیں۔ ورنہ وہ تو محذرات لکھنؤ کی زبان لکھنا چاہتے ہیں اور عورتیں اتنی ثقیل زبان کہاں بولتی ہیں البتہ جب فصحائے لکھنؤ کا جادو چلتا ہے تو سرشار پٹڑی سے اُتر جاتے ہیں۔ انھوں نے فسانۂ آزاد کی جلد چہارم کے مقدمہ میں اپنی زبان دانی کا اعلان ان الفاظ میں کیا ہے۔

"اس میں اصلا شک نہیں کہ زبان کے لحاظ سے ہندو مسلمان اہلِ اسلام کے مقلد ہیں۔ پس وہ اور دعوئے زبان دانی کس برتے پتہ تاپانی۔

شرحِ مجموعہ گل مرغِ سحر داند و بس
کہ نہ ہر کہ ورقے خواند معانی دانست

لنترانی شیخی اپنی وضع کے خلاف ہے۔ ہم ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ ہم نے اُردو زبان لڑکپن میں اہلِ اسلام کی پاکدامن محذراتِ ہمسایہ اور جوانی میں مسلمان علمائے

گراں مایہ سے سیکھی ہے مگر ہاں ہر کس و ناکس کی یہ طاقت نہیں کہ ہماری زبان پر حرف رکھ سکے۔"

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ سرشار کو اپنی زبان پر بڑا ناز تھا۔ یہاں بھی وہ دلّی والوں کا نام تک نہیں لیتے مگر اس زمانے میں مغلوں کی دہلی کہاں رہ گئی تھی۔ کہ کوئی میرامن کی طرح دعوے کرتا کہ دہلی کا روڑا ہو کر رہنے سے زبان آتی ہے۔ لکھنؤ بھی اجڑ چکا تھا مگر سرشار نے اس کے کھنڈر دیکھے تھے اور سرور کو لکھنؤ کی زبان کا محافظ گردانا تھا لہٰذا وہ لکھنوی ہونے اور وہاں کی زبان جاننے پر فخر کرتے ہیں۔ ان کی زبان بامحاورہ ہے مگر میرامن کی نسبت مشکل ہے۔ ان کی سادگی میں بھی پرکاری ہے۔ وہ عربی کے الفاظ کے میل سے تراکیب بنانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے اور لب سڑک جیسی تراکیب استعمال کرتے ہیں۔ غرض سرشار جہاں لکھنوی تہذیب کے جیتے جاگتے نقش دکھاتے چلے جاتے ہیں وہیں اپنی زباندانی کا لوہا بھی منوا کر دم لیتے ہیں۔

~.~.~.~.~.~

(ڈاکٹر) حسن اختر ملک

تعارف

"فسانۂ آزاد" اردو کے افسانوی ادب میں ایک بے نظیر تخلیق کا درجہ رکھتا ہے۔ اِسے جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ اردو کی کم کتابوں کو نصیب ہوئی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اِس کے مُصنف پنڈت رتن ناتھ سرشار کے حالاتِ زندگی کی تحقیق پر بہت کم توجہ دی گئی۔ جس کا نتیجہ ہے کہ اِن کی زندگی کے بارے میں بہت سی تفصیلات اب تک پردۂ خفا میں ہیں۔

چکبست نے لکھا ہے کہ ۵۵۔۵۶ برس کی عُمر میں سرشار نے وفات پائی۔ اُن کی تاریخ وفات ۲۷ جنوری ۱۹۰۲ء ہے۔ اگر چکبست کے بیان کو صحیح مانا جائے تو سرشار کا سنہ پیدائش ۱۸۴۶ء یا ۱۸۴۵ء قرار پائے گا۔

سرشار کے والد پنڈت بیج ناتھ در، کشمیری برہمن تھے اور بہ سلسلۂ تجارت کشمیر سے لکھنؤ آکر بس گئے تھے۔ سرشار لکھنؤ ہی میں پیدا ہوئے۔ یہ امجد علی شاہ کی نوابی کا زمانہ تھا۔ ایامِ طفلی ہی میں رتن ناتھ یتیم ہو گئے۔ والدہ نے ان کی پرورش کی۔ سرشار لڑکپن میں اپنے محلّے کے مسلمان شرفا کے گھروں میں آزادی سے آتے جاتے تھے۔ ان کے کردار کی تعمیر زبان و تہذیب کے اسی گہوارہ میں ہوئی۔ ان کی تصانیف میں روزمرہ خصوصاً عورتوں کی زبان اور محاورات پر جس بے پناہ قدرت کا ثبوت ملتا ہے وہ قدیم لکھنؤ کی معاشرت سے اِسی قربت کا ثمرہ ہے۔

اردو تو خیر اُن کی مادری زبان تھی مدرسہ میں اُنھوں نے دستور کے مطابق، فارسی ۱۰
اور عربی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ پھر اسکول کی تعلیم ختم کر کے سرشار نے لکھنؤ کے کیننگ کالج میں داخلہ لیا۔ لیکن بعض حالات کی بنا پر تعلیم ادھوری چھوڑ کر ملازمت اختیار کر لی۔ مدرسی کی یہ ملازمت انھیں لکھنؤ سے دور ضلع کھیری میں ملی۔

اس زمانہ میں اردو میں نئے نئے اخبارات و رسائل جاری ہو رہے تھے۔ سرشار بھی ملازمت کے ساتھ تصنیف و ترجمہ کا کام کرنے لگے۔ اودھ پنچ، مراسلۂ کشمیر اور دوسرے اخبارات میں اِن کے متعدد مضامین شائع ہوئے۔

ان کی شہرت سن کر منشی نول کشور نے اپنے اخبار "اودھ اخبار" کی ادارت کا کام انھیں سونپ دیا ۱۸۷۸ء سے انھوں نے یہ ذمہ داری سنبھالی اور اسی اخبار میں اپنا قصہ "فسانۂ آزاد" قسط وار شائع کیا۔ ان کے دوسرے متعدد ناول بھی پہلے اسی اخبار میں شائع ہوئے۔

۱۸۹۵ء سے اپنی وفات تک وہ حیدر آباد میں رہے۔ یہاں مہاراجہ کشن پرشاد اُن کے سرپرست تھے۔ قیامِ حیدر آباد میں وہ دوسرے تصنیفی مشاغل کے علاوہ ایک رسالہ "دبدبۂ آصفی" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ یہیں ۱۹۰۲ء میں ان کا انتقال ہوا۔

سرشار کی زندگی بے اعتدالیوں اور مالی پریشانیوں میں گزری۔ مے نوشی کی کثرت نے اِن کے جسم کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اِن ہی بے اعتدالیوں کی وجہ سے آخر زمانے میں ان کے سرپرست کشن پرشاد بھی ان سے نالاں ہو گئے تھے۔

سرشار بے حد ذکی، ذہین اور خوش طبع انسان تھے۔ ان کی شخصیت ملی جلی ہندوستانی تہذیب کا نمونہ تھی۔ زندہ دلی، آزادہ روی، شوخی اور بانکپن ان کے مزاج کا خاصہ تھا۔ وسیع المشربی، رواداری اور روشن خیالی ان کے کردار کے ایسے اوصاف تھے جن کا ذکر ان کے کئی احباب اور معاصرین نے کیا ہے۔ اِن کی شخصیت کے یہی تابناک پہلو، ان کی تصانیف میں بھی روح بن کر دوڑتے ہیں۔

یوں تو سرشار طویل اور مختصر آٹھ ناولوں کے مصنف ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے متعدد کتابوں کے تراجم بھی کئے اور نظمیں بھی لکھیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کا سب سے بڑا اور سب سے گراں قدر کارنامہ "فسانۂ آزاد" ہے۔

'فسانۂ آزاد' پنڈت رتن ناتھ سرشار کی پہلی تصنیف ہے۔ اس کے بعد اگرچہ انھوں نے سیرِ کہسار' اور 'جامِ سرشار' جیسے متعدد ناول لکھے اور 'فسانۂ آزاد' کی بے مثل شہرت کی وجہ سے وہ مقبول بھی ہوئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی

'فسانۂ آزاد' کی شہرت اور بلندی کو نہ پہنچ سکا۔

یہ قصہ پہلے منشی نول کشور کے 'اودھ اخبار' لکھنؤ میں دسمبر ۱۸۷۸ء سے دسمبر ۱۸۷۹ء تک قسط وار شائع ہوا۔ اس کے بعد ۱۸۸۰ء میں یہ طویل افسانہ بڑی تقطیع کی چار ضخیم جلدوں میں مطبع نول کشور سے طبع ہوا۔ اُس وقت سے ۱۹۴۸ء تک اس کے متعدد ایڈیشن منظرِ عام پر آئے۔

'فسانۂ آزاد' کی امتیازی حیثیت اور ہمہ گیر مقبولیت کے یوں تو بہت سے پہلو ہیں لیکن نوابی عہد کے لکھنؤ کی انحطاط پذیر معاشرت کی مصوری، اس کی اچھوتی ظرافت اور لکھنؤ کی بامحاورہ ٹکسالی زبان کے فن کارانہ استعمال کو سرشار کے کمالِ فن کا جوہر کہا جاسکتا ہے۔ اردو زبان پر سرشار کی بے پناہ قدرت کی داد کم و بیش سبھی نقادوں اور زبان دانوں نے دی ہے۔ یہ اس حاکمانہ قدرت کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے اپنے قلم سے لکھنوی معاشرت کا ایک ایسا بے نظیر اور بے لاگ مرقع کھینچ دیا ہے جس میں اس کی پستیوں اور مضحکہ خیز کجیوں اور ناہمواریوں کے ساتھ ساتھ اس کی تہذیبی فتوحات، سماجی اقدار اور دیرینہ شوکت و عظمت کے آثار و علائم بھی زندہ اور متحرک نظر آتے ہیں۔

اردو کا یہ ضخیم ناول، جسے ادبِ عالیہ کا درجہ حاصل ہے عرصے سے نایاب تھا۔ موجودہ حالات میں کسی پبلشر کے لیے اس کی موجودہ جلدوں کو شائع کرنا کم و بیش اتنا ہی دشوار ہے جتنا اس تیز رفتار زندگی اور کم فرصتی میں اس کا پڑھنا۔ اس خیال کے پیشِ نظر صرف ایک جلد میں اس کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ سرشار نے بعض صحافتی تقاضوں اور ضرورتوں کے تحت اس قصے کو بے جا طور پر طول دیا تھا۔ اور اس میں بہت سے ایسے ذیلی اور ضمنی ربط اشخاص اور منظر شامل کر دیئے تھے جن کا مرکزی قصے اور کرداروں سے کوئی خاص ربط پیدا نہیں ہو سکا۔ اس لیے خلاصہ کرتے ہوئے ان میں سے بیشتر غیر ضروری اور ضمنی واقعات کو نکال دیا گیا۔ اس طرح میاں آزاد اور خوجی سے تعلق رکھنے والا اصل مرکزی قصہ زیادہ مربوط اور چست ہو گیا۔ ہاں یہ کوشش ضرور کی گئی ہے کہ لکھنوی معاشرت کی نمائندگی کرنے والے اہم مناظر خلاصے میں شامل رہیں۔ دوسرے یہ کہ خلاصہ سرشار کے منفرد اسلوبِ تحریر کے کمالات اور خصوصیات کا آئینہ دار ہو۔ خوجی کا مزاحیہ کردار بلاشبہ اس قصہ کی جان

ہے۔ اس لیے خلاصے میں ان واقعات کو بھی نمایاں اہمیت دی گئی ہے جن کا تعلق خوجی سے ہے۔ الغرض کوشش کی گئی ہے کہ اس تلخیص میں مصنّف، ناول اور قارئین تینوں کے ساتھ انصاف ہو سکے۔

(ڈاکٹر) قمر رئیس

آغاز

سحر کاذب کے وقت مُرغِ بے ہنگام نے گربۂ مسکین کی آہٹ جو پائی تو گھبرا کر گکڑوں کوں کی بانگ لگائی اور ہمارے حبیب لبیب دقیقہ رس صبح نفس جو سرِ شام سے لمبی تانے میٹھی نیند سو رہے تھے، یہ آوازِ خوش آیند سنتے ہی کلبلا کر اُٹھ بیٹھے۔ اُدھر آنکھ کھلی اِدھر باچھیں کھل گئیں۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ابرِ نو بہار نسیم مشک بار نے تمام شہر کو زمرّدہ گل زارِ ارم بنا دیا ہے۔ یہ شاعر آدمی چمن پرست، وارفتہ مزاج، رنگین طبع، آزاد منش۔ تاب کہاں کہ مکان کے قفس میں قید رہیں بوئے گل کی طرح نکل کھڑے ہوئے۔ روشنیِ طبع کے صدقے ایک ایک قدم پر ایک ایک مصرعہ ریختہ موزوں ہوتا جاتا تھا۔ وہاں داد کون دے، خود ہی گردن ہلاتے جاتے تھے۔ اور احسنت و مرحبا وغیرہ کلمات زبان پر لاتے تھے اور خود ہی جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ الغرض ہمارے دُھن کے پکّے حبیب مجذوبوں کی قطع بنائے چلے جاتے تھے کہ دو مختلف الاوضاع حضرات نظر سے گذرے۔ ایک صاحب وضعِ دنیا سے نرالے، پتلون خاکی جاکٹ کالی۔ کوٹ پیلا، ریس کوٹ ڈھیلا۔ گھنی داڑھی خرگوش کی جھاڑی۔ ہاف بوٹ پہنے کھٹ پٹ کرتے ڈبل چال چلے جاتے ہیں۔ دوسرے بزرگ وار زیبا اندام نازک خرام، گل فام، کیچل لیٹ کا دھانی رنگا ہوا کرتہ اُس پر روپیہ گز والی مہین شربتی کا تین کمر توئی کا چست انگرکھا۔ گل بدن کا چوڑی دار گھٹنا پہنے۔ بیسواؤں کی طرح پٹیاں جمائے، عطرِ عروس لگائے۔ تُکّے دار ماشہ بھر کی ننھی سی ٹوپی الپین سے اٹکائے ہاتھوں میں مہندی پور پور چھلّے، آنکھوں میں سرمے کی تحریر، چھوٹے پنجے کا زردمخملی چڑھواں جوتا زیب پا کیے ہوئے ایک عجیب لوچ سے کمر لچکاتے پھونک پھونک کر قدم رکھتے چلے آتے تھے۔ انھوں نے اِن کو اور انھوں نے اُن کو خوب غور سے گھورا اور ہمارے حبیب لبیب نے دونوں پر ایک ایک نظر غلط انداز ڈالی چتونوں سے تاڑ گئے کہ دونوں دُھن کے پکّے ہیں۔ اتنے میں حضرت نازک بدن نے مسکراتے ہوئے آواز دی۔ اب دل لگی دیکھیے کہ لُطف کی نوک جھونک ہوتی ہے۔

نازک بدن ۔ میاں جانے والے ۔ او میاں جانے والے ۔ اے ذری اِدھر تو دیکھو یا الٰہی ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں میرا کلیجا بلیوں اچھلتا ہے بھری برسات کے دن لے ہے۔ کہیں پھسل نہ پڑیں تو قہقہہ اڑے ۔ یار لوگوں کو دل لگی ہاتھ آئے ۔ اِن بے چارے کی مٹی پڑی پر جائے ۔ حضرت ذری سنبھلے ہوتے ۔

جانے والا ۔ (ٹھہر کر) ارشاد آپ اپنا مطلب فرمایئے، میرے پھسلنے کی فکر نہ کیجیے ۔

نازک بدن ۔ گریئے گا تو مجھ سے ضرور پوچھ لیجیے گا ۔

جانے والا ۔ بہت خوب ضرور پوچھ لوں گا ۔ بلکہ آپ کو ساتھ لے کر گروں تو سہی ۔ نیچے آپ ہوں اوپر بندہ ۔ انشا اللہ ۔

نازک بدن ۔ آپ نے یہ کیسی نیم تر قطع بنائی ہے کہیں گلا میری پھبتی آپ پر تو لوگ نہیں کہتے ہیں ۔

جانے والا ۔ آپ کو یہ زنانوں کی وضع کیسی بھائی ہے یہ چھمی جان آپ ہی تو نہیں مشہور ہیں ۔

چھمی جان ۔ (وہی نازک بدن) خدا کی قسم آپ کے کالے کپڑوں سے میں سمجھا کہ بنڈیلا کسم کے کھیت سے نکل پڑا ۔ میاں آزاد جو سنا کرتے تھے وہ آپ ہی تو نہیں ہیں ۔

جانے والا ۔ قسم حضرت عباس کی میں آپ کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ کوئی زنانہ مٹکتا جاتا ہے ۔ یا پنجہ کش ستا قن مردانہ بھیس میں آتی ہے ۔

چھمی جان ۔ واللہ آپ کی دھج ہی نرالی ہے ۔ یہ ڈبل کوٹ اور لکڑ توڑ بوٹ ماشاء اللہ ثم ماشاء اللہ ۔

آزاد ۔ اللہ رے تیرے دستِ حنائی ۔ اُف ری تیری دلربائی یہ لگاوٹ یہ سجاوٹ یہ لوچ، نازک کمری یہ دیدے کی صفائی ۔ یہ شوخ نظری ۔ خدا اس چشم سرگیں کو عین الکمال کے اثر سے بچاتے ۔ اللہ تم کو مردوا بنائے ۔

چھمی جان ۔ اس وقت آپ ایسے بدحواس کہاں بگٹٹ بھاگے جاتے تھے ۔ سچ کہیے گا آپ کو ہماری جان کی قسم ۔ ہمارا ہی لہو پیے جو لگی لپٹی بات کہے ۔

آزاد ۔ آج پروفیسر لاک صاحب زبانِ پاک سنسکرت کی اشرفیت پر لکچر دینے والے ہیں ۔ یہ بزرگ وار بڑے مقدس اور عالم یگانہ یکتائے زمانہ مشہور دیار امصار

ہیں۔ اِن کی زیارت مغتنمات سے ہے۔

چھمّی جان۔ لاحول ولاقوۃ۔ بھئی قسم خُدا کی کتنے بھونڈے ہو، کتنا خراب مذاق ہے پروفیسر صاحب کے مشہور ہونے کی ایک ہی کہی۔ ہم اتنے بڑے ہوئے آج تک نام بھی سُنا ہو تو قسم لیجیے۔ کیا دلی خاں سے زیادہ مشہور ہیں۔ نام زبان پر آتے ہی لطفِ صحبت آنکھوں میں پھر گیا۔ اور تو نہیں جانتا۔ بھئی جو کہیں 'تمھارے گھونگریالے بال'۔ ایک دفعہ بھی اس کی زبان سے سن لو تو عمر بھر نہ بھولو۔ واللہ کیا ٹیپ دار آواز ہے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بین بجا رہا ہے۔ مگر تم ایسے کوڑھ مغزوں کو گلے بازی اور نازک آوازی سے کیا واسطہ؟ تم تو پروفیسر صاحب کے پھیر میں ہو۔ تڑکا ہوا اور چلے لکچر سننے۔ ایسے مذاق پر تین حرف۔

آزاد۔ بندہ پرور مجھے جو کچھ صلواتیں سناتا ہوں سنا لیجیے۔ اُتو بنا لیجیے مگر برائے خُدا ایسے طیب النفس فخرِ بنی نوعِ انسان، بلیغ نکتہ داں بزرگ وار کے حق میں تو کلماتِ خرافات زبان سے نہ نکالیے۔ آج وہ تمام یورپ میں محققِ اکمل فاضل اجل سمجھے جاتے ہیں اور ہزاروں آدمی اُس عالمِ تبحر کی تحقیقِ انیق سے فیض پاتے ہیں۔

چھمّی جان۔ کیوں حضرت یہ شعر کس دھن میں ہے۔ واللہ گانے کے لائق ہے۔

آزاد۔ آپ پر خُدا کی منوار۔ اور آپ کی دُھن پر شیطان کی پھٹکار۔ لے توبہ شعر کی تعریف کرنا تو درکنار، کہنے لگے کہ یہ کس دھن میں ہے۔ دھن کسی ٹہاڑی بچے سے پوچھیے، میں دھن وُھن نہیں جانتا۔ وزن، تقطیع، بحر البتہ پوچھیے تو تشفی کر دوں۔ آپ کو میں دیکھتا ہوں نے میں ڈوبے ہوتے ہیں۔ بندہ نواز اِس ناچ رنگ نے آپ کی یہ گت بنائی کہ مونچھ اور داڑھی کتروائی، منہدی لگائی۔ عورتوں کی وضع بھائی۔ للّٰہ اب تو مردوے بن جاؤ۔ اِن باتوں سے باز آؤ۔

چھمّی جان۔ جی تو آپ کے پروفیسر لاک کے پاس چلا جاؤں۔ آپ کے پیرِ مغاں کی بیعت لاؤں آدمی سے مخنث بن جائیں اپنے کو آپ کی طرح گدامی بناؤں۔ آپ کسی گلی کوچے میں نکلیں تو واللہ اس وضع پر کتے ٹنگڑی لیں۔ اپنی وضع تو دیکھیے۔

ہمیں پر شیر ہیں۔ خود را فضیحت و دیگراں را نصیحت۔

آزاد۔ اب یہ فرمایئے کہ اس وقت آپ کہاں کے ارادے سے نکلے ہیں۔

چھمتی جان۔ کل شب کو تین بجے تک ایک رنگیلے دوست کے یہاں محفلِ رقص و سرود میں شریک تھا۔ واللہ وہ پیاری پیاری صورتیں دیکھنے میں آئیں کہ واہ جی واہ، کس کافر کا اٹھنے کو جی چاہتا ہو۔ جلسہ برخواست ہوا تو بس کلیجے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر، ہم بھی بادلِ سرد اٹھ کھڑے ہوئے۔ لیکن دل زلف ِ مہوشاں ہی میں پھنسا تھا۔ رات بھر کانوں میں چھما چھم کی آواز آیا کی۔ پھلوں کی پیاری صورت آنکھوں میں پھرا کی ایک ایک جو وہاں تھی دُنیا سے نرالی فتنۂ زمانہ آفت ڈھانے والی جسے دیکھو نور کا عالم چندے آفتاب چندے ماہتاب مگر وہ چاند سا مکھڑا نہ بھولے گا نہ بھولے گا۔ ہائے مرتے دم تک نہ بھولے گا۔ زاہدِ صد سالہ بھی دیکھے تو اس بتِ بے پیر کی پرستش کرے۔ اب اس وقت جھٹ پٹ بھر جاتے ہیں ذرا آنکھیں سینک آئیں۔ پھر وہیں اڑ رہی ہو گی۔ ریلی نینوں والیوں نے پھندا مارا۔

آزاد۔ کل فرصت ہو تو ہم سے ملیے گا۔

چھمتی جان۔ کل کو ملنا معلوم۔ کل تک تو نیند کا خمار رہے گا۔

آزاد۔ اچھا جانے دیجیے پرسوں سہی۔

چھمتی جان۔ پرسوں، اے پرسوں تو فغفورِ چین بھی یاد فرمائیں تو بندہ نہ جائے گا۔ پرسوں نواب صاحب کے ہاں بٹیروں کی پالی ہے۔ مہینوں سے بٹیر تیار کیے ہیں۔ دو دو بجے تو کسالیں اِدھر یا اُدھر دیکھیے تو میری توری کیسی بڑھ بڑھ کے لات دیتی ہے کہ اچھے اچھے بٹیر ایک ہی مُنہ میں نوک دُم بھاگیں۔

آزاد۔ خیر صاحب پرسوں نہ سہی دوشنبہ کے دن ملیے۔

چھمتی جان۔ دوشنبے کو تڑکے سے بانے کی کنکیاں لڑیں گی۔ ابھی بنارس سے بانا منگایا ہے۔ واللہ ماہی جال کی کنکیاں ایسی سدھی ہیں کہ ہر دم قابو میں۔ موڑ دو غوطہ دو۔ کھینچو۔ جو چاہو سو کرو۔ جیسے اصیل گھوڑا۔ بھئی کھینچ میں تو ولایتی اپنے فن کا جالینوس ہے۔؟

آزاد ۔ الٰہی خیر۔ چلیے یہ سہ شنبہ یوں گیا۔ چہار شنبے کو فرصت ہے؟
چھمّی جان ۔ واہ واہ، چہار شنبے کو تو بڑے ٹھٹے سے بھٹیاریوں کی لڑائی ہوگی۔ دیکھیے تو کیسی کیسی پری زاد بھٹیاریاں کس بانکی ادا سے ہاتھ چمکا کر انگلیاں مٹکا کر لڑتی ہیں اور کیسی بے نقط سناتی ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔
آزاد ۔ پنجشنبہ کو تو ضرور ملنا ہوگا تم کو واسطہ خدا کا۔
چھمّی جان ۔ حضرت آپ تو بڑے مرچڑے ہیں۔ ملوں تو سب کچھ جب فرصت بھی ہو، یہاں مرنے تک کی تو فرصت نہیں۔ اب کی نوچندی جمعرات ہے خدا جانے کس کس کے وعدے وفا ہوں گے۔ برسوں سے منتیں مانی ہیں۔ آپ کو دُنیا و مافیہا کی خبر تو ہے ہی نہیں آپ کو تو بس ایک پروفیسر صاحب دوسرے لکچر سے سروکار ہے۔ باقی اللہ اللہ خیر صلاح۔
آزاد ۔ بس قبلہ ملنا ملانا معلوم۔ فرصت عنقا ملاقات معدوم آج مُرغ لڑائیے گا کل پتنگ جھپکائیے گا۔ پرسوں بلبیروں کی پالی میں جائیے گا۔ کہیں محفلِ رقص و سرور آراستہ ہوگی کہیں بزم طرب پیراستہ ہوگی۔ آپ رونق افروز نہ ہوں تو رنگ کیوں کر جمے۔ اربابِ نشاط کا فروغ آپ کے دم سے، جلسے کا لُطف آپ کے فیضِ قدم سے، میلا ٹھیلا تو کوئی آپ سے کاہے کو چھوٹتا ہوگا پھر بھلا ملنے کی کون صورت۔

ہمیں لکچر سے اور تم کو تھرکنے سے کہاں فرصت
چلو بس ہو چکا ملنا نہ یاں فرصت نہ واں فرصت

لو وداع یار زندہ صحبت باقی جیئں گے تو مل رہیں گے۔

رنگے سیار

میاں آزاد زُلف پریشاں کی یاد میں رات بھر خواب پریشاں دیکھا کیے۔ تڑکے خواب خرگوش سے بے دار ہوتے۔ تو پھر سینیچر پانوں پر سوار ہو گیا دوپہر تک بے آب و دانہ ہردم خیالِ وصلِ جانانہ۔ دوپہر ڈھلے ایک قصبے میں پہنچے پیپل کے پیڑ کے سایہ میں بستر جمایا سبزۂ بے گانہ کو اپنا مسکن بنایا پیپل کے دھانی دھانی پتوں کی رنگت پر جو نظر پڑی تو سبزانِ رنگین ادا کا حسن برشتہ یاد

آیا۔ کلیجے پر سانپ لوٹنے لگے۔ تھکے ماندے چلے آتے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے ذرا دل کو ڈھارس ہوئی پانو پھیلا کر لمبی تانی تو دنیا ومافیہا کی خبر نہیں۔

جب خوب نیند بھر سو چکے تو ایک مرد آدمی نے جگایا۔ الااللہ کہہ کر اُٹھ بیٹھے وحشت کسی قدر دور ہو گئی تھی۔ مگر پیاس کے مارے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ سامنے اندارے پر ایک گُل بدن سیم تن عورت عجیب نزاکت سے پانی بھر رہی تھی حضرت بھی پہنچے۔

آزاد۔ کیوں نیک بخت ہمیں اک ذرا سا پانی نہیں پلا تیں۔ بھرنا دو بھر ہو تو لاؤ، ہم بھر دیں۔ تم بھی پیو، ہم بھی پئیں۔ احسان ہو گا۔

سیم تن ۔ جواب ندارد۔ تیکھی چتون سے بھرپور نظر ڈالی۔ مگر قہر کی بھری ہوئی۔

آزاد۔ سخی سے سوم بھلا جو ترنت جواب دے۔ بیوی پانی پلاؤ یا ٹکا سا جواب دو۔ یہ قصبہ تو اپنے حق میں دشتِ کربلا ہو گیا۔ ایک بوند پانی کو ترس ترس گئے۔ اب تو آبِ خنجر کی چاہ ہے ایک دفعہ دزدیدہ نگاہ سے پھر دیکھ لو تو پانی بھی نہ مانگوں۔

سیم تن ۔ (لب تک نہ ہلے۔ سکوت مگر ایک نازِ معشوقانہ سے ظرفِ سیمیں بھر کر پانی لے چلی)

آزاد ۔ بھئی اچھا گاؤں ہے۔ جو بات ہے انوکھی جو ریت ہے نرالی۔ ایک آب خورہ پانی نہ ملا واہ ری قسمت۔ لوگ تو اس بھادوں کی جلتی بلتی دھوپ میں پوسالے بٹھاتے ہیں۔ کیوڑا پڑا ہوا آبِ سرد پلاتے ہیں۔ یہاں کٹوروں کی جھنکار نہ (سبیل ہے نذرِ حُسین) کی پکار۔ میاں آزاد کو حیرت تھی کہ یہ کم سن نازنیں یہ

مشک افشاں بال اور مستانہ چال یہاں ویرانے میں اس کا کیا کام سائے کی طرح ساتھ ہو لیے۔ وہ کنکھیوں سے دیکھتی جاتی تھی مگر مُنہ نہیں لگاتی تھی۔ بارے بائیں ہاتھ پر ایک خوش نما پھاٹک کے قریب وہ گل فام سیم اندام ٹھہر گئی ظرفِ سیمیں کو دوسرے ہاتھ میں لیا اور پیڑ کے سایہ میں بیٹھ کر سستانے لگی

آزاد ۔ ہم بھی ہم راہِ رکاب ہیں۔ ہم تاڑ گئے کہ نزاکت کے مارے یہ ہلکا پھلکا برتن ہی پہاڑ ہو گیا۔ اشارے کی دیر ہے۔ ذرا لب ہلاؤ تو ہاتھ بٹا لوں۔ قسم جو

ایک قطرہ بھی پیوں۔ گو پیاس کی شدت سے کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ دم نکلا جاتا ہے۔ اور چاہوں تو چھین لوں لیکن تمہارا دل دکھانا منظور نہیں۔ اس میں چاہے جان پر بن آئے۔ افسوس یہ چہرۂ نورانی اور یہ نامہربانی!

اس ناطور رشکِ طاؤس زیب و عابد فریب نے پھر اس برتن کو بڑی کوشش سے اٹھایا اور پھاٹک کے اندر ہو رہی۔ میاں آزاد نے ایک درد انگیز آواز سے حسبِ حال ایک شعر پڑھا اور چپکے چپکے خود بھی پھاٹک میں دبے پانو اس گُل عذار کے پیچھے پیچھے گئے۔ وہ رعنا شمائل ایک کھلے ہوئے چھوٹے سے بنگلے میں جا بیٹھی۔ میاں آزاد ایک روش میں دُبک رہے۔ گو شیطان ورغلاتا تھا کہ چل کر زلفِ چلیپا کی بلائیں لیں۔ مگر ڈر تھا کہ کہیں یہ کالی ناگن ڈس نہ جائے اور تہذیب بھی مانع تھی۔ جی بھر بھر آتا تھا مگر قدم آگے نہیں بڑھتا تھا۔

تنگ آیا ہوں نہایت خاطرِ مشتاق سے
ہر گھڑی کہتی تھی چل ہر وقت سمجھاتی تھی ہاں

اب اس فرح بخش و دل کش مقام ندرت التیام کا ذکر سنیے۔ چوطرفہ کھائی کھدی ہوئی آٹھ آٹھ گز گہری سرپٹ اِردگرد لوٹی ہوئی۔ ایسی گھنی کہ چڑیا تک کا گزر نہ ہو سکے۔ اور وہ تیز کہ تلوار گرد۔ بڑا عالی شان محراب دار پھاٹک لگا ہوا ہے نہ جو ہردار شیشم کی لکڑی کہ بایدوشاید کیاریاں روز سینچی جاتی تھیں۔ روشوں پر سرخی کُٹی تھی۔ اشجار پر بہار گویا آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔ کہیں اناد کی قطار۔ کہیں لکھوٹ کی بہار۔ اِدھر انبہ لذید و شیریں اُدھر امرود حلوائے بے دود۔ چکوتروں اور مہتابیوں سے ٹہنیاں پھٹی پڑتی تھیں۔ پھولوں کی بُو باس۔ کہیں گل مہندی۔ کہیں گل عباس۔ پواڑی پھولی ہوئی چوطرفہ عالم نور ہے ہر سمت لطف موفور ہے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ اودی اودی گھٹا۔ کلیوں کی چٹک جوہی کی بھینی مہک۔ کلغے کی دھک۔ کنیل کی دمک۔ وسط باغ میں ایک تین فٹ کا اونچا پکا مربع چبوترہ بنا ہے اور ایک کونے میں چھوٹا سا خوش نما بنگلہ ہے۔ اغل بغل دو ایک صاف ستھری کوٹھریاں۔ یہ تو سب کچھ ہے مگر مکین کا پتہ نہیں۔ اس سیم تن کی چال ڈھال اور طرزِ نشست سے اجنبیت برستی تھی۔ حیرت تھی کہ اس باغ

لطافت بار کے یکیں سلیقہ شعار کہاں چھپ رہے۔

باغ ہے پر عجب ہے بے رو داد
نہ کہیں آدمی نہ آدم زاد

گُل ہیں سب اپنے اپنے جوبن پر — بُوئے گُل ہے صبا کے توسن پر
ہے عجب لطف ہر شگوفہ و گُل — کہیں شبو کھلی کہیں سنبل

انھوں نے دیکھا کہ وہ بتِ طنّاز سرایۂ ناز ظرفِ بیمیں زمین پر پٹک کر ایک نواڑ کی نازک پلنگڑی پر سو رہی۔ اب تو ان کو خوب ہی موقع ملا۔ اٹھے اور میوۂ تر جس قدر جی چاہا خوب چھک کر کھائے اور اس ظرفِ بیمیں کو منہ سے لگایا تو ایک ایک قطرہ پی گئے۔ اتنے میں پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ میاں آزاد جھٹ انگور کی ٹٹی میں چھپ رہے مگر تاک لگائے بیٹھے ہیں کہ دیکھیں ہے کون۔ دیکھا تو پھاٹک کی جانب سے کوئی آہستہ آہستہ آرہا ہے قریب آیا تو انھوں نے بغور نظر ڈالی۔

ایک کشیدہ قامت مُجسم و مُتنّم ڈنڈ پیل جٹ لنگوٹ باندھے اکڑتا اینٹھتا اس بنگلے کی طرف جاتا ہے۔ سمجھے کہ کوئی پہلوان کشتی گیر اپنے اکھاڑے سے واپس آتا ہے۔ قریب آیا تو یہ گمان دور ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ کوئی شاہ جی ہیں وہ چٹ لنگوٹ جس سے پہلوان کا دھوکا ہوتا تھا۔ تہ بند نکلا۔ شاہ صاحب سیدھے بنگلے میں داخل ہوئے، سیم تن کو پلنگڑی پر سوتا پایا ایک دفعہ ہی پلنگڑی پر ہاتھ مار کر چلا اٹھے۔ (اٹھ حکم معبود) وہ زنِ رعنا شمائل گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اٹھتے ہی قدم لیے۔ شاہ جی نے فرطِ شفقت سے اس کی جبینِ نورانی اور جبینِ پیشانی پر بوسہ دیا اور ایک تپائی پر بیٹھ کر یوں تقریر کرنے لگے۔

شاہ جی۔ بیٹی! آج تم کو ہمارے سبب سے بہت راہ دیکھنی پڑی! ایک گانوں میں یہاں سے دس کوس پر ایک راجہ رہتا ہے مگر اسی برس کا ہوگیا اللہ نے اسے لڑکا دیا نہ لڑکی۔ ایک دن مجھے بلوایا میں کہیں کو جاتا آتا تو ہوں نہیں۔ وہ رانی کو لے کر آپ آیا قدموں پر گر پڑا۔ میں نے رانی کے سر پر ایک گلاب کا پھول بن سونگھا دے مارا۔ پانچویں ہی مہینے اللہ نے لڑکا دیا۔ راجہ میرے پاس دوڑا آتا تھا کہ میں راہ میں ملا۔ دیکھتے ہی مجھے رتھ پر بٹھا لیا۔ کہتا ہے روپیہ لو جاگیر لو۔ گانوں لو۔ ہاتھی گھوڑے

لو۔ مگر میں کب مانتا ہوں۔ اس وقت بیچا چھوٹا تم پانی لائی ہوگی تو میں پھونک دوں گا۔ جس میں تم نامحروم نہ رہو۔

سیم تن۔ میں آپ کی لونڈی ہوں یہی کیا کم ہے کہ آپ کی زیارت نصیب ہوئی۔ پانی وہ رکھا ہے آپ پھونک ڈالیں تو میں رخصت ہوں۔ یہ کہہ کر سیم تن اٹھی دیکھا تو ظرف موجود مگر پانی ندارد۔ ایں یہ پانی کیا ہوا۔ زمین کھا گئی آسمان کھا گیا۔ ابھی پانی رکھا دیکھتے ہی دیکھتے اڑ گیا ہے۔ ہے شاہ صاحب آپ کے پاس میں جھوٹی بنی میری بڑی کرکری ہوئی زمین پھٹ جائے تو میں دھنس جاؤں۔ لے لو غضب خدا کا ایک بوند تک نہیں اللہ جانتا ہے لبالب بھرا ہوا تھا۔

شاہ جی۔ بتا ہی دوں۔ اچھا۔ اب بے چین نہ ہو۔ مجھے اشراق سے معلوم ہوگیا کہ تم آتی ہو جب تم سو رہیں۔ تو میں نے آنکھ بند کی اور یہاں پہنچ گیا۔ پانی پیا پھر آنکھ بند کی اور راجہ کے پاس ہو رہا پھونک ڈالنے کی ساعت اس وقت تھی۔ ٹل جاتی تو پھر ایک مہینے کو بات جاتی۔ اب تم یہ الائچی لو اور کل آدھی رات کو کسی مرگھٹ میں دفنا دو۔ بس مطلب حاصل ہو جائے گا۔ سیم تن نے الائچی لی اور اسی دم واپس گئی۔

میاں آزاد چپکے چپکے سب سن رہے تھے اب انھیں خوب ہی معلوم ہوگیا کہ شاہ جی رنگے سیار ہیں۔ آفتابے کا پانی تو انھوں نے پی لیا تھا اور شاہ صاحب نے معاً یہ بٹی کہ آنکھ بند کرتے ہی یہاں آئے اور پانی پی کر پھر کسی ترکیب سے چل دیے۔ یہ سن کر آزاد خوب کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ شاہ جی کی باتوں سے ان کے دل پر یہ نقش ہوگیا کہ بڑے ہی ذات شریف ہیں۔ اتنا بڑا جھوٹا دیکھا نہ سنا۔ ایسے بڑے ولی اللہ ہوگئے کہ ان کی دعا سے ایک رانی پانچویں مہینے بچہ جن پڑی۔ اس کذب پر خدا کی سنوار چھوٹا بھی تو کتنا اور علم اشراق میں بھی حضور کو بڑا دخل ہے۔ چشم بد دور، حق تو یوں ہے کہ جھوٹوں کے سردار ہیں۔ مگر پٹے بڑھالیے۔ تہ بند باندھ کر شاہ جی بن گئے۔ لگے پجنے کوئی بیٹا مانگتا ہے کوئی تعویذ کا خواستگار ہے۔ کوئی کہتا ہے میرا مقدمہ جتوا دو تو حق خدمت بجا لاؤں۔ کوئی کہتا ہے کہ فلاں عہدہ دلوا دیجیے تو مٹھائی کھلاؤں۔ اتفاق وقت سے مطلب بر آیا تو شاہ

صاحب کی چاندی ہے ورنہ مجال کس کی کہ شکایت کا لفظ زبان تک لائے۔ ڈر ہے کہ کہیں زبان نہ سڑ جائے۔ اللہ ری دھاک۔ بہت سے دشمن عقل ان بنے ہوئے فقیروں کے دام تزویر میں پھنس جاتے ہیں۔ بعض بعض تو معاذاللہ انھیں دوسرا خدا سمجھتے ہیں خدا ایسے خیالات مزخرف سے بچائے میاں آزاد اس درویش کی گفتگو سے سمجھ گئے تھے کہ پڑھے لکھے خاک بھی نہیں ہیں ورنہ (بہ سبب) اور (نامحروم) نہ کہتے۔ بھلا اَن پڑھے کندۂ ناتراش بھی کہیں مسلک خدا شناسی کے سالک ہو سکتے ہیں۔ اور غیب کی بات تو جناب باری عزّ اسمہٗ کے سوا اور کوئی جانتا ہی نہیں۔ یہ شاہ جی بے چارے کیا کھا کر بتائیں گے۔ یہ سب باتیں ہیں۔ ضعیف الاعتقاد آدمی ایسے جاہل مکاروں کے ہتھّوں میں آتیں تو آئیں۔ ہم بھلا کب پھنسنے والے ہیں۔ لے تو یہاں طفلی ہی سے فقیروں کے قائل نہ ہوتے اور ان شاہ صاحب نے تو کذب کے پل باندھ دیے۔ وہ بے چاری عورت ناقص العقل دنیا کے حالات سے واقف نہیں جس کا جی چاہا بہکا دیا۔ ہم ایسوں کو شاہ جی چکمہ دیں تو ٹانگ کی راہ نکل جاؤں۔

میاں آزاد کی کارستانی اور شاہ جی کی پریشانی

ہم سے کھل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

میاں آزاد ایسے بنے ہوئے سدھ رنگے یا فقیروں کی قبر تک سے واقف تھے معاً تاڑ گئے کہ شاہ صاحب ایک ہی مرشد بڑے ہی رنگ باز ہیں۔ خرقہ سالوس زر بر اور عمامۂ زور بر سر گو لوں کو پھانس پھونس کر ہنڈیا چڑھا دیتے ہیں اور بے وقوفوں کو اور بھی الّو بناتے ہیں۔ اُن پڑھ جوان چنگ پر چڑھ جاتے ہیں۔ سوچے کہ شاہ جی کی قرار واقعی مرمت کرنی چاہیے۔ اتنے میں شاہ صاحب نے ایک صاف شفاف چبوترے پر لنگی بچھائی اور اس پر دراز ہو کر مناجات پڑھنے لگے۔ مگر پڑھتے

کا خوب دل کھول کر خون کیا اور اناپ شناپ بکنے لگے۔

شاہ جی بڑے سوز و گداز سے لہرا لہرا کر حضرت نظامی گنجوی علیہ الرحمۃ و الغفران کے کلام معجز نظام کا خون اپنی گردن پر لے رہے تھے کہ میاں آزاد سے نہ رہا گیا۔ ایک دفعہ ہی بول اٹھے کہ یادِ وحشت تیرا ہی آسرا ہے۔ اب تو شاہ جی چکر میں آئے۔ یہ آوازہ کس نے کسا۔ یہ حریف کون پیدا ہوتے۔ یہ پھبتی کس نے کہی۔ اِدھر اُدھر دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر آدم نہ آدم زاد۔ انسان نہ انسان کا سایہ۔ یاالٰہی یہ کون بولا۔ یا خدا یہ کس نے ٹوکا۔ سمجھے کہ یہ آسمانی ڈھیلا ہے۔ خدا کھوسپڑی کو بچائے ڈرپوک ضعیف الاعتقاد تو تھے ہی ڈرے کہ کوئی بلائے ناگہانی یا آفتِ آسمانی ہے۔ رونگٹے کھڑے ہوگئے بدن تھر تھرانے لگا ہاتھ پانوں پھول گئے۔ کشف و کمال سب بھول گئے جواس بلا اجازت سپاٹو پر ہو رہے۔ ہوش قلابازی کھانے لگے۔ دفعِ بلا کی آیتیں پڑھنا شروع کیں آخر میں بآوازِ بلند چلّائے کہ دریا مظہر العجائب، اِدھر یہ بول اٹھے رنگی مع شاہ جی غائب۔ اب شاہ جی کی گھبراہٹ کا حال نہ پوچھیے کچھ چہرے پر مردنی چھا گئی۔ ع کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ دم بخود۔ میاں آزاد نے بھانپ لیا کہ شاہ صاحب پر رعب چھا گیا۔ جھٹ نکل۔ پانوں کو خوب پانوں سے کھڑکھڑایا شاہ جی کانپ اٹھے کہ پریتوں کا لشکر آن کھڑا ہوا۔ اب گئے بچ گزرے۔ آزاد نے بہ لحنِ داؤدی خاص اہلِ عجم کے لہجے میں ایک غزل پڑھی۔ گو شاہ جی الف کے نام بے بھی نہیں جانتے تھے مگر رات خوب ہی بھیگی تھی اور چاندنی نکھری تھی۔ ہوائے سرد پھولوں کی بو باس کو منتشر کر رہی تھی۔ آزاد نے ایسی سُریلی آواز سے اس حقانی غزل کو گایا کہ کندۂ ناتراش تک کو وجد آیا۔ شاہ جی مست ہوگئے۔ سمجھے کہ کوئی درویشِ باکمال آنکلے۔ اب تو جان میں جان آئی۔ میاں آزاد کے قدم لیے انھوں نے پیٹھ ٹھونکی۔ شاہ جی اس وقت دو آتشہ شراب اڑائے ہوئے تھے۔ نشہ کی ترنگ میں خیال بندھ گیا کہ کوئی آسمان سے اُترا ہے۔

آزاد۔ کیستی واز کجائی و بامنت چہ کار است۔ سکوت تا کے ما اسمک انت شیخ او سنید۔

بلغنا المراد و زال العناد لک الحمد والشکر یا ربنا۔ اللہ بس باقی ہوس۔

شاہ جی کے رہے سہے حواس اور بھی غائب ہو گئے۔ زبان سمجھ میں نہ آئی سمجھے کہ بے شک فرشتۂ آسمان سے ہماری روح کو قبض کرنے کو نازل ہوا، دبے دانتوں فرماتے کیا ہیں کہ میں علم سے نامحروم ہوں گا۔ سمجھتا نہیں ہوں گا کہ آپ اس وقت کیا حکم دیتے ہیں۔ ہم نے بہت گناہ کیے اب ماف (معاف) فرماؤ کچھ دن اور جینے دو تو توبہ کروں یہ ٹھگ بدیا چھوڑ دوں میں سمجھ گیا کہ آپ فرشتے ہو روح قبض کرنے آئے ہو۔

آزاد۔ یہ پیرانہ سالی اور یہ بداعمالی۔ یہ سن وسال اور یہ چال ڈھال، یاد رکھ کہ قعرِ جہنم میں پڑے گا اور نارِ دوزخ میں جلایا جائے گا۔ سن فرشتۂ آسمانی نہ ملک روحانی۔ میں حکیم بلیناس کی روح پاک عالم ہوں حکیم ہوں خدا ترس ہوں رحیم ہوں ملکوتی صفات ہوں صاحبِ طلسمات و نیرنجات ہوں شجاعت میں رستم سیستانی حکمت میں ارسطوئے نامی مصوّری میں رشکِ بہزاد و مانی۔ سکندر نامے میں نظامی نے یہ شعر میری ہی شان میں کہا ہے۔

بلیناس فرزانہ را بیش خواند
نبردِ یک جام جہاں بیں نشاند

میری تعریف و توصیف میں بڑے بڑے شعرائے بلند پایہ و سخن ورانِ گراں مایہ رطب اللسان ہیں۔ میرا مزار اس جگہ پر تھا جہاں تیرا حجرا ہے اور جہاں تو ناپاک رہتا ہے اور شرابیں لنڈھاتا ہے۔ خیر۔ تیری ناواقفیت کے سبب سے تجھے میں نے چھوڑ دیا لیکن اب آپ نے یہ نیا ہتھ کنڈا سیکھا کہ اس زنِ جادو جمال زہرہ تمثال کو پھانسا اور اس سے کچھ اینٹھا چاہتے تھے۔ وہ اس زمانے میں میری منکوحہ اور مطبوعہ بیوی تھی لے اب یہ ہتھ کنڈے چھوڑ و مکر و ریا سے منہ موڑو ورنہ تم ہو اور ہم۔ ابھی ابھی ٹھیک بناؤں گا اور ناچ نچاؤں گا۔ مفر اس میں ہے کہ اپنا کل جال پوست کندہ راست براست بے کم و کاست کہ چلو نہیں خود ہی بھگتو گے میرا کچھ نہ جائے گا۔ شاہ جی نے شراب کی ترنگ میں مارے ڈر کے اپنی آپ بیتی صاف کہ سنائی۔ جس کو ہم اپنی زبان میں ادا کرتے ہیں ذرا کان دھر کر سنیے۔

شاہ جی۔ چودہ برس کے سن سے مجھے چوری کی لت پڑی وہ مشاقی بہم پہنچائی کہ آنکھ چوکی اور گٹھری اڑائی غافل ہوا اور ٹوپی کھسکائی۔ پہلے کچھ دن تو لٹیا چور رہے مگر یہ تو کرتی بڑیا ہے چند ہی روز میں چوروں کے ولی کمنگر ہو گئے۔ سیند لگانا کوئی ہم سے سیکھے۔ چھت کی کڑیوں میں یوں چپٹ رہوں جیسے چھپکلی اچک پھاند میں بندر میرے مقابلے میں گرد ہیں۔ دبے پانو کوسوں نکل جاؤں ممکن کیا کسی کو آہٹ معلوم ہو۔ شہر بھر کے بدمعاش، اوباش، لُقّے، لُچّے، شہدے، گُرگے ہماری ٹکڑی میں شامل ہوئے۔ بڑے بڑے مہاجن ساہوکار جھک کر سلام کرنے لگے۔ جس نے ہیکڑی کی لی اس کو نیچا دکھا دیا جو ٹیڑھا ہوا اس کو سیدھا بنا دیا۔ خوب چوریاں کرنے لگے۔ آج اس کا مال مارا۔ کل اس کی چھت کاٹی۔ پرسوں کسی نواب کے گھر میں سیندی لگائی۔ رفتہ رفتہ ڈاکے مارنے لگے۔ سڑکوں پر لوٹ مار شروع کر دی تھا نگ میں دُنیا بھر کے بے فکرے جمع ہیں۔ ایک طرف یارانِ سرپل جانڈہ اڑا رہے ہیں دوسری طرف چرس کے دم لگ رہے ہیں۔ گانجا، بھنگ ٹھرے سب کا شغل ہے تانیں اُڑ رہی ہیں۔ شراب کی بوتلیں چنی ہوئی ہیں۔ گنڈیریوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ مکھیاں بھِن بھِن کر رہی ہیں۔ سب کو یہی فکر ہے کہ کس کا مال تاکیں۔ کوئی زردار کورا نہ بچ نکلے داغی نہ رہ۔ ہو ایک دن شامتِ اعمال سے ایک نواب صاحب ذی مقدرت کے یہاں چوری کرنے کا شوق چرایا۔ ان کے خدمت گار کو بلایا۔ ماما چھو چھو کو کچھ چٹایا۔ ایک بجے کے وقت گھر سے نکلے۔ اس محلے میں ایک مہینے قبل مکان کرایہ پر لیا۔ اس مکان میں بیٹھے۔ نواب کا ایوانِ عالی شان کوئی پچاس ہی قدم پر ہوگا تین آدمی دس قدم پر اور پانچ بیس قدم پر کھڑے ہوئے۔ ہم اور خدمت گار اور ایک چور ساتھ چلے کہ گھر میں دھنس پڑیں۔ قریب گئے تو ڈیوڑھی پر چوکیدار نے پکارا۔ کون۔ سن سے جان نکل گئی عمر بھر میں یہی خطا ہوئی کہ چوکیدار کو پہلے سے نہ ملا لیا۔ اب کیا کریں۔ قہرِ درویش بر جانِ درویش۔ پھر چوکیدار نے للکارا کون آتا ہے ہم نے کہا ہم ہیں کھئی ر چوکیدار ہم "ہم کی ایک ہی کہی ہم کا کچھ نام بھی ہے۔" آخر کار ہم نے چوکیدار کو کچھ چٹا کر سیندھ دی گھر میں گھسے تو دیکھتے کیا ہیں کہ نواب صاحب پلنگ پر سوتے ہیں اور

اُن کی بیگم دوسرے پلنگ پر خوابِ ناز میں ہیں۔ مگر شمع روشن ہے۔ اپنے ساتھی سے اشارہ کیا کہ شمع کو گل کر دے اتفاقِ وقت سے وہ ایسا گھبرایا کہ بڑے زور سے پھونک ماری۔ میں نے کہا کہ خدا ہی خیر کرے ایسا نہ ہو کہ نواب صاحب جاگ اٹھیں۔ تو لینے کے دینے پڑیں آگے بڑھ کے میں نے بتی کو تیل میں کھسکا دیا جیسے چراغ گل پگڑی غائب، بیگم صاحب کے سرہانے زیور کا صندوق رکھا تھا۔ مگر آڑے ہیں ہم تو ماما کی زبانی کچا چٹھا سن چکے تھے۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ فوراً صندوق اٹھا اور دوسرے ساتھی کو دیا کہ باہر پہنچاتے وہ کچھ ایسا گھبرایا کہ مارے بوکھلاہٹ کے کانپنے لگا اور ایک دفعہ ہی ارارا کر دھم۔ دھماکے کی آواز سنتے ہی

نواب چونک پڑے شیر پنجہ سرہانے سے اٹھا پلنگ سے اٹھ بیتر ے بدل بدل کر پھکیتی کے ہاتھ دکھانے لگے۔ میں نے ایک چاکی کا ہاتھ دیا اور جھٹ کمرے سے نکل دیوار پر چڑھ پچھواڑے کو دا اور چور چور پکارتا ہوا نا کے باہر۔ وہ دونوں سر بوجھیے نو سکھے تھے دھر لیے گئے۔ مگر واہ رے نواب واللہ جری آدمی ہے دونوں کو گھیر لیا وہ تو جیل خانے گئے۔ بندہ نلوہ بچا۔ اب ہم نے یہ پیشہ چھوڑا اور سفاکی پر کمر باندھی۔ ایک مہینے میں کئی خون کیے۔ پہلے ایک سوداگر کو گھر میں گھس کر چارپائی پر ڈھیر کر دیا اور جمع جتھا ہمارے باپ کی ہو گئی۔ پھر ریل پر ایک مال دار جوہری کا گلا گھونٹ ڈالا اور جواہرات صاف اڑا لیے۔ تیسری دفعہ دو بنجارے سرائے میں اترے تھے ہمیں خبر ملی کہ ان کے پاس سونے کی اینٹیں ہیں۔ ان کو سرائے ہی میں انٹا غفیل کرنا چاہا بھٹیارن نے ہمیں دیکھ لیا۔ غل مچا یا پکڑے گئے۔ چالان ہوا مجسٹریٹ نے قید خانہ دکھایا۔ وہاں آٹھ دن رہے تھے کہ نویں دن آزادی یاد آئی۔ رات کو موقع پا کر کال کوٹھری کا دروازہ توڑا۔ ایک کنجی بردار کا سر اینٹ سے پھوڑا۔ پہرے کے کانسٹبل کو اسی بندوق سے شہید کیا۔ صاف نکل بھاگے اب ہم سوچے کہ کوئی نیا پیشہ اختیار کریں۔ اس گاؤں میں آئے تو عجیب ہتھکنڈے سے درویش بن بیٹھے۔ فقیروں کا بھیس بدل کر ایک پیڑ کے نیچے بستر جما دیا پجنے لگے ایک دن اس گانوں کے ٹھاکر کا لڑکا بیمار ہوا یہاں طبیب نہ ڈاکٹر کسی نے کہہ دیا کہ ایک ولی اللہ پکریا کے نیچے بیٹھے یادِ خدا کیا کرتے

ہیں چہرے سے نور برستا ہے کسی سے لیتے ہیں نہ دیتے ہیں۔ ٹھاکر نے سنتے ہی اپنے بھائی کو بھیجا ہم ساتھ گئے۔ چہرۂ بشاش کہ آج پالا ہمارے ہاتھ رہا تو عمر بھر چین سے گزرے گی۔ ہمارا پہنچنا تھا کہ سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم کسی سے بولے نہ چالے (قدمِ درویشاں رد بلا) بہ آوازِ بلند کہہ کر لڑکے کے پاس بیٹھ گئے اور

کچھ بڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ دیکھا کہ لڑکے کا بڑا حال ہے پہنا حال ہے ٹھاکر قدموں پر گر پڑا۔ ہم نے پیٹھ ٹھوکی اور لمبے لمبے ڈگ بڑھاتے چل دیئے۔ اس دن اتفاق سے ایک یورپین ڈاکٹر دورہ کرتے ہوئے اس گانوں میں آئے۔ اور ان کے معالجے سے مریض چنگا ہو گیا اب لطف دیکھیے کہ ڈاکٹر کا تو کوئی نام بھی نہیں لیتا سب ہماری تعریف کرتے ہیں۔ کوئی عیسیٰ بناتا ہے کوئی خدا رسیدہ کہتا ہے۔ ٹھاکر نے ہمیں ایک ہاتھی اور ہزار روپیہ دیا۔ وہ ہم نے قبول نہ کیا سبحان اللہ پھر تو ہوا بندھ گئی اب چو طرفہ ہم ہی ہم ہیں۔ کوئی بیمار ہو تو ہم پوچھے جائیں۔ کوئی مرے تو ہم بلائے جائیں۔ میاں بیوی کی شکر رنجی میں ہم قاضی بنتے ہیں۔ باپ بیٹے کا جھگڑا ہم فیصل کرتے ہیں۔ صبح سے شام تک ڈالیوں پر ڈالیاں اور نعمتوں پر نعمتیں ہمارے سامنے چنی رہتی ہیں عورت مرد غریب و امیر برنا و پیر سب زیارت کو آتے ہیں۔ ہمارے آزاد منش بے باک روش پاکیزہ مشرب عالی گوہر فرخندا اختر معزز ممدوح میاں آزاد اب حکیم بلیناس فرزانہ کی روح بن بیٹھے بھئی کیا کیا فقرے یاد ہیں۔ اچھا روپ بدلا۔ شاہ جی کو وہ گیدڑ بھپکی سنائی کہ آئے حواس غائب ہو گئے۔ شراب کے نشے نے سمندِ وحشت پر ایک اور کوڑا جمایا مکر و زور کا سارا حال مو بمو کہہ سنایا۔

واللہ اچھا سہل نسخہ ہاتھ آیا۔ شاہ صاحب کی قلعی کھل گئی۔ سچ ہے ہر فرعونے را موسیٰ۔ گانوں بھر چوکھایا تھا خوب دامِ تزویر پھیلایا تھا اب پھنسے بچا۔ میاں آزاد نے جب دیکھا کہ مارے بوکھلاہٹ کے ان کی جان پر بن آئی ہے تو تشفی دی اور دلوں سمجھایا۔ سنو شاہ جی سمک سے سما اور ثریٰ سے ثریا تک اپنا راج ہے لیکن ہماری بیعت لاؤ ہمیں اپنا پیر بناؤ تو چھوڑ دیں۔ اس وقت تو مزے سے پانو پھیلا کر سو رہو۔ کل تڑکے گجر دم گانوں بھر میں غلغلہ

ڈال دو کہ ہمارے پیر مقدس نے قدم رنجہ فرمایا ہے۔ مگر ہمارا سن دو سو گیارہ برس کا بتانا اور سب سے کہہ آنا کہ ابھی نام خدا سبزۂ آغاز ہے اور جوان طناز ہی معلوم ہوتے ہیں۔ شاہ جی کی باچھیں کھل گئیں کہ چلو کسی طرح جان تو بچے نور کے تڑکے تمام گانوں میں اس سرے سے اس سرے تک پکار آئے۔ کہ ہمارے پیر مقدس آئے ہیں جسے دیکھنا ہے دیکھ لے۔

صحبت رندانِ مے آشام و مہوشانِ نازک اندام

اِن یارانِ صادق و دوستانِ موافق یارانِ بادہ نوش و بذلہ سنجان عشرت کوش میں دن بھر تو وہ چہل پہل قہقہے اور چہچہے رہے سرِ شام سے ناچ رنگ کی دھما چوکڑی مچی۔ خانہ و باغ میں جس کے در و دیوار سے صحرائیت برستی تھی شامیانہ عیش کا شانہ بہ صد حشمت شاہانہ نصب ہوا۔ یارانِ سرپل بیٹھے رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ گلرخاں پری چہرہ شادیانے بجاتے ہیں۔ طبلے پر تھاپ ہے۔ گت بج رہی ہے۔ حاضرینِ جلسہ زیر و بم سے واقف چڑھاؤ اُتار کے سمجھنے والے خوش رو خوش گلو کوئی تان سین بنا بیٹھا ہے۔ کوئی بیجو باؤلا۔ گردن سب کی ہل رہی ہے اہا ہا ہا اہو ہو ہو۔ واہ وا واہ۔ اے سبحان اللہ اے صدقے قربان جاؤں کیا گلا ہے۔ یہ گل بانگ توصیف و طنطنہ تعریف ہر سمت بلند ہے۔ ایک بت پندار شوخ و ستم گار نے یہ غزل عجب لُطف و انداز برنائی اور شانِ خود آرائی سے ادا کی ؎

خُدا جانے یہ آرایش کرے گی قتل کس کس کو
طلب ہوتا ہے شانہ آئینے کو یاد کرتے ہیں

اس پر کٹاؤ تھے۔ سب بے خود و بے ہوش۔ بے قابو۔ بے دل۔ بے صبر۔ سر دیا کی خبر نہیں ایک رند عالم سوز و آزادہ نغمہ سنجی کے دل دادہ نے چوتالے کی فرمایش کی کہنے بھر کی دیر تھی سارنگی غضب ڈھانے لگی اور زنجھر یابند یا کیو بور ا کی آواز خوش آنے لگی۔ ادھر مطرب کی ناخن بازی ادھر خوش الحانوں کی نازک آوازی بے فکروں کی واہ واہ الحذر۔ خُدا کی پناہ۔ کسی سیہ جرده ششیر بند

حرکات نے خدیو مصرِ سخن واقف رموز ہر فن عراقی آں جہاں کی یہ غزل لگائی اور ہاتھوں ہاتھ داد پائی ؎

ہمارہ قلندر سزا وار من نمائی | کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی
در دیر چو زدم من ز درون ندا بر آمد | کہ بیا بیا عراقی تو ز خاص گان ما ئی

اس کا مطلب تو دو ہی چار سمجھے مگر ٹوپیاں چو طرفہ اچھلنے لگیں سحر کاذب کے وقت جب پپیہا بولنے لگا اور نسیم سحری مشک و عنبر سے بسی ہوئی بہشت کی لپٹیں لانے لگی تو کہروے کی فرمائش ہوئی۔ زلفیں پریشان۔ مست و خوش الحان سب حاضرینِ جلسہ شاداں و فرحاں مگر حضرتِ آزاد آزردہ و گریاں۔ لاحول گویاں یہ بے اعتدالی اور بے عنوانی بحرِ بے حیائی کی روانی و طغیانی دیکھ کر ان کا دل اس صحبتِ فسق و فجور سے بھر گیا۔ چہرہ مارے غصے کے لال بھبھوکا بدن میں رعشہ مزاج کبھی تولہ کبھی ماشہ۔ معلوم ہوتا ہے ایک آدھ کو پھاڑ کھائیں گے یا گھس پٹی بتائیں گے۔ چکت دیا ہی چاہتے ہیں آڑے ہاتھوں لیا ہی چاہتے ہیں۔ اتفاق سے اس تخلیے کی صحبت میں ایک خواجہ صاحب کا بھی گزر ہوا تھا اور وہ بے چارے نئے پینچھی تھے۔ میاں آزاد کے بشرے سے تاڑ گئے کہ اس صحبت سے حضرت بہت کبیدہ خاطر ہیں وہ بھی ان سے متفق الرائے تھے لہذا دونوں میں سرگوشی ہوئی۔

خواجہ۔ یا حضرت مجرا عرض ہے۔

آزاد۔ سبحان اللہ۔ ع۔ اے وقت تو خوش کہ وقتِ ما خوش کردی۔ یہ ریش سفید یک مشت و پانزدہ انگشت۔ اور یہ شستہ تقریر یہ جبہ و دستار اور یہ شعار کہنے لگے مجرا عرض ہے تسلیم آداب کورنش بندگی السلام علیکم بالائے طاق۔ ناچ و رنگ کا ضلع حفظ ہے۔ واہ ری جگت بازی استغفر اللہ۔

خواجہ۔ قبلہ یہ دیکھیے واللہ ہے کہ میں بھی گھبرا اٹھا۔ یہ بے حیائی دیکھی نہیں جاتی جو ہے مست۔ جو ہے رندِ خرابات۔ جو ہے پھکڑ۔ یہ دیکھیے واللہ ہے کہ آپ کے چہرے کی رنگت سے بھانپ لیا کہ اتنی محفل میں ایک یہ ہمدرد ہیں۔ یہ دیکھیے واللہ ہے کہ یار لوگوں نے تڑ کا کر دیا مگر آنکھ تک نہ جھپکی دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں۔

آزاد۔ جی ہاں اور ابھی کوئی نیک کام کرتے ہوتے تو چراغ جلے ہی سے پڑ رہتے

ایک جو منکتا۔ مگر اس تھرکنے اور چمک دمک کے قربان کہ چار پہر بیٹھے ہی بیٹھے کاٹ دیے۔ اُٹھنا دور ہلنے تک کی قسم ہے۔ ستم ستم ہے۔ دم بہ دم پر حقہ چلم پر چلم بھری جاتی ہے۔ خمیرا اور سیر مشک بو دھواں دھار اڑ رہا ہے۔ گلوریوں پر گلوریاں چلی آتی ہیں عطر کی شیشیاں لنڈھائی جاتی ہیں۔ سچ کہوں حضرت پہلے تو آپ مجرا ایسا بجا لائے کہ میں سمجھا کہ آپ بھی اس چھٹی ہوئی محفل کے جھٹے ہوئے ہیں۔ مگر آپ تو بندے کے ہمدرد نکلے۔

خواجہ۔ یہ دیکھیے واللہ ہے کہ یہ جتنے حضرات نظر آتے ہیں سب شرفا کے صاحب زادے ہیں۔ نصف تو امرا کے لڑکے ہیں۔ دال روٹی سے خوش باقی ماندہ مفلس ٹکا کفن کو پاس نہیں مگر بانکپن پر جان دیتے ہیں۔ گھر میں فاقہ ہے۔ رہنہان شریف در بدر کھڑے ہیں ہر مہینے مڑچڑوں کی طرح اڑے ہیں۔ ٹوپی ہے تو جوتا غائب غلّہ، جوتا ہے تو ٹوپی نہ دارد۔ لیکن اکڑتے نکلتے ہیں۔ پڑھنا لکھنا تلاش معاش سب کی دم ہیں رسّا۔ لنگوٹی میں پھاگ۔ کبھی رنگ کبھی راگ۔ بھیرویں ہو یا راگ امیر زادوں کو دیکھیے واللہ ہے کہ کیا قطع بنائی کیسی وضع بھائی جن کے پاس روٹی کھانے کو نہیں وہ تحصیلِ علم سے باز رہیں تو مضائقہ نہ دارد مگر ان سے کوئی اتنا تو پوچھے کہ کیوں کبھی تم پر کون ایسی سختی پڑی تھی کہ کالج چھوڑ بیٹھے عربی پڑھی نہ انگریزی۔ موچی گیری کرو گے یا رنگ ریزی۔ جگت بولنے میں سب طاق ہیں۔ ابھی کوئی ضلع بولیے دیکھیے واللہ ہے کہ سب کے سب طوطی کی طرح چہچہ زن ہوتے ہیں یا نہیں۔ ہاں ذرا چھیڑیے تو آپ کو واللہ۔ بس ایک فقرہ چست کر کے چپکے ہو رہیے وہ پرسوں تک بکے جائیں گے۔

آزاد۔ حضرت مجھے تو ان کی صورت سے نفرت ہو گئی ہے۔ بس چلے تو کھڑے کھڑے شہر بدر کرا دوں ابھی حبسِ دوام بعبور دریائے شور کا حکم نافذ کروں یہ ننگ خاندان پیدا ہوئے ہیں۔

زنانِ باردار اے مردِ ہشیار | اگر وقتِ ولادت مار ایند
ازاں بہتر بہ نزدیکِ خرد مند | کہ فرزندان ناہموار زایند

"جلسہ برخاست تا بہ چاشت۔ وقت در وہنگام کاشت۔ پاس مرایت نگاہ داشت"۔ یہ بے تکی صدا ایک کونے سے آئی۔ طبلیوں نے بغچہ سنبھالا موھار کو

نے بوریا بندھنا اٹھایا۔ عابد فریبوں نے ناز و انداز سے قدم بڑھایا۔ صبح کی نوبت بجنے لگی مرغ نے بانگ لگائی۔ شولے کا گھنٹا ٹھنا ٹھن بجنے لگا۔ موذن نے مسجد میں اللہ اکبر کہنا شروع کیا۔

منشیِ سحر ہاتھ میں لے کر قلمِ زر — لکھنے لگا منصوبی و معزولیِ لشکر
لے فردِ سیہ شب کو کیا خارجِ دفتر — منصوب ہوا عاملِ روز اپنی جگہ پر
مہتاب پہ جاری تھا قلم امر و نہی کا — پروانہ چراغوں کو ملا برطرفی کا

شمع گل پگڑی غائب۔ رند جھٹ سے جا نماز بچھا نماز پڑھنے لگے۔ ایک مسخرے نے اپنے فریب کے یار عیار کو ڈھکیل دیا تو منہ کے بل زمین پر۔ دوسرے نے ایک کی کھوپڑی پر چپت جمائی تو ٹوپی دس قدم پر۔ تیسرے نے جوتے کو انگلی بتائی تو چاروں خانے چت۔ پانچویں نے باآوازِ بلند کہا۔

بنکار و آج خوب چلو میکدے کو ذوق — چھوڑو کہیں وظیفہ بہت بڑبڑا چکے

ایک اور بادہ گسار نے دیکھا کہ وہ سب مزی رہے ہم ہی پھسڈی رہے جاتے ہیں فرمایا۔

فصلِ بہار آئی پیو صوفیو شراب — بس ہو چکی نماز مصلّا اٹھائیے

چلیے حضرت اللہ میاں پر احسان کر چکے۔ نماز پڑھی یا نہ پڑھی وضو کر کے مستعد تو تھے۔ الاعمال بالنیات۔ پھر خوف کا ہے کا ہے اور بھئی نماز چاہے ایک نہیں پچاس بار قضا ہو جائے۔ نماز خفتن پڑھ لیں گے۔ چلو چھٹی ہوئی۔ میاں آزاد کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا کہ یہ سواد الوجہ فی الدنیا حضرت قادر ذوالجلال سے کبھی نہیں چوکتے نماز میں کبھی دل لگی۔ عبادت میں مسخرہ پن۔ خاصے ٹھٹے ہیں۔

خواجہ۔ یہ دیکھیے واللہ ہے کہ یہ مرتد رحمتِ رب سے محروم رہیں گے۔ اپنے تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ دیکھیے واللہ ہے کہ بس توبہ ہی بھلی۔

آزاد۔ بندہ پرور گستاخی معاف۔ یہ تکیہ کلام تو چھوڑیے آپ ایک جملہ بولتے ہیں تو تین سو پینسٹھ (یہ دیکھیے واللہ ہے) کوئی فقرہ (یہ دیکھیے واللہ ہے) سے خالی نہیں۔ یہ بری عادت ہے۔

خواجہ۔ یہ دیکھیے نہیں۔ توبہ توبہ مگر یہ دیکھیے واللہ ارے پھر وہی فقرہ نکلا۔ مگر

واللہ اس توڑ جوڑ کے قربان جاؤں ۳۶۵۔ کی بہت ہوئی سال میں ۳۶۵ ہی دان ہوتے ہیں۔

میاں آزاد اس صحبتِ رنداں مے آشام سے ایسے ناراض ہوئے کہ بلا رخصت بھاگ گئے۔ اجی حضرت اجی حضرت۔ سنیے تو ہی سنیے تو سہی۔ واسطے خدا کے پیچھے پھر کے نہ دیکھیے تو جنت سے نکالا جائے وہ سنتے کس کی ہیں یہ جا وہ جا۔

لکھنؤ کا محرم الحرام

میاں آزاد سیلانی آدمی سیر سپاٹے پر ادھار کھائے ہوئے مٹر گشتی کی دھن جو سمائی تو ریل کے انجن کی طرح چل کھڑے ہوئے اور سوچے کے چل کر محرم لکھنو کا دیکھ لیں۔ دیکھتے کیا ہیں کہ گھر گھر شیون وشین گھر گھر بکا و گریہ وزاری۔ اشک باری جم غفیر مجمع کثیر۔ ایک جا تن بول اٹھے اور کیوں نہ ہو مجالس عزا کی دھوم دھام ہے لکھنؤ کا محرم الحرام ہے۔ لکھنو کی سوز خوانی لکھنو کی خوش بیانی۔ لکھنو کی عزا داری لکھنؤ کی سوگ واری از شام تا روم مشہور ہر مرز و بوم ہے۔ تعزیہ خانوں میں دھوم امام باڑوں میں ہجوم ہے اور ان سب میں حسین آباد مبارک کالبدر فی النجوم ہے ان کے ساتھ ان کے ایک دوست بھی ساتھ ہو لیے تھے۔ ان کی بے قراری کا حال پچھ نہ ہو چھیے، وہ لکھنو سے واقف نہ تھے لوٹے جاتے تھے کہ شہید کربلا کا واسطہ آل مصطفےٰ کا صدقہ ہمیں لکھنو کا محرم دکھا دو۔ مگر کوئی جگہ چھوٹنے نہ پائے۔ ایک شخص نے ایک آہِ سرد کھینچ کر کہا کہ میاں اب وہ لکھنؤ کہاں وہ لوگ کہاں۔ وہ دل کہاں۔ لکھنؤ کا محرم رنگیلے پیا جانِ عالم کے وقت میں دیکھتا تو ارنی گوٹے اوج طور بھی غش کر جاتا بانکوں کی شمشیر دو پیکر جب دیکھو میان سے دو انگل باہر کسی نے ذرا تیکھی چتون کی اور انھوں نے کھٹ سے سر زنی کا تلا ہوا ہاتھ چھوڑا۔ بھنڈارا کھل گیا۔ ایک گھنٹوں میں ہیں ہیں خانہ جنگیوں کی نوبت آتی تھی۔ دکان دار جوتیاں چھوڑ چھوڑ کر شک جاتے تھے وہ دھکم دھکا وہ بھیڑ بھڑکا ہوتا تھا کہ واہ جی واہ انتظام کرنا خالہ جی کا گھر نہ تھا۔ اب کوئی چوں بھی نہیں کرتا۔ ادنیٰ ادنیٰ آدمی ہزاروں لٹاتا تھا

اب کوئی بھی نذر حسین نہیں نکالتا۔ اب انیسؔ ہیں نہ دبیرؔ، مومنؔ ہیں نہ مشیرؔ، صغیرؔ ہیں نہ دلگیرؔ ؎

افسوس جہاں سے دوست کیا کیا نہ گئے — اس باغ سے کیا کیا گلِ رعنا نہ گئے
تھا کون سا نخل جس نے دیکھی نہ خزاں — وہ کون سے گل کھلے جو مرجھا نہ گئے

دبیرؔ مبرور کی تربت کو خدا عنبریں کرے واللہ خدائے سخن تھا سر منبر ؎

جب قفلِ دہن کھلا جواہر نکلے — گویا کہ زباں کلیدِ گنجینہ ہے

ایک ہی رباعی پڑھی اور سامعین چار موجۂ حیرت میں غرق ہو گئے کہ اللہ اللہ یہ فصاحت یہ بلاغت ؎

مداحِ امیر ابنِ امیر آتا ہے — دربار میں شاہوں کے فقیر آتا ہے
مشتاقِ سخن خلق چلی آتی ہے — لو مرثیہ پڑھنے کو دبیرؔ آتا ہے

اور انیسؔ مغفور کو خدا بخشے باللہ العظیم کلام کیا جواہرات کے ٹکڑے ہے قند و نبات کے ریزے نور کے مرثیے ہیں۔

جوہر شناس ہے تو انھیں موتیوں میں تول

فصحائے خطۂ پاک ایران تک کہتے ہیں کہ کجا انیسؔ کجا فردوسی کجا کمر بند مرصع کجا شال طوسی بزم میں وہ ڈھنگ رزم میں وہ رنگ کہ ؎

مضمونِ انیسؔ کا نہ چہرہ اترا — اترا بھی تو کچھ بگڑ کر نقشا اُترا
نقاش نے سو طرح کی خفت کھینچی — تصویر نہ کھنچ سکی تو چہرا اُترا

لیکن ہاتھی لٹے گا بھی تو کہاں تک اب بھی اس شہر کی ایسی عزاداری ہفت اقلیم میں نہیں ہوتی۔ اب کہاں کی سدھیاں ہیں۔ نجف اشرف کربلا کاظمین۔ میر باقر کے امام باڑے۔ چوپٹیاں جہاں چلو داخلِ حسنات ہو۔ واللہ بہشت کی بھی کیا سیدھی راہ ہے ؎

دربارِ جنابِ مصطفےٰ کو دیکھا — ان آنکھوں سے شانِ کبریا کو دیکھا
فردوس میں پہنچے جو نجف میں پہنچے — جنت دیکھی جو کربلا کو دیکھا

رنگ رلیاں مناتے پو قدمے چلے جاتے تھے راہ میں وہ بھیڑ وہ ریل پیل کہ عیاذاً باللہ شانے سے شانہ چھلتا تھا۔ ہوا جب بعد خرابی بصرہ کہیں گزر پائے تو ضیق

النفس، ہو جائے بانکے ترچھے تیکھے ثقات مقدس کس و ناکس غریب و امیر برنا و پیر امڈے چلے آتے ہیں۔ جدھر دیکھو نرالی سج دھج مومن پاک مثلِ کعبہ سیاہ پوش۔ کوئی ماتمِ حسین میں سر برہنہ چلا جاتا ہے کوئی حلہ پوشانِ بہشت کی طرح ہرا ہرا جوڑا پھڑکاتا ہے۔ جبینانِ عنبریں مو او رمہ جبینان قوس ابرو کی مستانہ چال، ماتمی پوشاک بکھرے ہوئے بال واہ واہ ناز۔ وہ نگاہِ غلط انداز وہ چھپ چھپ کر کترا جانا۔ کبھی کجانا کبھی مسکرانا بے فکروں کی سو سو چاک پھبتیاں تماشائیوں کی زور آزمائیاں عاشق تنوں کی گھاتیں۔ رمز و کنایہ کی باتیں۔ دیہاتنیں گنوارنیں بندی لگائے پھریا پھڑکائے گوندنے پٹیاں جمائے حیرت سے باہم چہ میگوئیاں کر رہی ہیں ؎

اری دیدی تنک مہکا بتادے یہ کندیلیں جو لٹکت ہیں ہیر دہماں
حسین آباد تو پھر پھر ہے بے کنٹھ برت ہے یاں دیا لکرن کے گھر ماں

لیجیے آغا باقر کے امام باڑے میں کھٹ سے داخل۔ او ہو ہو، ہو خدا کی قدرت مجسم نظر آتی ہے۔ واہ میاں باقر کیوں نہ ہو۔ نام کر گئے۔ چکاچوند کا عالم ہے۔ لیکن گلی تنگ تماشائیوں کی عقل دنگ۔ ع جائے تنگ است و مرداں بسیار۔ مگر خلقت گھس پیٹھ کر دیکھ ہی آتی ہے ناک ٹوٹے یا سر پھوٹے آغا باقر کا امام باڑہ غرور دیکھیں گے یہاں سے جو گزارہ ہوا تو کچے پل پہنچے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک پیرِ فرتوت دقیانوس کے ہم عمر بیٹھے دُکھنے وقتوں کے لوگوں کو رو رہے ہیں واللہ لکھنؤ کے کمہار بھی نادرہ کار ہیں ایسا بڈھا بنایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ یوں چلے منہ سے اب بولا اور اب بولا۔ وہی سن کے سے بال۔ وہی سفید بھویں وہی چتون وہی پیشانی کی شکن وہی ہاتھوں کی جھریاں۔ وہی کمر خم، وہی سینہ جھکا ہوا۔ واہ رے کاریگر تو بھی اپنے فن میں یکتا ہے اور تیرا بڑھوا تو اللہ ہی اللہ۔ وہاں سے جو چلے تو داروغہ میر واجد علی صاحب مرحوم کے امام باڑے میں آئے۔ یہاں سورج مکھی پر وہ جوبن تھا کہ آفتاب اگر ایک نظر چھپ چھپا کر دیکھ پاتا تو مارے غیرت کے بحرِ ظلمات میں غوطے کھاتا۔ بے تکلف کرسیوں پر جا ڈٹے اہل کاران سلیقہ شعار نے الائچی چکنی ڈلی کی پیش کش کی۔ وہاں سے حسین آباد مبارک میں پہنچے سبحان اللہ سبحان اللہ یہ امام باڑہ ہے یا روضۂ رضواں۔ الٰہی یہ مکان ہے یا باغِ جناں۔ ہر در و دیوار سے محمد علی شاہ فردوس آرام گاہ کا نام روشن ہے۔ امام باڑہ سجا سجایا دلہن کا

ایسا جوبن ہے۔ برجوں پر ضیائے موفور۔ تو منار نور علیٰ نور حیرت تھی کہ یہ کوہ ہے یا شعلۂ طور ہے۔ سرخ قندیل پر یاقوت احمر ہیرا کھائے۔ چراغاں کی قطار بر مہتاب پروانہ ہو جائے پھر نہر مصفّا جو نظر آئی تو آنکھوں نے عجب طراوٹ پائی ؎

منور ہمچو چشم تیز بیناں　　مصفّا چوں دل خلوت گزیناں
رسیدہ عمق او تا گاؤ ماہی　　نمودہ ہمچو عینک در سیاہی
پئے کسبِ لطافت آبِ حیواں　　در و گشتہ چو در دروازہ نشیناں

بتوں کی گلی چھوڑ کر کون جاوے
یہیں سے ہے کعبہ کو سجدہ ہمارا

اب ان کے دوست کو شوق چرایا کہ ارباب نشاط کے امام باڑوں کی زیارت کریں۔ پہلے تو میاں آزاد جھجکے۔ اے حضرت خدا خدا کیجے بندہ ایسی جگہ نہ جائے گا۔ اپنی وضع کے خلاف ہے۔

دوست۔ بھئی واللہ کتنے روکھے آدمی ہو ارے میاں حیدری کی نازک آوازی مشتری کی جادو طرازی۔ گوہر کی چمک دمک آبادی کے رخ انور کی جھلک سے کانوں کو سرور آنکھوں کو نور حاصل ہوا تو لکھنؤ کا محرم گیا خاک دیکھا اور پیر و مرشد خدا اور خدا کا رسول آگاہ ہے کہ انہیں دس دن تو جہاں جا ہیے جایئے۔ رنگیں کمروں پر دو گال ہنس بول آیئے بچے اور بوڑھے سب پہنچتے ہیں۔ مضمون واحد ہے۔

آزاد۔ یہ کہیے تو خیر۔ چلیے بندہ بھی ہو مل کر شہیدوں میں داخل ہو جائے۔ پہلے گوہر کے یہاں پہنچے اللہ اللہ دماغ عرشِ بریں پر ہے اچھے اچھے رئیس زادے فخریہ مصاحبت کر رہے ہیں۔ ایک بڑے مالدار جوہری صاحب مٹکتے ہوئے آئے دس روپے کی کارچوبی ٹوپی زیبِ سر فالس اطلس کا فوق البھڑک دگلہ زیب بر سنہری لیس ٹکی ہوئی یک رنگ جوڑا خاصے مرغ زریں بنے ہوئے۔ خدمت گار کے کاندھے پر زنگاری دوشالہ۔ یہ وضع یہ قطع۔ مگر بیٹھتے ہی ٹوکے گئے بیٹھے تو ضریح کی طرف پشت کر کے صاحبِ خانہ نے ایک عجیب ادائے دل ربا سے جھڑک دیا۔ اے واہ بڑے خوش تمیز ہو۔ ضریح مبارک کی طرف پشت کی سیدھے بیٹھیے آدمیت کے ساتھ۔

جوہری۔ ماجلا (معاذاللہ) بیوی مجھے بیٹھ نہیں آتا۔ میاں آزاد نے چپکے سے

دوست کے کان میں کہا۔ لاحول ارے میاں یہ باایں ہمہ تمیم تام گھڑے کے گئے اور ذرا چیں بہ جبیں نہ ہوئے پیشانی پر شکن تک نہ آئی۔

دوست۔ بھائی جان۔ گوہر جانِ لکھنؤ شانِ لکھنؤ آن بانِ لکھنؤ روح رواںِ لکھنؤ ہے۔ رگ رگ میں شوخی ؎

قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام قیامت کرے جس کو جھک کر سلام

ایسا خوش قسمت کوئی ہو تو لے کہ ایک بتِ عربدہ جو کی گھڑکی ہے حاضرین ادب سے گردن جھکائے بیٹھے ہیں جسے دیکھو دزدیدہ نگاہ سے محوِ نظارہ بازی ہے لیکن رعبِ حسن سے بات کرتے کلیجہ لرزتا ہے ؎

غرورِ حسن اجازت مگر نداد اے گل کہ پرسشے بہ کنی عندلیبِ شیدا را

یہاں سے درد کی طرح اٹھے تو فرنگی محل میں حیدر جان کے یہاں پہنچے۔

نکلے خیمے سے جو ہتھیار لگائے عباس چڑھ کے رہوار پہ میدان میں آئے عباس

اس سوز کو ایسی نازک آوازی سے سارنگ کی مانجھ میں ادا کیا کہ سامعین لوٹن کبوتر ہوئے جاتے تھے۔ راگ اور راگنی تو اس کی لونڈیوں کا نام ہے۔ اوہو، ہو، ہو کی صدا ہر در و دیوار سے بلند تھی۔ واللہ کیا پیارا گلا پایا ہے۔ میاں آزاد کی باچھیں کھلی جاتی تھیں اور گردن تو گھڑی کا کھٹکا ہو گئی تھی۔

اب پھدک کر بی منجھو مشتری کے کمرے پر پہنچے ان کی لفاظی ان کی جادو طرازی ان کی خوش بیانی ان کے طرزِ سوز خوانی کی دھوم ہے ارباب صفائی مذاق کا ہجوم ہے کہ تل رکھنے کو جگہ نہیں ؎

خنجر جو بوسہ گاہِ پیمبر پہ چل گیا

اس کو جھنجھوٹی کی دھن میں اس لطافت سے پڑھا کہ سامعین سر دھننے لگے۔

دوست۔ کیوں! کیا لکھنؤ میں زیور پہننے کی قسم ہے۔

آزاد۔ لاحول ولا قوۃ تم بالکل ہی گنوار ہو۔ ماتم میں زیور کا کیا ذکر۔ گورے گورے کانوں میں کالے کالے کرن پھول۔ ہاتھوں میں سیاہ سیلی بس کافی ہے۔

سیاہ سیلی بدستِ آن نگارے بشاخِ صندلی پیچیدہ مارے

لیکن یہ سادگی بھی عجب لطف دکھاتی ہے، چلیے ذرا مجالسِ عزا کا رنگ

ڈھنگ بھی تو دیکھیں۔ نواب باقر حسین خاں بہادر اور داروغہ میر واجد علی صاحب مرحوم اور جناب آغا علی خاں صاحب سابق ناظم کی مجلسوں میں گئے۔ ماتم داران جناب سید الشہدا علیہ التحیۃ والثنا اور زائرین مصائب خامس آل عبا کی اشک باری اور گریہ و زاری سے یقین کامل ہوگیا کہ ماتم داری لکھنؤ پر ختم ہے۔ عاشورے کا دن تو نچوڑ کا دن تھا۔ آزاد نے لکھنؤ کے محرم کا خوب لطف اٹھایا۔

آخری یہ شب ہے یارو الوداع | الوداع اے اشک بارو الوداع
سر کو پیٹو اور پکارو الوداع | عشرۂ ماہ عزا کا ختم ہے

جدھر جاتے ہیں آوازِ گریہ و زاری جسے دیکھتے ہیں صرفِ اشک باری رات تو زیارت میں بسر ہوئی۔

پنہاں درازیِ پرِ طاؤس شب ہوئی | پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی
مجنوں صفت قبائے سحر چاک جب ہوئی | اور قطع زلف لیلیِ زہرہ لقب ہوئی

یعنی عاشورے کے دن پو پھٹتے کے وقت تعزیے نکلے۔ رانگے کا تعزیہ، جو کا تعزیہ۔ موم کا تعزیہ۔ کھیلوں کا تعزیہ۔ روئی کا تعزیہ۔ پیپل کے پتوں کا تعزیہ۔ انڈوں کا تعزیہ۔ لوگرہ تعزیہ لاکھوں تعزیے تالکٹورے کی کربلا میں دفنائے جاتے ہیں۔ اربابِ نشاط برہنہ سر برہنہ پا۔ سیاہ ماتمی پوشاک نے اِن کے جوبن کی آگ کو اور بھی بھڑکا دیا لیکن۔

منھ آبِ گہر سے بھی نہ دھونے پائے | رومال نہ اشکوں سے بھگونے پائے
جی بھر کے حسین کو نہ رونے پائے | کیا جلد ہوا ماہ محرم آخر

تندرستی ہزار نعمت

لکھنؤ کے محرم کی چہل پہل۔ علم اٹھانے والوں کا زور اور بل، امام باڑوں کی تیاریاں، صناعوں کی گل کاریاں، نازک اندامون کی بہار جوانی، صادق علی خاں کی سوز خوانی، اربابِ نشاط کی بناوٹ دکانوں کی سجاوٹ، تنبولیوں کی سرخ روئی، دل بر میوہ فروش کی دل جوئی، تعزیہ خانوں کی دھوم، تال کٹورے کی کربلا معلّی

کا ہجوم، حسین آباد مبارک کا نور، نجف اشرف کا لطفِ موفور، ماتم داران سید الشہدا کی گریہ و زاری، مومنوں کی اشک باری دیکھ کر حضرتِ آزاد با دلِ شاد طاؤسِ مست کی طرح جھومتے چوک میں آنکلے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ پندرہ بیس کم سن لڑکے جزدان لٹکائے سلیٹیں دبائے پرے جمائے پوقدمے آتے ہیں۔ پندرہ پندرہ بیس بیس برس کا سن اٹھتی جوانی کے دن مگر کمر بہتر جگہ سے خم جیسے تیغ ریختہ دم۔ گالوں پر کچھ بل کے بڈھے کی طرح جھریاں۔ آنکھیں گڑھے میں دھنسی ہوئی منھ پر ہوائیاں چلنا محال ہے۔ یا الٰہی یہ جھکا ہوا سینہ یہ شانے۔ یہ ڈنڈا اور تین کا نے اس نئی جوانی میں قبلۂ پیری و صد عیب بن بیٹھے پیرانہ سالی میں تو شاید اٹھ کر پانی پینا بھی وبال جان ہو جائے گا۔ بڑھ کر ۔

پوچھا تم لوگ جیل کے خیل آتے ہو کدھر سے صورتِ سیل

میاں صاحب زادو! ہمیں اس وقت واللہ حیرت ہے کہ عنوانِ شباب اور کمزوری۔

طالب علم۔ یہ بے چارے طاقت توانائی اور کس بل کس کے گھر سے لائیں زور دوا تو ہے نہیں کہ عطار کی دکان پر جائیں۔ دعا نہیں کہ کسی شاہ جی سے رجوع لائیں۔ ان کی تو جان عذاب میں ہے۔ دس برس کے سن میں تو بیوی چھم چھم کرتی ہوئی گھر میں آئی۔ چلیے اس دن سے پڑھنا لکھنا چھپر پر رکھا نظارہ بازی کا سبق نوکِ زبان کیا۔ جب دیکھیے چاہتی بیوی کے مصحفِ رخ پر نظر ہے۔ نئی دھن ہے کچھ اور ہی اد میڑبن ہے۔ تیرھویں ہی برس ایک چھوکری کے باپ یا چھوکرے کے ابا جان ہوے فکرِ معاش نے دامن پکڑا کھلائی دائی ماما چھوچھو کی فکر ہوئی یہ دبلے پتلے نہ ہوں تو کون ہو۔ اس کو بھی جانے دیجیے ورزش سے طبیعت نفور، ڈنڈ مگدر سے منزلوں دور، کشتی سے اجتناب۔ غذا مقوی نہیں طرزِ معاشرت بھونڈا۔

میاں آزاد اس تقریرِ پُر تنویر سے باغ باغ ہوگئے دل میں سوچنے لگے کہ ہائے ان کی جوانی کیسی برباد ہو جاتی ہے اس ردمیں کہیں حضرت گنج دل کشا سکندر باغ کی طرف نکل گئے۔ دیکھتے کیا ہیں ایک فرح بخش و نزہت انتما دل کش و خوش نما بنگلے میں دس دس برس پندرہ برس کی انگریزوں کی لڑکیاں اور لڑکے صاف ستھری

پوشاک زیب تن کیے ہوئے کھیل رہے ہیں۔ سب سیم بدن غنچہ دہن۔ ایک پیڑ کی ٹہنی پر جھولتا ہے دوسرا دیوار کو رہ وار بنائے مزے سے اس پر دندناتا ہے۔ ٹخ ٹخ ٹخ ٹخ۔ دس بیس دو دو میل سے رپ رپ کرتے آتے ہیں۔ چار پانچ گیند کھیلنے پر لٹو ہیں۔ ایک مقام پر دیکھا کہ رسی کا سرا ایک لڑکے نے ادھر سے دوسرے نے ادھر سے لیا اور کئی فٹ زمین سے بلند کیا۔ اور ایک پیاری لڑکی بدن تول کر زمین سے اس پار اچک گئی۔ دوسری طرف سے ایک لڑکا جھپٹ کر کئی گز رسی اونچا کود گیا۔ کوئی دوڑتا ہے کوئی کرکٹ کھیلتا ہے۔ سب صحیح و تندرست خوش و خرم دوڑ دھوپ میں طاق۔ جس سڑک پر جاتے ہیں اور جس طرف بار پاتے ہیں یہی تماشا۔ اس وقت حضرت آزاد نے ان ہونہار لڑکوں اور گل اندام لڑکیوں کو دل سے دعا دی اور ہندوستان کے ادبار پر لاحول پڑھتے ہوئے گھر آئے۔

امیرزادوں کو فکرِ معاش اور نوکری کی تلاش

ساقیا مے ہلا کے ٹھلیا دے — سوندھی مٹی کی بھر کے کلھیا دے
ساقیا تجھ سے التجا یہ ہے — سچ جو پوچھے تو مدعا یہ ہے
گھول کر اک ذری پلا افیون — تاکہ پھر نشے میں گٹھے مضمون
حظ اٹھایا بہت مسہری کا — اب تماشا دکھا کچہری کا

میاں آزاد صبح منہ اندھیرے تاروں کی چھاؤں میں بستر استراحت سے اٹھے۔ معاً دل میں ٹھان لی چلو بھئی اِدھر اُدھر کے تو خوب سیر سپاٹے کیے اب ذری عدالت اور کچہری کی بھی دو گھڑی سیر کر آئیں۔ پہنچے تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک لق و دق باغ ہے اور سہانی چھاؤں میں میلا سا جمع ہے۔ کوئی حلوائی ٹے سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے۔ کہیں خوانچے والا بیٹھا ہے۔ (گلابی حلوا سوہن) مدار لیے۔ حقے ایک سمت تازے کیے جاتے ہیں وہ تڑاقا کہ واہ واہ میں آتو آیہ آوہ آ۔ آدمیوں کا تانتا لگا ہوا ہے۔ بیسوں منشی، متصدی، چٹائیوں پر بیٹھے عرضیاں لکھ رہے ہیں۔ مستغیث ہیں کہ ایک ایک کے پاس دس دس جھرمٹ کیے بیٹھے قانون چھانٹ

رہے ہیں دارے منشی جی یو کا انٹ سنٹ چنگھٹیاں سی کھپاے دے ہو) ہم تو اپنی مجمون بناوت ہیں آئ تم اپنے اڑھائی چاول الگے چوراوت ہو۔ لے مورمنسی جی تنک اس سوچ بچار کو لکھو تاکہ پھر یک تانی کیا مکدمہ ڈھمسائے جاے تو ہار گوڑ دھرت ہے دو ہی کچا اور لے لیو) یہ زبان سنتے ہی میاں آزاد ہنس بڑے گواہ گھر کی طرف جو رُخ کیا تو سبحان اللہ سبز مندیلیں اور فوق البھڑک چغے چنے ہی نظر آتے ہیں۔ وکلا ادھر ادھر بیٹھے مقدمے چکار ہے ہیں ہیں تو میرزا منشی چکوتا کیسا

اِدھر اُدھر دیکھا۔ یار نہ غم گسار۔ نہ کوئی ہاں ہوں سے شریک نہ کوئی پرسانِ حال۔ اکیلا باؤلا مثل مشہور ہے پیچھے پھر کر دیکھا کہ ایک دوست کھڑے گلوریاں بنوا رہے ہیں۔ جان میں جان آئی مارے خوشی کے باچھیں کھل گئیں فرطِ ابتہاج سے بول اٹھے کہ اے حضرت (ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں) آخاہ آپ ہیں۔ آئیے۔ کچہری کے اندر چلیے دو قدم بڑھے تھے کہ چپراسی نے کڑک کر آواز لگائی (مسیتا بیگ حاضر ہے) ایک افیمی کے پاؤں لڑکھڑائے سیڑھیوں سے لڑھکتے ہوئے دھم سے نیچے۔ یا علی ایک ٹھٹول نے کہا۔ واہ قبلہ دیکھیے یہ شرط تھی گرے تو مگر بندہ درگاہ سے پوچھ نہ لیا اٹھے تو یار لوگوں نے گرد جھاڑ دی۔ اتنے میں ایک اپرینٹس (امیدوار) اور آیا اور کرسی پر ڈٹ گیا۔

امیدوار۔ کہاں سے آنا ہوا۔

دوست۔ جی اسی شہر میں رہتا ہوں۔

امیدوار۔ کچہری میں کھڑے رہنے کا حکم نہیں ہے۔ ہمارے کمرے میں سے آپ جائیے ورنہ چپراسی کو آواز دیتا ہوں۔

دوست۔ بگڑیے نہیں بس صرف یہ تو بتا دیجیے کہ آپ کا عہدہ کیا ہے۔

امیدوار۔ ہم امیدواری کرتے ہیں۔ تین مہینے سے روز یہاں کام سیکھتے ہیں۔ اب فراٹے اڑاتا ہوں آٹھوں گانٹھ کمیت ڈاکٹ تڑ سے لکھ لوں۔ نقشا چکیول میں بناؤں۔ کسی کام میں بند نہیں۔ پندرہ روپے کی آسامی ہمیں صبح و شام لا ہی چاہتی ہے مگر پہلے تو واللہ گھانس چھیلنا مشکل معلوم ہوتا تھا اب بقراط بن گیا۔

آزاد۔ کیوں میاں صاحب زادے تمہارے والد کہاں نوکر ہیں۔

امید وار۔ نوکر تو بہ توبہ کیجیے وہ دس گانوؤں کے زمیں دار ہیں۔
آزاد۔ کیا تم کو گھر سے نکال دیا یا عاق کر دیا۔ یا کچھ کھٹ پٹ ہے
امید وار۔ ہم ہونہار لڑکے ہیں ؟ اس سن میں نوکری کی فکر ہوئی۔
آزاد۔ حضرت جسے کھانے کو روٹیاں نہ ہوں وہ ستو باندھ کر نوکری کے پیچھے پڑے تو مضائقہ ندارد۔ تم خدا کے فضل سے خوش و خرم مرفہ حال فارغ البال۔ زمیں دار روپے والے ہو۔ تم کو یہ کیا سوجھی کہ دس پانچ کی نوکری کے لیے ایڑیاں رگڑتے ہو۔ اسی نے تو ہندوستان خراب ہے۔ واہ رے ادبار جسے دیکھو نوکری پر ہزار جان سے عاشق میاں صاحب زادے کہا مانو اپنے گھر جاؤ اپنا کام دیکھو اس پھیر میں نہ پڑو۔ عمامہ باندھا اور کچہری میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ محرری پر لوٹ۔ امانت پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں اور گھر میں سونے کی اینٹیں بھری ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔

دوسرے امید وار کی نسبت معلوم ہوا کہ ایک مہاجن لکھ پتی کا لڑکا امید واری کرتا ہے۔ باپ کی کوٹھی چلتی ہے۔ لاکھوں کا وارا نیارا بیٹا بارہ روپے کی نوکری کے لیے سو سو چکر لگاتا ہے۔ چوتھے درجے سے مدرسہ چھوڑا اور اپرینٹس ہوئے۔ کام خاک نہیں جانتے ہیں۔ ڈاک میں لکھتے آنر ڈ سر باہر جاتے ہیں تو منصرم صاحب سے پوچھ کر۔ مولوی صاحب اگر اجازت باشد۔ آب خوردہ بیایم۔ اس وقت جب سب دفتر والے اپنے اپنے گھر جانے لگے تو حضرت پوچھتے کیا ہیں۔ کیوں جی یہ سب چلے جاتے ہیں اور ابھی چھٹی کی گھنٹی تو بجی ہی نہیں۔ اسکول کی گھنٹی یاد آ گئی۔

میاں آزاد دل ہی دل میں سوچنے لگے کہ کم سن لڑکے مسیں بھیگتی ہوئی۔ نوجوان۔ امیروں کے لڑکے ابھی گبھرو نام خدا، پندرہ پندرہ سولہ برس کا سن پڑھنے لکھنے کے دن مدرسہ چھوڑا کالج سے منھ موڑا امید واروں کے زمرے میں شامل اپرینٹسوں کی ٹکڑی میں داخل۔ الغرض الف بے نگاڑا علم و ہنر کو چنے کے کھیت میں پچھاڑا۔ ہائے ستم وائے ستم۔ محنت کرنا وبال۔ درس و تدریس میں جی لگانا دشوار، دو چار برس جم کر پڑھنا محال۔ لاحول ولا۔ یہ سب ہندوستان کے ادبار کی دال ہے۔ یورپ میں دیکھیے کہ ایک ایک پیر زال تک تربیت یافتہ و بدیع الخیال ہے۔

افسوس اپنی تو یہ کیفیت کہ جہاں کسی کم سن مرفہ حال کو قبل تکمیل مدرسہ چھوڑتے دیکھا سینہ پاش پاش ہو گیا۔ دل کراہنے لگا۔ اکثر لوگوں سے پوچھا کہ بھئی صاحب زادے مدرسہ کیوں چھوڑ بیٹھے تو جواب یہی پایا کہ اقلیدس کی شکل سے نفرت ہے۔ جبر و مقابلہ سیکھنا طبیعت پر جبر کرنا تھا۔ تاریخ کسے یاد رہے یہاں تو خدا جھوٹ نہ بلائے گھر کے بچوں کا نام یاد نہیں آتا۔ لہٰذا پڑھنے کی دم میں نمدا باندھا۔ ہم بھی سوچے کہ کہاں کی جھنجھٹ۔ بھئی الگ بھی کرو چلتا دھندا کرو اور لطیفہ سنیے مدرسہ چھوڑا اور نوکری کی فکر ہوئی۔ عمامہ اونٹ پٹا تنگ باندھا اور کچہری میں خواہ مخواہ موجود اس پلٹس دستار کے قربان اور اس وحشت کے صدقے زمیں دار کے لڑکے کی یہ خواہش کہ کھیتی کو یک قلم القط کرے اور کچہری میں گھس پیٹھ کر داخل ہوئے۔ تاجر کے صاحب زادے کو بھی یہ لگی ہے کہ کالج سے چمپت ہوں اور کچہری کی کرسی پر جا ڈٹیں۔ متصدی محرر، منشی اہل قلم کے صاحب زادوں کی تو گھٹی ہی میں نوکری ہے۔ علما، فقہا، عقلا، کملا، معزز حکام اور افسران ذوی الاحترام کہتے کہتے تھک گئے۔ پڑھو کر اپنا پیشہ کرو اور اسی کو جمکاؤ۔ مگر بابو بننے کا شوق اور اہل دفتر کہلانے کا عشق ایسا چرایا ہے کہ عقل بالائے طاق وحشت گلے کا ہار ہوتی ہے مگر دیکھیے تو بھی رفتہ رفتہ سب سیدھے ڈھرے پر آجائیں گے اور چار دانگ ہند میں تربیت یافتہ ہی تربیت یافتہ نظر آئیں گے۔

مصاحبت

ہمارے ندیم یار فرہنگ۔ ہم سنگ دانایانِ فرنگ۔ والا نژاد فرخ نہاد میاں آزاد کڑی کمان کے تیر کی طرح چل کھڑے ہوئے اور سیدھے ریل کے اسٹیشن پر پہنچے۔ لگے پلیٹ فارم پر چہل قدمی کرنے۔ پل مارنے کی دیر ہوئی تھی کہ سامنے سے نور کا بکا نظر آیا۔ چکا چوند کا عالم تھا۔ ان کے کان کھڑے ہوئے کہ این گل دیگر شگفت۔

اتنے میں دیکھتے کیا ہیں کہ اغل بغل مشعل دستی روشن ادھر ادھر مصاحبین رفقاء خوشامد خورے لیمو نچوڑ بیچ میں ایک امیر کبیر رئیس ابنِ رئیس بڑے ٹھسے سے آرہے ہیں، ہٹو بچو دور باش و ادب کی آواز بلند ہے۔ سب سے پہلے اس جھنڈ کی نظر میاں آزاد پر

پڑی۔ جو ہے آنکھیں کو گھور گھور کر دیکھ رہا ہے یہ اس وقت وحشت میں جو آئے تو اور بھی ڈبل چال چلنے لگے۔ رئیس کے مصاحبین سب حاضر جواب تیز طبیعت زبان دراز، فقرہ باز، ٹھٹھول ضلع جگت میں طاق پھبتی کہنے میں مشاق آوازہ کسنے میں شہرہ آفاق تھے "پھبتی نہ کہیں تو ذہن کند ہو جائے۔ ایک نے کہا "حضور دیکھیے گا یہ فرنگی بھی واللہ عقل کے پتلے ہیں۔ آسمان میں انھوں نے ہی تھگلی لگا لی" ذری دیکھیے تو بے پٹری کے چھوٹا موٹا انجن چبوترے پر چلا دیا" دوسرا بولا "خدا کی قسم کیا لاگ ہے" تیسرے صاحب نے فرمایا "خداوند یہ چلتا پرزہ ہے" چوتھے "ماشاء اللہ ذری اس وحشت کو ملاحظہ فرمائیے گا کہ یہ احتباس یہ گرمی اور آپ سیاہ بانات کا دگلا ڈانٹے گھوم رہے ہیں" پانچواں "بادۂ انانیت کے نشے میں جھوم رہے ہیں" چھٹا "یہ سر ہے یا دھیلے والا کدو یہ توند ہے یا بانگر مئو کا تربوز" ساتواں "ماشاء اللہ کیا چہرۂ نورانی ہے"

میاں آزاد نے دیکھا کہ پھبتیوں کا گرداب ہی پڑنے لگا۔ جسے دیکھو نئی سناتا ہے جو ہے وہ بناتا ہے تو پر پرزے جھاڑ کر یہ بھی جواب ترکی بہ ترکی دینے پر آمادہ ہو گئے۔ جیسے ہی ایک مصاحب نے کہا کہ ماشاء اللہ کیا چہرۂ نورانی ہے۔ میاں آزاد تڑ سے بول اٹھے "واللہ اچھا غول بیابانی ہے" اب تک تو سیار اور سگ زرد بردار شغال ہی دور دور سے ہو ہو کیا کرتے تھے اب برمہ ڈاکس بھی اسٹیشن پر آنے لگے۔ میں تو اس روشنی ہی سے تاڑ گیا تھا کہ غولِ بیابانی ہے"

مصاحب۔ اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی۔

رفیق۔ اس کالی بانات کے دگلے پر مجھے دھوکا ہوا کہ کسم کے کھیت سے بندیلا نکل آیا۔

لیموں نچوڑ۔ ع سب صورت لنگور ذرا دم کی کسر ہے۔

میاں آزاد نے اس کا مصرع اولی پڑھ دیا۔ ع لاحول ولا قوۃ یہ کون بشر ہے

ایک اور صاحب نے آگے بڑھ کر پوچھا "اسم نامبارک" میاں آزاد نے کہا "آپ کا مزاجِ پلید" دوسرے نے قہقہہ لگا کر کہا "کس کھیت کے ہو" یہ بولے "بھیڑیے کے بھانجے سے کب نکلے بھئی" رئیس کو میاں آزاد کی باتیں ایسی بھائیں کہ پاس بلوا لیا "حضرت آپ اس وقت جو لکھ لو رہے تھے یہ آپ ہی کا کام ہے۔ میاں آزاد جھک کر ایک فرشی سلام بجا لائے۔ رئیس بانو قیر تو امیر کبیر تھے ہی جس سے خوش ہوئے دم کے دم میں نہال کر دیا

فرمایا کہ آج سے آپ ہمارے ساتھ رہا کیجیے، خانہ احسان آباد بہت خوب ہم راہ رکاب ہوں۔ جہاں حضور کا پسینا گرے میں خون گراؤں۔ کوئی تیکھی چتون سے دیکھے تو آنکھیں پھوڑ ڈالوں، مصاحبوں کو میاں آزاد کا نوکر ہونا کانٹے کی طرح کھٹکا۔

ایک۔ (دبے دانتوں)۔ پیر و مرشد۔ استخارہ تو دیکھ لیں ذرا جب آتے تو کیا مضائقہ

دوسرے۔ (جل بھن کر) خداوند بے سمجھے بوجھے کیوں کر یہ رکھ لیے گئے۔ خدا جانے چور ہیں اچکے ہیں خونی ہیں۔ یہ ہیں کون بلا اور یوں صورت سے تو مرد آدمی سب ہی معلوم ہوتے ہیں مگر کسی کے دل کا حال کیا معلوم۔

تیسرے۔ بے شک کیا چوٹٹوں کے سر پر دو سینگ ہوتے ہیں۔

چوتھے۔ حضورِ والا یہ ایک دفعہ جعلی دستاویز بنانے کی علت میں ماخوذ ہو چکے ہیں۔

پانچویں۔ اجی یہ تو برف بیچا کرتے ہیں۔ مگر واللہ اچھا نقشا جمایا

چھٹے۔ خداوند ان کی چشمِ ارزق پر نظر ڈالیں یہ عین دلیل طوطے چشمی کی ہے۔

ساتواں۔ نا صاحب ان کا یہاں کہاں ٹھکانا۔

میاں آزاد سب کی ہانک سن کر بولے۔ پیر و مرشد یہ سب چوٹٹے اٹھائی گیرے ہیں جانبازوں میں بندہ درگاہ ہی ہیں اچھا ایک کام نہ کیجیے اسٹیشن پر کوئی کام بتا دیجیے دیکھیے کون حسنِ لیاقت سے انجام دیتا ہے۔

مصاحب۔ تو آپ تو ریل کے خلاصیوں میں کام کر چکے ہیں آپ سے اس میں کون بھڑے۔

آزاد۔ اچھا حضور عروض میں کچھ سوال و جواب ہوں۔ دیکھیے ان سب کا قافیہ تنگ کر دیتا ہوں یا نہیں۔

اتنے میں ایک صاحب نے جھلا کر کہا "اے واہی ہوا ہے ٹمیں ٹیں لگائی ہے" کہیں میں ایک گدا نہ دوں حضور کو بھولا بھالا سادہ مزاج دیکھ کر بہت چل نکلا ہے چل الگ ہٹ۔

میاں آزاد

بری رخوں ہی کی میں نے بھی آنکھیں دیکھی ہیں
میں ڈر نہ جاؤں گا آنکھیں دکھائیے نہ مجھے

یہ گیدڑ بھپکیاں۔ اے کیوں نہ ہو شانِ خدا۔ آپ اور ہمیں گدا دیں سن او گاؤدی، ہم گدا کھانے والے نہیں۔ کیا کہوں ایک رئیس کے مصاحبوں میں نہ ہوتا تو اسی

دم میں گردن ناپتا۔ مگر کل تم کو ٹھیک بناؤں گا۔" اس میں ایک اور رفیق نے ڈپٹ کر کہا" آپ ہیں کس بھکوے رئیس کے مصاحب؟ میاں آزاد نے کہا۔ دیکھیے خدا و ندِ نعمت ایسے مصاحب ہیں حضور کے۔ ایک تو حضور کے سامنے گدا دینے پر آمادہ ہیں۔ دوسرے پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئے۔ تیسرے نے آپ کے دشمنوں کو بھکوا بنا دیا۔ چوتھے صاحب نے فرمایا کہ ہمارے آقا بھولے سادے آدمی ہیں اب کون نہیں جانتا کہ بھولا اور سادہ اس زمانے میں گاؤدی احمق گھامڑ سے مراد ہے۔ لاحول ولا قوۃ" رئیس کو یہ کلمے ایسے برے معلوم ہوئے کہ فوراً مصاحبوں کو للکارا جس نے بھکوا کہا تھا وہ تو کھڑے کھڑے موقوف ہوا۔ کیوں بے نمک حرام یہ کیا بات چیت تھی۔ جس کا نمک کھائے اسی کو بھکوا بتائے۔ ابھی موقوف۔ ان کو نکال دو۔ میاں آزاد نے (بہت خوب پیر و مرشد) کہہ کر ان کو تو اسٹیشن کے باہر نکالا۔ اب ان کی شامت آئی جو سادہ مزاج بتاتے تھے۔ کیوں بے مردک ہم احمق ہیں بھولے ہیں گدھے ہیں۔ ابھی دور ہو سامنے سے۔ اگر ڈیوڑھی پر آیا تو (رئیس نے تو کہا ہی تھا کہ میاں آزاد نے فقرہ پورا کر دیا) وہ بے بھاؤ کی پڑیں گی بچہ کہ سر پر ایک بال نہ رہے گا۔ رئیس نے پوچھا کوئی ہے۔ حاضر پیر و مرشد کہہ کر آزاد نے ان کی بھی گردن ناپی اور اسٹیشن سے بدر کیا۔ خبردار جو ڈیوڑھی پر آیا تو جانے گا۔ اب ان حضرت کی باری آئی جو گدا دیتے تھے۔ ہاں جی کیا تم نے کہا تھا ذرا پھر تو کہنا۔ گدا دو گے۔ میری طرف دیکھو۔ گدا دو گے اللہ اللہ اب آپ اتنے ہو گئے کہ جس کو ہم نوکر رکھیں اس کو آپ گدا دیں ہٹ سامنے سے۔

بھولے بھالے نواب

کمال بھی کیا چیز ہے واللہ ان کے ٹھاٹھ دیکھیے کہ کیا آن بان ہے جدھر گزر ہوتا ہے انگلیاں اٹھتی ہیں۔ شدہ شدہ نوابوں رئیسوں میں بھی اس کا ذکرِ خیر پہنچا۔ رئیسوں کو مرض ہے کہ پہلوان پھکیت بنوٹیے کو ساتھ رکھیں بگھی پر لے کر ہوا کھانے نکلیں۔ ایک نواب صاحب نے ان کو بھی بلوایا۔ یہ اونچی بنے ہوئے دو دو ولائتیاں کمر سے لگائے تنے ہوئے جا پہنچے تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک نواب صاحب اپنی ماں کے لاڈلے اندھیرے گھر کے اجالے بھولے بھالے مسند پر بیٹھے پیچوان گڑ گڑا رہے ہیں۔ تمام عمر زنان

خانے ہی میں حضرت نے پرورش پائی تھی۔ کبھی گھر کے باہر تک جانے کی نوبت نہ آئی تھی گویا گھر سے باہر قدم رکھنے کی قسم کھائی تھی۔ دن بھر کمرے میں بیٹھنا، یاروں، دوستوں سے گپیں اڑانا، کبھی چوسر کا رنگ جمایا کبھی بازی لڑی۔ کبھی پو پر گوٹ اڑی۔ کبھی سہ بازی دینی پڑی کبھی جبکہ اڑانے لگے۔ ع۔ آفتاب آیا ہے سورج کنڈ میں۔ ع بزن چپے کہ کفرستاں بہ لرزد۔ تاج کی کھیل اعلیٰ غلام ندارد برات کا سر۔ یہ فقرے اڑے پھر شطرنج بچھی۔ شاطر اپنے اپنے منصوبے کرنے لگے کسی نے پیادیں کی۔ کسی نے گردبیلا۔ جھرے کھٹ کھٹ پٹتے تھے۔ کشت بادشاہ کہ پھر کشت۔ وہ گھوڑا پیٹے لیا وہ پیادہ تھپک لیا۔ رخ چھڑا دیئے۔ فکر کے میدان میں عقل کے گھوڑے دوڑ رہے ہیں۔ جب دل گھبرایا تو مدک کا دم لگایا۔ چانڈو کے چھینٹے اڑائے۔ افیون کی چسکی لی۔ اس دن حضرت اپنے صاف ستھرے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں میر آغا بٹیر کو موٹھ کرتے ہوئے تشریف لائے اور آداب بجالاکر دو زانو بیٹھ گئے۔ میر آغا ابھی اچھی طرح بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ اچھے مرزا پونڈا چھیلتے ہوئے آہی گئے اور ایک کونے میں جا ڈٹے میاں جھمن انگرکھے کے بند کھولے گدی پر ٹوپی رکھے کھٹ سے موجود۔ اگاڈنی دن سے داخل۔ پھر کیا تھا۔ تو آ۔ میں آ۔ دس پندرہ حضرات جمع ہوگئے مگر سب جھنڈے تلے کے شہدے چھٹے ہوئے گرگے۔ کوئی چینی کی پیالی میں افیون گھول رہا ہے۔ کوئی چانڈو کا قوام بنا رہا ہے کسی نے گنڈیریاں بنائیں کسی نے امیر حمزہ کی داستان چھیڑی۔ سب اپنے اپنے دھندے میں مصروف ہوئے اتنے میں نواب صاحب نے میر آغا سے پوچھا کہ میر صاحب آپ نے خشکے کا درخت بھی ملاحظہ فرمایا ہے۔

میر آغا۔ حضور قسم ہے جناب امیر علیہ السلام کی ستر اور دو جو ستر دہ۔ بہتر۔ لاحول! مجھے تو گنتی بھی نہیں آتی) بہتر برس کی عمر ہونے کو آئی غلام نے آج تک آنکھوں سے نہیں دیکھا لیکن حضور ہوگا درخت بڑا تو وجہ کیا۔ ایک عالم کی اس سے پرورش ہوتی ہے۔ جسے دیکھو خشکے پر بھتے لگاتا ہے۔ پھر آخر یہ آتا کہاں سے ہے۔

اچھے مرزا۔ قربان جاؤں درخت کے بڑے ہونے میں کیا شک ہے۔ کشمیر سے لے کر قربان جاؤں بڑے گاؤں تک اور لندھن سے تا بولایت سب اس کے خوشہ چیں ہیں مگر حضور بنگال میں خشکے کے پیڑ بڑے بڑے کوئی بلینڈی کے برابر ہوتے ہوں گے۔

وہاں تو اسی پر دار و مدار ہے۔

نواب صاحب۔ میرا قیاس بھی یہی کہتا ہے کہ درخت ہوگا عظیم الشان۔ لیکن بان نہ یافت طلب یہ بات ہے کہ آخر کس درخت سے زیادہ مناسبت ہے اگر یہ دریافت ہو جائے تو پھر جانیے کہ ایک نئی بات ایجاد ہوئی اور بھئی سچ پوچھو تو تحقیقات کے بھی یہی معنے ہیں کہ جب تک ایک ایک بات کی خوب چھان بیان نہ ہو تب تک لطف نہیں۔

مسیتا بیگ۔ حضور برگد سنا بڑا عظیم الشان درخت ہوتا ہے واللہ اعلم بالصواب۔ نیم کا پیڑ تو ہم نے بھی دیکھا ہے۔ کتابوں میں البتہ پڑھا ہے کہ۔ ع برگد کی جٹائیں بال اس کے۔ اگر درخت بڑا نہ ہوتا تو شاعر مثال کیوں دیتے۔

چھمّن۔ ہم نے کیلے کا پیڑ امرود کا پیڑ گیندے کا پیڑ خربوزے کا پیڑ یہ سب انہیں آنکھوں سے دیکھ ڈالے۔

آزاد۔ بھلا یہاں کسی صاحب نے واہ واہ کی پھلیوں کا پیڑ بھی دیکھا ہے

گیتی۔ جی ہاں حضرت۔ ایک دفعہ نیپال کی ترائی میں دیکھا تھا۔ مگر شیر بوڑ کا را تو نہ گیندے کے درخت پر جھپ سے چڑھ گیا۔ کچھ یاد نہیں کہ بیتی کیسی ہوتی ہے۔

شخے میاں۔ کسی خشکے کے درخت کا کچھ تو حال دریافت کرنا چاہیے۔ یہ کیسی فرمائش ہو گیا ہے کیا؟ کہ لاکھ جتن کیجیے۔ بھید ہی نہیں کھلتا۔ اور ہاں گدے باز یوں سے کام نہیں۔ پیپل سے بڑا درخت تو آج تک سنا ہی نہیں حتیٰ کہ لوگ اس کے سایے تلے کے لوگوں کی قسم کھاتے ہیں۔ مثلاً۔ ع پیپل تلے کے بھتنے کے شیطان کی قسم۔ انشاء اللہ کہہ گئے ہیں۔

اچھے مرزا۔ قربان جاؤں ان لوگوں کی باتوں کا اعتبار کیا سب سنی سنائی کہتے ہیں۔ ع شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ قربان جاؤں غلام نے وہ بات سوچی کہ سنتے ہی پھڑک جائیے۔ قربان جاؤں کہتے ہوئے لب بندھے جاتے ہیں۔

نواب صاحب۔ ہاں واللہ میر صاحب۔ آپ کو قسم ہے پنجتن پاک کی جو نہ کہیے حضور اب اشتیاق بڑھتا جاتا ہے لے واللہ ہے مجھے یقین ہو گیا کہ آپ نے اس کی لم دریافت کر لی ہوگی واللہ دور کی کوڑی لائے ہو۔

اچھے مرزا۔ قربان جاؤں (کنارے کو ٹیک کر اور نیم خبز ہو کر) اگر خشکے کا درخت ہوگا تو اس کنارے کے برابر ہوگا جو بھر بڑا نہ تل بھر چھوٹا۔

نواب صاحب - واللہ میر صاحب کیا بات نکالی ہے۔
مصاحبین - سبحان اللہ واہ اچھے مرزا واہ میرزا صاحب قربان اس سوجھ بوجھ کے۔ کیا شیریں بیانی ہے واللہ اس گفتار کے صدقے۔
آزاد - آپ تو اپنے وقت کے لال بجھکڑ نکلے کیا بات پیدا کی ہے یقین معلوم ہوتا ہے سفر بہت کیا ہے؟
اچھے مرزا - کون۔ میں نے۔ سفر۔ ارے توبہ لو جو نخاس سے باہر گیا ہوں۔ مگر میاں میں لڑکپن سے ذکی تھا۔ والد مرحوم تو بالکل بے وقوف تھے مگر اماں جان بلا کی عورت تھیں۔ اف فوہ۔ وہ بات میں بات پیدا کرتی تھیں کہ اچھے اچھے مردوں کی عقل دنگ ہو جاتی۔ سترہ برس کی عمر تک انھوں نے ہمیں پالا پوسا۔ پھر بھلا ہم برق کیوں نہ ہوں۔

اتنے میں غل غپاڑے کی آواز آئی ہائیں: خیر تو ہے۔ بستی آخر اجڑا کیا ہے۔ اندر سے مبارک قدم لونڈی ننگے پاؤں سر پیٹتی ہوئی آئی حضور حضور۔ میں صدقے واسطے خدا کے جلدی چلیے یہ ہنگامہ کہاں ہو رہا ہے۔ پڑوس میں موے سنڈے خون کیے ڈالتے ہیں۔ بڑی بیگم صاحب رو رہی ہیں کہ میرے بچے پر آنچ نہ آجائے اور سنیے پچاس قدم پر تو جھگڑا ہو رہا ہے ان کے یہاں کھلبلی مچ گئی نواب صاحب جوتیاں چھوڑ کر اندر بھاگے دروازے سب بند اب کسی کو حکم نہیں کہ زور سے بولے اتنے میں ایک صاحب نے ڈیوڑھی پر سے پکارا کہ پیر و مرشد میاں آزاد پھر آخر کس مرض کی دوا ہیں۔ گنڈیری بھیلنے کے کام کے نہیں قوام بنانا نہیں جانتے۔ بٹیر مٹھیانے میں جانگلوان کو بھیج کر دریافت نہ کرائیں کہ یہ دنگا کہاں ہو رہا ہے۔
مبارک قدم - ہاں ہاں بھیج دیجیے۔ کہیے کتے کی چال جائیں اور بلی کی چال آئیں۔

میاں آزاد نے ایک خدمت گار کے ہاتھ میں تیغ اصفہانی دی اور خود کٹار لے کر اینڈتے ہوئے چلے راہ میں لوگوں سے پوچھتے جاتے ہیں کہ کیوں بھئی یہ فساد کیا ہے۔ یہ دنگا کہاں ہو رہا ہے۔ ایک نے کہا اجی چکمنڈی ہیں بڑ قصابوں میں چھیچھڑے پر چھری چلی۔ ایک شخص گوشت لینے آیا تھا۔ اس کو سردست یہ سوجھی کہ اپنے کتے کے لیے چھیچھڑے لے بھاگے جب بوچڑ نے دیکھا تو سب بوچڑوں کے نام لے لے کر کوسنے اور صلواتیں سنانے لگا۔ اس چھیچھڑے پر چھری چل گئی ایک نے بھچاڑا ٹنگڑی لی اور وہ تو جھپٹنے سے چوری چکاری میں برق ہو گیا ہے اس دل گردے کو تو دیکھیے کہ دن

دھاڑے آنکھ میں خاک جھونک کر دکان پر سے مال غائب کیا۔ یہ چوری ہے یا سینہ زوری پانچ چار قدم آگے بڑھے تو دو چار آدمی باتیں کرتے جاتے تھے کہ میاں ہوا یہ کہ پنساری نے پڑیا میں جمال گوٹہ باندھ دیا۔ پس انھوں نے آنے ہی گردن ناپی کہ مغز کدو کے عوض جمال گوٹہ ملا دیا۔ اور دس قدم چلے تو ایک شخص نے کہا وہ تو کہیے خیریت گزری کہ جاگ ہو گئی نہیں تو بھیڑیا گھر بھر کو اٹھائے جاتا۔ ہائیں بھیڑیا کیسا۔ جی حضور ایک منہار کے گھر سے بھیڑیا تین بکریاں دو مینڈھے ایک خرگوش اور ایک خالی پنجرا اڑائے گیا۔ اس کی عورت کو بھی پیٹھ پر لاد چکا تھا کہ منہار جاگ اٹھا۔ اب میاں آزاد چکرائے کہ بھئی یہ عجب بات ہے جو ہے وہ نئی سناتا ہے انوکھی روایت بتاتا ہے۔ قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ پندرہ بیس آدمی مل کر چھپر اٹھاتے ہیں اور غل مچا رہے ہیں۔ لاحول ر قوۃ۔ کوئی کہتا تھا کہ چھپڑوں پر چھری چلی۔ کوئی پنساری اور جمال گوٹے کی کہانی سناتا تھا ایک گرگ باراں دیدہ بھیڑیے کی روایت بٹ لائے۔ بس دس ہی قدم میں پچاسوں باتیں سننے میں آئیں اور قریب آئے تو ٹائیں ٹائیں فش۔ معقول جتنے منہ اتنی باتیں۔ جتنی زبان اتنے ہی بیان۔ الاماں۔ الاماں۔ اور واللہ ہنسی تو یہ آتی ہے کہ نواب صاحب کیسے بدحواس ہو کر غڑاپ گھر کے اندر ہو رہے اور گھر میں کہرام مچ گیا۔ رفقا اور مصاحبین نے دروازے بند کر لیے آخر کار ہم اس میدان میں چن کر بھیجے گئے۔ واللہ ری دہشت واہ میاں واہ۔ بانکپن ختم ہے۔

ایک دن کوچہ گردوں کے پیر پہلوان کشتی گیر منازل وحشت کے ہفت خواں لڑ نتیے جواں میاں آزاد ادھر ادھر ولائتی لٹکائے بانکے بنے ہوئے اکڑے اور تنے ہوئے اپنے آقا نواب صاحب بہادر کے یہاں پہنچے مجرا عرض کرتا ہوں۔ حضرت آئیے آئیے۔ آج تو میاں آزاد پورے اوبچی بنے ہیں۔ آپ ڈھال نہیں باندھتے۔ پیر و مرشد ڈھال تو زنانوں کے لیے ہے ہم عمر بھر ایک انگ لڑا کیے۔ تلوار ہی سے چوٹ لگائی اور اسی پر چوٹ روکی یا خالی دی یا کاٹ گئے۔ یہ بنوٹ کے ٹھاٹھ ہی نرالے ہیں۔ کون ایسا فن ہے کہ جس میں ہم طاق نہیں شہرۂ آفاق نہیں۔ واہ آقا کیوں نہ ہو دھوم ہے۔ یہ سب حضور ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔ ایک دن حضور کو تلوار کے جوہر دکھاؤں گا اور حضور کی آنکھوں میں آب شمشیر سے سرمہ لگاؤں گا۔ صاحب بندہ درگزرا۔ یہ کھیل اجڈوں کے ہیں۔ میری روح کانپتی ہے۔ تلوار کی صورت دیکھے جوڑی چڑھ آتی

ہے۔ ہاں میرزا صاحب چوٹ کے آدمی ہیں۔ ان کو جو رنگ کہیے وہ اُف کرنے والے نہیں۔

مرزاجی۔ خداوند سے

مرا ہم چنیں چہرۂ گل فام بود   بلورنیم از شوخی اندام بود

مگر قربان جاؤں حضور سے

بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے   یہ قصہ ہے جب کا کہ مرزا جواں تھا

اوراب تو یہ   وقتِ پیری شباب کی باتیں

ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

اب بال پک گئے۔ دانت چوہے کی نذر ہو گئے۔ گالوں پر جھریاں پڑ گئیں۔ کمر دوتا ہوئی۔ بصارت نے ٹکا سا جواب دیا۔ ہوش حواس چمپت ہوئے۔ بس ایک گرمٹ ذعصائے پیری ہے۔ باقی خدا کا نام۔ کیا کہوں حضور جس وقت یاران سرپل گنڈیریاں چوستے ہیں مُنہ دیکھ کر رہ جاتا ہوں۔ اور گنڈیری والا جب صدا دیتا ہے تو کلیجہ پکڑ کر رہ جاتا ہوں۔ اتنے میں حوالی موالی میاں دنی۔ میاں کمالی۔ آن موجود ہوئے دربار گرم ہے اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔

مٹر گشت۔ خداوند آج تو بڑی تشویش کی بات سنی میرے تو حواس فعود ہو گئے۔ شہر بھر میں کھل بلی مچی ہے۔ اللہ بچائے اب کی گرمی کی فصل خیر سے گزرتی نہیں سوجھتی۔ آثار بُرے ہیں۔

نواب۔ کیوں کیوں خیر باشد کیا قیامت آنے والی ہے۔ یا آفتاب سوا نیزے پر ہو رہا ہے یا دوسرے طوفانِ نوح کا خیمہ نصب ہو گیا ہے۔ یہ کھل بلی کیسی مچی آخر ماجرا کیا ہے۔ کچھ بتاؤ تو سہی۔ یہ تو بڑی بری سنائی۔ الّٰلھم حفظنا من کل البلیات۔

میرزا۔ اے حضور یہ جب آتے ہیں ایک نیا شگوفہ چھوڑتے ہیں خدا جانے کون فرشتہ ان کے کان میں پھونک جاتا ہے۔ اس وقت ایسی سنائی کہ واللہ نشہ ہرن ہو گیا۔ جمائیاں آنے لگیں۔ ابھی افیم گھولی تھی ابھی ابھی ڈبیا کھولی تھی۔ حضور کے سامنے ہی چسکی لی۔ مگر ان کے آتے ہی نشہ ہرن ہو گیا۔ ان کی عادت ہے کہ جب آئیں گے کچھ نہ کچھ اوٹ پٹانگ ضرور سنائیں گے۔ مفت میں نشہ اُتر گیا۔

مٹر گشت۔ اجی آپ کس کھیت کی مولی ہیں۔ ہم سے تو بڑے بڑوں کے نشے ہرن ہوئے ہیں۔ آپ نے تو جہاں افیون کا جوگا کھایا اور آنکھیں بند کیں بس پھر بولنا قسم ہے کسی نے

بات کی اور آپ کی پینک میں فرق آیا۔ جب پہلی تاریخ آئے گی تو آپ کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ اور دو چار دن بڑھ بڑھ کر باتیں بنا لو۔

ماما پختیاں اٹائو لیجیے صاحب ہم تو ڈھونڈھ ڈھانڈ کر خبریں لاتیں آپ دن بھر اونگھا اور مٹھائی ٹونگا کریں اور ہیں کو الو بنائیں۔ اینڈی بینڈی سنائیں۔ پہلی کو قلعی کھلے گی۔ بچہ صورت بگڑ جائے تو بھی۔

نواب۔ کیا کیا پہلی تاریخ کیسی۔ ارے میاں تم تو پہیلیاں بجھواتے ہو کچھ حال تو کہو۔ آخر پہلی کو کیا ہونے والا ہے۔

مسٹر گشت۔ اے حضور یہ نہ پوچھیے بس کچھ عرض نہیں کیا جاتا۔ یہ ایک حلوائن ابھی جوان جہان ہے۔ کچوری کے ایسے پھولے پھالے گال آنکھیں جیسے بتاس پھینی۔ کہیں اتفاق سے اوٹتا ہوا دودھ جو مارے ہوکے کے پی گئی تو بیٹ پھول کے کپا ہو گیا۔ کسی نے کچھ بتایا کسی نے کچھ نسخہ پلایا۔ مگر وہ اتنا غفیل ہو گئی۔ اب سنیے کہ اس کا میاں اس کو بہت چاہتا تھا جب چتا پر جانے لگی تو ایک دفعہ ہی کلبلا کر اٹھی۔ آئیں۔ ارے رام ارے باپ رے باپ توبہ توبہ۔ جیو کاڑ بھوا۔ حلوائیوں اور گنواروں نے وہ بم مچائی کہ توبہ ہی بھلی۔ ارے چپی ہو۔ یو دیکھو۔ لہاس ہلت ہے۔ آخر کار دو چار حلوائیوں نے جی کڑا کر کے لاش کو چپکے سے گھسیٹ لیا تو آہستہ سے کہتی کیا ہے (ارے یو کا ؟ اندھیر مچا یو ارے میں جلی جات ہوں رہے) جھٹ پٹ کفن پھاڑ کے اس کو نکالا تو ٹیاں سی اٹھ بیٹھی۔ حضور قسم ہے خدا کی اس نے وہ وہ باتیں بیان کیں کہ سننے سے تعلق رکھتی ہیں۔ کہنے لگی کہ جب مری تو فرشتوں نے بٹھے نرتی گل بدر چلایا۔ اور میری پیاری پیاری صورت پر عاشق ہو گئے۔ دو تین میں خوب گدے بازی ہوئی۔ دو نے تو لڑ کنی کھائی۔ ایک نے مجھے اٹھا کر خدا کے پاس پہنچایا۔ خدائن بیٹھی بلوری بیلت راہیں (نقل کفر کفر نہ باشد) ہم کا دیکھ کر خدا ڈپٹا کہ اس کو لے جاؤ۔ اتنے میں تم نے چتا ہی پر رکھ دیا۔ حضور مجھے اس کی بولی تو یاد نہیں مگر مطلب یہی تھا۔ پھر اس نے کہا کہ پہلی کو بڑا اندھیر گھپ چھا جائے گا اور طوفان آئے گا جتنے گنہ گار بندے ہیں سب سے اس دن منکر و نکیر سوال کریں گے اور افیمی جس گھر میں ہوں گے اس کو فرشتے جلا کر خاک سیاہ کر دیں گے۔

نواب۔ میرزا صاحب لے بوریا بدھنا اٹھائیے۔ آپ کا یہاں ٹھکانہ نہیں۔ ناحق کہیں فرشتے میری کوٹھی پھونک دیں تو کہیں منوائی بھی نہ ہو سکے۔ قبلہ اب میرا پیچھا چھوڑیے

بس بقچہ سنبھالیے کہیں اور بستر جمائیے۔

میرزا۔ پیر و مرشد یہ بڑا اڑی مار بے ایمان آدمی ہے۔ حضور تو بھولے بھالے رئیس ہیں جس نے جو کہا فوراً باور کر لیا۔ جو اس کی کچھ بھی اصلیت ہو۔ بھلا کہیں فرشتے گھر پھونکا کرتے ہیں۔ ذرا تو سوچیے اس مزدور کے بھروں میں آن کر مجھ بڈھے کو نہ نکالیے۔ غلام پشتہا پشت سے اس دربار میں پرورش پا یا گیا۔ اب کس کا دامن پکڑوں۔ حضور کا سایۂ دامن کافی ہے۔ اس مردک کی افترا پردازی پر نہ جائیے۔ یہ تو میرا جانی دشمن ہے۔ پائے تو کچا ہی کھا جائے۔ ارے واہ رے فقرہ باز اچھی بٹی۔ حلوائن کی چھوکری مری بھی اور جی بھی اٹھی۔ جھوٹے کی ایسی تیسی بھلا کسی نے بھی یہ باتیں سنی تھیں۔ اور سنیے کہنے لگے آنکھیں جیسے بتاشن بھینی واہ بھئی واہ کیا مثال دی ہے۔

ظریف۔ حضرت یہ افیون کا تلازمہ تھا۔

میرزا۔ جی بس آپ بیٹھے رہیں کہ نے میں یہ دگی کا موقع نہیں ہے آپ کو تو سوائے مسخرے پن کے دو مری بات ہی نہیں آتی۔

نواب۔ خیر صاحب یہ جھگڑا تو ہوا ہی کرے گا آپ اپنا سبھیتا کریں میرے باپ دادا کی ملکیت مفت میں فرشتے پھونک دیں تو میں کہیں کا بھی نہ رہوں۔ آپ ہیں کس مرض کی دوا چار پائیاں توڑا کرتے ہو۔

میرزا۔ واہ ری قسمت برسوں ریاض کیا۔ جان لڑا دی بکری کی جان گئی کھانے والوں کو مزہ نہ آیا۔ اس ملعون سے خدا سمجھے جس نے میرے حق میں یہ کانٹے بو دیے۔ خدا کرے اس کا آج کے ساتویں دن ہی جنازہ نکلے۔ جیسے ہی یہ آکر بیٹھا میری بائیں آنکھ پھڑکنے لگی۔ سمجھا کہ کچھ دال میں کالا کالا ہے تو یہ گل کھلا۔ اچھا بچہ چچا ہی بنا کر چھوڑوں تو سہی۔

نواب صاحب مصاحبوں کو یہ نادری حکم دے کر زنان خانے میں گھس گئے کہ میرزا صاحب کو نکلوا دو۔ وہ تو داخلِ دفتر ہوئے یہاں مرزا صاحب کی لے دے شروع ہو گئی۔

ہمارے بھولے بھالے امان والے نواب صاحب کا زنان خانے میں داخل ہونا تھا کہ ماں نے چٹ پٹ بلائیں لیں۔ ماما اصیلون نے دعائیں دیں۔ چھوٹی بیگم صاحبہ نے آٹھ آٹھ آنسو رونا شروع کیا سب نے منتیں مانیں۔ اب کے تو چندی خیر سے گزرے

تو مسجد میں گھی کے چراغ جلائیں۔ کمال شاہ کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھائیں۔ ہے ہے پہلی تاریخ کیا آتی ہے جیسے کال آتا ہے۔ اے خدا کے لیے اس نگوڑے افیمی کو ٹھکانے لگا دو۔ موئے نے افیم گھول گھول کر اتنے دن سیہ کاری کی جب دیکھو سوگ نشینوں کی طرح ماتم میں رہتا ہے۔ ادھر باہر رفقا اور مصاحبین نے میرزا بے چارے کا ٹیٹوا دبوچا اور نکدم کر دیا۔

مرزا گشت - مرزا جی افیون کا ڈبا بغل میں دبایئے اور چلتے پھرتے نظر آئیے سرکار کا حکم ہے۔ اور چھوٹی بیگم صاحبہ جہنا متھ مچا رہی ہیں کہ اس بڈھے خبیث کو کھڑے کھڑے شہر بدر کر دو۔ سو اب کھسکیے ورنہ بُری ہوگی۔

مستیا بیگ - واجبی بات ہے۔ سرکار چلتے چلتے حکم دے گئے تھے ہم لوگ مجبور ہیں۔ اب آپ اپنا بسیتا کیجیے۔ ابھی سویرا ہے نہیں، تم پر پٹس پڑے گی۔ اور پھر جب فرشتوں کے آنے کا ڈر ہے تو کوئی تم کو کیوں کر اپنے گھر میں رہنے دے۔ جوکھم ہے۔ اور جو فرشتوں نے ایک ننھی سی چنگاری رکھ دی تو کہیے مکان جل بھن کر خاک سیاہ ہو جائے گا یا نہیں پھر کیسی ہوگی۔

میرزا - ابے تو نامعقول۔ فرشتے کہیں گاؤں جلایا کرتے ہیں۔ وہی اوٹ پٹانگ باتیں بکتا ہے جن کا سر نہ پیر۔ لو صاحب ہمارے رہنے میں جوکھم ہے۔ جو آٹھوں پہر ڈیوڑھی پر بنے رہتے ہیں۔ تم سے اٹھائی گیرے اور ہمیں نکلوائیں۔ خدا کی شان تم سب کی ملی بھگت ہے ارے میں تو تمھاری قبر تک سے واقف ہوں اچھا اڑنگا دیا۔

جھمن - اڑنگا وڑنگا میں نہیں جانتا اب آپ کھسکنت کی ٹھہرائیں قبلہ۔ بہت دن بیٹھے ٹکڑے اڑائے چغل خور، رئیس کا مزاج بگاڑ دیا۔ ذرا سی خطا کسی سے سرزد ہوئی اور آپ نے جڑ دی۔ بس میں جنگی ڈال جما لو الگ کھڑی۔ صدہا تو خدمت گار تو نے موقوف کرائے۔ اور پچاسوں بھلے مانسوں کی روٹی لی۔ بندہ بشر ہے۔ غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ یہ چغلی کھانا کیا معنے ع۔ اصل بد از خطا خطا نکند۔ تو بھی جو جہنم میں نہ ملا دوں۔ غر سڑی تو صاحبی اس پر چبوترہ گچ کا ٹکے کا آدمی اور لگا فرعون سے ٹکر لڑنے۔ پہلے اپنی ہستی کو دیکھو۔ غفور میاں غفور میاں۔ مرزا نے تمھاری بھی بیخ کنی کی ٹھہرائی تھی۔

غفور - (خدمت گار) کون مرزا جی۔ یہ تو اپنے باپ کی جڑ کھودنے والے آدمی ہیں۔ اندر سے باہر تک کوئی ماما کوئی اصیل کوئی آدمی، ان سے خوش نہیں۔ ایسے چڑ چڑے تو

دیکھے نہ سنے۔ آج ہی تو ہتھے چڑھے ہیں۔ ان کے سر پر تڑ تڑ پڑے پڑیں۔ پھر سیر دیکھیے جیسے مینڈک کی کھوپڑی پر نمک چھڑک دیا۔

مسیتا بیگ۔ مرزا اگر غیرت ہے تو اس مصاحبت پر پا مردی سے لات مارو جس اللہ نے منہ چیرا ہے وہ رزق بھی پہنچا دے گا۔

مبارک قدم۔ (لونڈی) غفور۔ غفور چھوٹی بیگم صاحبہ کا حکم ہے کہ اس موئے افیمی کو شہر بدر کر دو۔ فرماتی ہیں کہ جب تک یہ دفان نہ ہو گا داہنے ہاتھ کا کھانا حرام ہے۔

میرزا۔ شہر بدر! کیا شہر شملہ ہے کچھ لوٹ پڑی ہے۔ تمام شہر پر بیگم صاحبہ کا کیا اجارہ ہے۔ وہ ابھی کل آئیں یہاں اس گھر میں عمر تیر ہو گئی۔ اب وہ ہمیں گدھے پر سوار کرا کر شہر بدر کرواتی ہیں جیسے نواب ویسے مصاحب ویسی ہی بیگم صاحبہ۔

اتنے میں جو یاروں نے شہ پائی تو چو طرفہ سے للکار اٹھے۔ ابے او نمک حرام چھوٹا منہ بڑی بات بیگم صاحب کے کہنے کو ٹالتا ہے۔ اتنی پڑیں گی بے بھاؤ کی کہ یاد کرو گے بچہ بہت لن ترانیاں اچھی نہیں ہوتیں۔ کیسے بلوں پر تھے جب دیکھو نتھنے پھلائے بیٹھے ہیں۔ بات کی اور لپک کر چکت دی۔ آپ ایسے شیر ہو گئے کہ بیگم صاحبہ کو برا بھلا کہنے لگے۔ چاند گنجی کر دی جائے گی جو زیادہ ٹرائے۔

میرزا۔ اب جو یہاں پانی پیے تو اس کی ہفتاد پشت پر لعنت۔ چو طرفہ سے ہمیں پر بوچھاڑ ہونے لگی۔ اٹھائی گیروں کا یہاں طوطی بولتا ہے۔ لو خدا حافظ۔ نظم۔

نواب کی چاہ دیکھیے گا	مرزا کا نباہ دیکھیے گا
لچوں سے کھرے کھرے سمجھ لوں	انشاء اللہ دیکھیے گا
جوتی خورے ہمیں بنائیں	ماشاء اللہ دیکھیے گا
افیون کی لم میں یاں سے نکلے	تقصیر و گناہ دیکھیے گا
مرزا کی ابجد الیم کا رنگ	سبحان اللہ دیکھیے گا

مصاحبین۔ واہ کیا زٹل قافیہ ہے۔ بڑے شاعر کی دم بنے ہیں ہات تیرے کی۔ چلیے نہیں گردن ناپی جاوے گی۔ لے بڑھو نہیں دوں گا دھکا بس لڑھکنیاں کھاؤ گے

مرزا تھے تو پیر فرتوت مگر تیکھے۔ جھٹ بھرا ہوا تمنچہ لے کر کھڑے ہو گئے۔ یا جیو یہ لام کاف چہ معنے دارد۔ میں بھی ہمایوں کی نسل سے ہوں کوئی ایسا ویسا نہیں۔ تم مگر گردوں

کی یہ مجاں کہ ہم کو مارنے اٹھو۔ اس پر سب کے سب کھلکھلا کر ہنس پڑے کہ واہ رے بڑے بڑا تیکھا ہے۔ رسی جل گئی رسی کا بل نہ گیا۔ القصہ میرزا نے افیم کی ڈبیہ اٹھائی اور چلے لو بھئی۔

خدمت گاروں نے جلانے کے لیے فقرہ چست کیا کہ مرزا صاحب کبھی کبھی آجایا کیجیے ایک بولا لو میں ڈبیا میں پہنچا دوں۔ دوسرے نے کہا کہیے تو گھوڑا کسوا دوں۔

مرزا۔ ؎ جو ہاتھ اپنے سبزی کا گھوڑا لگا
تو سلفے کا اور اس کو کوڑا لگا

مرزا تو چار و ناچار بہ حسرت و ارماں نکلے۔ اِدھر پہلی تاریخ آئی تو مٹر گشت چکرائے کہ اب میں جھوٹا بنا اور ساکھ گئی۔ لوگوں نے نواب کو چنگ پر چڑھایا کہ حضور جو ہم کہیں وہ کیجیے تو آج کی بلا ٹل جائے۔ نواب صاحب نے مصاحبوں کو سیاہ و سفید کا اختیار دے دیا۔ اب سرِ شام سے کیفیت قابلِ دید تھی۔ ایک طرف تو برہمن بیٹھے استت پڑھ رہے ہیں اور کھٹا کھٹ جاپ کر رہے ہیں۔ سوا ہا سوا ہا کی آواز آ رہی ہے۔ دوسری طرف قرآن خوانی ہو رہی ہے۔ اور علما قرات کے ساتھ عمل پڑھ رہے ہیں۔ گھر بھر میں چراغاں کی بہار۔ اور چراغوں کی قطار۔ ہزاروں لیمپ جھاڑ کنول روشن ہیں اور محفلِ رقص و سرود آراستہ ہے۔ قدسی تماشا دیکھیں تو لاہوت کو بھول جائیں ؎

جب تک کہ نہ دل کی بے کلی جائے
او وائرے والے گت چلی جائے

ہاں اور چھیڑے جائیے یہی آہنگ۔ یہی رنگ۔ فرشتوں کو پھانسا کوئی خالہ جی کا گھر تو ہے نہیں۔ اس وقت تو حضرتِ جنوں ہمارے مرشدِ کامل ہیں۔ ہیر پھیر کر جھنجھوٹی کی دھن رہے۔ سنا ہے کہ سبحان ملا اعلیٰ اسی راگ پر مفتوں ہیں اور اب ان سے خوف ہی کیا ہے۔ وہ تو افیمچیوں کی تلاش میں آتے ہیں یہاں کوسوں افیمی کا پتہ نہیں۔ مرزا سدھارتے نہیں تو معاذ اللہ کا مقام ہوتا اس وقت خدا جانے کیا کچھ ہو گیا ہوتا۔ نواب۔ ہوتا کیا کوٹھی کی کوٹھی بھک سے اڑ جاتی۔ توبہ کی کہ اب کسی افیونی کو آنے تک نہ دوں گا۔ اس کالی بلا سے اللہ بچائے۔ چانڈو تک خیریت ہے۔ افیم کا بندہ دشمن ہو گیا۔ خبردار آج سے افیونی دہلیز کے پار نہ ہونے پائے۔ ہے ہے

جو کہیں مرزا ہوتے تو فرشتوں نے وہ دھوم مچائی ہوتی کہ توبہ ہی بھلی۔ دل مسوس کر رہ جاتا پہلی تاریخ کے انتظار میں آنکھیں پتھرا گئیں۔ بارے صد شکر کہ بخیر گزشت۔

مسیتا بیگ۔ حضور میاں شوری کا ٹپا سنیے گا۔ یا کوئی غزل چھیڑ دی جائے۔ اچھا غزل ہی سنیے۔ ذرا اشارے کی دیر تھی دو تین طوائفوں نے مل کر یہ غزل گائی ؂

مرا گھر کہاں ان کے آنے کے قابل بلاؤں اگر ہوں بلانے کے قابل
کبھی بوسہ مانگا دہن کا تو بولے چلو تم نہیں منہ لگانے کے قابل
ہنسا میں تو ہنس کر کہا اس نے مجھ سے ہوئے آپ بھی مسکرانے کے قابل
کہا کچھ جو میں نے تو بولے وہ صفدر ہوئے تم بھی باتیں بنانے کے قابل

بھئی واہ، واللہ کیا دور کی سوجھی کہ محفلِ رقص و طرب آراستہ ہو۔ فرشتوں کے پھسلانے کا نیا طریقہ ایجاد ہوا۔ ماشاء اللہ۔

میاں آزاد کئی دن سے ساری کیفیت چپ چاپ بیٹھے دیکھ رہے تھے سوچ کہ ایسے رئیسوں کی سرکار میں نوکری کرنا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ چغل خوروں کا بازار ہر دم گرم۔ ایک کا ایک دشمن۔

ایک دن مرزاجی منڈی میں پونڈے چکارتے تھے اور سامنے سے میاں آزاد باندی ہاتھ میں لئے جھومتے جھامتے گھومتے گھامتے آرہے تھے۔ جب دو چار ہوئے تو باہم یوں گرم گفتار ہوئے۔

آزاد۔ تسلیم کا چھرا پھینکتا ہوں۔ سن سے بچیے۔

میرزا۔ ہاں تو میں بھی آداب داغتا ہوں۔ دن سے سنبھلیے۔

آزاد۔ اللہ اللہ ابھی تک چشمۂ لفاظی جاری ہے۔

میرزا۔ مگر یار چغل خوروں سے عقل عاری ہے۔

آزاد۔ کہیے اب کیا شغل کیا رنگ ڈھنگ ہے۔

میرزا جی۔ تنیخے کل پر چڑھے ہیں آمادۂ جنگ ہیں۔ حضرت میں نے دھوپ میں تو بال سفید کیے نہیں ہیں ایک در بند سو در کھلے۔ مگر۔ ع۔ بہ ہر جا کہ رسیدم آسماں پیداست۔ ایک اور رئیس کے یہاں گیا اور جاتے ہی چینی کی رنگ برنگ پیاری پیاری پیالیوں میں اس حکمت کے ساتھ افیم گھولی کہ رئیس پیتے ہی پینک میں آگئے جس نے چسکی لگائی آنکھیں بند۔ ان ہاتھوں کے قربان اجی مجھ میں تو وہ جوہر ہے کہ جہاں جاؤں قدر

ہو۔ افیم کا بول بالا اور پینک کا منہ کالا جب رئیس اور ان کے رفیقوں کو ذری ہوش آیا تو حقّے کی پکار ہوئی۔ کوئی ہے۔ دس پانچ آدمی بول اٹھے۔ حاضر حکم پیر و مرشد۔ ذرا پیچوان تازہ کر کے بھر لانا۔ بھائی ہماری سٹک بھی لاؤ۔ میاں ایک اچھی سی چلم پلاؤ۔ میں تڑ سے حقّہ بھر لایا۔ اور مشک بو تمبا کو دھواں دھار رئیس کو بلایا۔ پینا دینا بخیر۔ مہنال منہ سے لگائے اور اونگھ رہے تھے جب پھر ہوش آیا تو دو چار کش پیے آنکھیں کھل گئیں۔ باچھیں کھل گئیں۔ یہ حقّہ کس خدمت گار نے بھرا ہے۔ اس کو ہماری ولائی انعام دے دو۔ تب تو بندہ درگاہ ہاتھ جوڑ کر سامنے آن کھڑے ہوے۔ خداوند یہ غلام کی کارگزاری ہے خدمت گار کو اشارہ کیا تو دلائی ایں جناب کے کاندھوں پر جھک کر سات مرتبہ فراشی سلام بجالایا۔ حق تعالیٰ ایسے رئیسوں کو سلامت رکھے۔ دم غنیمت ہے۔ اس وقت حضور کا بار احسان بر دوش ہے۔

رئیس۔ یہ افیم بھی تو آپ نے گھولی تھی واللہ مزہ آگیا۔

بندہ۔ قربان جاؤں حضور ایسی افیون پلاؤں کہ قیامت تک پینک رہے دخل کیا کہ بے کیف ہو جائے۔ ہاتھ تلے ہوئے ہیں۔ سانچے کے ڈھلے ہوئے ہیں۔ پیر و مرشد کمال یہ ہے کہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں سرخا سرخ ہو جائیں۔ لال لال ڈورے رنگ جمائیں۔ بلبل کے زیر بال کا لطف حاصل ہو۔ کیا مجال کہ کسی دوسرے کے ہاتھ کی افیون بھائے۔ اب شام کو حکم ہو تو غلام پھر پلائے۔

رئیس - حضور! شام کیا معنے اب میں آپ کو جانے نہ دوں گا۔ آپ تو واللہ ڈبیا ہی میں بند رکھنے کے قابل ہیں۔ افیون تو کروروں روپے کی پی ڈالی مگر ایسی کبھی آج تک نصیب نہ ہوئی۔ واللہ کیا ہاتھ ہیں۔ جی چاہتا ہے چوم لوں۔ میں نے پھر جھک کر فراشی سلام کیا۔ حضور کا سایۂ دامن مجھے کافی ہے۔ مگر بھائی اس وقت جلنے خوشامد خورے بیٹھے تھے سب کا رنگ فق اور کلیجہ شق ہو گیا۔ پیٹ میں چوہے چھوٹے کہ اس نے اچھا رنگ جمایا۔ ایسا نہ ہو کہ ہم نظروں سے گر جائیں۔ کل کدھارے کو کہیں دھتا بول دیا جائے تو اُف قیامت ہی کا سامنا ہو۔ واللہ معاً وہ تدبیر کی کہ ہمارا جما جمایا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ سیئے افترا پر دازوں نے کیا شیطانی حرکت کی، ایک شخص نے کہا۔ حضور کی آواز اس وقت کچھ بھاری ہے دوسرے نے فقرہ چست کیا کہ آواز سے کچھ ضعف بھی پایا جاتا ہے۔ تیسرے صاحب

بولے نصیبِ اعدا کیا طبیعت بے لطف ہو گئی۔ چوتھے نبض پر ہاتھ لے گئے۔ اخاہ تپ چڑھی ہے۔ پانچویں نیم حکیم پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ افوہ ماتھا کیسا جلتا ہے۔ چھٹے صاحب نے فرمایا کہ حضور کی آنکھوں ہی سے نصیب دشمناں علالت پائی جاتی ہے۔ اب جو طرفہ سے یہی ہانک سنائی دی کہ رئیس علیل ہیں۔ جب سب نے مل کر کہنا شروع کیا تو وہ بھی گھبرائے فرمانے لگے کیا ہیں۔ ہاں آج تو کچھ بدن بھی ٹوٹ رہا ہے۔ آنکھیں بھی جلتی ہیں اور نبض میں بھی کچھ سُرعت ہے اتنے میں ایک مصاحب نے کہا۔ خداوند کیا عرض کروں کلیجہ بیٹھا جاتا ہے خدا جانے کیا ہوگیا دوسرے نے سر پکڑ کر کہا اُف سر پھٹا جاتا ہے۔ تیسرے نے آنکھیں مل کر کہا بھئی آنکھیں نکلی پڑتی ہیں۔ الغرض سب نے ایک نئی بیماری بتائی۔ کسی کو بخار آیا۔ کسی کو جوڑی کسی کا بدن گنگنا ہو گیا کسی کا جی متلایا۔ سب بیکمان بن بیٹھے ایک کانکھنے لگا دوسرا ہائے ہائے کرنے لگا۔ ہم چکرائے کہ بار خدا یہ کیا بات ہے یہ سب کے سب ایک دم سے بیمار کیوں کر پڑ گئے: ارے! پھر تو میں سوچا کہ یہ یارانِ سرپل کی کارستانی ہے۔ اکھاڑا مل کر۔

رئیس۔ آخر کچھ سوچیے تو یہ بیٹھے بٹھائے کیا گل کھلا۔ ابھی تو ہم سب بھلے چنگے بیٹھے تھے آناً فاناً میں یہ کیسی ہوا چلی کہ سر درد، دردِ کمر، تپ لرزہ نے آ دبوچا۔ اس میں کچھ فیہ ضرور ہے۔

مصاحب۔ حضور کو جہاں کسی نے دو چار چکنی چپڑی باتیں سنائیں بس دم میں آگئے خدا جانے ان ذات شریف نے افیم میں کیا ملا دیا تھا کہ سب کے منہ پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔ کچھ دال میں کالا کالا ضرور ہے۔

رفیق۔ کیا پتے کی بات کہی ہے۔ واللہ میری زبان سے لے گئے جب سے افیم پی جی متلانے لگا۔ اور ایک ہم پر کیا فرض ہے سب کا یہی حال ہے۔

لیموں نچوڑ۔ میں کہتے ہی کو تھا کہ یہ انھیں تازہ وارد حضرت کے کانٹے بوئے ہوئے ہیں۔ اور حضور سچ کہوں مجھے تو یہ کوئی اٹھائی گیرے سے معلوم ہوتے ہیں دیکھیے آنکھوں ہی سے جوتا بن برستا ہے۔ اور خدا جھوٹ نہ بلائے تو یہ چیبر کی فکر میں آئے ہوں گے۔ ضرور افیم میں کچھ ملا دیا ان کو تھانے پر لے چلیے۔

خدمت گار۔ میرے سامنے انھوں نے کچھ جیب سے نکالا اور افیم کے ساتھ گھولا۔ پھر حقہ بھرا تو تمباکو میں بھی کچھ ملا دیا۔ اب مجھے ان کی نیت کا حال کیا معلوم تھا۔

بھلا صورت سے تو بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کوئی کسی کے پیٹ میں تو بیٹھا ہی نہیں ہے۔

رئیس۔ واہ صاحب آپ کے جوہر تو اب کھلے۔ بھلے کو جلد آپ کی ذات نے پہچان لی ورنہ آپ تو ایک آدھ کی جان لیتے اور سنکھیا دے دیتے اب خیر اسی میں ہے کہ آپ چپکے سے کھسک جائیں ورنہ بری ٹھہرے گی۔

مصاحب۔ ہم تو ان کو بغیر ٹھیک بنائے نہ جانے دیں گے۔ وہ تو کہیے حضور کی نیک نیتی اس گاڑھے وقت کام آئی۔ ورنہ اس نے تو تسمہ تک نہیں باقی رکھا تھا۔ ان کو کوٹھری میں بند کر کے خوب ٹھونکیے اور پھر راہِ خدا پر چھوڑ دے۔ مگر ذری خیال رکھیے کہ خون نہ نکلنے پائے۔

حضرت تب تو میرے ہوش اڑ گئے کہ خدا ہی خیر کرے بڑے پھنسے دولائی کیا پائی کہ شامت ہی آئی۔ اب کروں تو کیا کروں بھاگوں تو چور بنوں بیٹھوں تو پٹتا جاؤں۔ مگر اتنی تشفی تھی کہ کوتوالی کوئی نہ دکھائے گا۔ ان میں اتنی جرات کہاں ایک دفعہ ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھی غنیمت سمجھے کہ ازیں چہ بہتر۔ ایک نے دلائی پر ہاتھ مارا دوسرے نے ہر وتی چھین لی۔ تیسرے نے کہا بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی۔ یعنی یہاں تو دلائی انعام میں پائی تھی کہاں شجاع الدولہ کے کوٹھوں کی ہر وتی بھی ہاتھ سے دی۔ قہر درویش بر جانِ درویش۔ بھاگا تو یہاں آکر دم لیا۔ رخصت لی امان اللہ۔

میاں آزاد دل میں سوچے کہ بھئی رئیسوں کے دربار میں چغل خوروں کی بڑی گرم بازاری ہے ان ملعونوں کی دم میں رسانہ باندھا تو آزاد نہیں۔ اس وقت سے بیڑا اٹھا لیا کہ ان کو ٹھیک بناؤں گا۔ پھر سوچے کہ کوشش ٹھکانے لگنا معلوم۔ یہاں پر تو ایک دفعہ بوچڑ بن چکے ہیں۔ اب کہیں منہیار یا چمار نہ بنائے جائیں کہ ساری مشیخت نکل جائے۔ بھئی کم کھائے غم نہ کھائے۔ اتنے میں میاں آزاد اپنے آقائے نامدار کی کوٹھی پر پہنچے تھوڑی دیر بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے نواب صاحب کو ایک خط دیا اور کہا حضور میرزا جی نے یہ خط بھیجا ہے۔ اس کو ملاحظہ کر کے جواب عنایت کیجیے۔ مصاحبین کا چہرہ زرد اور دل سرد ہو گیا کہ اب اس نے یہ تدبیر نکالی کہ چٹھیاں بھیجنے لگا۔ اے حضور اس ردی کو چاک کر ڈالیے۔ وہ اور خط بھیجے۔ اتنے ہوئے اے تیری قدرت یہاں تک آتے کیا پاؤں کی منہدی گھستی تھی۔ ایسے بڑے مشیخت پناہ

ہو گئے۔ نواب صاحب نے کہا اچھا پڑھو تو دیکھو کیا لکھا ہے۔

مرزا صاحب کا خط

"افیمچیوں کے پشت پناہ! مدکیوں کے قبلہ گاہ دام لعنتہ۔ لاکھ سکھایا پڑھایا مگر تم لونڈے ہی بنے رہے۔ ابھی جمعہ جمعہ اٹھوارے کی پیدائش اور ہم پر عتاب۔ تمھارے دادا جان تک کی تو میں نے آنکھیں دیکھی ہیں اور تمھارے لکڑ دادا کے دادا پیر تک کی قبر سے واقف ہوں۔ اس بڑھوتی وقت تم نے مجھ کو نکالا، ناچ نچاؤں تو ہی۔ سنیے صاحب ایک بدمعاش نے آکر زٹل قافیہ اڑایا اور حضرت کو چنگ پر چڑھایا کہ یم کو فرشتے گھر پھونکیں گے۔ ہات ترے جھوٹے کی دم میں رسا۔ اور نواب کو تو کیا کہوں وہ تو بچھیا کے تاؤ ہی نکلے۔ جس کو اتنی عقل بھی نہیں کہ فرشتے کہیں جھوپڑے بھی جلایا کرتے ہیں۔ واہ ری عقل، قربان اس فہم و دانش کے۔ لو صاحب اب فرشتے بھس میں چنگاری ڈالنے لگے۔ ارے توبہ ارے توبہ۔ اِن بے ایمانوں پر آسمان نہیں پھٹ پڑتا۔ اور دل لگی دیکھیے گا کہ حلوائن مر کر جی اٹھی، اس کذب پر شیطان کی پھٹکار۔ نواب صاحب ذرا تو دل میں غور کرو کہ ساری خدائی بھر میں کہیں کبھی اندھیر گھپ چھایا کوئی بھی فرشتہ آیا ایک بھی گھر جلایا آپ کے یہاں مفت خوروں نے میری بیخ کنی کے لیے یہ بنی۔ مگر آپ تو سادہ لوح ہیں سنتے ہی نادری حکم دے دیا کہ نکال دو۔ افسوس صد افسوس۔ صد سالہ، ما پیر شد و گاؤ نہ شد۔ نام خدا میانے ہو گھامڑ نہ ڈیولنے ہو۔ ذرا تو عقل سے کام لو۔ ذرا تو ان خوشامدیوں کے منہ میں کالک ملو۔ کل کو کہیں بے چاری بیگم پر آنچ نہ آجائے ایسا نہ ہو کہ کسی دم میں اس کو بھی شہر بدر کرائیں۔

واہ بھئی واہ۔ کیوں نہ ہو آگئے نہ جھانسے میں، کھا گئے نہ غچا، چڑھ گئے نہ چنگ پر۔ ابھی کیا ہے دیکھنا جو کہیں تو جینے یہ لوگ جم گئے تو کوٹھے پر جھنڈی کا پھریرا اڑ رہا ہوگا ڈگڈگی بجے تو بھی۔ کسی کا دل دکھانا اچھا نہیں۔ اب تمھارے یہاں تو بندہ آنے سے رہا لاکھ روپے دو آنے کی دم میں نمدا ہے

گر صد ہزار لعل و گہر می دہی چہ سود
دل را شکستہ ئی نہ کہ گوہر شکستہ ئی

اب دل لگی دیکھیے تمھاری قلعی نہ کھولوں تو میرزا نہیں۔ مجھے تو اندر باہر سب کا

حال معلوم ہے نا۔ وہ پتے پتے کی سناؤں کہ یاد ہی تو کرو۔ دریا میں رہ کر مگر سے بیر۔ ارے نادان نواب نوابی کے ٹھاٹھ ہی اور ہوتے ہیں۔ ریاست کے تیور ہی اور ہیں وہ خم و دم ہی اور ہیں تم تو دمڑی کے بھوے ہی بنے رہے۔ نام کے نواب۔ میاں نواب بننے کا شوق چرائے تو ہم ایسوں کو نوکر رکھو۔ داستان گوئی میں ہم بند نہیں لفاظی میں ہم بند نہیں۔ خوشامد میں، ہم بند نہیں۔ خیر اب بکے کون۔ آدمی ہو تو سمجھ جاؤ گے۔ ورنہ پچھتاؤ گے۔"

ہمارے گول مول نواب صاحب ایک دن دونوں وقت ملتے اپنی خوش سواد کوٹھی کے ایک رنگین کمرے میں بیٹھے مصاحبوں رفیقوں سے چہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ اتنے میں میاں آزاد نے دروازے ہیں سے گردن نکالی، مجرا عرض کرتا ہوں پیرو مرشد! آئیے میاں آزاد کہیے کہاں سے سواری آتی ہے۔ اس وقت تو کچھ چہرہ تمتمایا ہوا ہے۔ کیا کسی سے جھوڑ ہوئی ہے۔ اے حضور آپ کی جوتیوں کے صدقے میں اس جوار میں تو کوئی آنکھ نہیں ملا سکتا۔ دھاک ہے، محلے محلے ہوا بندھی ہے۔ اچھے اچھے پہلوانوں نے پچھاڑیں کھائیں۔ ہم نے وہ ٹھنیاں بتائیں کہ چھٹی کا دودھ یاد آیا ہوگا۔ اس وقت بندہ ایک نان بائی کی دکان پر کوکو پلاؤ بنانا سیکھتا تھا۔ آنچ کے سامنے جو جم کے کچھ دیر بیٹھنا پڑا تو چہرہ لال انگارا ہو گیا۔ خاصے تو یہ کہیے کہ نان بائی گری کا بھی شوق چرایا۔ ع۔ دماغ بیہدہ پختہ و خیال باطل بست۔ خیر صاحب ع روٹی تو کما کھائے کسی طور مچھندر۔ کیوں بھئی۔ معقولات میں بھی کچھ دخل ہے۔ یا لنگوٹا باندھ کر کشتی اور دھینگا مشتی ہی جانتے ہو۔ کون! میں! معقولات! ہونھ۔ عمر بھر کیا کیا کیے۔ اس فن کی وہ کون سی کتاب ہے۔ جس پر اس جناب نے نکتہ چینی نہیں کی۔ فقہ امامیہ اور فقہ حنفیہ اور کتب تفسیر و تصوف جس میں چاہیے بحث کیجیے۔

مصاحب۔ حضور اس شہر میں ایک عالم آیا ہے کہتا ہے دنیا بھر کی کتابیں چاٹ گیا ہوں خصوصاً علم مناظرہ میں تو ید طولیٰ رکھتا ہے۔ منطق کے زور سے جھوٹ کو سچ کر دکھائے، مگر خدا کو نہیں مانتا ہے۔ پکا ملحد اور منکر ہے۔

آزاد۔ واہ منطق کی اچھی قدر کی۔ حضرت ان کے تو ہم بھی مشتاق ہیں۔ واللہ خدا کا وہ کامل ثبوت دوں کہ وہ خود پھڑک جائیں۔ ذری یہاں تک لائیے تو سہی۔ بھاگے راہ نہ ملے۔ جو پھر اس شہر میں منہ دکھائیں تو آدمی نہ کہنا۔

نواب۔ ہاں ہاں میر صاحب ذرا اِن کو پھانس کر لائیے تو میاں آزاد کے جوہر تو کھلیں۔ مگر میاں ان منکروں سے بھڑنا دل لگی نہیں کسی کے قائل ہی نہیں۔ بس ایک مادے کے قائل ہیں۔

اس پر میر صاحب نے زور سے دو چار قدم لگائے اور لڑھکتے ہوئے گئے۔ اور جھپ سے اس دہریے کو لائے یہاں ہجوم عام تھا وہ اژدحام تھا کہ تھالی اچھالیے تو سر ہی سر جائے ملحد نے آتے ہی پوچھا کون بزرگوار بحث کریں گے۔

میاں آزاد بولے ہم ۔ اب سب منتظر ہیں کہ دیکھیے کیا سوال و جواب ہوتے ہیں چو طرفہ کھچڑی پک رہی ہے کہ یہ ملحد تو آج تک کسی سے قائل ہی نہیں ہوئے انھیں کوئی کیا بند کرے گا۔

میاں آزاد ؎ توحید میں مقام نہیں قال و قیل کا
ہے کس کو ناطقہ ترے ذکرِ جمیل کا

یاایہا السامعین۔ اس دہریے کے دل گردے کو دیکھیے کہ اللہ میاں ہی کے قائل نہیں۔ یہ شکل اور یہ صورت اور یہ خیال اے لعنت۔

ملحد۔ پانی پی پی کر کوسنا اور بات ہے اور بحث کرنا اور بات ہے ہمیں کوئی معقول کر دے تو البتہ جانیں۔ یہ بات کیا کہ لگے گالیاں دینے۔

آزاد۔ نامعقول کو معقول کون کرے۔ کوئی سوال کیجیے تو ہم جواب دیں۔ شک ہو رفع کر دیں۔

ملحد۔ اچھا پہلے تو ان تین سوالوں کا جواب دیجیے پھر اور بحث چھیڑیں۔

سوال اوّل۔ خدا ہے تو ہمیں نظر کیوں نہیں آتا۔

سوال دوم۔ شیطان ناری ہے اور وہ دوزخ میں جلایا جائے گا۔ واہ واہ۔ بھلا ناری کو آگ کا کیا ڈر ہے۔ اس سزا سے وہ ضرور نڈر ہے۔

سوال سوم۔ جو کرتا ہے خدا کرتا ہے۔ پھر انسان کا قصور کیا۔ چو طرفہ سناٹا پڑ گیا کہ واللہ کیا عالم ہے۔ اہو ہو ہو۔ کیا کڑے سوال کیے ہیں سب کے اوسان خطا ہوش اڑے ہوئے۔ بگڑے دل لوگ دانت پیس رہے ہیں کہ باہر نکلے تو گردن ہی ناپیں کوئی دل ہی دل میں کوس رہا ہے کہ خدا کرے یہ مردک ابھی ابھی مر جائے کوئی قہر کی نگاہ سے گھور رہا ہے کہ اتنے میں میاں آزاد نے کہا یار عزیز ایسی باتیں نہ کرو جہنم میں جلائے

جاؤ گے۔ جہنم میں آس نے مسکرا کر کہا کہ

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اس پر میاں آزاد نے ایک ڈھیلا کھینچ مارا کھٹ سے اس منکر کی کھوپڑی پر پڑا۔ ہائے کر کے بیٹھ گیا۔ اف لاحول ولا قوۃ چھے وحشی سے پالا پڑا میں بحث کرنے آیا یا لپاڈگی۔ جب تقریر میں ہارے تو کلوخ اندازی کرنے لگے اور جو میں بھی ایک پتھر کھینچ ماروں تو پھر کیسی ہو بچہ جی۔ جاہلوں کا قاعدہ ہے کہ ہاتھا پائی پر آمادہ ہو جاتے ہیں ہوہائی ہے نواب صاحب کی بے وجہ بے سبب ہم پر ایک چہار کا چہار کھینچ مارا سر بھنا گیا۔

نواب۔ بھئی آزاد ہمیں یہ تمہاری حرکت پسند نہ آئی۔ یہ ڈھیلے بازی کے کیا معنے۔ مانا کہ یہ ذات شریف کشتنی، سوختنی گردن زدنی ہیں۔ مگر بحث کر کے معقول کیجیے۔ یہ نہیں کہ جوتا کھینچ مارا یا تان کے ایک ڈھیلا لگایا۔

آزاد۔ پیر و مرشد میں نے تینوں سوالوں کا وہ جواب دیا کہ اگر کوئی قدر دان ہوتا تو اس وقت گلے سے لگا لیتا۔ اور کروڑں روپیہ انعام کا دیتا۔ سنیے۔

پہلا سوال۔ خدا ہے تو ہمیں کیوں نظر نہیں آتا۔

جواب۔ اگر اس ڈھیلے سے ان کو چوٹ لگی تو چوٹ نظر کیوں نہیں آتی۔

سبحان اللہ کا ڈونگرا برس گیا۔ واہ استاد واہ واللہ کیا جواب ترکی بہ ترکی دیا ہے۔

دوسرا سوال۔ شیطان کو نارِ جہنم میں جلانا بے کار ہے وہ تو خود ناری ہے۔

جواب۔ ان سے پوچھیے کہ یہ مٹی ہی کے پتلے ہیں یا نہیں۔ ان کی کھوپڑی مٹی ہی کی بنی ہے یا سو برڈ کی۔ پھر مٹی کا ڈھیلا لگا تو سر کیوں بھنا گیا۔

ہات ترے کی واہ میاں آزاد کیا جواب دنداں شکن دیا کہ دانت کھٹے ہو گئے۔

تیسرا سوال۔ جو کرتا ہے خدا کرتا ہے۔

جواب۔ پھر ڈھیلا مارنے کا جرم ہم پر کیسا۔

ٹوپیاں چو طرف اچھلنے لگیں کہ واہ میرے شیر کیا کہنا ہے۔ اہو ہو ہو کہو چنڈا گل خیرو۔ اب خدا کے قائل ہوئے یا اب بھی کچھ مین میکھ ہے۔ کروڑں باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ جب آپ بھی خاکی ہیں اور مٹی ہی کا ڈھیلا مارا تو آپ کی کھوپڑی کیوں بھنائی۔

لیجیے صاحب اب تک تو میاں آزاد پہلوان پھکیت ہی تھے اب صوفی صافی اور

مولوی بھی مشہور ہو گئے۔ نواب نے میاں آزاد کی پیٹھ ٹھوکی۔ واہ کیوں نہ ہو۔ پہلے تو میں جھلایا کہ یہ ڈھیلا بازی چہ معنے دارد مگر پھر تو پھڑک گیا کہ واہ واہ کیا نازک خیال آدمی ہے۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک مصاحب بڑی سی رضائی جس میں کوئی دس سیر روئی پڑی تھی اوڑھ کر تشریف لائے۔ ایں! یہ رضائی کیسی رضائی کیا لحاف کہیے۔ کیوں میاں یہ بے فصل رضائی اوڑھنا کیسا۔ واہ قبلہ اس بھید کو آپ نہ سمجھے ارے بھائی رضائی تو طالب علم کی لنگی ہے اوڑھیے تو گرم بچھائیے تو نرم دبکیے تو دھرم۔ باندھیے تو بھرم۔ واہ بھئی قافیہ سنجی بھی ہو تو اتنی۔

ایک دن ہمارے باغ و بہار جوان لڑ بھڑ پہلوان میاں آزاد اپنے آقائے نام دار نواب لررد دل مدار کی کوٹھی میں دو زانوں بیٹھے مصاحبین سے گپ اڑا رہے تھے۔ کسی کو لکڑی کی چوٹیں کسی کو کشتی کے داؤں بتا رہے تھے کہ اتنے میں نواب صاحب نے کہا کیوں آزاد۔ کبھی بٹیریں بھی لڑائی ہیں۔ نیت بخیر۔ اب کی ربیع الاول میں وہ گھماسان کی لڑائیاں دکھائیں کہ واہ جی واہ۔

مصاحب۔ میاں آزاد تم تو اپنے کو بڑا جہانیاں جہاں گشت سمجھتے ہو۔ مگر واللہ یہ لڑائی نہ دیکھی ہو گی۔ اس طرح گتھ جاتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ بٹیر کی لڑائی کے آگے تو توپ تفنگ بھی گرد ہیں۔ اور پھر ہمارے نواب صاحب کے یہاں کی پالیاں۔ اف فوہ آج ہماری سرکار میں جتنے بٹیر ہیں اتنے تو مٹیا برج کے چڑیا خانے میں بھی نہ ہوں گے۔ ایک ایک بٹیر ہزار ہزار کی خرید کا۔ نوک دم کے بنانے میں غوڑے کے توڑے صرف ہو گئے۔ سیروں موتی مروارید تو میں نے اپنے ہاتھوں پیس کر کھلائے ہیں۔ کچھ دنوں روز کھرل چلتا تھا۔ مگر واللہ آپ بھی کہیں گے کہ ہم آدمی ہیں۔ اس ڈیوڑھی پر اتنے دن سے ہو اب تک بٹیر خانہ بھی نہ دیکھا آؤ چلو تم کو سیر کرائیں۔ یہ کہہ کر بٹیر خانے لے گئے۔ میاں آزاد کیا دیکھتے ہیں کہ چو طرفہ کابکیں ہی کابکیں نظر آتی ہیں اور کابکیں بھی وہ جن پہ کہ اہو ہو ہو۔ ہاتھی دانت کی تیلیاں۔ ان پر گنگا جمنی گمزیاں اور کار چوبی چھتیں اور مقیش کی جھالر اس پر کام دار مخملی غلافیں۔ رنگ برنگ سونے چاندی کی ننھی ننھی کٹوریاں۔ جن میں بٹیر اپنی پیاری پیاری ننکھی چونچوں سے پانی پیئیں۔ پانچ پانچ چھ چھ سو کی لاگت کی کابکیں ہر سمت ٹنگی ہیں۔ کھونٹیاں بھی رنگ برنگی۔

مصاحب ایک ایک کابک اتار کر بٹیر دکھا کر تعریف کرنے لگے تو پل باندھ دیے۔

ایک بٹیر کو دکھا کر کہا کہ اللہ رکھے کیا منھولا جنور ہے۔ صف شکن جو آپ نے سنا ہو یہی حضرت ہیں لندن تک خبر کے کاغذ میں اس کا حال چھپ گیا میری جان کی قسم ذری اس کی آن بان کو تو دیکھیے گا (بوسہ دے کر) ہائے کیا بانکا بٹیر ہے۔ یہ نواب صاحب کے دلوا جان کے وقت کا ہے ایسے رئیس پیدا کہاں ہوتے ہیں دم کے دم میں لاکھوں پھونک دیے۔ روپیہ تو ٹھیکریاں سمجھا کیے۔ پتنگ بازی کا شوق ہوا تو شہر بھر کے پتنگ بازوں کو نہال کر دیا۔ کنکوے والے بن گئے آج اور تو اور لونڈے جو گلی کوچوں میں لنگر اور گگے کر ڈور لوٹا کرتے ہیں روز ڈور بیچ بیچ کر چکھوتیاں کرتے تھے۔ عیاشی میں بھی وہ نام روشن کیا کہ کوئی ڈوم ڈھاری غریب نظر نہ آیا۔ چانڈو کا شوق ہوا تو دقیانوس کے وقت کی نگالیاں ہزاروں روپے کو خریدیں اور فی سبیل اللہ دو دو ڈھائی ڈھائی سو آدمیوں کو ایک ایک دن میں چانڈو پلا دیا۔ افیم اتنی خریدی کہ ٹکے سیر سے سولہ روپے سیر بکنے لگی بالوا خالی چین کھکھل۔ دن رات قوام کے چولھے کا منھ کالا۔ افیم کے ست کا بول بالا۔ جب دیکھو لیمپ روشن جاگتی جوت مکھیاں تک فیض سے محروم نہیں رہیں۔ بمبئی تک کے گنے آتے تھے اور ہاتھی کے قد آدم چھلکوں کا ڈھیر لگ جاتا تھا۔

آزاد۔ ہاتھی کے قد آدم بھی کتنا خوب۔

مصاحب۔ اللہ کی عنایت ہے جو شوق کیا ایسا ہی کیا۔ پھر بٹیر بازی میں ان کے سامنے کون ٹھہرتا۔ لاکھوں روپیہ صرف کر ڈالا اب یہ ایک صف شکن ان کے وقت کا باقی رہ گیا ہے۔ یہ بزرگوں کی نشانی ہے۔ بٹیر کیا ہفت خواں منازل پہلوانی ہے۔ ہفت اقلیم میں لاثانی ہے۔ ان کی وفات کو کوئی بیس تیس برس ہوئے ہوں گے بس یہ سمجھیے کہ محمد علی شاہ کے وقت میں خریدا گیا تھا۔ اب کوئی سو برس کا ہوگا۔ دو کم یا دو اوپر۔ مگر اس بڑھوتی وقت بھی وہ ہتھے سے موتھرے ہیں کہ مرغ پر لپک کر لات دے تو وہ چیں بول جاوے جیسے باز اور پدے کی لڑائی اور کیوں نہ ہو نمک کس سور کا کھاتا ہے اور نواب صاحب کے جیوٹ پنے کو تو آپ جانتے ہی ہیں شاہی میں جب دگلے والی پلٹن بگڑی تھی تو ہمارے حضور ہی بھیجے گئے تھے۔ پار سال کی دل لگی سنیے۔ نواب صاحب کے ماموں تشریف لائے ان میں بھی ریاست کی بو ہے۔ کنکوا تو ایسا لڑاتے ہیں کہ میاں ولائتی ان کے آگے پانی بھریں۔ دو دو تولے افیم پی جائیں۔ اور وہی تُم ودم۔ بٹیر بازی کا بھی پرلے سرے کا شوق ہے۔ آپ کا ظفر پیکر تو

بلا کا بٹیر ہے۔ بٹیر کیا شیدی لنڈ ہور ہے۔ ڈھوہ کا ڈھوہ۔ جیسے خاصہ چھوٹا تیتر۔ خیر آتے ہی نواب کو لے کر بٹیر دیکھنے گئے میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا کہ حضور کو تو بٹیروں کا مدت سے شوق ہے کروروں ہی بٹیر دیکھ ڈالے ہوں گے مگر صف شکن سا بٹیر تو حضور نے بھی نہ دیکھا ہوگا۔

ماموں۔ ہونہہ اس کی اصل و حقیقت کیا ہے۔ ظفر پیکر کو دیکھو تو آنکھیں کھل جائیں۔ عقل کے ناخن لیجیے بڑھ کر ایک لات دے تو صف شکن کیا معنے آپ کو نکدم پالی باہر کر دے۔ حوصلہ ہو تو منگوائیں۔

نواب۔ اچھا ماموں جان پھر کل شد ہو جائے۔ دو دو چونچیں تو ہوں۔

ماموں۔ کیا مضائقہ۔ مگر اپنا بٹیر آپ مفت کٹوائیں گے۔ آپس کی لڑائی سے فائدہ۔ یا اچھا کل ہو ہی جائے۔ اِدھر یا اُدھر۔ الغرض دوسرے دن پالی ہوئی۔ ہزاروں آدمی جوق جوق آن موجود ہوئے۔ شہر بھر میں دھوم تھی کہ آج بڑے معرکے کی جنگ ہے۔ بھئی قسم ہے رزق کی دو چیزیں جس نے نہیں دیکھیں اس نے دنیا میں کچھ دیکھا ہی نہیں ایک تو یہ پالی۔ دوسرے پیر ول کی سوگھی۔ اِدھر ظفر پیکر اس ٹھاٹھ سے آیا کہ زمین ہل گئی اور میرا تو کلیجہ دہلنے لگا۔ مگر صف شکن نے اس دن آبرو رکھ لی۔ جب ہی تو نواب صاحب اس کو بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ پہلے اس کو دانہ کھلاتے ہیں پھر کہیں آپ کھاتے ہیں۔ ایک دن خدا جانے بلی دیکھی یا کیا ہوا کہ اپنے آپ پھڑکنے لگا۔ نواب صاحب سمجھے کہ بوندا ہو گیا۔ پھر تو ایسے دھاروں دھار روئے کہ گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ میں نے کبھی نواب صاحب کو روتے دیکھا نہیں۔ مجالسِ عزا میں ایک آنسو نہیں نکلتا۔ جب بڑے نواب صاحب نے انتقال کیا تو اشک کا ایک قطرہ بھی نہ گرا۔ بھئی یہ بٹیر ہی ایسا انمول ہے اور سچ تو یوں ہے کہ اس نے اس دن نواب صاحب کی سات پیڑھیوں پر احسان کیا۔ واللہ جو کہیں گھٹ جاتا تو بندہ تو جنگل کی راہ لیتا۔ میاں جنگ میں آبرو ہی آبرو تو ہے اور ہے کیا۔ خیر صاحب جیسے ہی دونوں چکی کھا چکے۔ ظفر پیکر بجلی کی طرح صف شکن کی طرف چلا۔ یہ تُوری وہ گھاگر آتے ہی دبوچ بیٹھا اور چوٹی کو چونچ سے پکڑ کر ایسی ایسی مرڈیاں دیں کہ دوسرا ہوتا تو ایک رگڑے میں پھر سے بھاگ کھڑا ہوتا۔ نواب کا اس دم چہرہ فق ہو گیا۔ اور کلیجہ شق۔ منہ پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔ نصیب اعدا زہر کھانے کا وقت پہنچا کہ اتنے میں صف شکن قلغی

کر کے لوٹ ہی تو پڑا۔ واہ میرے شیر۔ خوب پھرا۔ پالی بھر میں آواز گونجنے لگی۔ کہ اہو ہو ہو وہ مارا ہے۔ ہاں بیٹے دے بڑھ کر لات ایک لات ایسی جمائی کہ ظفر پیکر نے مُنہ پھیر دیا۔ مُنہ کا پھیرنا تھا کہ صف شکن نے اچک کر ایک جھنجھوڑی بتائی کہ واہ واہ وا۔ اسی مقام پر ایک لات اور کس کر۔ اُہو ہو ہو شاباش۔ واہ پٹھے۔ اہو ہو ہو۔ اسی جگہ ایک اور آہو ہو ہو۔ لگا ایک اور مڑوڑی۔ اہو ہو ہو اتنے میں میاں ظفر پیکر فیچ کر کے نو کدم پالی باہر۔ پھر سے اڑ گیا۔ پالی بھر نے کہا وہ بھگایا۔ وہ مارا۔ چو طرفہ ٹوپیاں اُچھلنے لگیں۔ اور زنفیل بجنے لگے۔ واہ رے صف شکن ظفر پیکر گھٹ گیا تو صف شکن کا دل اور بھی بڑھا۔ آج یہ بٹیر اپنا ثانی نہیں رکھتا۔

میاں آزاد نے دیکھا کہ نواب کا ہزار ہا روپیہ بٹیروں کے پھیر میں ناحق گھوما جاتا ہے۔ دھن کے پکے تو تھے ہی سوچے کہ آؤ آج ان سب کو اڑا دیں تو اچھی دل لگی ہو یہ سوچتے ہی مصاحب سے کہا کہ یار آج اچھی سی افیون گھول کر پلاؤ تو ہم بھی بسم اللہ کر دیں۔ مصاحب کی باچھیں کھل گئیں کہ اچھے کو چیلا کیا۔ بڑے مڈھ کو مونڈا۔ دوڑتے ہوئے گئے کہ افیون گھول کر لائیں۔ ادھر میاں آزاد نے میدان خالی پا کر کابکوں کی کھڑکیاں کھول دیں۔ بٹیر سب پھر سے بھاگ گئے۔ صف شکن کو انھوں نے چھپا لیا۔ باقی سب ہوا میں موجیں لے رہے ہیں۔ ہات ترے کی۔ گھر بھر میں کتاب کا نام نہیں۔ کاغذ قلم دوات سے کام نہیں۔ کہیں اور کابک اور بٹیر کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ لو بچہ اور پالو بٹیر۔

ہمارے رئیس نامدار یعنی نواب عرش وقار جھٹ پٹے کے وقت اپنے باغیچہ پر بہار میں فرش مکلف پر بیٹھے رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ مصاحب اور رفقا خوشامد کی باتیں بنا رہے تھے اور میاں آزاد صحبت گرما رہے تھے۔ اتنے میں دریائے اخضر فلک پر کشتی ہلال نظر آئی۔ یعنی مہ نو نے اپنی پیاری پیاری صورت دکھائی۔ چاندنی کا چھٹکنا تھا کہ مصاحب بلبل کی طرح چہکنے لگے۔ نوابوں کے درباروں میں مسخروں کا کال نہیں۔ ایک افیمی پلاؤ کی چاٹ پر مسخرے بن گئے۔ چو طرفہ سے ان پر بوچھاڑ ہونے لگی۔ ایک شخص نے پوچھا کیوں یار۔ واحد علی تمھارے کون ہیں۔ بھائی ہیں نہ۔ تو فرماتے کیا ہیں۔ جی واحد علی! میری خالہ جان کی بہن کے میاں کے لڑکے کے باپ لگے بیٹے ہیں۔ اس پر وہ فرمائشی قہقہہ پڑا کہ فلک ہفتم تک آواز پہنچی۔ بھئی واللہ یہ نیا رشتہ

ہے اچھی الٹ پھیر ہے اور کیوں میاں تمھارے باپ تمھارے کون ہوئے ۔ واہ واہ اس میں کون سی مشکل بات ہے بھلا ۔ ہوئے کون ماں باپ ہوئے ۔ اچھے رہے اب ہمیں ایسا گھامڑ سمجھ لیا ہے مجھے بھی کوئی گنوار مقرر کیا ہے ۔ نواب صاحب نے کہا خوجی اس حوض میں نہاؤ تو ایک اشرفی دیتا ہوں ۔ پیر و مرشد اشرفیاں تو حضور کی جوتیوں کے صدقے میں بہت سی مل جائیں گی مگر پھر جینا دوبھر ہو جائے گا ۔ وہ نہ مرے سہی لیکن نکٹا جیے برے احوال ۔ نا صاحب مجھے تو فی غوطہ ایک اشرفی دے تو بھی پانی میں نہ پیٹھوں پانی کی صورت دیکھے بدن کانپ اٹھتا ہے اور روح لرزنے لگتی ہے ۔ بھئی واہ ۔ کیسے مردوے ہو جی ۔ میاں نہاتے نہیں ۔ تو آپ کوئی قاضی ہیں ۔ ہم نہیں نہاتے پھر آپ کو کیا ۔ اجی سرکار کا حکم ہے ۔ چلیے آپ کی بلا سے کہنے لگے سرکار کا حکم ہے ۔ پھر کوئی اپنی جان دے دے ۔ حضور جو یہ اس وقت دھم سے حوض میں نہ کود پڑیں تو افیم انھیں نہ ملے ۔ آپ بہت چل نکلے ہیں ۔ کھلائیں حضور کھائیں ہم ۔ آپ کون بیچ میں بولنے والے ۔ اڑسٹھ برس سے تو میں افیم کھاتا آیا ہوں اب آپ کے کہنے سے چھوڑ دوں تو کیسے مرا یا جیا ۔ نواب صاحب نے کہا اچھی بھئی جانے دو ۔ دودھ کھاؤ گے ۔ واہ خداوند نیکی اور پوچھ پوچھ دودھ تو وہ شے ہے جس کو انسان ماں کے پیٹ سے نکلتے ہی غٹ غٹ پیتا ہے لیکن ذری مٹھاس خوب ہو ۔ شاہ جہاں پور کی سفید شکر یا روسر کی کوٹھی کا قند ، یا کالپی کی مصری گھولیے گا اور تھوڑا سا کیوڑا بھی گبر دیجیے تو پیتے ہی آنکھیں کھل جائیں ۔ نواب صاحب نے حکم دیا کہ بھئی ان کے واسطے دودھ لاؤ کیوں جی تم حلوائی کا دودھ پیتے ہو یا گھوسن کا ۔ حضور جو مل جائے ۔ آم کھانے سے کام ہے یا پیڑ گننے سے ۔ غفور خدمت گار چاندی کے کٹورے میں دودھ لایا خواجہ صاحب دودھ پیجیے ۔ چپ نامعقول اتنا بڑا لومڑ ہوا ابھی تک تمیز نہیں آئی ۔ یہ دودھ کو پینا کہاں کا محاورہ ہے گنوار دودھ کھانا نہیں کہتا ۔ کٹوری یہاں رکھ دے ۔ میں ابھی آیا ذری کتے بلی کو دیکھتے رہنا ۔ کہاں کہاں خوجی کہاں ۔ ارے دودھ تو کھائے جاؤ مرد آدمی ۔ کہیں نہیں حضور ابھی آیا ۔ خوجی جب نظر سے اوجھل ہوئے تو میاں آزاد چپکے سے آدھا دودھ کھا گئے اور کٹورا لبالب کرنے کے لیے حوض سے پانی لے کر بھر دیا ۔ اتفاق سے ایک چھوٹی سی مچھلی بھی پانی کے ساتھ کٹورے میں آ رہی جب خواجہ صاحب تھوڑی دیر میں پھونک پھونک کر قدم بڑھاتے ہوئے

برآمد ہوئے اور کٹورے کو دودھ سے لبالب پایا تو باچھیں کھل گئیں جاتے ہی منہ ڈال دیا۔ اتنے میں مچھلی بھی منہ میں آ ئی تب تو چکرائے کہ الٰہی یہ کیا اسرار ہے۔ غفور پر بہت ہی جھلائے اور نواب صاحب سے بڑی شکایت کی کہ حضور اس کی کان گوشی واجب ہے۔ ایسا غافل ہو گیا کہ حوض سے مچھلی اچک آئی اور انھیں کانوں کان خبر نہیں۔ او گیدی اتنی قرولیاں بھونکی ہوں گی کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ حاضرین نے خوب قہقہہ لگایا جیسے دیکھو لوٹ رہا ہے کہ واللہ اچھی دل لگی ہوئی۔ اس پر میاں آزاد نے کہا ارے کھا جا یہ شیر ماہی ہے۔ تب تو میاں افیمی نہایت ہی افسوس کرنے لگے کہ ہائے ہائے سونے کی چڑیا ہاتھ سے نکل گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ شیر ماہی ہے ورنہ کچا ہی چبا جاتا۔ اس قسم کی مچھلی میں یہ خاصیت ہے کہ اسی برس کا بڈھا کھائے تو جوان ہو جائے نئے سرے سے دانت نکل آئیں۔ اس پر گھنٹوں دل لگی رہی۔ اتنے میں ایک صاحب نے پوچھا کہ خواجہ صاحب لوگ آپ کے پدر بزرگ وار کو باورچی بتاتے ہیں۔ واللہ ہم تو آپ کو شریف زادہ سمجھتے تھے مگر آپ پاجی ہی نکلے۔ پاجی آپ اور آپ کے باپ کچھ بعید ہے تو نہیں ہو یہ پاجی کی کون سی بات جیت ہے ہم نے تو عمر بھر کبھی چولھا نہیں پھونکا۔ باپ دادا کا حال نہیں معلوم کون تھے کون نہیں تھے۔ واہ میاں تو یہ کہیے آپ کو اپنے باپ دادا کا حال ہی معلوم نہیں۔ یہ لاعلمی تو بندہ نواز آپ کی عالی خاندانی کی قلعی کھول گئی۔ بس بس اب آپ اس دربار کے لائق نہیں۔ نواب صاحب نے مسکرا کر کہا ارے میاں خوجی تم کو اپنی زبان سے بھی کہنا نہیں یہ تم کیا بک گئے۔ کوئی اپنے باپ دادا کو بھی نہیں جانتا۔ واہ بے پاگل ساٹھ برس کا ہوا آدمیت نہ آئی سٹھیا گیا ہے۔ میاں آزاد نے پوچھا کیوں میاں صاحب پٹھان ہیں یا شیخ۔ جی میں تو ہندوستانی ہوں۔ ایں۔ بھئی یہ کیا خوب ارے بھئی مسلمان ہو یا کافر؟ صاحب پیدا کہاں ہوئے۔ ہندوستان کے بیچ میں۔ پھر اس سے کیا واسطہ اگر اصطبل کے بیچ میں پیدا ہوتے تو کیا لوگوں کے بیچ میں گھوڑے کہلاتے۔ اس معاملے کے بیچ میں انصاف تو کیجیے پھر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا اور حاضرین لوٹنے لگے۔ اب سنیے کہ ایک اور مسخر الدولہ آئے۔ حضور کو مجرا۔ آخاہ میر مذاق۔ آئیے مشفق کہیے کوئی تازہ خبر۔ تازہ خبر یہ ہے کہ آج سے ایں جناب تارک اللحم ہو گئے۔ گوشت اب نہ چھوئیں گے۔ نباتات ہی پر دانت لگائیں گے۔ کیوں کیوں خیر باشد۔ یہ کیا بد پرہیزیاں ہیں۔ کیا باورچی نے گوشت نہیں دیا۔ غفور۔ حضور محمدو کو بلاؤ۔ محمدو آیا۔ آداب

بجالایا کیوں جی تم سے تو ہم نے کہہ دیا ہے کہ سب کو ایک آنکھ دیکھا کرو۔ (اتفاق سے میاں محمد و واحد العین تھے) حضور غلام سب کو اسی ایک آنکھ سے دیکھتا ہے۔ جھوٹ کہتا ہوں تو یہ دکانی کو دکھا کر (آنکھ اپنے بائیں ہاتھ کی چھنگلیا سے پھوڑ ڈالیے (بائیں ہاتھ کی چھنگلیا نواب صاحب کی نذار تھی) اس پر نواب صاحب ہنس پڑے۔ اِن کا ہنسنا تھا کہ مصاحبوں نے بھی کھلکھلانا شروع کیا۔ مسخر الدولہ بولے کہ خداوند اس کا قصور نہیں۔ میں کچھ اور ہی عرض کرتا ہوں! وہ فرمائیے حضور۔ ایک بڑے عالم نے لکھا ہے کہ نباتات کھایا کرو۔ گوشت کھانا بُرا۔ سو حضور آپ بھی کچھ دن اس کا تجربہ کریں۔ مصاحبوں نے جو یہ سنا تو پیٹ میں چوہے چھوٹ گئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ نواب سیدھے سادے تو ہیں ہی گوشت دوشت کا کھانا چھوڑ دیں تو پھر ہم منہ ہی تاکا کریں۔ یہ سیخ اور شامی کباب اور قورمہ اور کوفتے اور دوپیازہ اور کوکو پلاؤ کھانے ہی میں نہ آئے۔ واہ بے بھانجی خوب اچھا آیا۔

۱۔ اے حضور ان کو تو سودا ہو گیا ہے۔ گرمی کے دن آئے اور ان کے سر پر شیخ سدّو سوار ہوئے۔ کہنے لگے گوشت نہ کھائیے پھر کھائیں کیا برے کا سر۔ آپ تو گھاس کھا گئے ہیں۔

۲۔ پیر و مرشد یہ ایسی ہی بے ٹھکانے بات بک دیا کرتے ہیں جس کا سر نہ پیر۔ ایک عالم گوشت چکھتا ہے ان کے یہاں ممانعت ہے لو صاحب گوشت نہ کھائیں تو پھر بھوسا کھائیں۔ سانی کھائیں۔ جھیلا کھائیں۔ چھپر کا پھوس کھائیں۔

۳۔ اجی ان کی فصد کھلوائیے۔ قطرب کی علامت پائی جاتی ہے حضور گوشت کبھی نہ چھوڑیے گا یہ بڑی نعمت ہے۔

۴۔ میاں کیسی باتیں کرتے ہو۔ حضور چھوڑ بھی دیں تو کہیں چھوٹ سکتا ہے۔ رئیسوں سے گوشت بغیر ایک لقمہ تو کھایا نہ جائے۔ نہ کہ ترک کرنا۔ اور ان کی نہ کہیے یہ تو دیوانے مشہور ہی ہیں۔ پائیں تو بکرے کا بکرا چکھ جائیں اور ڈکار تک نہ لیں۔ مگر نصیحت کرنے میں آندھی ہیں۔ آپ کو قسم ہے جو آج سے گوشت کھائیے۔ گوشت کھاؤ تو مردار۔ حرام سور۔ کھو بیٹھ باد بس رہ گئے۔

مسخر الدولہ۔ میاں سو برس کے بعد گھورے کے بھی دن بہورتے ہیں سو کئی صدی بعد گھانس پھونس کی بھی رتی چمکی۔ لے دیکھ لینا جو دس برس میں ایک گوشت خور بھی

نظر آئے۔ سب گھانس خور ہو جائیں تو سہی۔

میاں آزاد ایک دن سویرے منہ اندھیرے بازار میں سیر گشت کر رہے تھے۔ بازار بھر میں سناٹا حلوائی بھٹی میں سو رہا ہے مگر نانبائی برتن دھو رہا ہے بزازہ بند کنجڑوں کی دکان پر اروی نہ شکر قند۔ جوہریوں کی دکان پر قفل لگا ہوا ہے مگر تمبا کو والا جاگا ہوا ہے۔ خاک روب سڑک پر جھاڑو دے رہا ہے۔ میدے والا پسنہاریوں سے جائزہ لے رہا ہے۔ ادھر صدائے مرغ سحر ادھر ندائے اللہ اکبر۔ شوالے کا گھنٹا ٹھن ٹھن بج رہا ہے کوئی اپنی دکان سجا رہا ہے میاں بُز قصاب دکان پر ڈٹے ہوئے کھٹا کھٹ چھری چلا رہے ہیں کتے دُم ہلا رہے ہیں اور بوٹیوں کی خبر سنا رہے ہیں۔ اتنے میں دیکھتے کیا ہیں کہ ایک شخص لنگی باندھے افیم کی پینک میں جھوم رہا ہے اور دکھلایا ہوا چوطرفہ گھوم رہا ہے ہاتھ میں چلم۔ دکان کے صدقے ہو رہا ہے کہ کہیں سے ایک چنگاری مل جائے تو دم لگے دھواں دھار حقہ اڑے۔ جہاں جاتے ہیں پھر مانگ کی آواز آتی ہے۔ بہت ہی چکرائے۔ لاحول ولا قوۃ۔ بھئی ایسا شہر نہیں دیکھا منحوس جہاں آگ مانگے نہ ملے۔ جانو اس میں بھی کوئی چھپن ٹکے صرف ہوتے ہیں یا گرہ سے کچھ جاتا ہے۔ الغرض محلے والوں کو صلواتیں سناتے اور دل ہی دل میں جھلاتے ہوئے نانبائی کی دکان پر حضرت پہنچے۔

حضرت۔ بڑے بھائی اک ذری آگ لوجھپ سے دے دینا۔ میرا یار لا تو جھٹ پٹ۔

نان بائی۔ اچھا تو دکان سے الگ رہو۔ چھاتی پر کیوں چڑھے بیٹھتے ہو۔ یہاں سو دھندے کرتے ہیں آپ کی طرح کوئی بے فکرا تو ہے نہیں کہ تڑکا ہوا اور چلم لی اور لگے کوڑی دکان مانگنے مل گئی تو خیر نہیں تو گالیاں دینی شروع کیں۔ صبح صبح اللہ کا نام نہ رسول پیغمبر سے کام نہ رام رام۔ چلم لیے دوکان پر ڈٹ گئے۔ واہ اچھی دل لگی مقرر کی ہے۔ ایسی ہی طلب ہے تو ایک کنڈی کیوں نہیں گاڑ رکھتے کہ رات بھر آگ ہی آگ رہے اب ہم اپنا کام کریں۔ گاہکوں کو سودا دیں یا آگ دیتے پھریں۔ اب کیا کوئی خوان لے بھاگے گا۔ یا کٹھرا تاکا ہے یا سیخ پر دانت ہے۔ ایسے ہی اچکے تو چوری کرتے ہیں۔ آنکھ چوکی اور مال غائب۔ کیا سہل نسخہ ہے کہ چلم لے کر آگ مانگنے

آ بے ہیں کسی دن میں چلم دلم نہ توڑ تاڑ کے پھینک دوں۔ تم تڑکے تڑکے دکان پہ نہ آیا کرو جی۔ نہیں مفت میں کسی دن ٹھائیں ٹھائیں ہو جاوے گی۔

حضرت کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا۔ جی چاہا کہ بھٹی ہی میں سر گھونس دوں مگر سوچے کہ ہم افیمی آدمی وہ نان بائی گوشت پراٹھے کھا کھا کر کپے کی طرح پھول گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک پٹخنی بتائے خیر دانت پیس کر رہ گئے۔ وہاں سے چلے تو حلوائی کی دکان پر پہنچے۔

حضرت۔ میاں اک ذری سی آگ دینا بھائی ہوت۔

اس وقت حلوائی کا دودھ بلّی پی گئی تھی جھلایا بیٹھا تھا گھبراہٹ میں سمجھا کہ کوئی فقیر بھیک مانگنے آیا ہے کڑک کر اور جھڑک کر بولا کہ اور دکان دیکھو۔ سویرے سویرے کوڑی کی پڑ گئی۔ جاتا ہے کہ دوں دھکا۔ رہیں کہیں مریں کہیں۔ کوڑی مانگنے یہاں موجود۔ دنیا بھر کے مردے نانا مو گھاٹے۔ اب کھڑا گھورتا ہے کیا۔ دونوں کہیں پھوڑ نہ ڈالوں میں۔

حضرت۔ کچھ واہی ہوا ہے۔ بے۔ ابے ہم کوئی فقیر ہیں۔ میں ایک لس پٹی نہ بتاؤں بچہ۔ لو صاحب ہم تو آگ مانگنے آئے ہیں۔ یہ ہم کو بھک منگا بتاتا ہے۔ اندھا ہے بے کون۔

حلوائی۔ (دکان سے اتر کر) بھک منگا نہیں تو ہے کون لنگوٹی باندھ لیں اور چلے آگ مانگنے۔ تمھارے بابا کا کرج (قرض) دھرا یت ہے جب انھوں نے دیکھا کہ یہ لپاڈگی پر آمادہ ہو ہی گیا اور لنگ کس کے دھم سے کود پڑا تو سوچ کر بولے اور پیچھے گئے۔ یہ اس وقت جھلایا ہوا ہے ایسا نہ ہو کہ دو چار گدے کس کے لگا دے تو پھر کس ہی نکل جائے چپکے سے کان دبائے چل کھڑے ہوئے آج تڑکے تڑکے کس کا منہ دیکھا تھا کہ جہاں جاتے ہیں جھوڑ ہو جاتی ہے آگ نہ ملی نہ ملی۔ اتنے میں دیکھا کہ ایک سنار کی دکان پہ آگ دہک رہی ہے او ہو ہو بھئی یہ بے چارہ بھلا مانس آدمی ہے بے عذر آگ دے دے گا۔ اتفاق سے اس وقت سنار دکان پر نہ تھا۔ یہ تو حقے کی فکر میں چوندھیائے ہوئے تھے ہی۔ جھپ سے دکان پر چڑھ گئے ان کا دکان پر چڑھنا تھا کہ سنار بھی اسی وقت آگیا اور ان کو دیکھ کر آگ بھبھوکا ہو گیا تو کون ہے بے۔ دیکھو بے تے نہ کرنا۔ سنار نے جھلا کر ایک چپت جمائی ابے تو ہے کون۔ اور سنیے صاحب خالی دکان

پر کس مزے سے چڑھ گئے (ایک اور ڈھب بنا کر) اور جو کوئی عدد جاتا رہتا۔ میاں افیمچی نے دیکھا کہ اس نے تو "لیں جناب کا سرپنچوں کا سر مقرر کیا ہے۔" معاً چلم پھینک کر سامنے کھڑے ہو گئے۔ بھلا اب کی تو ہاتھ چلا۔ سنار نے دیکھا کہ منحنی سا آدمی دُبلا پتلا اور اتنا اکڑتا ہے بڑھ کر ایک چانٹا اور رسید کیا اور لے گا اتنے میں تیس چالیس آدمی جمع ہو گئے۔ کیا ہے میاں کیا ہے۔ ہے کیا یہ ہماری دُکان پر چوری کرنے آئے تھے۔ ہم نے گردن ناپی۔ تو میں چوری کرنے آیا تھا۔ میں چور ہوں، چور کی ایسی ہی صورت ہوتی ہے۔

لوگ۔ کون! تم! ہمیں تو تم شاہین چور معلوم ہوتے ہو۔ کال جواری۔ اچھا پھر تم ان کی دکان پر گئے کیوں۔ دکان دار نہیں تھا تو وہاں تمھارا کیا کام۔ اور جو سونا چاندی کا گہنا لے بھاگتے تو یہ تمھیں کہاں ڈھونڈتے پھرتے۔

سنار۔ توبہ کرو صاحب ان کا پھر پتہ کہاں ملتا۔ یہ چانڈو خانے میں جاتے یا جمنا کے اس پار۔ چلو تھانے پر۔

لوگ۔ میاں اب جانے دو۔ تم اپنی طرف دیکھو جاؤ خبردار اب دُکان پر نہ چڑھ جانا۔ نہیں پیٹے جاؤ گے بچہ۔

افیمی کی جان اس مخمصے سے بچی تو سب سے پہلے چلم کی فکر ہوئی۔ اس چلم کون لے بھاگا۔ بارے خدا خدا کر کے چلم ملی سنار نے کہا اچھا آؤ آگ لیتے جاؤ۔ حضرت نے آگ پائی اور گھر کی راہ لی۔ تڑکے تڑکے اچھی ٹھنی ہوئی۔ چور بنے مار کھائی جھڑکے گئے۔ تب کہیں بعد خرابی بصرہ آگ پائی۔ ایسی طلب کو آگ لگے۔

میاں آزاد یہ دل لگی دیکھ کر آگے بڑھے۔ چلتے چلتے نواب کی ڈیوڑھی پر آئے اور آداب بجا لائے۔

نواب۔ آج اتنا دن چڑھ گیا کہاں تھے۔ کیا دربار گئے تھے۔

آزاد۔ حضور آج بڑی دل لگی دیکھنے میں آئی۔ واللہ سنتے سنتے لوٹ پوٹ ہو جائیے گا۔ طلب بھی کیا بری چیز ہے اور یہ افیمچی تو اور بھی ستم ڈھاتے ہیں (ساری داستان کہہ سنائی)

نواب۔ (کھلکھلا کر) واللہ اچھی دل لگی ہوئی۔ آگ کے عوض چپتیں پڑیں مارے میاں ذرا خوجی کو بلانا۔ ہاں ذرا خوجی کے سامنے سنانا کسی دن وہ بھی بہکیں گے۔

اتنے میں خواجہ صاحب تولہ بھر افیم پی کر نشے میں غین جھومتے جھامتے لڑھکتے پڑھکتے آئے۔ غلام کو حضور نے یاد کیا ہے؟ جی ہاں اس وقت کس فکر میں تھے۔ اے خداوند افیم گھول رہا تھا اور فکر تو حضور کی بدولت قریب ہی نہیں بھٹکنے پاتی۔ میں فکر کیا جانوں جو روانہ جانتا اللہ میاں سے ناتا۔ دو وقتہ پلاؤ اڑانا اور افیم کی چسکی لگانا۔ حضور اب تو لٹ گیا نوابی میں غلام پر بھی جو بن تھا۔ چوک میں انگلیاں اٹھتی تھیں۔

مصاحب۔ (قہقہہ لگاکر) اچھی بے تکی سنائی اس وقت جوبن اور ڈنڈ بل کا کیا ذکر تھا جی۔

اتنے میں ایک چوب دار برہنہ سر پریشان و مضطر پیکتا ہوا آیا۔ خداوند بڑا غضب ہو گیا۔ کیا۔ کیوں کر کہوں۔ کہو اں خیر ہے بولو تو۔

سب کا رنگ فق کہ خدا ہی خیر کرے۔ نواب کا کلیجہ دہل گیا میاں کچھ منہ سے بولو۔ سر سے کھیلو۔ آخر کیا آفت آئی۔ کچھ معلوم تو ہو۔

چوب دار۔ (ہاتھ جوڑ کر) جان بخشی ہو تو عرض کروں۔ بٹیر سب اڑ گئے۔

نواب۔ (ہاتھ ملتے ہوئے) سب!!! ارے سب اڑ گئے۔ ہائے میرے صف شکن کو جو ڈھونڈھ لائے ہزار نقد انقد گنوائے۔ اس وقت میں جیتے جی مر مٹا۔ اف اف بھئی ابھی سانڈنی سواروں کو حکم دو کہ پنچ کوس دورہ کریں۔ جہاں صف شکن ملے سمجھا بجھا کر لے ہی آئیں۔

مصاحب۔ خداوند سمجھانا کیسا وہ بھی کوئی آدمی ہے کہ سمجھ جائے گا۔ جنور لاکھ پڑھے پھر جنور ہے۔

نواب۔ کوئی ہے۔

رفقا۔ حاضر۔ پیر و مرشد خداوند جی حضور۔

نواب۔ ان پر جوتے پڑیں۔ لو صاحب ہم تو اس وقت گھبرائے ہوئے ہیں۔ یہ بات کاٹتا ہے۔ صف شکن کو تم ایسے گدھوں سے زیادہ تمیز ہے۔

رفقا۔ حق ہے۔ اے حضور وہ تو عربی سمجھ لیتا ہے۔

دوسرے بولے خداوند اس کو قرآن کے کئی پارے یاد ہیں۔ تیسرے نے کہا قسم ہے پنج تن پاک کی میں نے اس کو نماز پڑھتے دیکھا ہے جو تھے۔ ایک دن ہنس رہا تھا۔ پانچویں اجی ہم نے ڈنڈ پیلتے دیکھا ہے۔

نواب صاحب کو ان کل باتوں کا یقین آگیا۔ اس مصاحب بے چارے کی گدّی پر دو چار گدے پڑ گئے۔

بیٹر کیا اڑ گئے نواب صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے آنکھوں سے اشک جاری ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہیں۔ کلیجہ بلیوں اچھل رہا ہے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ ہائے رے میر صف شکن۔ پیارا صف شکن ؎

اگر دانستم از روزِ ازل داغِ جدائی را نمی کردم بدل روشن چراغِ آشنائی را

مجھے تو اس سے عشق ہو گیا تھا جی۔ میں تو اس کی بانکی ادا پر جان دیتا تھا۔ یارو وہ نکیلی چونچ۔ وہ بے تابی سے کاکن چگنا چکھی کھائی اور ڈٹ گیا۔ سینکڑوں معرکوں میں لڑا مگر کورا آیا۔ دو دو بیچ پچیں ہو گئیں اور بٹیر دم دبا کر بھاگا۔ پھر سامنا ہوا اور منہ پھیر دیا۔ کس بانکپن سے جھپٹ کر لات دیتا تھا کہ پالی بھر تھرا اٹھتی تھی اور اس کی بساط ہی کیا تھی منجھولا جنور۔ لیکن بلا کا کس بل۔ اور قسم ہے صف شکن ہی کی اس کی خوبیاں تو مجھ پر آج کھلیں۔ یہ تو میں پہلے ہی سے جانتا تھا کہ وہ حقانی جانور ہے۔ صورت بٹیر کی۔ مگر سیرت فقرا کی۔ اور ایک پنڈت نے کہا تھا کہ یہ کیا جانے کیسی کھنڈت ہو گئی ہے نہیں تو اس کا بڑا درجہ تھا۔ اب سنا کہ نماز بھی پڑھتا تھا۔

مصاحب۔ حضور کو یاد ہوگا کہ رمضان شریف کے مہینے میں اس نے دن کے وقت دانہ تک نہ چھوا۔ حضور سمجھے تھے بوندا ہو گیا مگر میں تاڑ گیا کہ پابند صوم و صلوٰۃ ہے۔

خوجی۔ جل جلالہٗ۔ جل جلالہٗ۔ کیا شان کبریائی ہے۔ خداوند اب میں حضور سے کہتا ہوں کہ دس پانچ دفعہ میں نے افیم بھی پلا دی مگر واللہ باللہ ثم باللہ۔ جو ذرا بھی نشہ ہوا ہو۔ ہاں انکھڑیوں میں لال لال ڈورے تو پڑ گئے تھے۔

میر صاحب۔ پیر و مرشد یقین جانیے پچھلے پہر سے سحر کاذب تک حق حق کی آواز کابک سے آیا کرتی تھی۔ غفور تم کو بھی ہم نے کئی بار جگا کر سنایا کہ صف شکن یاد خدا میں مصروف ہے

غفور۔ ہاں میاں پچھلے سے حق حق کیا کرتے تھے اور اکثر دیکھا تھا کہ سجدہ کر رہے ہیں۔

خوجی۔ جل جلالہٗ۔ جل جلالہٗ۔ واہ میاں صف شکن علی شاہ۔

نواب۔ بھئی ہم نے اسے پہچانا ہی نہیں ؎

افسوس کہ عمر رفت و ہشیاری نیست   دردا کہ خیال خویشتن داری نیست

آف آف بھئی کوئی پنکھا جھلنا۔

مصاحبین۔ (غل مچاکر) پنکھا لاؤ۔ جلدی۔ سامنے کھڑے ہو کر جھلو۔

نواب۔ ؎ بیتم جو میں جانتی کہ پیت کیے دکھ ہوئے
نگر ڈھنڈھورا پیٹتی کہ پیت کرے نا کوئے

خوجی۔ (پینک سے چونک کر) ہاں ذری اونچے سروں میں۔ واہ استاد چھیڑے جائیے اس وقت تو میاں شوری کی روح پھڑک گئی ہوگی۔

نواب۔ چپ نامعقول، کوئی ہے ان کو یہاں سے ٹہلاؤ۔ یہ رئیسوں کی صحبت کے لائق نہیں۔ مجھ کو بھی کوئی گویا مقرر کیا ہے۔ یہاں تو جی جلتا ہے اور اندر ہی اندر پھک رہا ہوں۔ ان کے نزدیک قوالی ہو رہی ہے۔ کہنے لگے اونچے سروں میں۔ میاں شوری یاد آتے ہیں۔ تم ایسے مفت خوروں کو کسی کے دکھ درد سے کیا سروکار۔ تم کو تو چکھوتیوں سے مطلب ہے اور بس۔ فیرنی ہو کھیر پکے مزعفر پر ہاتھ پڑے۔ ٹکڑے کھائے دل بہلائے کپڑے پھٹے گھر کو آئے۔

خوجی۔ خداوند غلام تو اس دم اپنے آپے میں نہیں صف شکن کی کابک خالی ہو اور میں اپنے ہوش و حواس سے چوکس رہوں۔ میرا معشوق نظر سے غائب ہو تو طبیعت کیوں کر حاضر ہو۔ حضور نے اس وقت مجھ پر جبر کیا۔ افسوس ہائے افسوس۔ ارے یارو صف شکن کو کہیں سے ڈھونڈھ لاؤ۔ کوئی تو پتہ لگاؤ چور گیدی سے خدا سمجھے۔

نواب۔ شاباش۔ خوجی شاباش۔ اس وقت طبیعت بہت ہی خوش ہو گئی بے شک تم نمک حلال تمھارے باپ دادا نمک حلال۔ ارے بھئی سانڈنی سوار دوڑائے گئے یا نہیں۔

مصاحب۔ شجاعت علی سے کہو ابھی سانڈنی تیار ہو اور پنج کوس چکر لگائے۔ جہاں صف شکن ملیں ان کو سمجھا بجھا کر لے ہی آئے۔

شجاعت۔ جانتا تو ہوں مگر وہ تو منطق پڑھے ہیں میری کیا مانیں گے کوئی مولوی بھی تو ساتھ بھیجیے ان سے بحث کا کون غلام تو کچھ اونٹ ہی چلانا خوب جانتا ہے۔ ان سے دلیل کون کرے بھلا۔

خوجی۔ خداوند قربان جاؤں۔ افیم چانڈو مدک چرس کی بحث ہو تو بندہ درگاہ کو

بھڑا دیجیے مگر وہاں تو حقانی باتیں ہوں گی۔ اس میں ایں جانب کو واجبی ہی واجبی دخل ہے پھر دخل در معقولات دے کر اتو بنوں مفت میں۔

میاں آزاد۔ پیر و مرشد۔ بانک بنوٹ لکڑی پٹے کا چرچا ہوتا تو بندہ بھی تلوار سوت کر عین موقع واردات پر جا ڈٹتا۔ اور چرکے پر چرکا نشتر پر نشتر لگاتا۔ مگر منطق کی بحث کچھ خالہ جی کا گھر تو ہے نہیں کسی جغادری مولانا کو بلوائیے۔

مصاحبوں نے ایک مولانا صاحب کو تجویز کیا۔ مولانا بے چارے پھٹے حالوں تھے سمجھے کہ جو ملے غنیمت ہے مگر یاران سرپل نے ان سے کل داستان نہیں بیان کی۔ چوب دار مکان پر گیا اور کہا کہ نواب صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے چلیے کسی بڑے عالم سے بحث ہوگی۔

مولانا۔ السلام علیکم۔ حضور نے آج یاد فرمایا ہے۔ زہے نصیب۔

نواب۔ وعلیک السلام۔ آپ کو اس وجہ سے تکلیف دی کہ میرا قرۃ العین لخت جگر نور بصر ناراض ہو کر چلا گیا مگر منطقی آدمی ہے اسرارِ خدائی سے واقف علم مناظرہ میں طاق۔ پابند روزہ و نماز آپ بحث کیجیے اور معقول کر کے لے آئیے۔

مولانا۔ انشاء اللہ۔ والدین کا بڑا حق ہوتا ہے وہ کیسے نادان آدمی ہیں کہ والدین سے خفا ہو گئے۔ مقام استعجاب ہے۔

خوجی۔ مولانا صاحب وہ بٹیر ہے۔ مگر خوش تمیز۔ عارف۔ زاہد۔ عفت کوش۔ متقی۔ متشرع۔ منطقی۔ فلسفی۔ ہیئت داں۔ عربی خواں۔

میر صاحب۔ کیا صف شکن کا نام مولانا صاحب نے نہ سنا ہوگا۔ وہ روم تک مشہور تھے قبلہ حقیقت حال یوں ہے کہ سرکار کا بٹیر صف شکن کل کابک سے اڑ گیا۔ اب تجویز یہ ہوئی کہ ایک سانڈنی سوار جائے اور سمجھا بجھا کر لے آئے۔ مگر شتر بان پھر شتر بان ہے لاکھ صحبت یافتہ ہو تو کیا۔ لہٰذا آپ بلائے گئے کہ سانڈنی پر سوار ہو جیے اور ان کو بہ لطائف الحیل لائیے۔

مولانا۔ درست آپ سب کے سب نشے میں تو نہیں ہیں۔ ہوش کی باتیں کیجیے۔ خود مسخرہ بنتے ہو یا مجھے مسخرہ بناتے ہو۔ بٹیر منطقی کیسا لاحول ولا قوۃ۔ آپ نے مجھے بھی کوئی نقل محفل بنایا ہے۔ اور سنیے بٹیر اڑ گیا اس کو سمجھا کر لاؤ۔ وہ بھی کوئی مولوی ہے یا آدمی ہے۔ صف شکن۔ کون لڑائی سر کی تھی۔ استغفر اللہ استغفر اللہ اچھے گاؤدیوں کا مجمع ہے۔ بندہ رخصت ہوتا ہے۔

نواب۔ یہ کس کوڑھ مغز کو لائے تھے۔ خاصا جانگلو ہے۔
آزاد۔ اچھا حضور بھی کیا یاد کریں گے کہ اتنے بڑے دربار میں ایک بھی منطقی نہ نکلا۔ لے اب غلام نے بیڑا اٹھا لیا کہ جاؤں گا اور لاؤں گا۔ ایک تو سانڈنی دیجیے باد رفتار اور دو دن کی خوراک دیجیے اور ایک خط اپنے دست خط مبارک سے لکھ دیجیے تیسرے دن غلام مع صف شکن خان بہادر کی ڈیوڑھی پر موجود نہ ہو تو مونچھیں منڈوا ڈالیے۔
نواب۔ اچھا آپ جائیے اور لیس ہو کر آئیے میں یہاں بندوبست کیے دیتا ہوں مگر ابھی آئیے۔ دیر نہ ہونے پائے۔ اتنا خیال رہے۔
میاں آزاد گھر گئے تو اور مصاحبوں میں کھچڑی پکنے لگی۔ یارو یہ تو بازی جیت لے گیا۔ پالا اسی کے ہاتھ رہا۔ اور جو کہیں صف شکن کو لے آیا تو پھر ہم سب پر شیر ہو جائے گا پھر آزاد ہی آزاد جو طرف نظر آئیں گے۔ ہم کو آپ کو کوئی نہ پوچھے گا۔ اس کی فکر ضرور کیجیے۔
خوجی۔ حضور جان بخشی ہو تو عرض کروں۔
نواب۔ کہیے یہ جان بخشی کا کون موقع ہے۔ کوئی عمدہ صلاح بتائیے۔ کوئی معقول تدبیر نکالیے۔
خوجی۔ حضور میاں آزاد بھی دو دن سے اس دربار میں آئے ہیں ان کا اعتبار کیا۔ خدا جانے اچکے ہیں۔ اٹھائی گیرے ہیں۔ چور ہیں۔ گرہ کٹ ہیں۔ کوئی کیا جانے اور سانڈنی ہی لے کر رفو چکر ہوں تو پھر کوئی کہاں ان کا پتہ لگاتا پھرے۔ انصاف سے کہیے گا کہ ایک خانہ برباد خانہ بدوش آدمی کا ٹھکانا ہی کیا اور وہ کچھ بیدھا ہے کہ پھر واپس آئے گا۔
مصاحب۔ ہاں خداوند کہتے تو سچ ہیں۔
رفیق۔ پیر و مرشد سڑی ہے تو کیا ہوا مگر کہتا پتے کی ہے۔
میر صاحب۔ یہ خوجی صورت سے ہی ایسے معلوم ہوتے ہیں لیکن بات کہی ٹھکانے کی۔ لے ہاں ایسے آزاد کا ٹھکانا کیا۔ سانڈنی کے کوڑے کو لے اور اپنی راہ لے۔
مسیتا بیگ۔ ہم تو حضور کو صلاح نہ دیں گے کہ میاں آزاد کو سانڈنی دیجیے۔
نواب۔ چلو بس بہت نہ بکو۔ تم اٹھائی گیرے مفت خورے ہو نہ سب کو اپنا ہی ایسا سمجھتے ہو۔ آزاد کی چتون کہے دیتی ہے کہ وہ وزارت کے قابل ہے۔ تم میں سے کوئی اس کی جوتی کی پھٹ پھٹ کو نہیں پہنچتا۔ اور فرض کرو کہ سانڈنی جاتی ہی رہے تو کیا

میں بھی کوئی مٹکڑ گدا ہوں کہ سانڈنی کے کھونے سے مجھے بھیک مانگنے کی نوبت آ جائے گی۔ اور ہزار بات کی ایک بات تو یہ ہے کہ صف شکن پر سے لاکھوں صدقے ہیں۔ سانڈنی کس میں ہے۔

میاں آزاد سرائے میں

آج میاں آزاد سرائے میں لمبی تانے پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔

بھٹیارن۔ (پاؤں ہلاکر) اٹھیے اٹھیے۔ اے اٹھو بھی۔ آج تو جیسے گھوڑے بیچ کر سوئے ہو۔ اے لو وہ آٹھ کا گجر بجا۔ لے واہ میاں انگڑائیوں پر انگڑائیاں لے رہے ہیں مگر اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ اجی۔ میاں مسافر (شانہ ہلاکر) اے میاں مسافر آپ تو کہتے تھے کہ ایک دن تماشا نہ دیکھیں تو کھانا ہضم نہ ہو۔ یہ آج بد پرہیزیاں کیسی۔ لے اٹھو بھی بہت نخرے نہ بگھارو۔ اے ہوش کی دوا کر مردوے۔ اوئی۔

چانڈو باز۔ اے جی تم کو کیا پڑی ہے سونے نہیں دیتیں کیا جانے کس موج میں پڑے ہیں۔ تر نگی آدمی تو ہی ٹھہرے کہنا کیسا دھاوت سیلانی ہے اف اوہ۔ کچھ ٹھکانہ ہے۔ دوسرا اتنا گھومے تو ہلکان ہو جائے ان کا تلوا ٹکتا ہی نہیں۔ کوئی خاکی ہوتا ہے کوئی ناری یہ سیمابی ہے۔ اور جو جگانا ہی منظور ہے تو آفتابے کی ٹونٹی سے ذرا سا پانی کان میں چھوڑ دو دیکھو کیسے کلبلا کر اٹھ بیٹھتے ہیں۔

بھٹیاری نے منہ پر قطرہ افشانی شروع کی۔ دس ہی پانچ بوندیں ٹپ ٹپ گری تھیں کہ میاں آزاد ہائیں ہائیں! ہائیں! کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

آزاد۔ واہ خوب ابھی دل لگی نکالی ہے۔ کیسی میٹھی نیند سو رہا تھا کہ واہ جی واہ خواب میں وہ پری چہرہ صورتیں نظر آتی تھیں کہ بس کچھ پوچھو نہیں۔

بھٹیاری۔ واہ وا۔ نو نقد تیرہ ادھار۔ اب تو پری چہرہ آنکھوں کے سامنے ہے۔

آزاد۔ کون آپ نہ!

بھٹیاری۔ اے آج حضور کی سواری چھتر منزل نہیں گئی وہ دیکھو سانڈنی بلبلا رہی ہے۔

آزاد۔ ارے آج تو اتوار ہے بی بی۔ آج چھٹیاں منائیں۔ کل سمجھا جائے گا۔

چانڈو باز۔ کیوں میاں جتاؤ تو خوب ہوتے، ہوں گے بھئی کل ہمیں بھی سانڈنی پر بٹھا!

بھٹیاری۔ میں واری مجھے ٹکٹ لے دینا۔

آزاد۔ ارے یار بس یہی تو افسوس ہے کہ آدمی تھوڑے ہی آتے ہیں جو سب کے سب مل کے چلیں تو خوب ہی لقشے جمیں اور وہ دل لگیاں ہوں کہ آدمی لوٹتے لوٹتے فرش ہوجائیں۔

چانڈو باز۔ سنیے بندہ نواز رات کا وقت۔ نو بجے شروع ہو بارہ بجے ختم۔ ایک بجے گھر پہنچے محلے بھر میں آگ ڈھونڈھے سلگائے حقہ بھرے۔ تو اجمائے گھنٹہ بھر گڑگڑائے، پلنگ پر جائے نیند اچاٹ کروٹیں پر کروٹیں لے تب کہیں چار بجتے بجتے آنکھ لگے۔ پھر فرمایئے جو بھلے مانس چار بجے تڑکے سوے وہ دوپہر تک اٹھنے کا نام لے گا۔ بھلا لیجیے دن یوں گیا رات دوں گئی۔ اب انسان چانڈو کب پیے۔ داستان کب سنے۔ قوام کب بنائے۔ پینگ کے مزے کب اڑائے۔ بھئی کون جائے۔ مفت میں مٹی پلید کرنا اس سے فائدہ۔ کیا گلابو شتابو کے تماشے سے اچھا ہوتا ہوگا۔ اجی بس بیٹھیے بھی جس وقت وہ مٹک مٹک کر کہتی ہیں (جنیاں لال ملوں گی)، واللہ بے چانڈو پیے نشہ چڑھ جاتا ہے جو وہاں جائے تو اس سے ریچھ والے ہی کا تماشا دیکھے۔ وہ چٹخنی دی اور وہ دے مارا۔ چاروں خانے چت۔ میاں اینٹھا سنگھ کے مزے نہ اڑائیے۔ بکری پر تنے بیٹھے ہیں۔ چھینک پڑی اور کھٹ سے پھندنے دار ٹوپی الگ۔ اچھیں۔ وہ پہنچی ڈگڈگی بج رہی ہے۔ بندریا تھرک رہی ہے۔ ناچ کھلاڑی دھنک دھنا۔ بھئی کوئی بیدھا ہی ہو جو وہاں جائے ہم تو نہ جائیں گے۔ اور میاں لوگ آئیں گے کہاں سے خلقت تباہ خستہ ہے۔ کسی میں دم کہاں اور جب سے افیم سولہ روپے سیر ہوگئی تب سے تو اور بھی خلق کا دیوالہ نکل گیا اور رہا سہا یہ چانڈو کی ٹھیکیوں نے مار ستیاس کردیا۔ جائے تو دام کس کے گھر سے لائے۔ سیلانی تو یہاں کا چھوہا چوہا ہے۔ جسے دیکھو سیر سپاٹے پر لٹو۔ مگر ٹکٹ کا نام نہ ہو اور بھئی صاف تو یہ ہے کہ ہم لوگ مفت کے تماشا دیکھنے والوں میں ہیں۔ میلا ٹھیلا تو کوئی چھوٹنے ہی نہیں پاتا ایک بندہ درگاہ ہی ہیں کہ ساون بھر عیش باغ کے میلے نہ چھوڑے۔ کبھی املیوں میں جھول رہے ہیں۔ بہت بڑھے کر حاتم کی قبر پر لات ماری تو ایک گنڈے کے بونڈے لیے۔ ایک گنڈا اور بڑھایا اور بی ساقن کی دکان پر دم لگایا چلیے پانچ چھ پیسے میں میلا ہوگیا۔ بھلا یہ بات یہاں کہاں۔ حقہ نوشی کی پہلے ہی قطعی ممانعت ہوگی۔ نادری حکم ہے

کہ دھواں کوئی نہ اڑ لے نہیں تو ہم سوچے تھے کہ چانڈو کا سامان سب لیتے چلیں گے اور مزے سے کسی کونے میں لیٹے ہوئے اڑاتے جائیں گے۔ اس میں کسی کے باپ کا کیا اجارا۔ بندے کو خدا نے فعل کا مختار کر دیا پھر اپنی اپنی سب بھگت لیں گے ٹکٹ تو کرا دیجیے معاف اور چنڈو کی دکان دیجیے کھول اور دس دن پہلے ڈھنڈھورا پٹوائیے کہ فلاں تاریخ کو سر شام سے بڑے بڑے کھیل اور بڑے بڑے تماشے ہوں گے ٹکٹ ندارد۔ کڑم دھم کڑم دھم۔ پھر دیکھیے جو لکھنؤ بھر نہ ٹوٹ پڑے تو اپنا نام بدل ڈالوں۔

آزاد۔ جی بجا ہے۔ سوجھی تو خوب چشم بد دور۔ دور کی کوڑی لاتے ہو۔

بھٹیارن۔ ہاں ہاں۔ اچھے آزاد پھر تو، ہم بھی روز چلا کریں۔

آزاد۔ کتنی سادی ہو۔ یہ تو بھنگیا گئے ہیں۔ رہا تمہاری عقل بھی دیمک چاٹ گئی۔ ان کو کیا پڑی ہے بھلا کہ بمبئی سے انگڑ کھنگڑ لے کر کوسوں اتنی دور آئیں، چلتے چلتے آندھی روگ آجائے اور یہاں آن کر آپ کو مفت تماشا دکھائیں۔ بچپڑی اور دو دو۔ وہی بے ٹھکانے بات کہتی ہو جس کا سر نہ پیر۔ ایسے آنکھوں کے اندھے گانٹھ کے پورے اللہ کے بندے کہیں اور رہتے ہوں گے۔ ایسی تو خوب صورت بھی نہیں ہو۔

چانڈو باز۔ اچھا تو تمہاری خاطر ہی سہی تم بھی کیا یاد کرو گے بھلا ایک دن ہم چونی گلا ئیں گے، چار آنے کا خون ہی سہی یہاں تماشا ہوتا کہاں ہے۔ گول دروازے میں نہ۔

آزاد۔ ہیں گول دروازہ نہ لمبا پھاٹک! چھتر منزل یہاں سے دس قدم پر ہے۔

چانڈو باز۔ ہونہہ تو بندہ جا چکا دس قدم کی ایک ہی کہی۔ ہاں تم کو البتہ پاس ہے مینڈو خان کی سرائے سے نکلے اور کھٹ سے داخل۔ یہاں سات بجے سے چلنا شروع کریں تو دس بجے پہنچیں آدھا تماشا ہو چکا ہو مفت میں الو بنیں اور جو کہیں پینک نے زور کیا تو خود تماشا بن گئے۔ بگھی کرایہ پر کریں تو آٹھ آنے آنے کے اور آٹھ ہی آنے جانے کے ایک روپیہ ہوا اور جو تین گھنٹے بگھی روک لی تو اس نے دو روپیہ اور ٹھونک دیئے۔ مفلسی میں آٹا گیلا۔ تین بجے گھر پہنچیں تو چخ چلے کہ اب تک میاں تھے کہاں؟ نا صاحب ہم نہ جائیں گے اور میاں آدھی عمر تماشے ہی دیکھتے دیکھتے گزری ہے اب تین اوپر ساٹھ برس کے ہوئے مگر یار سنا ہے سبز پری پر بلا کا نکھار ہے جو شوقین ہے تو کسی روز چانڈو پینے آوے ہی گی دیکھ لیں گے۔

آزاد۔ جی منہ دھو رکھیے یہ مداری لال کی اندر سبھا نہیں ہے کہ چانڈو نہ ہو تو آواز

ہی نہ نکلے ارے نادان یہ سب تربیت یافتہ لوگ ہیں مزے گاودی ہی رہے۔ اچھا بھئی
اب ان کو صلاح دیں گے کہ شہر میں بھی دو ایک دن کے لیے چلیں۔ وہاں تو آؤ گے۔

چانڈو باز۔ (مونچھوں پر تاؤ دے کر) انشاء اللہ تعالیٰ ضرور خیال کیجیے کہ کجا چھتر منزل کجا نگریاں دنیا کے اس سرے، چلتے چلتے پاؤں سوج جائیں تین دن تک کھٹیا سے اٹھنا مشکل ہو۔ الہٰی توبہ کیوں جی سنا اڑن کھٹولے آتے ہیں اور سچ مچ کی پریاں آن کر گورا گورا مکھڑا دکھاتی ہیں بھئی چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ ایں جانب کل ضرور ڈٹیں گے مگر یہ قید تو نہیں ہے کہ کوئی باہر نہ جائے ایسا نہ ہو کہ چار گھنٹے تک قید میں پڑے رہیں۔ بلا سے ہم باہر چنڈو اڑائیں گے اس میں کسی کا کیا اجارا ہے۔ اندر سبھا تو دیکھنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے کل سو کام چھوڑ کر جاؤں گا۔

بھٹیارن۔ واہ تو شہر میں ہم کیوں کر جائیں گے اتنی دور بھلا۔ اچھا آزاد کی سلامتی بہر ان کے ساتھ ہی سوار ہو لیں گے۔ مزے سے دل لگی دیکھ کر دو بجے تک سرا میں آجائیں گے۔ پیدل جانا کٹھن ہے۔

پارسی تھیٹر کا تماشہ

ہمارے جواں مرد جہاں نورد میاں آزاد فرخ نہاد سرا میں ٹکٹ بانٹ زرق برق کپڑے ڈانٹ۔ سانڈنی پر کاٹھی کس کر عطر و عنبر میں بس کر بی بھٹیاری کو پیچھے بٹھائے اونٹنی کو چمکائے یہ جا وہ جا۔ شہر بھر میں دھوم ہے ہر سمت ہجوم ہے۔ چھوٹے بڑے کو معلوم ہے۔

اوہو، ہو، ہو۔ آج تو محفل جگماتی ہے۔ آنکھ جھپکی جاتی ہے۔ ہر دیوار برستان کا لطف دکھاتی ہے۔ بادِ عنبر بیز سے باغِ نعیم کی بو آتی ہے۔ سامنے پردۂ زمرد گوں اور اس پر نقش و نگار بوقلموں۔ دامنِ کوہ میں لالہ زار سراپا بہار، قلعۂ کوہ پر سپہر زرنگاری بالا اعتبار، ایک دفعہ ہی پردے میں سے زمزمۂ سحر آمیز۔ اور نغمۂ فسوں انگیز سامعہ افروز ہوا۔ اور دلِ سامعین رنگیں طبع مصروف آہِ جگر سوز ہوا۔ ہر سمت شورِ تحسین بلند ہوا ہر فردِ بشر آرزو مند تھا کہ کہیں گھونگھٹ کا طلسم ٹوٹے چاند گہن چھوٹے نازک آوازی اور جادو طرازی کہے دیتی تھی کہ پردے والی ابھی کم سن ہے۔ نامِ خدا الھڑ پنے کے دن ہیں۔ خدا خدا کر کے وہ کافر پردہ اٹھا۔ تو۔

نظر پڑا اک بت پری وش نرالی سج دھج نئی ادا کا
جو عمر دیکھو تو دس برس کی پہ قہر و آفت غضب خدا کا

زہرہ کا کیا زہرہ کہ تاب جمال لائے مہر انور کو شوق دیدار چرائے تو پہلے سو بار آب کوثر سے منہ دھو آئے۔

اس بت شکر لب اور دلبر سیم عضب کا بلبل بیمار نام ہے اور واقعی اس کی رسیلی آنکھ نرگس بیمار ساقی رندان مے آشام ہے۔ اس محبوب چاردہ سالہ کو اس کا دادا بجھپکا ماما ایک پیر فرتوت کے سپرد کر گیا جس نے دقیانوس کے باپ کو گود یوں کھلایا تھا اور بابا آدم کو بولنا سکھایا تھا۔ لو بھئی ہم تو سفر کو چلے۔ ایک مہینے میں جیتے بہورے تو فہو المراد۔ ورنہ تم جانو اور یہ پری زاد۔ فی امان اللہ۔ یہ کہہ کر اس پری کا زاد بار بد نژاد پری چہرہ کے جد امجد تو سدھارے۔ اور ایک مہینہ بات کرتے گزر گیا انھوں نے آنے کا نام نہ لیا۔ ادھر بڈھے میاں کو یہ بڑھ بھس ہوا کہ اس برق دم پری چھم کوہ سار دل ربائی جدت تیغ رعنائی کے ساتھ بیاہ رچے ؎

پیری کہ دم زعشق زند بس غنیمت است　　　از شاخ کہنہ میوۂ نورس غنیمت است

واہ بھئی بوڑھے میاں۔ واہ میاں لال خاں۔ بڑھوتی وقت ان سفید بالوں میں کالک لگاؤ گے۔ کمر بہتر جگہ سے خم مگر یہ دم ماشاءاللہ منہ چق رنگ فق۔ خاصے ہونق۔ گالوں پر کروروں جھریاں آنکھیں اندھا کنواں کانکہ کو نکہ کے لٹھیا ٹیکتے ہوئے ذرا چلے تو بے پھسلن کے پھسل پڑے۔ دانت بتیسوں چوہے کے بل میں اور خیال گدگدیا کہ پری کو عقد میں لائیں۔ اور بیوی بنائیں عقدۂ دل کھلے ایک دن کمر و مرکس کر سفر کی تیاریاں کر دیں۔

پیر نابالغ۔ او بت عیار ترک ستم گار نکیلی گل عذار۔ پیاری بلبل بیمار میں اس چاند سے مکھڑے پر واری۔ میری جان میری پیاری وہ تو آج تک آتے ہی رہے اور ہم مناتے ہی رہے۔ آج ہم سوچے کہ کسی نا خدا ترس کے پالے پڑ گئی تو میری روح پر صدمہ ہوگا اس سے میرے ہی شبستاں کو اپنے چاند سے چہرے سے منور کرو تو کیا۔ ہم اپنی پرانی کھوپڑی پر نئی پگیا جمائے نوشہ بنائے ٹٹو پر سوار ہو کر بیں بیں کرتے آئیں تو تم سولہ سنگار کیے گردن نیوہڑائے بیٹھی رہو۔

بلبل بیمار۔ (مسکرا کر) اے واہ میاں (واہ میاں کا ڈونگرا برس گیا)

پیرنا بالغ - ادھر ساون بھادوں کے جھالے ہوں - ادھر ہم میں تم میں پینگ بڑھیں - دونوں جھولے پر چڑھیں - بانس گڑے ہوں - امریوں میں جھولے پڑے ہوں بیوی ملار گائیں میاں بغلیں بجائیں -

بلبل بیمار - بغلیں نہیں میاں تالیاں بجائیں - امریوں میں بور آجائیں -

پیرنا بالغ - اشرفی لقمہ کھلاؤں - پھولوں کی سیج پر سلاؤں -

بلبلِ بیمار - اے واہ ری چاہ بس اتنے ہی کے لیے بیاہ -

پیرنا بالغ - تمھارے دم کے لیے گرمی کی فصل میں خس خانہ و برف خانہ ہو - اور سردی کے دنوں میں شرابِ ناب اور گرماگرم نرگسی کباب ہو -

بلبل بیمار - یہ ٹھنڈی گرمیاں -

پیرنا بالغ - رات کو کہانیاں سناؤں - فرمایشی قہقہے لگاؤں -

بلبلِ بیمار - یہ سوکھے ٹھٹھے -

پیرنا بالغ - رات کو ہم مال کی کوٹھری میں تم مہتابی پر سو رہو -

بلبل بیمار - دگردن نیوڑھا کر) پھر آگے کیا -

پیرنا بالغ - کہا مان میری جان -

بلبلِ بیمار - (قہقہہ لگاکر) اے واہ جی میاں -

پیرنا بالغ - میں نہالِ عاشقی ہوں -

بلبل بیمار - مگر نخل بے ثمر -

پیرنا بالغ - میں شمعِ محفلِ عشق ہوں -

بلبل بیمار - مگر چراغِ سحری -

پیرنا بالغ - میں آفتابِ سپہر سرور ہوں -

بلبل بیمار - مگر آفتابِ لبِ بام -

پیرنا بالغ - اب تو عشق چرایا سو چرایا -

بلبل بیمار - کس برتے پر -

پیرنا بالغ - بیاہوں گا - ضرور بیاہوں گا -

بلبل بیمار - شرط جواں مردی یہی ہے -

پیرنا بالغ - ے

کوچ کی اپنے اب تیاری ہے　　　تیرا حافظ جنابِ باری ہے

بلبل بیمار۔ (انگلیاں مٹکا کر) چھچھے دور۔

اس بتِ عنبریں مو۔ قوسِ ابرو کی اس حاضر جوابی اور بوڑھے میاں کی بے قراری اور بے تابی پر محفل جشنِ عشق کرتی تھی۔

بلبلِ بیمار کی تیکھی چتون اور پیاری ادا پر دل لوٹ پوٹ تھا۔ کلیجے پر چوٹ تھی۔ کس ناز و ادا سے تھرک تھرک اور چمک چمک کر پیر فرتوت کو دنداں شکن جواب دیتی تھی کہ واہ جی واہ۔ عنفوانِ شباب اور آب و تاب اٹھتی جوانی اور خوش الحانی نازک آوازی اور زباں درازی نے ستم ڈھایا۔ حشر بپا کیا۔ ستم بپا کرنے اور آفت ڈھانے والی تھی ساری خدائی سے نرالی تھی۔ بوڑھے میاں نے بوڑھی خرانٹ ماما عصمت کو بلایا۔ اور کہا لو عصمت ہم تو کچھ دن کے لیے باہر جاتے ہیں گھر بار اور پیاری بلبل بیمار تم کو سونپ چلے۔ پنبے غلام حبشی کو طلب کیا اور کہا خبردار جو کسی رہنا ہاتھ لگائے پیری تمام کر راہ لی۔

اب سنیے کہ وہ گلِ سدا بہار یعنی بلبل بیمار ایک جوان سادہ کار گل رخسار پر عشق تھی اور وہ اس پر ہزار جان سے عاشق۔ سمجھا کہ مامتِ دیرینہ روزِ گرگ باراں دیدہ ہے چلو مطرب پیر اور خنیا گر کے بھیس میں چلیں۔ بڑھیا رنگین مزاج چمن شاع ہے شاید ریجھ جائے سارنگی بجاتے اور خوش الحانی سے ٹھمریاں گاتے بلبلِ بیمار کے ایوانِ جواہر نگار کے پھاٹک پر پہنچے پہنچے تو شراب کی بوتل مطرب کی رشوت دی اور بیٹھ کر گانا شروع کیا دیپا کے آدن کی کبھی بریاں صد جوانٹیاں لاگ رہی بلبل بیمار نے جو یہ آواز سنی تو بے قرار جو دروازے کی سلاخوں کے پاس سے تاک جھانک کرنے لگی۔ اِدھر بڑی بی نے للکارا۔

عصمت
پنبے پنبے اور نیچے کیا ہے یہ طوفان

پنبے
عاشق و معشوق ملے ہیں چپ رہ اے نادان

عصمت
منہ کالا ہو تیرا پنبے کیا بکتا ہے بدنام
بڈھا ہم کو سونپ گیا ہے یہ دخترِ گل فام

عاشق
کیا ترتر کرتی ہے بڈھی تجھ کو اس سے کیا کام

پنبے۔ ارے یہاں قفل لگا ہے۔ اور قلفا۔ قلف کا بھی باپ۔

عصمت۔ ہے ہے اس بڈھے نے میرا بھی اعتبار نہ کیا۔ تو عصمت جو اس فیاض جوانِ

طناز کو گھر میں داخل نہ کر دوں قفل لگا کا لگا ہی رہے۔ یہ کہ کر عصمت نے دو سو کی تھیلی سیدھی کی اور پچھواڑے کے دروازے سے عاشقِ زار کھٹ سے بلبلِ بیمار سے ہم کنار ہوا۔

عصمت۔ ارے جوانی میں بھی آفت کی پرکالہ تھی۔ مجھ پر بھی عالم تھا اتنے میں پیر نو دہ سالہ سفر سے واپس آئے دروازے کو دیکھا تو افیونیوں کی آنکھ کی طرح بند۔ میاں پنبے کہیں اتفاق سے شراب لینے باہر گئے تھے ان کی چار آنکھیں ہوئیں۔

پیر۔ پنبے پنبے ارے کمبخت گھر بار کس پر چھوڑ گیا تھا۔

پنبے۔ بلبلِ بیمار کے عاشقِ زار پر۔

پیر۔ ہائیں بلبلِ بیمار کا عاشقِ زار تو میں ہوں۔ کیا اور بھی پیدا ہوا۔

پنبے۔ ہونہہ اب چار دن میں سن لینا کہ لڑکا پیدا ہوا۔

پیر۔ (سر پیٹ کر) اف ہائے ستم وائے ستم۔ گھر میں گھسے تو بلبلِ بیمار اور عاشقِ زار بیٹھے رنگ رلیاں منا رہے ہیں اس وقت انھوں نے توبہ کی کہ اب اس سن میں شادی کرے تو اس پر لعنت۔

نواب صاحب اور رفقا کی چہ میگوئیاں

اب اِدھر نواب کے یہاں کا حال سنیے کہ وہاں کیا ہوتا تھا جب کئی دن گزر گئے تو خوشامد خوروں نے چنگ پر چڑھایا کہ پیر و مرشد دیکھا ہم نہ کہتے تھے کہ میاں آزاد خانہ برباد کا ٹھکانا کیا۔ حضور نے نہ مانا آخرش سانڈنی کی سانڈنی گئی اور رنج کا رنج ہوا۔

خوجی۔ اور بے وقوف کے بے وقوف بنے۔

میر صاحب۔ اور انعام و زادِ راہ جو دیا گیا گھاتے میں۔ اس کی گنتی ہی نہیں۔

غفور۔ ہجور اب وہ پھرتے بچیر نہیں آتے۔ دو تین سو کی سانڈنی پر پانی پھر گیا۔

خوجی۔ ہونہہ۔ یہ دو ہی تین سو لیے پھرتے ہیں۔ اے میاں وہ سانڈنی بلا کی دھاوا کرنے والی ہے۔ ریل کی دم میں باندھ دو دیکھو چند وسی تک برابر چھم چھم کرتی چلی جاتی ہے یا نہیں۔ ہندوستان سے ملک میں ویسی ایک تو نظر آتی نہیں۔ بلکہ یاد م خم سے بھئی۔ میں دو ایک دفعہ سوار ہوا۔ واللہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہوا پر جا رہا ہوں وہ ٹھمک ٹھمک چال کر اوہو ہو ہو۔ سواری اونٹ گھنٹہ گھوڑا یا لگی ہاتھی سب اس کے

مقابل میں گر دیں اور بھئی سچ پوچھو تو میاں صف شکن سے اس کے کھونے کا زیادہ رنج ہوا۔

میر صاحب۔ واہ خواجہ صاحب آپ بھی واللہ کیا بے تکی باتیں کرتے ہیں۔ کجا بے زبان جانور کجا ہمارے صف شکن سلمہ اللہ تعالیٰ۔ پاجی اور بھلے مانس کا مقابلہ کیا، ارے وہ اشرف الحیوانات ہے ایسی ایسی ہزار سانڈنیاں اس کی ایک لات پر نثار۔ کہنے لگے سانڈنی کے کھونے کا زیادہ رنج ہوا۔

نواب۔ اتنے بڑے لونبڑ ہوئے مگر گو کھے ہی رہے جو بات کریں گے بے ٹھکانے سانڈنی ٹکے کا جانور۔ گئی گئی اب اس کا رونا کیا۔ ہائے اب رنج تو یہ ہے کہ صف شکن اب ہاتھ نہ آنے کے میرا ہی جی جانتا ہے کہ کلیجے پر کیسی چوٹ لگی ہے۔ بھئی اس سے تو مجھ ہی موت آجاتی تو سمجھتا بڑا خوش نصیب ہوا۔ افسوس۔

مصاحب۔ حضور صبر کیجیے ع۔ صبر تلخ است ولیکن بر شیریں دارد۔ آتش کہہ گئے ہیں۔ بڑے نواب صاحب مر گئے تو حضور نے کیا کر لیا، چچا حضور کو چھوڑ کر چل بسے تو حضور نے کیا کر لیا دادا جان ساری ثروت سے منہ موڑ کر داغ جدائی دے گئے تو حضور نے کیا کر لیا۔ اب صبر کیجیے صبر کیجیے۔

نواب۔ میاں بات یہ ہے کہ باپ دادا تو سب ہی کے مرا کرتے ہیں مگر صف شکن سے وفادار جانور کا ایک دم بھی جدا ہونا کھلتا ہے نہ کہ کابک سے اڑ جانا۔ خیر خدا ان کو بخشے اس وقت دل ہے کہ بے اختیار امڈا چلا آتا ہے۔

خوجی۔ یہ کیا بک دیا کہ۔ صبر تلخ ست ولیکن بر شیریں دارد۔ آتش کہہ گئے ہیں۔.. واہ ری معلومات۔ اے حضرت یہ سعدی کا شعر، شیخ جی کا کلام ہے۔

نواب۔ کیا خرافات بک رہا ہے یہ شعر شاعر کی تحقیقات کا بھلا کون موقع ہے۔ وہ سعدی نہیں رودکی کہہ گئے ہی۔ پھر اس سے واسطہ معلوم ہے کہ آپ بڑے شاعر کی دم ہیں، عجب نامعقول آدمی ہے بھئی۔

مصاحب۔ اور خداوند یہ ان میں سخت عیب ہے کہ کسی نے بات کی اور انھوں نے چٹ کاٹ دی۔ یوں نہیں وہ یوں ہے وہاں نہیں یوں ہے۔ آم نہیں املی ہے پوچھیے ہم تو اپنے آقا کی تسلی کے لیے تشفی آمیز باتیں کر رہے ہیں کہ صبر کیجیے۔ یہ ٹٹوے پر چڑھے

بیٹھتے ہیں کہ آتش نہیں سعدی کا کلام ہے جس میں لوگ سمجھیں کہ آپ بھی بڑے شاعر غرا ہیں اور املا تک درست نہیں بھلا صف شکن تو اس کاغذ پر لکھ دیجیے

خوجی۔ چلیے صاحب وہ ہم کو کیسے گھامڑ گاؤدی سہی۔ آپ تو اپنے وقت کے افلاطون ہیں نہ بس چھٹی ہوئی۔

نواب۔ چھٹی کے بھروسے نہ رہیے گا۔ چھٹی نہیں ہوئی ایک بھلے مانس کو آپ نے دس آدمیوں کے سامنے ذلیل کیا آپ کو ہم ذلیل کریں گے۔ عفو۔ نہ قلم کاغذ خوجی کو دو۔ لکھیے قبلہ۔ صف شکن کا لفظ لکھیے۔

مصاحب۔ نہیں حضور یہ فقرہ لکھوائیے کہ اس وقت ہوش و حواس درست نہیں خوجی نے یوں لکھا (اس وقت حوش وہواس درست نہیں)

مصاحب۔ (ہنس کر) واہ واہ۔ کیا لیاقت ہے حوش کو حائے حطی اور ہواس کو آپ ہائے ہوز سے لکھتے ہیں۔ یہ دیکھ لیجیے۔

نواب۔ اے لعنت خدا۔ اور بڑھ بڑھ کر باتیں بناؤ گے۔ پھر کسی کو اُلّو کے بچے۔ اے میاں ہوش و حواس نہیں لکھ سکتے۔ اے پھٹکار۔ شرمائے تو نہ ہوگے۔

میر صاحب۔ وہ شرما چکے۔ شرم چہ کتی ست کہ پیش مرداں بیاید۔ شرم تو انھوں نے بھون کھائی ہے۔ تب تو شرمائے نہیں جب بڑی بڑی محفلوں سے نکالے گئے۔

خوجی۔ حضور کے مزاج میں انصاف تو ضرور ہے لیکن بربِّ کعبہ اس وقت حضور نے میری گردن کند چھری سے ریتی۔ ہائے ہائے اتنا تو سمجھیے کہ اگر ہوش حواس ٹھکانے ہوتے تو پیش پا افتادہ الفاظ کے املا میں بھلا کیوں غلطی کرتا۔ شاعر ہیں۔ نثار ہیں۔ مولوی ہیں منشی ہیں۔ مگر جب ہوش بھی ہوں ہائے صف شکن کا پتہ نہ ملے اور ہم ماما پختیاں اڑائیں۔

نواب۔ واہ خوجی واہ۔ اس وقت طبیعت تمھاری نمک حلالی دیکھ کر خوش ہوگئی۔ شاباش۔ کوئی ہے۔

مصاحبین۔ کوئی ہے۔ حاضر ہو جلد۔ چلا۔

پیر و مرشد پیر و مرشد! (دست بستہ) کیا حکم ہے۔

نواب۔ داروغہ سے کہو کہ ہمارے رفیق خواجہ صاحب کو وہ عباسی رومال اُڑھا دیں جو

پرسوں خریدا تھا۔ لو خوجی یہ ہم نے انعام دیا۔

واہ بھئی واہ۔ گاہے بہ سلامے برنجند وگاہے بہ دشنامے خلعت دہند۔ کہاں تو خوجی پر وہ عتاب تھا کہاں اب انعام پایا۔

داروغہ نے طشت میں رومال لا کر خوجی کو اڑھا دیا خوجی نے استادہ ہو کر سات دفعہ سلام کیا اور کہا کہ واہ حضور کیا ریاست ہے۔ اب خدا گواہ ہے کہ اس وقت تہ دل سے دعا نکلتی ہے کہ میاں آزاد مع صف شکن علی شاہ کے کھٹ سے آجائیں اور حضور واللہ دل گواہی دیتا ہے کہ آیا ہی چاہتے ہیں بس صبح و شام آئے داخل۔

نواب۔ تمھارے منہ میں گھی شکر۔

مسیتا بیگ۔ حضور مٹھائی کا اقرار کریں۔

خوجی۔ اور سنیے یہ بندہ شکم گرسنہ چشم خوب بولا۔ لے مٹھائی کیسی وہ جلسے اڑیں وہ جشن ہوں کہ واہ جی واہ۔ ہیئوں طبلے پر تھاپ پڑے اور دور دور سے طائفے آئیں صف شکن کا آنا کوئی ایسی ویسی بات ہے۔ گیدی کہیں کا۔

نواب۔ انشاء اللہ پھر میں اپنے دل کا ارمان نکالوں، وہ دھما چوکڑی مچے کہ واہ جی واہ۔

مسیتا بیگ۔ (میر صاحب کے کان میں چپکے سے) نقل عیش بہ از عیش۔ آنا جانا ملنا ملانا معلوم مگر واللہ آزاد بھی بلا کا جوان ہے وہ جھانسا دیا کہ نواب بھی ساری عمر نہ بھولیں گے۔ سانڈنی تو بھئی اس نے بیچ لی۔ اونے پونے دام سیدھے کیے۔ صف شکن کی دم میں نمدا۔

میر صاحب۔ (آہستہ سے) کیوں جی یہ ہمارے رئیس بھی کتنے بھولے ہیں۔ ٹٹیر سے صف شکن ہوئے اور صف شکن سے اب صف شکن علی شاہ بنے (ہاہاہا) لاحول ولا قوۃ واللہ نرا گاؤدی ہی رہا۔

مسیتا بیگ۔ اجی خدا کرے ایسا ہی بنا رہے مگر یہ یار خوجی کا عباسی رومال آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ یہ مردک بگڑی بات کو ایسا بنا لیتا ہے کہ کچھ پوچھیے نہیں۔

میر صاحب۔ ہاں مگر آزاد ان کے بھی چچا نکلے ان کے کان انھوں نے ہی کاٹے۔ اور بھئی آدمی بھی پرکالہ آتش ہے۔ پڑھا لکھا عالم فاضل شاعر۔ نشانہ بھر کشتی پٹے میں طاق۔

نواب۔ اب زنان خانے میں جاتے ہیں ہم۔ رخصت۔

ادھر عائل روز نے بحرِ ظلمات کا راستہ لیا اور مہِ انور نے جلباب خفا سے رُخ انور نکالا ادھر بی بھٹیاری نے میاں آزاد پر فقرہ چست کیا۔

بھٹیاری۔ ہمیں تو آج بہن کے یہاں نیوتہ ہے۔ کوئی گھڑی دو گھڑی میں آ جاؤں گی لو اب ہمیں جانے دو۔ تمھاری سالی نے بڑے پیار سے بلایا ہے۔

آزاد۔ ذرا سالی کی صورت ہمیں بھی تو دکھا دو۔ ایسا بھی کیا پردہ ہے کہو تو ہم بھی ساتھ ساتھ نہ چلے چلیں۔ تھک جاؤ گی تو گود میں اٹھا لوں گا۔

بھٹیاری۔ بس رہنے دیجیے۔ یہ دل لگی تہ کر رکھیے گود کسی اور کو بٹھائیے۔

یہ کہہ کر بی بھٹیاری تنک کر کوٹھری میں گئیں اور سولہ سنگار کر کے نکلیں تو میاں آزاد پھڑک گئے اس وقت ان پر ظلم تھا۔ جو بن پھٹا پڑتا تھا پٹیاں جمی ہوئیں۔ گوری گوری ناک میں کالی کالی لونگ پیارے پیارے مکھڑے پر زلف عنبر بو۔ ہاتھوں میں کڑے پاؤں میں چھڑے۔ چھم چھم کرتی ہوئی چلیں۔ میاں چانڈو باز تو راہ میں منتظر کھڑے ہی تھے جھپ سے ہاتھ میں ہاتھ دے کر لے چلے۔

چانڈو باز۔ ذرا ان کے سامنے چمک چمک کر باتیں کرنا یہ نہیں جھینپنے لگو۔

بھٹیاری۔ مجھے اور آپ سکھائیں۔ چمکنا بھی کچھ سکھانے سے آتا ہے میری تو بوٹی بوٹی یوں ہی پھڑکا کرتی ہے نہ کہ ایسی جگہ آپ چلیں تو جو میری باتوں اور میری آنکھوں پر عاشق نہ ہو جائے تو اللہ رکھے نہیں۔ سات تو انھیں کرنے نہ دوں کچھ ایسا کر دوں وہ بھی نکاح پر رضا مند ہوں تو ان سے اور آزاد سے ذری جوتی چلے۔

اتنے میں وکیل کے مکان پر پہنچے۔ اہو ہو ہو۔ مکان کیا بہشت بریں ہے۔ باغِ نعیم ہے۔ وہ فرح بخش بنگلہ کہ روح خوش ہو جائے۔ پاگل جائے تو آدمی بن جائے۔ باغیچہء دل کشا بیس تخت بچھے ہیں اور ان پر ٹاٹ اور اس پر دری اور اس پر سفید چاندنی جیسے بگلے کا پر اور اس پر یارانِ بذلہ سنج بیٹھے رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ اغل بغل کرسیاں اس پر بھی احباب چمن طبع رنگیں مزاج۔

خدمت گار۔ (وکیل سے) گریب (غریب) پرور ایک عورت آئی ہے کہتی ہے کچھ کہنا ہے۔

حباب۔ کون کون۔ کیا۔ کون آیا ہے بھئی۔ ارے میاں عورت کیسی جوان یا پیر زال۔

خدمت گار - اب بجور یہ تو دیکھنے سے معلوم ہو بل ابھی ہے جوان -
وکیل - کہو صبح کو آئے - اس وقت نہیں - آخر ہے کون -
احباب - واہ واواہ - صبح کی ایک ہی کہی اجی بلاؤ بھی - بھئی ہمارے سر کی قسم بلاؤ
ذرا واسطے خدا کے - کہو ٹوپی تمھارے قدموں پر رکھ دیں -

بی بھٹیاری چھڑوں کو چھم چھم کرتی، ہوئی عجب مستانہ چال سے اٹھلاتی. بوٹی بوٹی
پھڑکاتی ناز و انداز سے قدم دھرتی ہوئی چھان چھان آئیں جس نے دیکھا پھڑک گیا -
کوئی چال پر عاشق، ہوا کوئی نازِ دل ربایانہ پر مرنے لگا - کسی کو پیاری پیاری صورت
دیکھ کر بلبل تصویر کی طرح سکتا ہو گیا - لطف یہ کہ تخلیہ کی صحبت -

یارانِ سر پل جمع - سب رنگیلے - عاشق تن - سودائی مزاج ٹھٹھوں بگڑے دل

مہذب شہدے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں.
نواب (وکیل سے) یا حضرت آداب عرض ہے - اجی قبلہ تسلیم با ایں ہمہ تہذیب یہ شہد
پرستی - مگر واللہ آپ کے مذاق پر صاد ہے خدا کی قسم حسینانِ روزگار ڈھونڈھ نکالی -
منشی - مرشد بھئی صورت سے تو بڑے مہذب معلوم ہوتے تھے لیکن ایک ہی مرشد نکلے -
شمیم - میاں عالم جوانی ہاست - لیکن چیز خوب ہے - خوش رو - خوش خو - خوش
سلیقہ - خوش تمیز -
وکیل - بھئی اب ہم کچھ نہ کہیں گے اور کہیں کیا - چھا گئی - قسم لو جوان کی صورت بھی
دیکھی ہو - بی صاحب آپ کس کے پاس آئی ہیں - کہاں سے آنا ہوا -
بھٹیاری - الہٰی خیر ایسی اجیرن ہو گئی -
جوان - اے نہیں لو واہ - تم اور اجیرن ؎

گر بر سرو چشمِ من نشینی نازت بہ کشم کہ نازنینی

بیٹھیے ادھر تخت پر آئیے - مزاج شریف - میں اور میرا خدا رعب حسن سے بات
کرنا دوبھر ہے -
بھٹیاری - ہاں بتائیے ہم تو سیدھے سادھے ہیں میر صاحب -
جوان - ہائے تیرے اس بھولے پن کے صدقے - آپ بھولی ہیں بجا ہے -
وکیل - واللہ بڑی معزز معلوم ہوتی ہیں - عورت ہے یا پرستان کی پری ہے -

احباب (قہقہہ لگاکر) رتجھے۔ رتجھے۔ رتجھے رتجھے حضرت رتجھے۔ لو بی اب پو بارہ ہیں۔

بھٹیاری۔ حضور، ہم یہ پو بارہ اور تین کانے تو جانتے نہیں۔ ہمارا مطلب نکل جائے تو آپ سب صاحبوں کا منہ میٹھا کر دیں گے۔

احباب۔ آپ کی باتیں ہی کیا کم شیریں ہیں اور حسن ہی کیا کم نمکین ہے۔

بھٹیاری۔ کیا خوب شیریں نمکین دونوں۔ تو یہ کہیے کھٹے مٹھی ہوں۔ واہ۔ اچھی کڑوی تعریف ہے۔

ٹھٹھول۔ اللہ ری شوخی۔ اف ری پھبن۔ بلا کا نکھار ہے اور تقریر میں جادو ہی جادو ہے۔

اتنے میں میاں چانڈو باز برآمد ہوئے۔

وکیل۔ (گھبرا کر) کون باہر ٹھہریے اس وقت۔ لاحول ولا قوۃ۔

بھٹیاری۔ میرے بھائی ہیں سگے۔ آپ ڈر ڈرائے دیتے ہیں۔

جوان۔ آئیے آئیے آپ کی ہمشیرہ جان تو بلائے بے درماں ہیں۔

چانڈو باز۔ حضور عرض کردوں یہ بی اللہ رکھی بھٹیاری ہیں۔ آج دور دور تک ان کا نام روشن ہے۔

جوان۔ اور آپ کا اور آپ کے باپ کا نام بھی انھوں نے خوب روشن کیا۔

چانڈو باز۔ بندہ نواز سرا میں ایک خوش رو جوان کرارے پہلوان۔ زندہ دل صبح نفس۔ روشن ضمیر بروزن وار ٹکے ہیں۔ وہ ان کے اوپر جان دیتے ہیں اور یہ ان پر مرتی ہیں۔ کئی آدمیوں کے سامنے وہ قبول چکے ہیں کہ ان کے ساتھ نکاح کریں گے مگر آدمی ہیں تلون مزاج ایسا نہ ہو کہ انکار کر جائیں۔

بھٹیاری۔ حضور مجھ غریبنی سے کوئی چھپن ٹکے تو آپ کو ملنے نہیں ہیں۔ رہا اتنا ثواب کیجیے کہ کوئی تدبیر بتا دیجیے جس میں وہ شکنجے میں جکڑ جائیں اور سرکار کے ذریعہ سے نکاح کرنا ہی پڑے۔ اب اکیلے رہتے رہتے جی گھبراتا ہے۔

ٹھٹھول۔ اگر نکاح ہی کرنے کا شوق چرایا ہے تو ہم کیا برے ہیں۔ میں صدقے ہمیں سے نکاح پڑھالو۔

جوان۔ اچھا تم نہیں ہم سہی۔

احباب - ایک تم پر کیا فرض ہے جی یہاں سب جھنڈے تلے کے شہدے چھٹے ہوئے لچے جمع ہیں تم جس کو پسند کرو اس کے ساتھ نکاح ہو جائے یوں ہی۔ ہاں جوانو - ذرا نکھر کر اور اکڑ کر بیٹھنا تو ہاں لے اب چھینے خدا کرے ہم ہی پر نظر پڑے -

وکیل - اچھا کل آؤ تو ہم وہ ترکیب بتائیں کہ تم بھی یاد کرو۔ یہ بتاؤ کہ تمھارے میاں کہاں ہیں -

بھٹیاری - خدا گنج پہنچے -

وکیل - اوہ تو پھر کیا مشکل ہے۔ کل تم ان سے کہو کہ چڑھے چاند کو بیاہ ہو جائے جو نہ مانے تو نالش داغ دو -

بھٹیاری - (جھک کر سلام کیا) مگر بندی نے کبھی سرکار دربار کی سکل (شکل) تک تو دیکھی نہیں - آپ وکالت کیجیے گا -

جوان - ہاں ہاں جی اس میں منت ہی کیا ہے - مگر جانتی ہو یہ وکیل تو روپے کے آشنا ہیں -

بھٹیاری - واہ روپیہ یہاں اللہ کا نام ہے - ہم ہیں چاہے بیچ لو -

وکیل - اچھا تم کل آؤ - پہلے دیکھو تو وہ کہتے کیا ہیں -

میاں آزاد کی پیاری اللہ رکھی بھٹیاری بیٹھے بیٹھے اکتا گئیں - نام خدا خوش سلیقہ تھیں - کچھ دیہاتن تو تھیں نہیں کہ دفعتہً فتنہ کی طرح اٹھ کھڑی ہوتیں - طبیعت کو تو کلفت ہو گئی تھی - لیکن مصرعِ ناموزوں کی طرح سکتے میں رہ گئیں - جب بے کلی بڑھی تو کنکھیوں سے میاں چانڈو باز کی طرف دیکھا اور چشم نسوں پرداز سے اشارہ کیا کہ بوریا بدھنا اٹھائیے اور سرا میں بستر جمائیے وہ ایک خرانٹ آٹھوں گانٹھ کمیت چھوٹتے ہی تاڑ گئے کہ بی اللہ رکھی زلفِ ہوشانِ فرخار کی طرح پریشان ہیں تو یوں منمنائے -

چانڈو باز - اے حضور ذری گھڑی کو تکلیف دیجیے گا دیکھیے تو کے بجے ہیں -

بھٹیاری - میں تو جانوں کوئی بارہ بجے ہوں گے اٹکل سے کہتی ہوں -

چانڈو باز - میں بھی کہوں یہ جمائیوں پر جمائیاں کیوں آرہی ہیں - انگڑائیاں الگ بدن کا کچومر نکال رہی ہیں ہڈیاں جدا چرمر ہو رہی ہیں - اب تو میں بھس ہو گیا - نشے کا وقت ٹل گیا کمبخت حلوائیوں کی دکانیں بھی بڑھ گئی ہوں گی - بالائی سے بھی گئے -

آج بے موت مرے صبح صبح میاں آزاد کی منحوس صورت دیکھی تھی جب ہی ان دھاڑوں کو پہنچے۔ لے پیر و مرشد اگر پروا گی، ہو تو رخصت ہوں۔ اب تو چانڈو کی لو لگی ہے یکر۔

بھٹیاری۔ اگر مگر تو رکھو چھپر پر۔ یہ میاں آزاد کا نام کیسا لیا۔ ہوش کی دوا کر مردوے۔ قدرت خدا کی اب کی کہا تو کہا اب ایسی اینڈی بینڈی سنائی تو مجھ سے برا کوئی نہیں۔ دست بناہ سے۔ پکڑ کر زبان کھینچ لوں گی۔ چلو ہٹو ایسی باتیں ایک آنکھ یہاں نہیں بھاتیں۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو آئینے میں سویرے اپنا ہی منہ دیکھا ہوگا۔ ناحق بن ناحق کسی پر چھڈا رکھنا اچھا نہیں۔

چانڈو باز۔ کیوں مفت ٹیں چھیتھڑوں سے بے زار ہوئی جاتی ہو۔ یہاں خود ستر ہوں کرم ہو گئے ؎

بیوی خطا معاف کرو میں نشے میں ہوں
شیشے میں مے ہے مے میں نشہ میں لشے میں ہوں

لے وکیل صاحب۔ اب ٹھیک ٹھیک وخت (وقت) بتاو تجیے یہ تو ہندی کی چھدی نکالا ہی کریں گی۔ یہاں اپنا قل ہوا جاتا ہے۔ ایک آدھ چھینٹا اڑائیں تو جی میں جی آئے بے پیے نشہ چڑھ گیا۔

یاران سرپل۔ قدرت ارے میاں قدرت۔ دیکھو دکانیں بڑھ نہ گئی ہوں تو ان کو چانڈو کہیں پلوا دیں۔ ذری دو گھڑی بی اللہ رکھی سے صحبت گرمائیں۔

قدرت۔ جانے کو کہیں میں جاؤں ایک نہیں بیس دفعہ۔ مل دکانیں کب کی بڑھ گئی ہیں ۸ بجے سے چانڈو خانے میں جانے کا حکم نہیں۔ کوئی بیدھا ہے جو اس وقت چانڈو نیچے گا۔ کتے بھوک رہے ہیں۔ سناٹا بازار بھر میں پڑا ہوا ہے چڑیاں چنگن تک سوئی پڑی ہیں۔ چوکیدار خربوزوں کے کھیت بچا رہے ہیں باغبان گوندنی کے کھٹا کھٹے کو کھٹکھٹا رہے ہیں۔ اب کوئی دم میں چکیاں چلیں گی۔

بھٹیاری۔ (تالیاں بجا کر) لے اوئی کیا آدھی رات ڈھل گئی باتوں باتوں میں یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ رات کدھر گئی۔ لے اب تو بندی رخصت ہوتی ہے۔

یارانِ سرپل۔ واہ۔ یہ اندھیری رات۔ آدمی نہ آدم ذات زناد ٹھوکر کھائی اس اندھیاری میں کہاں جاؤ گی۔ ساتھ میں ایک مرد دا سو کی عورت سے بدتر۔ کیا پدی کیا پدی کا شوربا۔ آج رات یہیں نہ تیر کیجیے فجر کو اپنے چل دینا۔ ہم تمھارے ہی کھٹلے

کے لیے کہتے ہیں۔ نہیں تو ہم پہنچا دیں۔

چانڈو باز۔ جی ہاں گود میں اٹھا لیجیے نات

جب حسن ہے تو عشق کا ہونا ضرور ہے
آنکھوں کی کچھ خطا ہے نہ دل کا قصور ہے

یہ چہرہ کیا پری کا ٹکڑا ہے۔ واللہ کیا گورا مکھڑا ہے۔

بھٹیاری۔ اب خوش گپیاں تو ہو چکیں۔ آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں۔ نیند نے بوکھلا دیا بس اب رخصت حضور بھولیے گا نہیں۔ اتنی دیر مزے سے باتیں کی ہیں۔ یاد رکھیے گا۔ لونڈی کو۔

یارانِ سرِپل۔ وہ ہنستے آئے یہاں سے ہمیں رلا کے چلے
نہ بیٹھے آپ مگر دردِ دل اٹھا کے چلے

وکیل دکھا کے چاند سا مکھڑا چھپایا زلفوں میں
دو رنگی ہم کو زمانے کی وہ دکھا کے چلے

جوان دکھایا ضعف نے زور اپنا جب مکاں سے چلے
مثالِ نبض وہیں رہ گئے جہاں سے چلے

ٹھٹھول ہوائے عشق سے ہے شہر بھر میں اب شہرہ
قلم کی طرح جدھر ہم چلے زبان سے چلے

وکیل انیسؔ بارِ علائق یہ اور بارِ گناہ
وہ بوجھ اٹھا کہ جو اس مشتِ استخواں سے چلے

داروغہ نہ تھا جو کوچے میں اپنا قیام مدِّ نظر
تو میرے بعد مری خاک بھی اڑا کے چلے

احباب۔ قسم حسین کی۔ اس وقت دل مسوس کر رہ گئے۔ واللہ کیا پیاری صورت پائی ہے۔ شان کبریائی ہے۔ اس دم تو سب کے سب شہید ناز مرغ بسمل ہو رہے ہیں۔ (ہاتھ

جوڑکر، از براے خدا اتنا تو بتاتی جاؤ کہ کل ضرور ملو گی۔ ہاتھ پر ہاتھ مارو۔
بھٹیاری۔ ہے ہے میرے دل کا تو عجب حال ہے یہ کیا جادو کر دیا بھلے مانسو۔ بس رخصت۔
احباب ۔ یہ بھی کوئی ہنسی ہے کہ رخصت کا لے کے نام
سو بار بیٹھے بیٹھے ہمیں تم رلا چکیں

وکیل آنکھوں آنکھوں میں لے گئیں وہ دل
کانوں کانوں میں خبر نہ ہوئی

اتنے میں بی بھٹیاری چمک کر انا البرق کہتی ہوئی چل کھڑی ہوئیں۔ میاں چانڈو باز سایے کی طرح ساتھ ساتھ ہیں۔ اِدھر وہ نظر سے اوجھل ہوئیں اُدھر یارانِ بذلہ سنج ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگے۔ عورت ہے یا چھلاوا جادو کر دیا۔ سحر کر دیا۔ ٹونا کر دیا۔ واللہ معشوق تو بہت دیکھے مگر یہ آن نے وارد۔ ع
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری
بی اللہ رکھی میاں چانڈو باز کو لے کر سرا میں پہنچیں۔ راہ میں وہ تو اپنے حسن و جمال اور کبک دری سی چال اور رنگین خد و خال اور پیاری پیاری بول چال کی تعریف کرتی جاتی ہیں۔ کیوں سب کے سب ہماری ادا پر لوٹ گئے نہ۔ میاں یہ تو فقیر کی دعا ہے کہ جس محفل میں جا کر بیٹھ جاؤں وہیں کٹاؤ ہونے لگے۔ راہ میں سینکڑوں شریف زادے آوازے کستے ہیں۔ ہزاروں عاشق مزاج ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہیں کوئی کہتا ہے خدا نظر کو بچائے کوئی کہتا ہے الٰہی اس مکھڑے کے صدقے، اس چھب کے واری اس سج کے قربان اس ناز کے نثار۔ قسم لو جو آنکھ اٹھا کر دیکھتی بھی ہوں۔ اور جو کہیں کسی سے آنکھ لڑ گئی تو کلیجہ پکڑ کر رہ گیا۔ بی اللہ رکھی تو اپنے حسن پر اترا رہی تھیں۔ اِدھر میاں چانڈو باز اپنی ہی سناتے تھے۔ سچ کہنا کیسے وکیل کے پاس لے گیا۔ صحبت کتنی اچھی ہے۔ میری جان کی قسم نہ کہو گی۔ ہم تو ہوا خواہ ہیں۔ دونوں میں خوب چخ چلی۔ ہوتے ہوتے میاں آزاد سے سرا میں دو چار ہوئے۔
بھٹیاری ۔ اللہ اللہ آپ جاگ رہے ہیں۔ آج کیا ہے۔ جو پلک تک نہ جھپکی جی۔ یہ کس کی یاد نے نیند اچاٹ کر دی۔ ع۔ دل میری طرف نظر کہیں اور۔ آثار تو کچھ برے ہیں۔

آزاد - ہاں جلاؤ - جلاؤ - دو دو بجے تک ہوا کھاؤ اور ہم سے آن کر باتیں بناؤ اور سڑاڈ چپنیے بس دیکھ لیا - یہ چنتر بازیاں رہنے دیجیے میں ایک گھاگ ہوں مجھ سے اڑ کر کہاں جاؤ گی بھلا - تم ڈال ڈال تو میں پات پات ، بندہ پرانا بیار ہے -

بھٹیاری - اے واہ - یہ بدگمانی - تو میں ان پٹ چکی - سنیے اب ان کے مارے کوئی بھائی بہن کو چھوڑ دے - آخر ہم نے کیا کیا وہاں گئے تو شہر بھر کی بھٹیاریاں جمع - خوب ڈھولکیں بجیں یہ چہل پہل رہی دھما چوکڑی مچی - اب کی تم کو بھی لے چلیں گے -

آزاد - ہاں ضرور اور میاں چانڈو باز کیا کیا کیے -

بھٹیاری - کون یہ اونگھا کیے - آنکھیں بند - گردن زمین دوز یہ گرے وہ گرے - چل چل چل - دھم - وہ گر پڑے - اے لعنت خدا اتنا پی کیوں جاتے ہو جو پھر اپنے آپے میں نہیں رہتے - خیر جی یہ دکھڑا تو ہوا ہی کرے گا اب یہ بتاؤ کہ نکاح کا کون دن قرار پایا ہے ہم آج سب سے کہہ آئے کہ میاں آزاد کے گھر پڑیں گے - پھر جھٹ پٹ نکاح پڑھوا لو - بکھیڑا جائے یہ روز روز کی فکر کیسی (گردن میں ہاتھ ڈال کر) اچھے آزاد اب کی چڑھے چاند نکاح ہو جائے صبح شام کیوں لگاتے ہو - خو جانے (خدا جانے) ہاتھی چھوٹے گھوڑا چھوٹے -

آزاد - تم یہ کہتی کیا ہو - کیا سچ مچ تم سب سے کہہ آئیں - غضب ہی کیا - واللہ کہیں ایسا کرنا بھی نہیں - میں دل لگی کرتا تھا - خدا کی قسم فقط دل لگی تھی - میں پردیسی آدمی - شادی بیاہ کے کیا معنے - اور پھر بھٹیاری کے گھر پڑوں - مانا کہ تم حور پری چہم مگر پھر بھٹیارن ہی تو - اپنی وضع کے خلاف ہے - چار دن کے لیے سرا میں آن کر ٹکے یہاں سے بلا ساتھ لے جائیں -

بھٹیاری (چمک کر) چونچ سنبھال مردوے - اور سنیے گا ہم بلا ہیں - جس پر سارے شہر کی نگاہ پڑتی ہے - بے تکا پن بھی تو کتنا - دوسرا کہتا تو خون خرابا کر ڈالتی - مگر کیا کروں قول ہار چکی ہوں برادری بھر میں کلنک کا ٹیکہ لگے گا - انگلیاں اٹھیں گی - بلا کی اچھی کہی - تمھارے منہ سے میری ایڑی گوری ہے چاہے ملا لو - آئے وہاں سے بڑے معادین بن کے -

آزاد۔ تو بھئی صاحب سنیے اس خیالِ خام سے درگزریے تم کو تو میں دیکھتا ہوں کہ گلے کا ہار ہو گئیں۔ کیسی شادی کس کا بیاہ کہاں کا نکاح بمعقول۔

بھٹیاری۔ معقول معقول کیا کرتا ہے نامعقول۔ کل ہی تو میں نالش داغتی ہوں تو سہی جو ناچ نہ نچاؤں۔ کیا نکلے جاتے ہیں اقرار کر کے مکر جانا خالہ جی کا گھر ہے۔ دیکھو یہ سِٹی بِٹی سب بھول جاؤ گے اے واہ انگلیاں مٹکاکر) ذری ٹھیرے ہوئے۔ میاں جو میں والی پر آئی تو بڑا گھر ہی دکھاؤں گی کسی اور بھروسے پر نہ پھولنا مجھ سے برا کوئی نہیں۔

آزاد۔ توبہ۔ خدا کی پناہ۔ میں اب تک سمجھتا تھا کہ میں ہی بڑا مقرر ہوں۔ مگر اس عورت نے میرے بھی کان کاٹے۔ بھلا دی ساری چوکڑی ہاری مانتی ہے نہ جیتی۔ خداوند کہیں تڑ کا جلدی سے ہو تو میں دوسری کوٹھری لوں۔

بھٹیاری (ناک پر انگلی رکھ کر) روورے رو ورت۔ اس سے چھوکری ہی ہوئے ہوتے تو کسی بھلے مانس کا گھر بستا۔ واہ رے مردوے۔ بھلا مجال پڑی ہے کوئی بھٹیاری ٹکائے۔

آزاد۔ تو سارے شہر بھر میں آپ کی حکومت ہے کچھ۔

بھٹیاری۔ ہئی ہے۔ ہئی ہے۔ دیکھ لینا نہ۔ کیا ہنسی ٹھٹھا ہے کل پرسوں تک آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔

آزاد۔ چلیے آپ کی بلا سے۔

چانڈو باز۔ بلا والا کے بھروسے بھی نہ رہیے گا۔ الٹی آنتیں گلے پڑیں گی دو چار دن تاتھیا مچے گی۔

آزاد۔ ذری آپ چپکے بیٹھے رہیے گا۔ تو کون بولنے والا ہے بے۔ ٹکڑ گدے جوتی خورے۔ یہ تو نازنین کامنی ہے۔ تمھاری مفت میں شامت ہی آجائے گی۔

چہ می گوئیاں

میاں آزاد کا ایک دلکش باغ کی روح افزا بہار دیکھ کر جی للچایا کہ ذرا ٹک جائیں۔ سانڈنی پر سے دھم سے کود ے ایک درخت کے قریب اس کو باندھا

اور زین پوش اتار کر ایک صاف ستھرے مقام پر پیڑ کے سایے میں بچھا کر لڑھک رہے تو کیا سنتے ہیں کہ ایک گاؤں میں دو آدمی بیٹھے ہوئے باہم مزے مزے سے یوں گفتگو کر رہے ہیں۔

ہندو۔ ارے میاں کچھ اور بھی سنا۔

مسلمان۔ اب سونے دو بھئی۔ آخر منزل طے کرنی کچھ دل لگی ہے بک بک بک لگائی ہے یہ سنو وہ سنو۔ یہاں آج مارے گرمی کے پنھتر بگڑے ہوئے ہیں۔

ہندو۔ اجی وہ بات سناؤں کہ نیند خواب میں بھی نظر نہ آئے۔ یاد ہوگا کہ اس بوڑھے کھوسٹ نے ایک جوان طناز شوخ سراپا ناز کو بیاہا تھا۔ اور خود جاکر دوسرے شہر میں بسے تھے وہ انتقال ہوئے اور ان کی بیوی نے سرا میں کچھ دکانیں سی بنوا کر رہنا اور مسافروں کو بسانا شروع کیا۔ میاں آزاد نامی ایک بھلے مانس ان پر ایسے لٹو ہوئے کہ روز اپنے ساتھ سانڈنی پر بٹھا کر تماشا دکھانے لے جاتے تھے۔ ایک دن ایسے ریجھے کہ اس کے ساتھ بیاہ کرنے کا اقرار کر لیا۔ اور پھر مکر گئے اب اس نے نالش جڑ دی تو وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ دیکھیے یہ لیٹے ہوئے ہیں۔

مسلمان۔ اونھ کہنے لگے بھلے مانس۔ بھلے مانس ہوتے تو چھوڑ بھی دیتے۔ اجی مزے سے نکاح پڑھواتے۔ اور اس کی جمع جتھا لے کر دھتا بوں دیتے۔

میاں آزاد کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ یہاں بھی ہمارے پہچاننے والے موجود ہیں۔ جب ٹھنڈا وقت ہوا تو میاں آزاد پھر چلے۔ مگر افسردہ اور پژمردہ چلتے چلتے خدا خدا کر کے نواب کے شہر کے قریب پہنچے۔ جب کوئی دو ڈھائی کوس شہر رہ گیا تو ایک کنوئیں پر پانی پیا کہ اتنے میں ایک بھٹیاری آنکلا۔ ساعت بچار س ساعت شگن بچار ہیں۔

بھٹیاری (بہ لوٹھی سنبھال کر) تمھاری نواب صاحب کے یہاں بڑی تلاش تھی جی تم غائب کہاں ہو گئے تھے اونٹ لے کے اب میں جاکے کہوں گا کہ میں نے پرشن دیکھ تو نکلا کہ آجاو (آزاد) ۵ کوس کے اندر ہی اندر ہیں جب تم لب دمینی پہنچ جاؤ گے تو پھر ہماری چڑھتی کلاں ہوگی۔ تم کو بھی آدھوں آدھ بٹادیں گے۔ مگر بھانڈا نہ پھوڑنا۔ چڑھ باجی ہے۔ جو تم راضی ہو جاؤ تو چاندی ہے۔

آزاد ۔ واللہ کیا سوجھی ہے۔ منظور ہے بس۔ اب تم جاؤ ہم بھی دم سے دم میں

پہنچتے ہیں۔

بھڈری نے پشتنک بغل میں داب کر راہ لی اور نواب کے یہاں دھر دھمکے۔

خوجی۔ اجی جاؤ بھی تمھاری ایک بات بھی ٹھیک نہ نکلی۔ اب کہو کچھ حکم لاتے ہو۔

نواب۔ برسوں ہمارا نمک تم نے کھایا ہے۔ برسوں۔ ایک دو دن نہیں برسوں برسوں۔ اب اس وقت کچھ پرشن ورشن بھی دیکھو گے یا باتیں ہی بناؤ گے چکنی چپڑی۔ ہم کو تو مسلمان بھائی تمھاری وجہ سے کافر کہنے لگے اور تم ذرا محنت کرکے کوئی اچھا سا حکم نہیں لگاتے۔

بھڈری۔ وہ حکم لگاؤں کہ اپٹ ہی نہ پڑے۔

خوجی۔ اجی جاؤ بھی دیکھ لیا۔ بس زبانی داخلہ۔ ڈینگیے ہو خاصے۔ کہیں کسی روز من قرولی نہ بھونک دوں۔ سوائے بے پرکی اڑانے کے اور بات سیکھی ہی نہیں۔ مرد آدمی ہو سال بھر میں ایک دفعہ تو سچ بولا کرو۔

مصاحب۔ واہ سچ بولتے تو قصائی کے کتے کی طرح پھول نہ جاتے۔

نواب۔ یہ کیا واہیات گفتگو ہے۔

بھڈری۔ نا ہیں، ہم سے ان سے ہنسی ہوتی ہے یہ ہمیں کہتے ہیں ہم انھیں۔ اب آپ کوئی پھول من میں لیں۔

نواب۔ یہ ڈھکوسلے ہمیں اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ ہمیں صاف صاف بتا دو کہ میاں آزاد کب تک آویں گے۔

بھڈری (کچھ بڑبڑا کر) پانی کے پاس ہیں۔

مصاحب۔ واہ آسوں برکھا گھم گھم برسے۔ واہ استاد پانی کے پاس کی ایک ہی کہی لڑکی نہ لڑکا۔ دونوں طرف اپنی ہی جیت۔

بھڈری۔ یہاں سے کوئی تین کوس کے اندر ہی اندر ہیں جو نہ ہوں تو ناک کٹا ڈالوں۔

خوجی۔ آؤ آؤ ناک ناک بدتے ہیں وہ منزلوں کی راہ ہیں۔ سانڈنی کے کوڑے کیسے ہوں گے۔ گلی چھرے اڑا رہے ہوا ہو گے آپ تین کوس لیے پھرتے ہیں۔

رفقا۔ حضور یہ بھڈری بڑا فیلیا ہے آپ تو پوچھتے ہیں کہ میاں آزاد کب آئیں گے وہ کہتا ہے کہ تین کوس کے اندر ہی اندر ہیں۔ واہ رے چھب چھالیے۔ سوائے جھوٹ

سوائے جھوٹ۔

بھڈری ۔ تو بتاتے بتاتے بتائیں گے۔ یا ایک دم سے بتا دیں سوچلیں بچار یں بھی تو۔ بے ناک ناک کون بدتا ہے کاٹ ہی لوں گا۔ ناکے کے پاس گوندنی والی بغیہ تک میاں آزاد بیٹھے ہوں گے جاؤ دیکھ لو۔ پوتھی جلا دوں ناک کٹا ڈالوں جو جھوٹ نکلے۔

نواب ۔ چابک سوار کو بلاؤ اور حکم دو کہ ابھی سرنگ گھوڑی پر سرپٹ جائے اور دیکھے میاں آزاد ہیں یا نہیں۔ ہوں تو اس بھڈری کا آج گھر بھر دوں۔ بس آج سے اس کا معتقد ہو جاؤں۔

چابک سوار نے بانکا منڈاسا باندھا اور سرنگ گھوڑی پر کاٹھی کس یہ جا وہ جا۔ پچاس ہی قدم گئے ہوں گے کہ گھوڑی بھڑکی اور عین تیزی میں دوسرے ناکے کی راہ لی۔ چابک سوار بہت اکڑے بیٹھے تھے مگر روک نہ سکے۔ دھم سے منہ کے بل سڑک پر گھوڑی چمپت۔

خوجی ۔ حضور گھوڑی نے نادر علی خاں کو دے پٹکا اور کیا جانے کس طرف نکل گئی۔

نواب ۔ چلو خیر سمجھا جائے گا۔ تم شرغہ ٹانگن کسواؤ اور دوڑ جاؤ۔

خوجی ۔ پیر و مرشد میں تو بوڑھا ہو گیا اور رہی سہی سکت افیم نے لے لی۔ ٹانگن ہے بلا کا شریر کہیں پھینک پھانک دے ہاتھ پاؤں ٹوٹیں تو دین و دنیا دونوں سے جاؤں۔ آزاد خود بھی گئے اور ہم سب کو بھی بلا میں مبتلا کر گئے۔ حضور مجھے معاف کیجیے شرغہ بڑا ہوتا ہے اور یہ ٹانگن برسوں سے بندھا ہے اور کاٹ کھاتا ہے پشتک اچھالتا ہے دولتیاں جھاڑتا ہے خدائی بھر کے عیب تو اس میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔ میرا تو بھر کس ہی نکل جائے گا۔

میاں آزاد ذرا اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے تھوڑی دور پر ایک پختہ مکان بنا ہے۔ مختصر موزوں۔ خوش نما اور دل کشا۔ ارد گرد گلبن بھی ہیں۔ دوب بھی جو طرفہ جمی ہوئی ہے۔ سڑک پر سرخی بھی کٹی ہے۔ شوق چرایا کہ دیکھیں تو یہ ہے کیا۔ جب ہم تھے تب تو یہاں اس کا نام و نشان بھی نہ تھا حال میں بنا ہے خراماں خراماں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھاتے لکڑی ہلاتے پہنچے تو دیکھا کہ کسی کا مقبرہ سا ہے۔

اخاہ یہ کسی بڑے شخص کا مقبرہ ہے کتبہ پڑھا تو یہ لکھا تھا:-

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم ۔ دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم

مزار پر انوار مقبول بارگاہ لم یزلی ولی حق آگاہ، عارف باللہ حضرت صف شکن علی شاہ۔ برد اللہ مضجعہ و انار اللہ برہانہ:-

پختہ مکاں کی طرح سے ہے فکر گور بھی ۔ انسان جان دیتا ہے آرام کے لیے

رہتا ہے آدمی کا نشاں اس جہان میں ۔ بنتی ہے قبر بعدِ فنا نام کے لیے

اے خاکِ تیرہ، خاطرِ جہاں نگاہ دار ۔ کیں نور چشم ماست کہ در بر گرفتۂ

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

میاں آزاد نے جو یہ پڑھا کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ یہ کیسے یار لوگوں نے قبر بھی بنوا دی۔ واللہ کیا کیا فقرے باز ہیں۔

ادھر چابک سوار نے شب دیز آہو شکار سے پٹخنی کھائی ادھر ایک لونڈے نے تالی بجائی۔ مگر واہ رے شہ سوار بھوم نکل گیا لیکن وہی خم و دم۔ گرد پیچھے جھاڑی پہلے نواب کے اصطبل میں گئے۔ اور ایک خوش خرام اور تیز گام کیت پر کاٹھی کس سوار ہوتے ہی کڑ کڑا دیا۔ ہوا سے باتیں کرتے جا رہے ہیں چلتے چلتے گوندنی والی بغیہ میں دھم سے جا کودے۔ دیکھا تو سانڈنی پر کا گریزی جھول جھلک رہی ہے اور اونٹنی گردن جھکائے چو طرفہ مٹک رہی ہے۔ پکارا میاں آزاد۔ میاں آزاد۔ ہوت۔ آخاہ۔ آپ ہیں۔ آئیے ذرا بغل گیر تو ہو جیے۔ مصافحہ معانقہ دونوں میں سے ایک تو ہو بسم اللہ کہیے مزاج معلی۔ اجی ہمارے مزاج کی نہ پوچھو۔ گھڑی میں ماشا گھڑی میں تولہ۔ ابھی شیطان انگلی دکھائے تو ولی ہو رہیں رہاں وحشت ٹیٹوائے تو دھماکے سے جبل پور پہنچیں۔ آپ کہیے نواب کے یہاں تو سب خیریت ہے۔ جی ہاں خیر صلاح کے ڈھیر ہیں مگر آپ کی راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں۔ ارے میاں کچھ اور بھی سنا اس بٹیر کی قبر بنائی گئی ہے۔ سبھی صاحب یہ سامنے وہی تو ہے واللہ لانا تو ہاتھ۔ یار تمہاری ہی کسر تھی کہو ہم نے سنا خوب گل چھرے اڑائے چلو پھر اب نواب نے یاد کیا ہے۔ ایں انھیں ہمارے آنے کی کہاں سے خبر ہو گئی بھئی۔ اجی اب یہ ساری داستان راہ میں سنا دیں گے۔ اچھا تو پہلے آپ ہمارا خط نواب کے پاس لے جائیں۔ لائیے ایک نہیں دس۔

میاں آزاد نے تڑسے خط کھینچ ڈالا۔

آج قلم کی باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ دماغ فلک الافلاک پر ہے سینہ تختۂ گل بن گیا۔ اور کیوں نہ ہو۔ میاں صف شکن علی شاہ حق آگاہ قدس سرہ الشریف کی سواری آتی ہے۔

حضور کے نمک کی قسم۔ ادھر تحت الثریٰ ادھر نہ کرسیِ آسمان تک ہو آیا تب کہیں جاکر کھوج پایا۔ شاہ جی صاحب ہر روز ڈاڑھیں مار مار کر روتے ہیں۔ اور الحق مُر الحق مُر الحق مُر، کیا کرتے ہیں۔

سنیے حضور برخور بندۂ جاں نثار نے وہ کام کیا ہے کہ خلعت دیجیے انعام و اکرام دیجیے۔ زر و جواہر دیجیے۔ یاقوت و جواہرات میرے اوپر سے صدقے دیجیے۔ اللہ اللہ یہ کار نمایاں کیا کہ صف شکن علی شاہ غازی کو سمجھا بجھا منا منو کر لے آیا۔ بڑی بڑی دلیلیں چھانٹتے تھے۔ پہلے فرمایا کہ۔ ع۔ دریں بزم رہ نیست بے گانہ را۔ میں نے چھوٹتے ہی جواب دیا کہ شاہ جی۔ ع۔ کہ پروانگی داد پروانہ را۔ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اور اشارے سے بلالیا۔ رو برو گیا تو خدمت گار سے کہا۔ ع۔ رمضانی مگساں می آیند۔ میں نے بڑھ کر عرض کیا کہ پیر و مرشد۔ ع۔ ناکساں پیش کساں می آیند بیٹھ ٹھونکی اور فرمایا کہ شاباش برخوردار نواب صاحب کی صحبت میں آپ بہت برق ہو گئے ہیں۔ الغرض کامل دو ہفتے تک مجھ سے بحث رہی۔ آخر کار فرمایا کہ تمھاری سر مغزن سے یاد الٰہی میں فتور پڑتا ہے۔ میں نے قدم لیے اور دست بستہ عرض کیا کہ آپ چلیے ورنہ میں زہر کھا کر مر جاؤں گا۔ مجھے سمجھایا اور کہا دیکھو یہ زندگی بھیس عطیۂ یزداں ہے اس کو مفت میں رائیگاں کرنا خلاف عقل و سعادت ہے۔ مگر خیر تمھاری خاطر سے چلتا ہوں۔ لیکن وہ خوجی جو نواب صاحب کے مزاج میں دخیل ہیں ان سے میری طبیعت نفور ہے۔ میں ایک شرط سے چلتا ہوں کہ جس وقت وہاں پہنچوں تو نواب صاحب کے سامنے خوجی پر بیس مشکیں پڑیں۔ عرض کیا بیس نہیں بائیس فرمایا کہ قول دو۔ عرض کیا کہ قول جان کے ساتھ ہے۔ تب کہیں آئے۔ اب آپ لوگوں کو ٹھاٹھ سے بھیجیے تو دھوم دھام سے میاں آزاد اُن کو ساتھ لائیں۔ اور اہل شہر اُن کی زیارت سے استفادہ اٹھائیں۔ میں بالکل مُجرم ہو گیا ہوں لیکن حضور کا سایۂ دامن مجھے کافی ہے۔ لے اب جلوس جلد بھیجیے تو شاہ صاحب تشریف لائیں۔

یہ خط لے کر چابک سوار روانہ ہوا۔

نواب کا کامل فن شہ سوار شب دیز باد رفتار کو ران کے تلے دبائے باگ ٹھائے آسن جمائے مہمیز کا اشارہ کرتا اکڑتا برتا کھٹا کھٹ جا رہا تھا اور پھٹا پھٹ پوڑے جما رہا تھا۔ اصیل گھوڑا اور اس پر کوڑا تاب کہاں بلا کی طرح جھپٹا بگولا بن گیا یہی معلوم ہوتا تھا کہ دریا لہریں مار رہا ہے۔ ہوا بھی مقابلے کو آئے تو پچھاڑیں کھا کے اس کی گرد تک کو نہ پائے۔ کیوں نہیں۔ نواب کے اصطبل کے گھوڑے خاصے کے گھوڑے پری زاد گھوڑے دیو نژاد گھوڑے ہیں کہ باتیں۔

الغرض میاں آزاد کا خط لے کر چابک سوار نواب کی خدمت میں حاضر ہوا۔

چابک سوار۔ مجرا عرض ہے۔

نواب۔ سلام۔ کہو منڈا کہ بیٹی۔ جلدی سے بولو۔ یہاں پیٹ میں چوہے چھوٹے ہوئے ہیں۔

چابک سوار۔ حضور غلام نے راہ میں دم لیا ہو تو جرمانہ دوں۔ بس گھوڑے کی پیٹھ پر آیا اور کڑ کڑا دیا۔

خوجی۔ کتنے بے تکے ہو میاں۔ سوال دیگر جواب دیگر کہیں کھیت کی سنیں کھلیان کی۔ بھلا اپنی کار گزاری جتانے کا یہ کون موقع ہے جی آزاد کا پتہ بتا مارے شنخیت کے دبلے ہی ہوے جاتے ہیں۔

چابک سوار۔ حضور گوندنی والی بغیہ کے پاس زین پوش بچھائے بیٹھے ہیں اور حضور کو یہ عرضی دی ہے۔

نواب۔ لاؤ لاؤ لاؤ بھئی لاؤ کہیں لاؤ تو۔ کوئی ہے منشی صاحب کو آواز دینا۔

منشی۔ تسلیمات عرض کرتا ہوں پیر و مرشد۔

منشی صاحب نے خط پڑھنا شروع کیا تو حاضرینِ جلسہ کا رنگ فق ہو گیا۔ ع

کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔

بہ وقت صبح ہو یوں نشۂ شراب طلوع
کہ جیسے شرق سے کرتا ہے آفتاب طلوع

یکایک ابر سے شیشے کے ہو گیا ساقی   وفورِ نور سے خورشید جامِ ناب طلوع

خوجی۔ خداوند جاں بخشی ہو تو غلام کچھ عرض کرے۔

نواب - جاں بخشی کیسی۔ آج تو وہ خوشی ہے کہ بادشاہ قیدیوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اور یہاں تو اس وقت شادیِ مرگ کی نوبت ہوگئی ہے۔ قدسیوں نے لاہوت پر وہ نہ دیکھا ہوگا جو ہم نے ان آنکھوں سے اس دار الغرور میں دیکھ ڈالا۔ ایسی خوشی کے وقت جان بخشی کیسی بے تکی بات ہے کہو نا۔

خوجی - پیر و مرشد۔ اور تو میاں آزاد نے جو کچھ لکھا اس میں رتی بھر فرق نہیں۔ مگر غلام کا جو حال لکھا ہے وہ سب ڈھکوسلا ہے جو ذری بھی اصلیت ہو تو ہاتھ کٹا ڈالوں۔

بھٹ رری - بس بیٹھے رہیے۔ تم پہلے بھی تو ناک کٹاتے تھے۔ اب کاٹ لوں جڑ سے ناک۔ ہجو۔ غلام کا بدشگن کیسا ٹھیک نکلا جو ہے سو مانو نشانے پر تیر کھٹ دینی بیٹھ گیا۔

نواب - ہاتھی گھوڑا جاگیر انعام اکرام خلعت جو کہو دیں گے مگر ذرا میاں آزاد کو آنے تو دو۔ اور کیوں بسی رتال نے تو بیان کیا کہ صف شکن علی شاہ کے دشمن خدا نہ خواستہ داخلِ خلد ہوئے۔ یہ میاں آزاد کو کہاں سے مل گئے۔ حیرت ہے۔ کیوں میر صاحب واللہ عالم یہ کیا اسرار ہے۔

میر صاحب - خداوند نعمت اس کی کنہ حقیقت تک پہنچنا امر محال ہے جناب باری کے قصر رموز کا کنگرۂ رفیع اس درجہ بلند ہے کہ اس کے لب بام تک کمند اوہام کا پہنچنا دشوار ہے۔ از بس دشوار ہے۔ ما عرفناک حق معرفتک۔ ما عبدناک حق عبادتک ؎

ہے تجھ کو جنوں کی قسم لے جذب محبت
اس نور تجلی کی جھلک مجھ کو دکھا دے

رفیق - قربان جاؤں حضور ہمیں تو کچھ دال میں کالا کالا معلوم ہوتا ہے۔ شق القمر تک تو جناب رسالت مآب نے کر دکھایا اور استدراج پر اعتبار ہو تو سمندر پھاند پھاند گئے ہیں لیکن یہ ہمارے فرشتوں نے بھی نہیں سنا کہ مردہ بٹیر از سر نو زندہ ہو جائے۔ کیا لوٹ پوٹ کے پر پرزے جھاڑ کر اٹھ بیٹھتے ہیں۔ توبہ کیجیے جو سچ ہو تو داڑھی منڈوا ڈالوں۔

اتنے میں اندر چھوٹی بیگم کو خبر ہوئی مبارک قدم نے کچا چٹھا کہہ سنایا۔

بیگم - ہمارے میاں کا ایسا سست اعتقاد کوئی خدائی بھر میں تو ہووے گا نہیں۔ لو پدے کے برابر تو موا بٹیر اور خوشامد۔ خوروں نے ابھار ابھار کر مقبرہ بنوا دیا۔

میری باتیں تو انہیں بری لگتی ہیں میں خواہی نہ خواہی روز روز کہاں تک بکوں مجھے تو ڈر ہے کہ کوئی مجھ پر کچھ طوفان نہ باندھ دے۔ اسی سے میں چھیڑ خانی نہیں کرتی ان کے پاس جو آتا ہے جھوٹوں کا سردار۔

مبارک قدم۔ بیوی برا مانو یا بھلا۔ یتھیں وہ رہیں ہی نہیں معلوم کہ میاں قابو میں آجائیں۔ ہم نے تو نیک قدم کے ابا کو شیشے میں اتار لیا تھا۔ رہا تمھیں تو بھوئی مونگ سمجھتے ہیں جھوٹے خوشامدیوں کی دھاڑ کی دھاڑ جمع رہتی ہے۔ نوج ایسے کسی کے میاں ہوں۔ آپ تو جان بوجھ کر انجان بنی جاتی ہیں۔

بیگم ۔ تم نے تو مبارک قدم دھوپ میں یہ چونڈا سفید کیا ہے۔ میری جوتی کی نوک کو کیا غرض پڑی ہوئی ہے۔ جب تو میں ان دھاڑوں کو پہنچی جو کلّے بازی کرتی تو جانے کیا ہوتا۔ ایک دن ذری منہ پھلا کر بیٹھی تھی تو جڑاؤ کیل اگلے نے نہ بنوادی نہ بنوادی۔ تم اچھی پٹی پڑھاتی ہو۔

اِدھر تو بیوی اور لونڈی میں یہ جج چل رہی تھی اُدھر سنیے کہ نواب قمر رکاب نے کل رفقا اور مصاحبین اور حوالی موالی کو بلا کر حکم دیا کہ اصطبل کے سب ترکی عربی تازی گھوڑے اور فیل خانے کے دیو نژاد مستیوں کی دھت ہاتھی اور فٹن اور بگھیاں اور خاص بردار اور جھنڈن بردار سپاہی جتنے ہماری سرکار میں ہیں سب سے کہو لیس ہو رہیں اور شہر بھر کے امیروں اور رئیسوں سے جلوس طلب کر لو اور سجا کر جاؤ۔ صف شکن علی شاہ کو ساتھ ہی لے آؤ مگر انتظام ایسا ہو کہ لوگ دور دور تک تعریف کریں سب چیزیں اپنے اپنے قرینے سے۔ انگریزی باجا ضرور ہو۔

خوجی ۔ اے پیر و مرشد انگریزی باجا تو آج کل دھوبیوں بھنگیوں تک کی برات کے ساتھ ہوتا ہے اس میں کیا منت ہے رہا جو دھوم دھام چاہتے ہوں تو غلام کو افسر مقرر کیجیے اور میر صاحب کو میری نیابت میں دیجیے پھر مزہ دیکھیے انتظام کا۔

میر صاحب ۔ جی بجا ہے۔ یہاں بادشاہوں کی مصاحبتیں کیا کیے ہیں اور آپ کے نائب ہوں۔

نواب ۔ اچھا تم دونوں مل جل کر انتظام کر لو۔

پھر کیا تھا اتنا اشارہ پانا تھا کہ یگہ ہاتھوں سب بندوبست ہو گیا کیل کانٹے سے

درست۔ چھوٹی بیگم کوٹھے پر کھڑے کھڑے جلوس دیکھ رہی ہیں اور دل ہی دل میں ہنس رہی ہیں کہ نواب کے دماغ پر گرمی چڑھ گئی ہے۔ اس وقت جو کوئی خوجی کو دیکھتا۔ دماغ ہی نہیں ملتے تھے اس کو ڈانٹ اس کو ڈپٹ کسی پر دھول جمائی کسی کو چانٹا رسید کیا۔ اس کو پکڑ لاؤ۔ اس کو گرفتار کرو۔ کبھی مشعلچی کو گالیاں دیں کبھی پنشاخے والے کو بے نقط سنائیں۔

العرض جد و جہد اور اہتمام بلیغ کے بعد جلوس اس ترتیب سے چلا۔ سب کے آگے نشان کا ہاتھی۔ ہری ہری جھول پڑی ہوئی مستک پر سندور سے گل بوٹے بنے بوٹے ایک دانتا مکنا ہاتھی جھوم جھام کر جا رہا ہے۔ اس کے بعد ہندوستانی باجا۔ گکڑ جھنیر۔ ترڑ ترڑ ترڑ ترڑ۔ دھم دھم دھم دھم۔ اس کے بعد آرایش۔ پھولوں کے تخت چنبیلی کھلا ہی چاہتی ہے۔ کلیاں چٹکنے کو ہی ہیں۔ کیتکی اب مہکی اور اب مہکی۔ جوہی پر نیا عالم ہے۔ موگرے کا تختہ۔ جوبن پر ہے گل لالہ کھلا ہوا ہے رہس منڈل وہ بنایا کہ جس نے دیکھا جی خوش ہو گیا۔ چانڈو بازوں کے تخت میں قلم توڑ دیے (ماشاءاللہ کیا تعریف کی ہے) دو چار تو پینک میں غین ہیں۔ دنیا کی خبر ہی نہیں دس پانچ اوندھے پڑے ہوئے منہ سے دھوئیں کے بقے اڑا رہے ہیں۔ کوئی بمبئی کا پونڈا لیے ہوئے چانڈو بازانہ ادا سے چھیل رہا ہے ایک گنڈیری چوس رہا ہے۔ گومٹ تھک افیم نکالی۔ تیل کی کپی۔ سب ہی کچھ ہے شکار کا وہ سماں باندھا کہ واہ جی واہ۔ ایک شکاری بندوق چھتیائے گھٹنا ٹیکے آنکھ دبائے نشانہ لگا رہا ہے۔ دائیں کی آواز بس آیا ہی چاہتی ہے ہرن چوکڑیاں بھرتے جاتے ہیں۔ خرگوش وہ کان دبائے لپکے آتے ہیں۔ اس کے بعد انگریزی باجا۔ تال سم سے درست اس کے بعد گھوڑے کمیت کاٹھیا دار کچھ سرنگ کرنگ۔ نقرہ خنگ۔ کمیت سبزہ۔ ویلا چھم چھم کرتے ہوئے جا رہے ہیں۔ دو دو آدمی تعینات گھوڑے دلہن بنے ہوئے مہندی کا رنگ رچائے بھرے جمائے کمر نازک ذراسی تھوتنی۔ چوڑی پیشانی کنوتیاں بدل رہے ہیں۔ اس کے بعد پھر ارگن باجا غول کے غول نامدان فنس۔ پالکی۔ نالکی۔ سکھپال اس کے بعد پھر باجا اس کے بعد پریوں کے تخت۔ نازنینان عربدہ جو اور پری پیکران عنبر مو تختوں پر تھرک رہی ہیں۔ صدہا تماشائی ان کے شمع رخسار کے پروانے ہیں۔ اس

کے بعد روشن چوکی والے ستم ڈھا رہے ہیں۔ اس کے بعد ہاتھیوں کی قطار جھومتے جھامتے سونڈ سے کھیلتے جاتے ہیں۔ روشنی کا انتظام بھی چوکس تھا۔ پنشاخے اور لالٹینیں جھک جھک کر رہی تھیں۔ سوئی گرے تو اٹھا لیجیے۔ رائی کا دانہ صاف نظر آئے۔ اس ٹھسّے سے برات چلی۔ ارے توبہ۔ برات کیسی جلوس چلا کہ میاں صف شکن علی شاہ کو لائیں جلوس کا جانا چکر کھاتے شہر بھر کو دکھاتے ؂

آہستہ خرام بلکہ مخرام زیرِ قدمت ہزار جاں ست

شہنائی میں گاتے بے فکرے بے تکی اڑاتے۔ اڑھائی چاول گلانے چلنے گوندنی والی بغیا۔ راہ میں جو دیکھتا ہے چکر میں آتا ہے کہ واہ اچھی برات ہے۔ دولہا کا پتا ہی نہیں۔ برات کیا گورکھ دھندا ہے۔ ٹیم ٹام دھوم دھام سب کچھ۔ مگر نوشہ ندارد۔ دولہا غائب تمام شہر اور شہر کے گلی کوچوں۔ اور گلی کوچوں کے مکانوں اور مکانوں کے در و دیوار کے صدقے ہوتے جلوس عین گوندنی والی بغیا پہنچا۔

اب سنیے کہ میاں آزاد اپنی سانڈنی پر سوار صف شکن علی شاہ کو کابک میں بٹھائے سڑک پر ڈٹے ہوئے تھے۔ ایں! صف شکن علی شاہ کہاں سے آگئے۔ اجی کسی اٹیر بٹیر کو ادھر ادھر سے خرید لیا ہوگا۔ نا صاحب وہی صف شکن۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ میاں آزاد نے اور سب بٹیروں کو اڑا دیا تھا مگر صف شکن علی شاہ کو چھپا رکھا تھا اب موقع پر ان کو نکالا خیر۔ خوجی آتے ہی ان سے بغل گیر ہوئے اور میر صاحب گلے ملے اور غفور خدمت گار نے سلام کیا اور رفقا و مصاحبین سے مصافحہ ہوا۔

خوجی۔ مثل مشہور ہے کہ سو برس بعد گھورے کے بھی دن بہورتے ہیں۔ سو ہمارے تو آج دن بہورے کہ آپ آئے اور شاہ جی کو لائے نواب کے یہاں سناٹا پڑا ہوا تھا۔ وہ چہل پہل ہی نہیں وہ دل لگی ہی نہیں صف شکن کے سوگ میں سب پر مردنی چھائی تھی۔ نواب چونک پڑتے تھے کھٹ ہوا اور پوچھا آزاد آئے دھم ہوا اور کنمنائے مگر آپ نہ آئے حاسدوں نے جڑ دی تھی کہ حضور وہ سانڈنی نواڈنی لے کر لمبے ہوئے کیسے آزاد اور کہاں کے صف شکن وہ پہنچے یہاں سے سو منزل پر۔ مگر یار ہم تمہارا جنبہ کرتے تھے۔

میر صاحب۔ جی ہاں اور ہم بھی آپ ہی کی طرف سے لڑتے تھے۔ ہم اور خواجہ صاحب دونوں۔

آزاد۔ بھائی کچھ نہ پوچھو نہیں۔ واللہ آسمان میں تھگلی لگائی تب کہیں ان کی زیارت نصیب ہوئی خدا جانے کن کن جنگلوں میں جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں کیا کیا افتاد میں پڑیں۔

خوجی۔ جی اس میں کیا شک ہے حضرت یہاں لوگوں نے وہ گپیں اڑائی تھیں کہ توبہ ہی بھلی۔ کسی نے کہا بھانڈوں کے یہاں نوکری کر لی۔ کوئی طوفان باندھتا تھا کہ کسی بھٹیاری کے گھر پڑ گئے مگر سب بہتان لوگ تہمتیں تراشتے تھے لیکن اب سب نے منہ کی کھائی بات تیرے گیدی کی۔

خلاصہ یہ ہے کہ خوجی اور میر صاحب اور رفقا اور مصاحبین سب مل کر میاں آزاد کو چیتے یا بناتے تھے مگر ہمارے آزاد ایک ہی استاد۔ ان مرد کوں کی قبر تک سے واقف تھے خوب سمجھے کہ اب نواب کے یہاں جو ہمارا طوطی بولے گا اس سے یہ سب ہمارے یار چے بن رہے ہیں۔ تھوڑی دیر تک خوب کھل کھل کر باتیں ہوئیں تو میاں آزاد نے کہا کہ حضرت اب رات جاتی ہے یا آتی ہے چلیے بس اب انتظار کس کا ہے۔ اچھا بسم اللہ کیجیے۔ پنشاخے چڑھاؤ لالٹینیں جلاؤ گھوڑے چلاؤ۔ ہاتھی کے پرے جماؤ میا باجا بجاؤ۔ تامدان بڑھاؤ سب قرینے سے لگاؤ جب جلوس آراستہ ہوا تو میاں آزاد ایک فیل فلک شکوہ پر جا ڈٹے اور صف شکن علی شاہ کی کابک کو آگے رکھ لیا۔ خوجی اور میر صاحب کو حکم دیا کہ خواصی میں بیٹھیں۔ ہائیں ہم بھی کیا چوڑے چمار چرکٹے ہیں جو خواصی میں بیٹھیں گے۔ آپ بھی خوب کہتے ہیں۔ لوگوں نے سمجھایا کہ اجی کچھ واہی سے معلوم ہوتے ہو بیٹھ نہیں لیتے خواصی میں۔ کیا مشیخت میں بٹا لگے گا۔ یا شان کرکری ہو گی۔ خیر قہر درویش بر جان درویش دونوں کے دونوں پیچھے بیٹھ لیے جلوس چلا۔ شہر میں تو غلغلے ہی سے۔ بلکہ تھا کہ نواب والا جیر بڑے ٹھٹے سے آرہا ہے لاکھوں آدمی چوک میں تماشا دیکھنے کو ڈٹے ہوئے تھے۔ چھتیں پھٹی پڑتی تھیں۔ وہ بھیڑ بھڑکا کہ شانے سے شانہ چھلتا تھا۔ باجے کی آواز جو کانوں میں پڑی تو تماشائی چشم در راہ انتظار ہوئے نشان کا ہاتھی جھنڈے کا پھریرا اڑاتا اٹکھیلیاں کرتا سامنے آیا پھولوں کے تخت آگے تھے۔ انگریزی باجے

نے کانوں کو سرورِ نازنینانِ پری وش کے رخ انور نے آنکھوں کو نور بخشا۔ جیسے ہی عین چوک میں میاں آزاد کا ہاتھی پہنچا ویسے ہی دیوانی کے دو مذکوریوں نے ڈانٹ کر کہا کہ ہاتھی روک لے۔ آزاد کے نام وارنٹ آیا ہے۔ ارے! اوسان خطا ہو گئے۔ فیل بان نے جو دیکھا کہ سرکاری آدمی لال لال پگیا باندھے کالی کالی وردی ڈانٹے۔ خاکی پتلون پہنے چپراس لٹکائے وارنٹ لیے ہاتھی روکے کھڑے ہیں تو اس کے ہوش پراں ہو گئے اور ہاتھی کو جدھر انہوں نے کہا پھیر دیا۔ میاں آزاد مع خوجی اور مع میر صاحب و مع میاں صف شکن علی شاہ اور مع فیل بان اور مع ہاتھی اور مع ہاتھی کی دُم مذکوریوں کے ساتھ ساتھ چلے۔ جلوس تتر بتر۔ کوئی تخت لیے بھاگا جاتا ہے۔ کوئی جھنڈی لیے دبکا پھرتا ہے۔ گھوڑے تھان پر پہنچے۔ تامدان اور پالکیوں کو چھوڑ چھاڑ کر کہار اڈے پر ہو رہے۔ جلوس کا پتا نہیں۔ برات و رات سب غائب غلہ۔ اب نئی سڑک کا پتا پوچھتے جاتے ہیں خوجی ابھی افیم کی پینک ہی میں ہیں۔ میر صاحب چانڈو کے نشے میں غین۔ اچھی دل لگی ہوئی۔ الٰہی یہ کیسی ہوا بندھی کہ ایک ہی جھونکے میں برات کا چراغ گل جلوس غائب۔ میاں آزاد لدے پھندے خوجی اور میر صاحب خواصی میں بندھے میاں صف شکن علی شاہ جور و جفا سہتے ہوئے اور فیل بان بری اور دھت کہتے ہوئے چلے نئی سڑک کا پتا پوچھتے پنشاخہ ہاتھ میں دو مذکوری ساتھ میں۔ اب سنیے کہ ہاتھی اک دنتا مست ؎

گویا خر طوم اژدہا تھی   صورت دیوار قہقہا تھی

سنسان بیابان۔ ہو کا عالم پرند کہیں پر نہیں مارتا تھا اتنے میں ہاتھی جو گرجا تو جنگل بھر میں ہوک پڑ گئی اور خوجی اور میر صاحب ایک دفعہ ہی پینک سے چونک پڑے۔

خوجی۔ ایں پنشاخے چڑھاؤ۔ پنشا ہے۔ ابے یہ کیا اندھیر مچا یا ہے۔ (آنکھیں بھی نیم باز ہیں) اور سنیے گا۔ ذری یوں ہی آنکھ جھپک گئی تو کی کرائی محنت ساری خاک میں ملا دی۔ اب اتر کر کوڑے پھٹکاروں گا تب مانیں گے۔ توبہ کیا باتوں کے آدمی کہیں لاتوں سے مانتے ہیں۔ (کہتے کچھ ہیں منہ سے نکلتا کچھ ہے)

میر صاحب۔ ہائیں! ہائیں! او فیل بان۔ یہ کہاں گلی میں آیا۔ یہ کیا آتش،

بازی سے بھڑکتا ہے ہاتھی۔ بڑھائے چلو میل میل۔ دھت۔ دھت۔ (آنکھیں کھول کر) ابی ارے میاں خوجی یہ کس چٹیل میدان میں آنکلے۔ ذری خواب خرگوش سے جاگو بھاگو بھاگو۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ بھئی میاں ذری دیکھو تو الٰہی خیر اللّٰھم حفظنا من کل البلیات۔ یا اللہ بچائیو۔ ع

یا علی مشکل کشا مشکل کشائی کیجیے

خوجی (چونک کر) پنشاخے چڑھاؤ پنشاخے۔ اور یہ باجے والوں کو کیا سانپ سونگھ گیا ہے۔ فرا زور زور سے جھپڑے جاؤ اب تو بھاگ کا وقت ہے بھاگ کا۔

میر صاحب۔ آنکھیں تو کھولیے روشنی کا چراغ گل ہوگیا۔ آپ کا اور میرا دونوں کا قل ہوگیا۔ باجے والوں کی درگت ہوگئی۔ آپ وہی بے وقت کی شہنائی بجا رہے ہیں۔ اس جنگلے میں آپ کو بھاگ کی دھن سمائی ہے۔

خوجی۔ پنشاخے چڑھاؤ پنشاخے۔ نہیں میں کچا پیسا تو دوں گا نہیں جھپ سے چڑھانا تو پنشاخے۔ شاباش ہے بیٹا۔

میر صاحب تو جلے بھنے بیٹھے ہی تھے۔ خوجی نے جب کئی بار یہ ہانک لگائی کہ پنشاخے چڑھاؤ تو وہ چلا اٹھے۔ ایک دفعہ ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ خوجی بے چارے کو دھم سے ہاتھی پر سے نیچے دھکیل ہی تو دیا۔ دھوں کون گرا۔ کون گرا۔ ذری ٹوہ تو لینا کون گرا۔ کون۔ اے حضرت ٹوہ کیا لیں آپ ہی تو لڑھکے۔ ارے! میں۔ ہائے ہائے وہ تو کہیے ہڈی پسلی بچ گئی۔ نہیں شیطان نے تو تسمہ تک باقی نہیں رکھا تھا۔ یارو ذری دیکھنا تو ہمارا سر بچا یا نہیں۔ واہ رے میرے گرنے۔ بس یہی معلوم ہوا کہ کوئی ڈھوہ کا ڈھوہ ہاتھی گرا۔ اللّٰھم احفظنا من کل البلیات۔

مذکوری۔ چلو بس کل بلیار ہنے دو۔ ہونہہ کل بلیا۔ وہ تو کہو تیل ہتا۔ ناہیں کلبلیا نکل جات۔ پھر بہن ستھنا اور چلے کلبلیا لے۔ ادھر آؤ اٹھاؤ اٹھاؤ۔ اپنا بوجھ لدیک

مذکوری نے خوجی پر لادا۔

خوجی۔ میں کیا کوئی مزدور مقرر کیا ہے یا سر بوجھیا بنایا ہے۔ شریف اور پاجی کو نہیں پہنچانتا لے اب اتارتا ہے بوجھ یا میں نالے میں پھینک دوں۔ یا باپ کا سر سمجھ کر بوجھ لاد دیا جانو ہم گدھے ہیں۔ او گیدی لانا قرولی۔

میر صاحب۔ گدھے نہیں اور ہو کون۔ تم نے بوجھ اٹھایا ہی کیوں۔ بڑا پاگل ہے

جب بوجھ سر پر رکھ لیا تب جھگڑتے ہیں سزا سزا تیری اور بیٹے گا بوجھ سر پر رکھ لیا اور لگے گالیاں دینے مو دور اکہیں کا۔

دوسرا مذکوری - تین کو بس رے - ارے تین کو بس - اتر ہاتھی پر سے اترت ہے۔ کہ ہم پہنچے پھر - ہائیں مُنہہ ماں نا ہیں بولت ہے لو تو ارے ہم بکت ہیں او دل پھر - تین اس نہ منبیے۔

میر صاحب - کہتا کس سے ہے ارے کس سے کہتا ہے کچھ بید معاتو نہیں ہے - اور سنیے گا صاحب - ارے کی یہ کیا تقریر ہے بچہ - ارے ترے کیسا - اور آتے ہیں ہم کچھ نا بر تھوڑا ہی ہیں لو آئے (دھم)

دوسرا مذکوری - اٹھا یہ بوجھ اٹھا - لکڑی ہے - ایک تھر یا ایک لوٹیا رکھ موڑے پر اور آگو آ۔

میر صاحب نے نیچے اتر کر دیکھا تو سرکاری پیادہ لال پگیا جمائے وردی ڈانٹے کھڑا ہے - اوسان خطا ہو گئے۔ لگے تھر تھر کانپنے چپ چپاتے تھالی لوٹا اٹھایا اور مچل مچل کر چلنے لگے - مذکوری دونوں کے دونوں خواصی میں جا بیٹھے - اب خوجی اور میر صاحب دونوں مزدور بنے ہوئے لدے پھندے گرتے پڑتے جانے لگے۔

خوجی - واہ ری قسمت کہاں تو فیل نشیں تھے کہاں اب سر بوجھ بنے چلتے ہیں - واہ کیا زمانے کا نشیب و فراز ہے - کیوں جی میر صاحب ہم تو یاد الہی میں تھے - یہ تم کو کیا ہوا تھا تم کہاں تھے۔

میر صاحب - جہاں حضور تھے وہاں بندہ بھی تھا - آپ بھی پینک میں تھے میں بھی پینک میں تھا - دونوں غین واللہ باللہ ثم باللہ یہ آزاد جھکمہ دے گیا - یہ اسی کی ساری کارستانی ہے۔

خوجی - خدا سمجھے ایسا شریر آدمی تو دیکھا ہی نہیں واللہ ہے۔

آزاد ذرا بچو بچ سنبھالے ہوئے نہیں اترتا ہوں پھر آؤں کر دوں مرمت۔

خوجی - بھائی فیل بان ہوت - تم کو خدا کا واسطہ اتنا بتا دو ذری کہ یہ ہوا کیا - یہ برات کدھر رفو چکر ہوئی - انشاخے پنشاخے سب غائب غلہ باجا واجا سب تین تیرہ۔ وہ روشنی نہ وہ گھر فقط ہم اور یا نہ وہ خر - واللہ طلسمات کا سامان نظر آتا ہے یہ سب جادو کی کرامات ہے۔

چلتے چلتے تڑکا ہو گیا تو خوجی بولے لو بھئی ہمارا تو بھونڈی ہو گیا اب جو بوجھ اٹھا کر چلے اس کی ہفتاد پشت پر لعنت ز بوجھ پھینک کر اسے جس کا جی چاہے اٹھائے مذکوریوں نے بوجھ تڑ سے اٹھا لیا اور ان دونوں کو بھی ہاتھی پر بٹھا لیا۔ جب ذرا دن چڑھا تو ایک مذکوری نے کہا بھئی بھیل بان سامنے ہاتھی روک لینا ہم ایک دو گوتے (غوطے) تو لگائیں جھپاک سے بے نہائے چین نہیں۔

فیل بان۔ یہ کیوں۔ کیا گیتا گھسیٹی ہے۔

مذکوری۔ ہاں تم کو کیا تم تو چاہے بیس بیس دن نہ نہاؤ۔ ہم تو جات باہر کر دیئے جائیں۔

فیل بان۔ اجی تو ایسا نہانا ابھی کیا۔ تالاب دیکھا اور کود پڑے گڑھیا ملی اور پھاند پڑے۔ واہ نہانا بھی کچھ قضا ہے کہ ٹلے ہی نہیں اچھے رہے تم گنوار دل ہی رہے۔

مذکوری۔ ہاں تمہرے تردنی طرح، عید بکر عید نہائیں تو گنوار دل نہ رہیں

آزاد۔ خوجی کہو یار چپ نہاؤ گے۔ بھئی ایک غوطہ لگاؤ ہماری خاطر سے واسطے خدا کے۔

خوجی۔ یوں ہی نہ زہر کی پڑیا دے دو۔ گلا گھونٹ ڈالو یہ دل لگی ہمیں پسند نہیں۔

خیر صاحب خدا خدا کر کے کہیں شہر میں داخل ہوئے آزاد نے متحیر ہو کر کہا کہ ایں اتنا دن چڑھ گیا۔

یہ نرالا امتحان ہے

یہ دل دادۂ جمال جانانہ میاں آزاد موزوں ترانہ اپنے شفیق رفیق اور خلیل بالتحقیق میاں ظراف کے ساتھ اس ایوان سعادت اساس کے قریب جماں جماں اور خراماں خراماں جانے لگے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ملاح ملیح یعنی وہی پیر مرد وجیہ پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا سامنے سے آرہا ہے۔

آزاد۔ السلام علیکم۔

پیر مرد۔ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

ظراف۔ مزاج اقدس حضور کا۔

آزاد۔ مزاج معلی۔

پیر مرد۔ آپ اپنے مزاج کی کیفیت فرمایئے۔ میرا مزاج تو آج اوج عیوق پر ہے۔
آزاد۔ ہاں تو پھر ہمارا دماغ بھی عالم بالا کی سیر کر رہا ہے۔ بے پر کی آج اڑا رہا ہے۔ آپ کے چہرے سے خوشی برستی ہے ۔

مرحبا طائر فرخ پے فرخندہ پیام
خیر مقدم چہ خبر یار کجا راہ کدام

ظراف۔ راہ تو وہ نکالی ہے کہ ہم آپ کے لیے خضر ہو گئے اور یار خواب ناز میں ہے۔

آزاد۔
تو بہ خواب ناز بودی دمن از رقیب پنہاں
کف پا تو بوسہ دادم رفقا خنیدہ باشی

ظراف۔ درست تو رقیب بندہ ہوا۔
آزاد۔ کہیے پھر کچھ کہیے تو مژدہ سنانے میں اتنی دیر۔
پیر مرد۔ آیئے غریب خانے تک قدم رنجہ فرمایئے وہ سامنے کلبۂ احزان ہے چل کر بہ آرام تمام تشریف رکھیے اور داستان سنیے فتح ہے فتح۔
آزاد۔ اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی۔ خانۂ احساں آباد۔
پیر مرد۔ اے حضرت یوں تشریف رہیے۔ میاں ظراف صاحب میری خاطر سے آپ ہی یوں آیئے۔ یارو مجھ بوڑھے کا اتنا تو کہنا مانو خیر صاحب۔ ع صدر ہر جا کہ نشیند صدر است۔ سنیے بندہ آج صبح کو ان دونوں کے پاس گیا اور آپ کی اس درجہ تعریف کی کہ پل باندھ دیے۔ اور پھر آپ جانیے بندہ گو عالم نہیں فاضل نہیں۔ منشی نہیں۔ مولوی نہیں لیکن آخر علما اور فضلا اور کملا اور شعرا کی آنکھیں تو دیکھی ہیں۔ بڑے بڑے نکتہ پردازان اور جادو طرازوں کی صحبت میں باریاب رہا ہوں اس لسانی اور لفاظی سے تقریر کی کہ اب آپ کے جمال با کمال دیکھنے کو نعل در آتش ہیں کئی بار کہہ چکیں کہ صورت تو دکھاؤ۔ لو حضرت معاملہ تو سب لیس ہے۔ ذرا کسر نہیں۔ لیکن بڑی بری پخ ہے۔ وہ آپ کا امتحان لیں گی۔ سوالات کے جوابات آپ کو دینے ہوں گے۔ ہاں یہ بڑی سخت شرط ہے۔ دونوں کی دونوں پرکالۂ آتش ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کچھ پوچھ بیٹھیں اور آپ بغلیں جھانکنے لگیں۔ یہ البتہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے جو رائے ہو اس سے اطلاع دیجیے۔ خدا کی قسم انھوں نے قسم کھائی ہے کہ جاہل مورکھ ان پڑھ کے ساتھ نکاح نہ کریں گے نہ کریں گے ہرگز نہ کریں گے آپ سوچ سمجھ لیجیے۔

آزاد ہے اے خدا قربان احسانت شوم   ایں چہ احسان ست قربانت شوم

واللہ منہ مانگی مراد پائی۔ جو تمنائے دلی تھی وہ برآئی۔ ایک نہیں ہزار بار امتحان لیں تو کیا پرواہ ہے کچھ مضائقہ نہیں ہمیں بھی آپ کو کیا سمجھے ہیں کیا۔ ہم تو لاکھوں میں امتحان دیں۔ ہمیں منظور ہے۔ بسم اللہ جاہے جو امتحان لے اور اگر وہ خود امتحان لیں تو واللہ روح خوش ہو جائے گی از ایں چہ بہتر ہمارے جوہر تو کسی طرح ان پر کھلیں۔ منطق میں فقہ میں ادب میں۔ فلاسفہ میں۔ ریاضی میں ہیئات میں نظم میں نثر میں جس میں چاہیں امتحان لیں۔ بھی جو نکل جاؤں تو آزاد نہیں۔ عمر بھر آخر کیا کیا کیے۔

ظاف۔ بھائی امتحان کا نام برا۔ شاید رہ گئے تو پھر۔

آزاد۔ پھر آپ کا سر۔ رہ جانے کی ایک ہی کہی۔ اور امتحان کے نام سے آپ جیسے گوکھوں کی روح فنا ہوتی ہے یا ہماری۔ خیر آپ چپ چاپ بیٹھے رہیں ہم اپنے سمجھ لیں گے۔

پیر مرد۔ میں جاکر کہہ دوں کہ وہ آئے ہیں۔ بسم اللہ امتحان لیجیے انھیں بسر و چشم منظور ہے۔ لیکن انھوں نے ہم سے کہا تھا کہ ہم بجرے پر سوار ہوں اور اس وقت ان سے آنکھیں چار ہوں مگر شرط یہ کر دی کہ چاہے بدلی ہو مگر مینہ نہ برستا ہو اور ہوا بہت تیز نہ ہو۔ سو اس وقت بدلی بھی چوطرفہ چھائی ہوئی ہے اور ہوا تو اس زناٹے سے چلتی ہے کہ دبلا آدمی شاید پتانے لگے اچھا آپ بیٹھیں میں آتا ہوں۔

کہیں (تو چل میں آتا ہوں) کے مطابق ہی عمل درآمد نہ کیجیے گا۔

الغرض پیر مرد رخصت ہو کر اور اجازت لے کر محل میں گئے۔

حسن آرا۔ کہیے آپ کیا خبر لائے۔ کچھ خوش آ رہے ہو۔

پیر مرد۔ وہ آئے ہیں امتحان کا نام سنتے ہی باچھیں کھل گئیں۔ کہیے تو بلا لاؤں بیٹی دیکھتے ہی جی نہ خوش ہو جائے تو سہی۔

سپہر آرا۔ نامحرم کا کھٹ سے گھر میں چلا آنا کیسا پہلے ان سے کہیے کہ چلیے باغ کی سیر کریں۔ روشوں میں ان کو لے کر ٹہلیے ہم جھروکوں سے دیکھیں تو سہی۔ یہ نہیں کہ ایرا غیرا پچکلیان جو آیا داخل۔ واہ۔

حسن آرا۔ ہاں کہتی تو سچ ہے ابھی بے موقع ہے۔

پیر مرد باہر گئے اور کہا کہ ابھی آرام میں ہیں آئیے تب تک ہم آپ مل کر گلگشتِ چمن کریں۔ دیکھیے تو باغ میں کیا فضا ہے اور روشوں میں سرخی پر قیامت کا جو بن ہے۔ بھئی چلو باغ میں ٹہلیں۔ اِدھر میاں آزاد اور میاں ظراف اور پیر مرد باغ کی روشوں میں ٹہلنے لگے اور ادھر جھروکوں سے ان دونوں زہرہ جبیں نازنیں رشک قمر پری پیکر خاتونوں نے دزدیدہ نگاہ سے دیکھنا شروع کیا۔ میاں آزاد مہر طلعت مہ لقا سبزہ آغاز شوخ و طناز حسین و مہ جبین اونچی بنے ہوئے باغ میں ٹہل رہے تھے۔ دیکھتے ہی پھڑک گیئں۔ بڑی بہن نے تو ضبط کیا مگر چھوٹی سے نہ رہا گیا۔

سپہر آرا۔ اہو ہو ہو۔ کیا رنگیلا چھیل چھبیلا جوان ہے۔ کیا نورانی صورت ہے بہن یہ تو تمھارے ہی لائق ہے۔ اللہ نے یہ جوڑی اپنے ہاتھ سے بنائی ہے۔ میری اچھی باجی جان ہماری خاطر سے ان کے ساتھ بیاہ کر لو۔ میں صدقے گئی مان لو۔

حسن آرا۔ اے واہ کیسی نادان ہو۔ بھلا شادی بیاہ بھی کہیں کسی کی خاطر سے ہوا کرتے ہیں۔ یہ دل کا سودا ہے۔ ہم بے سمجھے بوجھے دل سی پیاری چیز کسی کو نہ دیں گے۔ (جھلا کر) اور پھر ایسی ہی تم گرویدہ ہو تو تم ہی سہی۔

سپہر آرا (گردن نیچی کر کے) بڑی بہن ہو کیا کہوں۔ ادھر وہ سب سبزہ و لالہ و گل و سنبل کے جوبن لوٹتے تھے اور وہ دونوں گل بدن سیم تن دزدیدہ نگاہ میاں آزاد پر ڈالتی تھیں کہ ایک دفعہ ہی دو سوار سبک خیز اور بلا کے تیز گھوڑوں پر سوار عجب بانکی ادا سے آن موجود ہوئے۔ انھوں نے میاں آزاد کو اور میاں آزاد نے ان کو تیکھی چتون سے دیکھا۔

آزاد۔ (پیر مرد سے) یہ تو اچھے رقیب پیدا ہو گئے۔ بغلی گھونسا۔ ان کو کسی ترکیب سے ٹال دیجیے۔

پیر مرد۔ یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ ان دونوں کے منہ سے تو انگارے برستے ہیں۔ ہار کی مانتے ہیں نہ جیتی۔ مگر ہیں رئیس زادے یہ بھی۔ اور فوج کے افسر ہیں۔ آپ اونچی بنے ہوئے ہیں۔ آپ کی تلوار ہر دم میان سے دو انگل باہر رہتی ہے۔ آج خون ہوتا ہے۔ خدا ہی خیر کرے۔ اگر ایک بھی حلیم مزاج ہو تو بات بن جائے اور جو دونوں کے دونوں مغرور المزاج ہوئے تو پھر وہی شعر صادق آتا ہے ؎

دگر در ہر دو جانب جاہلانند
اگر زنجیر باشد بگسلانند

ایک کام کیجیے آپ کا اور ان کا سب کا امتحان لیا جائے۔ جو اول رہے اس کے نام فتح ہے۔ سچ کہیے گا کیا فیصلہ ہے۔

آزاد۔ منظور۔

پیر مرد نے محل میں جا کر حسن آرا اور سپہر آرا سے کہا کہ وہ دونوں گھبرو جوان بھی سامنے گھوڑوں پر سوار کھڑے ہیں۔ میاں آزاد ان کو اور وہ ان کو قہر کی نگاہ سے دیکھنے لگے تو ہیں۔ ہم نے یوں فیصلہ کیا کہ تم سب کا امتحان لیا جائے۔ دیکھیں کس کا ستارہ چمکتا ہے قسمت آزمائی ہے انھوں نے میرے اس مشورے کو پسند کیا مگر سپہر آرا سوچ کر بولیں بہن۔ آزاد ہی سے ساتھ بیاہ رچے تو کیا بات ہے۔ خیر پیر مرد خوش خوش باہر گئے اور ان دونوں جوانان روئیں تن سے یوں گفتگو کی۔

پیر مرد۔ اترو بھیا گھوڑوں کو سائیس کے سپرد کرو آؤ بیٹھو۔

اللہ اللہ کر کر وہ دونوں دھم سے اتر پڑے تو پیر مرد نے کہا سنو بھائی ان دونوں نے وشان جاہ وجلال پر اگر آپکا دل آیا ہے تو ہم ایک سہل سی تدبیر بتادیں۔ یہ بے سمجھے بوجھے بیاہ نہ کریں گی۔ اتنا سننا تھا کہ ایک کڑک کر بولا۔ کیا کہا۔ دوسرے نے کہا "داغ دے دھواں اس پار ہو" پیر مرد کے ہوش پراں کہ برے پھنسے آہستہ سے کہا کہ وہ امتحان لینے کو کہتی ہیں۔ امتحان چہ معنی دارد۔ سٹھیا گیا ہے بڈھا گیا۔ ارے صاحب۔ ارے ترے کہاں کی نکالی نامعقول۔ جی حضور وہ علم وفضل میں امتحان لیں گی یہ کیا؟ علم وفضل! ہم کیا کچھ مکتب خانے کے لونڈے ہیں۔ ہمارا علم ہماری تلوار دسڑاپ سے میان سے باہر نکال کر، یہ چمکتی دمکتی تلوار، دوسرے یہ تلوار (تڑ سے میان سے باہر تھی) اب پیر مرد ہکا بکا کہ بات کرتے ہی تلواریں اگل پڑیں۔ خدا ہی خیر کرے بھئی اچھے اجہلوں سے سابقہ پڑا ہے۔ بولیے کہ آپ امتحان دیں گے یا نہ دیں گے۔ ایک نے کہا دیں گے دوسرے نے کہا کہ پہلے تیرا سر کاٹ لیں گے تب تو پیر مرد بھی کسی قدر تیز ہوئے۔ بس میاں بس! بہت بانکپن کی نہ لو۔ میرے پوتے کے برابر ہو اور مجھی کو للکارتے ہو۔ اور تلوار دکھاتے ہو۔ بڈھوں کے منہ لگتے ہو دانتوں کے تلے انگلی اگر، توبہ توبہ بانکپن کے یہ معنے نہیں کہ بڈھوں پر تیز ہو۔ یہاں منہ

میں دانت نہ پیٹ میں آنت ہم تو اب حلوا کھانے کے کام کے ہیں۔ لڑنے بھڑنے کا زمانہ اب کہاں رہا۔ ایک جوان نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ معاف کیجیے گا۔ دوسرے نے قدموں پر ٹوپی رکھ دی کہ قصور ہوا۔ خیر اب اصل حال اور کل داستان کا لب لباب سنیے۔ کہ حسن آرا سپہر آرا سولہ سنگھار کر کے ایک پر تکلف کمرے میں جلوہ گر ہوئیں اور میاں آزاد کو وہاں بلوایا۔ یہ مژدہ روح افزا سنتے ہی میاں آزاد کے رخسار تاباں پر فرط طرب سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے قدم بڑھاتے ہوئے کمرے میں پہنچے تو دیکھتے کیا ہیں کہ کمرہ دلہن کی طرح سجا ہوا ہے۔ مشک و عنبر کی خوش بو چوطرفہ آتی ہے۔ جو شے ہے بے بہا۔ جو چیز ہے دل ربا۔ فرش مکلّف، کرسیاں رنگین، در و دیوار غیرت آگیں ؎

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

سامنے جو نظر کرتے ہیں تو ایک زرنگار اور پر بہار پردہ پڑا ہے اور وہ دونوں خواتین ملائک نظر فریب مہ لقا اور جادو نگاہ رنگیں ادا متمکن ہیں۔ مگر پردہ حائل۔ نور نظر سے غائب۔ تب تو میاں آزاد بے اختیار بلحن داؤدی کہہ اٹھے ؎

دیدار می نمائی و پرہیز می کنی　　بازار خویش آتشِ ما تیز می کنی
طالبِ نظارہ ام پردہ برافگن زرخ
پیشِ صفِ راستاں شعبدہ بازی مکن

حسن آرا۔ مزاج شریف۔

آزاد ؎　حسنِ تو ہمیشہ در فزوں باد
رویت ہمہ سال لالہ گوں باد

حسن آرا۔ یا الٰہی دیوان کے دیوان نوک زبان میں ہیں۔ میں مزاج شریف پوچھتی تھی۔

آزاد ؎　خجالت آفتابِ ہر نظر باد
زخوبی روے خوبت خوب تر باد

سپہر آرا۔ کوئی فی البدیہہ شعر سنائیے۔

کے شعر تر انگیز و غلط کہ حزیں باشد
آزاد — یک نقطہ دریں معنی گفتیم ذہیں باشد

حضرت اب تاب گفت گو نہیں۔ روح پر صدمہ ہے واسطے خدا کے ہمارا اور رقیب روسیاہ کا امتحان لیجیے۔

الغرض پیر مردان دونوں جوانان طناز دوسرا پا انداز کو بھی لے آئے اور امتحان شروع ہوا۔

حسن آرا۔ اس مصرع کا دوسرا مصرع فرمائیے۔ مگر مطلع ہو۔ ع

شب چو آمد ماہِ ما بر بامِ ما

جوان ؎ شب چو آمد ماہِ ما بر بامِ ما
پرشدہ از جوہرِ دل جامِ ما

آزاد۔ الغلط شرب کو فصحا۔ ے نکتہ پرور اور شعرائے ذی ہنر نے جوہر روح باندھا ہے۔ جوہر دل نیا محاورہ ہے۔ لسان الغیب حافظ شیرازی کا شعر ہے ؎

بدہ ساقی آں جوہر روح را — دوائے دلِ ریش مجروح را

دیکھو مصرع یوں لگاتے ہیں۔

شب چو آمد ماہِ ما بر بامِ ما
خندہ زد بر صبح روشن شامِ ما

حسن آرا۔ بارک اللہ۔ ایک بوڑھا اپنی نئی شادی کرنے کی ٹھانے مگر لڑکی چھوٹی ہو سنہ ۱۲۹۶ ہجری میں بیاہ قرار پایا مادہ تاریخ تو اس وقت موزوں کیجیے۔

آزاد — پیر نابالغ۔
۱۲۹۶ھ

سپہر آرا۔ دیکھوں پیر کے دو اور دس بارہ اور دو سو۔ دو سو بارہ ہوئے اور نا کے پچاس اور ایک اکیاون، اکیاون اور دو سو بارہ کتنے ہوئے دو سو ترسٹھ۔ اور با کے تین۔ دو سو چھیاسٹھ اور لغ کے تیس اور ہزار ایک ہزار تیئیس اور دو سو چھیاسٹھ بارہ سو چھیانوے ہوئے۔

حسن آرا۔ واہ واہ وا۔ سبحان اللہ کیا موزوں طبیعت پائی ہے۔ چشم بد دور۔ کیا ذہن کی رسائی ہے کیا برجستہ تاریخ فرمائی ہے۔ وہ دونوں جوان سخت شرمائے اور گو بڑے کرارے اور طاقت ور اور فنون سپاہ گری میں طاق تھے مگر آزاد پر کفر

ڈالی تواں کے حسن اور کس بل اور قد و قامت اور رعنائی کے مقابل میں جھیپ کے چل دیئے۔

بیا ساقی کہ فتح ماست امروز شکستِ توبہ ہا برخاست امروز
بیا ساقی کہ خلوت خانۂ ما منور گشت از جانانۂ ما
بدہ جامِ مے از مے خانۂ عشق کہ بے خود سر کنم افسانۂ عشق

اب میاں آزاد فلک الافلاک پر تھگلی لگا کر لامکاں کے پار ہو گئے اور کیوں نہ ہو ایک ماہ پارہ شوخ و شنگ روکش پری رخان فرنگ سے دوچار ہو گئے۔ ادھر آزاد شیفتہ و دیوانہ، شمع رخسارِ آتشیں پر پروانہ ادھر پری خانہ اور جانِ جانانہ۔
ایک دفعہ ہی بادِ بہاری نے اس پردۂ زرنگاری کو جو اٹھایا تو نور کا بکا نظر آیا۔ حسن آرا بے حجاب۔ سپہر آرا برافگندہ نقاب۔ دونوں نکھری ہوئیں۔ زلفیں بکھری ہوئیں پردے کا گرنا اور نامحرم پر نظر پڑنا ہی تھا کہ وہ انا البرق کہتی طرارہ بھر کے بدن کو چھپاتی ہوئی وہ ہو رہیں۔ اس وقت ان دونوں کا بے تابانہ پھرتی کے ساتھ اچکنا اور بجلی کی طرح چمکنا میاں آزاد کی آنکھوں میں کھب گیا۔ سپہر آرا کی تو رگ رگ میں شوخی بھری تھی وہ تو دم کے دم میں چمک دمک کر ایک ہی زقند میں نظر سے اوجھل ہو گئی مگر حسن آرا کسی قدر نستعلیق تھیں عمداً ذرا لڑکھڑانے لگیں اس بتِ طناز کو میاں آزاد خانہ برانداز نے نظر بھر کے دیکھ لیا۔

سپہر آرا۔ اس ہوا کو آگ لگے۔ اس پر ٹیکی پڑ جائے۔

آزاد۔ اب تو آپ ہوا سے بھی لڑنے لگیں۔ خدا ہی خیر کرے۔

حسن آرا۔ آپ تو کہیے ہی گا آپ اس کی ہوا خواہی کا دم نہ بھریں گے تو کون بھرے گا۔ پردہ اٹھا دیا نہ۔

آزاد۔ ہوا نے در پردہ فہمائش کی کہ بھلے مانسوں سے بھلے مانسوں کو پردہ کیسا۔

کس کا حجاب کیسی حیا اور کہاں کی شرم
پردے سے ہاتھ ہاتھ سے پردہ اٹھائیے

حسن آرا۔ ماشا اللہ ابھی شاید کلیجے میں ٹھنڈک نہیں بڑی بے نقاب تو دیکھ لیا اب اور کیا چاہتے ہو۔ بندہ پرور کچھ تو قناعت چاہیے۔

آزاد۔ قانع بہ تجلی نشود شایقِ دیدار

پروانہ بہ جہتاب تسلّی نہ تواں کرد

حسن آرا ۔ صاحب سنیے یہ دل کا سودا ہے دل لگی نہیں ہے۔ تعجیل کارِ شیطان ہے۔

آزاد ۔ در کارِ خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست

بڑی بیگم

اِدھر تو یہ خوش گپیاں ہوتی جاتی تھیں ۔ اُدھر کا حال سنیے کہ سپہر آرا مچل گئی کہ بہن تم دس دن کے اندر ہی اندر میاں آزاد کے ساتھ بیاہ کر لو۔ میں ایک نہ مانوں گی۔ جھنا متھ مچاؤں گی۔ آسمان سر پر اٹھاؤں گی۔ اب پیر مرد اور حسن آرا دونوں سمجھاتے ہیں کہ سنو سنو ٹھہرو ٹھہرو کس کا سننا ہیں ایک نہ مانوں گی میں روؤں گی۔ جب بہن میری بات نہ مانیں گی۔ ہم کسی کی سننے کے نہیں پیر مرد نے سمجھا کر بسہولت کہا کہ تم اس وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو تم سے جیتے کون ۔ آخر اس اسّی برس والی بوڑھی دادی سے بھی پوچھو گی یا تمہیں ان کی بڑی بن بیٹھیں۔ الھڑ پنے کی باتیں کرتی ہو چلو پہلے بڑی بیگم صاحب سے کہیں ان کی رائے لیں۔ ان کو سمجھائیں صلاح و مشورہ ہو بیاہ نہ ہوا ہنسی ٹھٹھا ہو گیا۔ سپہر آرا اور پیر مرد بڑی بیگم کے پاس گئے اور آداب بجالا کر پیر مرد نے کہا کہ حسن آرا آپ کے سلام کو حاضر ہوئی ہیں اور کچھ عرض کرنا چاہتی ہیں۔ انھوں نے گردن ہلا کر کہا ۔ آؤ بابا آؤ ۔ کہو اب تو میں نے شادی تمہاری تمہارے اُوپر چھوڑی ۔ مگر شریف زادہ ہو ۔ آج کیا جانے کیا خوش خبری سننے میں آئے گی کہ فجر سے میری بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے ۔ پیر مرد ایک جہاں دیدہ خرانٹ سوچا کہ بس یہی موقع ہے کہا کہ حضور اس سے بڑھ کر اور مژدہ کیا ہو گا کہ حسن آرا اپنے نکاح کا کچھ حال کہنے حاضر ہوئی ہیں مگر شرماتی ہیں ۔ لجاتی ہیں ۔ کہہ نہیں سکتیں ۔ یہاں ایک شریف زادہ آج کل آیا ہوا ہے ۔ بس بلا تشبیہ یوسف بے انتہا کا حسین و مہ جبیں اور علم کا یہ حال کہ عجب نورانی طبیعت پائی ہے ۔ شاعری میں ان کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں ۔ نثر لکھنا ان کا حصّہ ہے اور شریف مسلمان نجیب الطرفین ۔ تیمور کے

گھرانے سے ہیں عربی فارسی انگریزی حساب کتاب سیاق و سباق سب میں برق اور تقریر سے تو جادو ہی ٹپکتا ہے اور ابھی نام خدا مسیں بھیگتی ہیں۔ بس اللہ نے یہ جوڑی سچ مچ اپنے ہاتھ سے بنائی ہے کیا خوب صورت رئیس زادہ ہے کہ واہ۔ سپہر آرا بولی کہ میں نے تو آج تک ایسا خوب صورت آدمی دیکھا ہی نہیں۔ اور لطف یہ کہ شریف ہنس مکھ اور پڑھے لکھے اماں جان آپ بھی ایک دن دیکھ لیں اور آپ ان کو اجازت دیجیے۔ اتنے میں حسن آرا کو بڑی بیگم نے بلوایا۔ بے چاری لجاتی جاتی تھی اور فرط حیا سے ہاں یا نہیں کچھ زبان پر نہ لا سکتی تھی نیچی نظروں سے چپکے چپکے پیر زال کے چہرے کو دیکھتی جاتی تھی کہ بشاش ہیں یا ملول۔ اتنے میں بڑی بیگم نے سپہر آرا کو چھاتی سے لگایا اور ہنس کر کہا کہ لڑکی مجھ سے اڑتی ہے سکھائی پڑھائی آئی ہے اچھا کل ہم بھی انھیں دیکھ لیں تو پھر مشورہ کریں۔

حسن آرا اور سپہر آرا تو چلی آئیں مگر پیر مرد تھوڑی دیر تک وہیں بیٹھے باتیں کیا کیے۔ جہاں تک زبان نے یاوری کی انھوں نے میاں آزاد کی خوب ہی تعریف کی اور یقین دلایا کہ حسن آرا کے لیے آزاد ہی سا شوہر موزوں ہے وہ بہت ہی خوش ہوئیں اور دعائیں دیں کہ حسن آرا کا جیسا تم نے خیال رکھا ویسا تم کو خدا اجر دے۔

دوسرے دن میاں آزاد یکہ و تنہا وہاں پہنچے۔ ظراف کی دم میں بھی رسا باندھا۔ پہلے تو پیر مرد کے یہاں گئے۔ ان سے کچھ دیر گل خپ رہی۔ اور انھوں نے یہ مژدہ فرح بخش سنایا کہ بڑی بیگم نے بھی نکاح منظور کر لیا مگر ایک دفعہ آپ کو دیکھیں گی ضرور آج یا کل چلیے ہمارے ساتھ۔ انشاء اللہ وہ بھی خوش ہوں تو سہی۔

میاں آزاد ملاح ملیح کو لے کر حسن آرا کے پاس گئے مگر وہی پردے کی ملاقات۔

آزاد۔ بندہ حاضر ہے۔

حسن آرا۔ مزاج معلٰی۔

آزاد۔ الحمد للہ۔

سپہر آرا۔ بندہ پرور آج پردہ خوب مضبوط بندھا ہے آج تو ہوا کیا معنے آندھی بھی آئے تو ذرا نہ ہٹے۔ گر پڑنا کیا معنی۔

آزاد۔ نہیں روزن جو قصر یار میں پروا نہیں ہم کو
نگاہِ شوق رخنہ کرتی ہے دیوارِ آہن میں

حسن آرا۔ کل تو آپ کے فیضانِ صحبت سے ہم نے بہت سی باتیں سیکھیں۔ ہاں صاحب خوب یاد آیا۔ تقدم کی دو چار قسمیں بیان کیجیے

آزاد۔ تقدم بالزماں۔ تقدم بالشرف تقدم بالعلتہ تقدم بالمکان۔

حسن آرا۔ علم منطق کی تعریف کیجیے۔

آزاد۔ آلتہ قانونیتہ تعصم مراعاتہا الذہن عن الخطاء فی الفکر۔

حسن آرا۔ جذب شعری کس قوت کا نام ہے۔

آزاد۔ تجاذیب انابیب شعری اس قوت کشش سے عبارت ہے۔ جس کے ذریعے سے پانی اور اس قسم کی اشیاء رقیق چھوٹے چھوٹے سوراخوں کے وسیلے سے اپنی سطح سے کسی قدر اوپر چڑھ جاتی ہیں اور وہاں قائم رہتی ہیں۔ شعر بالفتح عربی میں بال کو کہتے ہیں وجہ تسمیہ یہ کہ جس قدر نے کا سوراخ چھوٹا ہو گا اسی قدر اشیاء رقیق زیادہ بلند ہوں گی۔ اگر بال کے برابر باریک ہوں تو اشیاء بہت زیادہ اونچی ہو جائیں۔

حسن آرا۔ یہ اتنے بڑے پہاڑ اللہ میاں نے دنیا میں کیوں پیدا کیے آخر فائدہ!

آزاد۔ جو بے شمار اور غیر محدود فوائد پہاڑوں سے حاصل ہوتے ہیں وہ خدا کے فضل و کرم پر دال ہیں۔

پہاڑوں کی چوٹیاں بادلوں کے پانی کو جذب کر لیتی ہیں جس سے انسان فائدہ کثیر اٹھاتے ہیں پودے نشو و نما پاتے ہیں پہاڑ نہ ہوتے تو مینہ کا پانی زمین میں جذب ہو جاتا اور ہر طرف دلدل ہی ہوتی جو ابخرے کشش آفتاب سے صعود کر کے ہوائے جو میں منتشر ہوتے ہیں ان کے سدِ راہ ہو کر ان کو ایک جگہ مجتمع کرتے ہیں۔ اور یہ ابخارات اعتدال اور ہوائے محیط ارض کے مطابق اولے یا برف یا بارش ہو کر زمین پر برستے ہیں جو رطوبات اس طرح حاصل ہوتی ہیں وہ پہاڑوں کی درزوں اور مسامات میں منجمد ہو کر زمین کے ابتدائی طبقوں میں جمع ہوتی ہیں اور انجام کار چشموں اور ندیوں اور نہروں وغیرہ کی مبداء ہوتی ہیں۔

حسن آرا۔ آپ کی ذکاوت اور طباعی پر صاد ہے آپ بڑے ذی لیاقت آدمی ہیں۔

آزاد۔ پھر آپ زکوٰۃ حسن تو دیجیے۔

حسن آرا۔ گھبرائیے نہیں۔ ذرا استقلال بھی چاہیے۔

آزاد ؎ عیشم مدام ست از لعلِ دل خواہ
کارم بکام ست الحمد للہ

پیر مرد۔ (آزاد سے) حضور تشریف لائی ہیں۔ آداب بجا لائیے جھک کر حسن آرا کی امّاں جان ہیں۔ یہی میاں آزاد ہیں۔ حضور۔

آزاد۔ (زمیں دوز ہو کر) آداب بجا لاتا ہوں۔

بیگم۔ جیتے رہو بیٹا۔ ادھر آ کے بیٹھو۔ مزاج اچھے۔

آزاد۔ دعا کرتا ہوں ایک عرصے دراز سے حضور کی قدم بوسی کا تہ دل سے اشتیاق تھا۔ بحمد اللہ کہ یہ سعادت مجھے نصیب ہوئی۔ بزرگوں کی زیارت بڑے خوش قسمتوں کو نصیب ہوتی ہے۔

بیگم۔ سپہر آرا تمھاری بڑی تعریف کرتی تھی اور بے شک تم اسی لائق ہو کہ تعریف کی جائے۔ چشم بد دور۔ لئیق اور خوب صورت اور ابھی بچے ہو اس وقت تم کو دیکھا بہت ہی طبیعت خوش ہوئی۔ اچھا پھر اب پرسوں ہم سے ملنا۔

آزاد۔ (اٹھ کر) آداب بجا لاتا ہوں اور اس وقت رخصت ہوتا ہوں پرسوں بہ شرطِ زیست ضرور حاضر ہوں گا۔

بیگم۔ امام ضامن کو سونپا۔

میاں آزاد اور پیر مرد دونوں باہر گئے پیر مرد نے کہا کہ لو میاں مبارک فال نیک ہے اب پرسوں آنا کل نہ آنا۔ لے خدا حافظ۔ اب آپ نے پالا جیتا۔ ہو قسمت کے دھنی ؎

بتوں کی گلی چھوڑ کر کون جاوے
یہیں سے ہے کعبے کو سجدہ ہمارا

ادھر مہر عالم افروز بہ صد کر و فر نور افشاں ہوا۔ ادھر سرتاج عشاقِ زار جواب مصرعۂ زلف جھوشان فرخار یعنی میاں آزاد کوے یار کی طرف سر کے بھل روانہ ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ برہمن چندن لگائے دھوتی بغل میں دبائے دریا سے نہا کر آرہے ہیں اور پجاری شیوالوں میں سنکھ بجا رہے ہیں۔ ملا سرگرم گفت گو۔ زاہد بہ تہیہ وضو۔ نوبتی نوبت بجا رہے ہیں۔ بادہ گسار جھومتے ہوئے مے خانے جاتے

ہیں برقندازجا بہ جا ڈنٹے کھڑے ہیں۔ بدمست خواب خرگوش میں پڑے ہیں۔ حلوائی بھٹی پر سوتا ہے۔ کتا برُوں کی قسمت کو روتا ہے۔ افیونی غین۔ چانڈو باز ٹین۔ منی روغنی والے ہوا کھاتے ہیں۔ مسافر لدے پھندے جاتے ہیں کوئی بھجن گاتا ہے کوئی مثنوی سناتا ہے۔

سپیدہ دم کہ صبا بوئے گلستاں گیرد چمن ز لطف ہوا نکہت جناں گیرد

اتنے میں ایک رندِ ساغر نوش بادۂ گل گوں کی بوتل دبائے لڑکھڑاتا اور پیترے بدلتا ہوا آنکلا

رند۔ استاد جام حاضر ہے۔ بادۂ ریحانی شراب ارغوانی۔

آزاد۔ نوش جان۔ آپ ہی کو مبارک رہے۔ یہاں بے پیے ہر دم کچے گھڑے کی چڑھی رہتی ہے۔

رند۔ میاں خدارا ذرا تو چسکی لگاؤ۔ اس میں عجیب خاصیت ہے ٹھنڈک کے وقت پیو تو گرما جاؤ۔ اور لوں میں پی کر نکلو تو جوڑی چڑھ آئے۔

آزاد۔ جی بجا ہے۔ بندہ اس کی خاصیت سے خوب واقف ہے اور ہم نے تو سنا ہے کہ شراب پی کر آگ میں پھاند پڑے تو آگ گل ہو جائے اور جو سمندر میں کودے تو انسان سے پل ہو جائے اور جو زیادہ پی جائے تو بس قل ہو جائے۔ بس دور ہی دور سے باتیں کیجیے گا الگ الگ۔

دس قدم آگے بڑھے تو دیکھا دکان پر ایک افیونی نے چینی کی پیاری پیاری چھوٹی رنگا رنگ پیالیوں میں افیون کو گھولا اور میاں آزاد سے کہا کہو بھئی کہاں کی سدھیاں ہیں۔ آؤ۔ ذرا چنیا بیگم سے تو علیک سلیک کرتے جاؤ۔ میاں آزاد نے کہا جی بس چنیا بیگم کو دور ہی سے سلام ہے۔ اس کالی بلا سے یہاں کیا کام ہے۔

اور دو چار قدم بڑھائے تھے کہ ایک بھنگڑ سلطان سے مڈبھیڑ ہوئی۔ ایک چلو میں الو۔ بھراتے کی بوٹی اڑا ئیں ذرا ادھر تو آئیے۔ خانہ احساں آباد۔ یہاں کوئی ٹھنگ نوش نہیں ہے۔ آپ اپنی بوٹی رہنے دیں اور آگے چلے تو دو چار آدمی اپنے بخت برگشتہ کی طرح اوندھے پڑے بھک بھک چانڈو اڑا رہے ہیں اور حقے کے دم لگا رہے ہیں۔ ایک چھینٹا پیے جائیے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھائیے۔ جی بس عنایت خدا اس بلائے بے درماں سے بچائیے۔ یہ مرحلہ طے کر کے میاں آزاد کف بہ

دست میداں سنسان بیاباں میں آئے تو پھولوں کا مہکنا اور کلیوں کا چٹکنا ستم بپا کر رہا ہے شاہد بہار کے خوب جو بن لوٹے اور چلتے چلتے دن سے داخل منزل مقصود۔ پیر مرد سے چار آنکھیں ہوئیں تو دونوں مسکرا کر باتیں کرنے لگے۔

آزاد۔ کورنش عرض ہے قبلہ۔

پیر مرد۔ زندہ باش۔ آج بڑا کڑا امتحان ہے۔ بڑی بیگم صاحب امتحان لیں گی۔ اگر پورے اترے تو ہاتھوں ہاتھ انعام دیں گی۔

آزاد۔ یا قسمت یا نصیب۔ آج بھی پالا جیتوں تو سہی۔ خدا کرے کوشش ٹھکانے لگے۔ حضرت بحق قوت جبریل و بحق صور اسرافیل و بحق دین محمد و بحق خلیل کچھ بتا تو دیجیے کہ کس میں امتحان لیں گی اور کیا انعام دیں گی

پیر مرد۔ میاں وہ پرانے فیشن کی آدمی ہیں کوئی دقیانوسی باتیں پوچھیں گی۔ اللہ پر شاکر رہو بھائی۔ اور انعام کو کیا پوچھتے ہو وہی جان آزاد بت ستم ایجاد انعام ہے۔ اس میں غور و فکر کا بھلا کیا مقام ہے۔ یہ انعام بڑے خوش قسمتوں کو ملتا ہے ؎

غالب ان سیمیں تنوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

چلیے پھر بسم اللہ۔ آپ کو بڑی بیگم صاحب تک لے چلوں۔

آزاد (بڑی بیگم سے) آداب بجا لاتا ہوں۔

بیگم۔ جیتے رہو بیٹا۔ اے فرخندہ۔ ذری پنکھا جھلو آپ کے۔ آپ کا سن شریف کیا ہوگا۔

آزاد۔ کوئی انیس برس کا۔

بیگم۔ اللہ رکھے بوڑھے ہو۔

آزاد۔ (جھک کر) آداب عرض ہے۔ اس وقت آپ نے وہ دعا دی کہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ سچ ہے بڑے بوڑھوں کی کیا بات۔

بیگم۔ اللہ تعالی نے کہا ہے کہ اگر انسان کا سجدہ جائز ہوتا تو بیویاں اپنے شوہر کو سجدہ کیا کرتیں اور ان کے قدم پر سر دھرتیں کیا شان کبریائی ہے۔ صدقے صدقے۔

آزاد۔ جل جلالہ ؎

صدقے اس بندہ نوازی کے ترے، ہم جائیں
باپ ماں ہوتے ہیں کب ایسے شفیق و اشفق

بیگم - کیوں بیٹا ہاتھی کو خواب میں دیکھے تو کیسا؟ اس کی تعبیر کیا ہوگی۔

آزاد - بُرا - ہاتھی کی تعبیر بلائے جان - مگر ہاں ایک بات ہے کہ اگر ہاتھی کسی پر اپنی سونڈ پھیر رہا ہو تو سمجھنا چاہیے کہ آئی ہوئی بلا ٹل گئی۔

پیر زال - شاباش تم بڑے لئیق آدمی ہو - چشم بد دور - تھوڑا سا کالا دانہ ان پر سے جلا دو۔

الغرض بیگم نے میاں آزاد کو دن بھر بٹھایا اور ساتھ ہی کھانا کھلایا اور خوب دیکھا بھالا، جانچا پرتالا۔ میاں آزاد گربہ مسکیں بنے ہوئے ہاں میں ہاں ملاتے جاتے ہیں اور دل ہی دل کھل کھلاتے ہیں۔ جب دن قریب اختتام ہوا اور وقت قلم ہوا تو پیر زال عجستہ خصال نے کہا کہ بھائی اب دو گھڑی حسن آرا اور سپہر آرا کے پاس بھی جاؤ۔ دو گھڑی وہاں بھی خوش گپیاں اڑاو۔ پیر مرد کو کنکھیوں سے اشارہ کیا کہ سایہ کی طرح قدم قدم پر ساتھ رہو میاں آزاد اور پیر مرد اٹھے اور بڑی بیگم سے رخصت ہو کر حسن آرا کے کمرے میں گئے آزاد نے پیر مرد سے کہا کہ حضرت ہمیں حیرت ہے کہ باایں ہمہ ضعیف الاعتقادی اس قدر بے تکلفی۔ کسی اور رئیس کے خاندان میں یہ بے تکلفی کب جائز رکھی جائے گی پیر مرد نے کہا، یہ سچ ہے مگر مجھے نصیحت ہو رہی ہے کہ خبردار ساتھ نہ چھوڑنا۔

آزاد - بندہ حاضر ہے۔

سپہر آرا - بسم اللہ آئیے بسر و چشم۔ کہیے اماں جان سے کیا بات چیت ہوئی۔

آزاد - آپ کی اماں تو بالکل سفید آدمی ہیں مگر بلا کی ضعیف الاعتقاد آج تمام دن بھوت پریت چڑیل بن مانس چھلاوے جادو ٹونے ہی کی باتیں کرتی رہیں۔ میں بھی ہاں میں ہاں ملاتا گیا۔ آخر اور کیا کرتا مصلحت وقت کا تقاضہ ہی یہ تھا۔

حسن آرا - لے تو بوڑھی عورت اور پڑھی لکھی نہیں پھر ان باتوں کو کیسے نہ مانیں۔

آزاد - اب تو اس گھونگھٹ کے طلسم کو توڑیے۔ مانا کہ آپ مہ پارہ ہیں، مگر ہم بھی طالب نظارہ ہیں۔ اتنا بھی بخل کیا۔ روز مصاحبت گرماتے ہیں۔ مگر صورت دیکھنے کو ترس ترس جاتے ہیں۔

سپہر آرا - چلیے آج ساتھ ساتھ سیر دریا کریں۔

بجرے کی روانی اور جان جانی

شب کو گھڑی بھر رات گئے حسن آرا اور سپہر آرا ہر صفت آرائش سے مجلی اور محلی - پیرایش سے مزین ہو کر اس زرق برق سے اور اس شان سے نکلیں کہ بس معلوم ہوتا تھا کہ پرستان سے پریاں اتر آئی ہیں - مگر دونوں کے چہرے پر نقاب - ہر امر میں حیا و حجاب اتنے میں بت رنگیں ادا حسن آرا اور معشوقِ دل ربا سپہر آرا اور آزاد کرنگ اور سرنگ اور نقرہ خنگ پر سوار گھوڑوں کو جماتے اور چمکاتے لبِ جوئبار آ کر اتر پڑے اور اترتے ہی بجرے پر چڑھے ؎

بہار آئی اے ساقیِ گل عذار — کھلے گل، ہوا لطفِ سیر و شکار
مرقع ہیں سبزے سے دشت و جبال — ہرن مست ہیں شوخیوں پر غزال
گھٹاؤں کی آمد ہے بارش کا تار — کبھی ہے تقاطر کبھی ہے پھوہار
چمن میں عنادل ہیں جنگل میں مور — وہ کوئل کی کوکو پپیہوں کا شور
کہیں جدولِ آب کی آب و تاب — کسی جا ہے لالہ کسی جا گلاب
گلستاں کا ہے اب سبق بر زبان — وہ موسم ہے کانٹے بھی ہیں تر زباں
شکارِ بطِ مے ہے مدِ نظر — دکھا سیرِ میخانہ اے باخبر
نہیں دخترِ رز کو خلوت پسند — پری اب رہے گی نہ شیشے میں بند

ادھر بجرا دریا میں رواں ہوا - ادھر میاں آزاد کو گلستاں کا اب پنجم وردِ زباں ہوا - موریلوں کی جھنکار - پپیہوں کی پکار - تھوڑی تھوڑی پھوہار - حسن آرا کی ہنستی پیشانی - سپہر آرا کا جوشِ جوانی چاہِ زنخداں وہ جو کنوئیں جھنکائے - زلیخا کا دل اس کی چاہ میں ڈانوا ڈول ہو جائے - رگِ جاں میں آفت اٹھائے - یوسف مصری کو شرمائے - ان دو گل بدنوں کے عکس سے دریا کا پانی گلاب ہو گیا - فرطِ خجالت سے گل آب آب ہو گیا - الٰہی یہ سرو قامت ہے یا قیامت ہے - یہ سرو ہے یا شمشاد یا الف جانِ آزاد - گردن رشکِ شمع کافور - فوارۂ نور - رخسارِ گل تر - رشکِ قمر - مینڈھا دریا میں اچھل رہا ہے - فرطِ جوش سے سینہ مثلِ دیگ ابل

ہا ہے۔ چو طرفہ بہار ہے۔ ادھر سبزہ نو دمیدہ ادھر مرغزار ہے بیچوں بیچ میں چشمہ سا لطافت بار۔ اور بجرے پر وہ دونوں پری رخاں طرح دار۔

آزاد ؎
منم موسیٰ نقاب از چہرہ بر دار
نمی آید خوشم ایں لن ترانی

الٰہی یہ عارض تاباں پر نقاب ہے یا مہر عالم افروز تہ سحاب ہے۔

سپہر آرا ؎
حیا کنم نہ چرا از رخ نقاب ہنوز
مرا جناب ندید ست بے حجاب ہنوز

حسن آرا۔ حضرت وہ لگاوٹ باز انکھڑیاں کہیں اور ڈھونڈئیے یہاں چشم حیا پرور ادب آموز نگاہ ہے۔ حیا بھی سامنے آئے تو آنکھیں بند کر کے۔ بوے گل تک گریباں کو چاک نہ دیکھے۔

اب سنیے اِدھر استغنائے ناز اُدھر آئینِ نیاز۔ اِدھر نقاب اُدھر طالب نظارہ کا دلِ بر اضطراب۔ اودھر کلیجہ فرطِ ابتہاج سے باغ باغ۔ اِدھر نقابِ رنگیں سے دل داغ داغ۔ حسن آرا کا دھانی اور سپہر آرا کا ارغوانی لباس اور اس پر عطرِ عروس کی بو باس۔

آزاد ؎
لباسِ سبز در بر کردہ سروِ من بہ رعنائی
برآید آفتابِ طالعم از چرخِ مینائی

حسن آرا ؎
تواں شناخت بیک روز از شمائل مرد
کہ تا کجاش رسید ست پایۂ گاہ علوم

آزاد۔ سبحان اللہ یہ لب شیریں اور یہ جواب تلخ تیوری چڑھا کر یہ اچھی جھڑکی دی بس سخن طرازی اور نکتہ پردازی آپ پر ختم ہے۔ مہمانوں سے کوئی ایسی بد کلامیاں کرتا ہے ؎

صبح دم مرغِ چمن با گلِ نوخاستہ گفت ناز کم کن کہ دریں باغ بسے چوں تو شگفت
گل بخندید کہ از دست نرنجیم ولے ہیچ عاشق سخنِ تلخ بہ معشوق نہ گفت

حسن آرا۔ دگر دن نیوڑھا کر) آپ بھی کیسے انجان بنے جاتے ہیں۔ ذرا سی بات پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ بادل کی یہ اٹھکھلیاں بجلی کی یہ شوخیاں۔ پھر میں نے بھی شوخی کی تو کیا گناہ کیا۔ ہمارا حریفانہ جواب اور تمہارا عتاب اور خیر سے آپ معشوق

کس کے بنے ہیں۔ لے تیری قدرت آپ بھی اتنے ہوئے غیر جہان ہو گیا کہوں۔

آزاد۔ خوب رو جتنے ہیں دل لیتی ہے سب کی شوخی
ہے مگر آپ کی شوخی تو غضب کی شوخی

سپہر آرا کے تو اس وقت بڑے کڑوے تیور پڑتے ہیں۔ ذرا ہماری خاطر سے مسکرا دیجیے۔ غریبوں کی ہفتاد پشت پر احسان کیجیے۔

بر آسمان چہارم مسیح بیمار ست
تبسم تو ز بہرِ علاج می خواہد

پیر مرد۔ میاں یہ عروس شرمگیں اور عصمتیانِ پردہ نشیں ہیں حیا اور مزاج جیسے بو در گل۔ ادب اور طبیعت جیسے کیف در مل۔ خدا کا شکر کرو کہ ایک رنگیں دبر بہار بجرے پر ایسے سہانے وقت یہ رو کشِ شاہدان فرخار تمہارے قریب اس شانِ برنائی اور زیب و خود نمائی سے بیٹھی مذاق کر رہی ہیں۔ پہلے کوئی ہو تو لے۔ صبر کرو۔

آزاد عاشق سے بھی ہوتا ہے کہیں صبر و تحمل
وہ کام تو کہتا ہے جو آتا نہیں مجھ کو

اتنے میں وسط دریا میں ایک رنگین و عشرت آگیں و خوش نما اور باتزئین کوٹھی نظر آئی اور سپہر آرا اس کو مشاہدہ کر کے خوب ہی کھلکھلائی۔ حسن آرا بول اٹھی کہ لو وہ کوٹھی آئی وہ کوٹھی آئی۔ پیر مرد نے کہا چلو اب بن آئی۔

سپہر آرا۔۔ یہ کوٹھی ہے یا روضۂ رضواں یہ مکان ہے یا چوتھا آسماں یہ دریا ہے یا سلسبیل یہ باغ ہے یا گل زارِ خلیل۔ سبزہ چو طرفہ لہلہایا گلستانِ عالم بدا برمسرت چھایا۔ کہیں کوئل کی کوک کہیں موروں کی ہوک ادھر ادھر دریا رواں۔ بیچ میں ایوانِ سپہر تو اماں چلیے یہاں لطفِ صحبت اٹھائیں سب سے الگ تھلگ بستر جمائیں۔

آزاد۔ واہ کیا پری خانہ ہے کہ پرستان بھی اس کے آگے مات ہے یہ رات ہے یا شب برات ہے اور کیوں نہ ہو سعد اکبر کی کرامات ہے۔ سچ تو یوں ہے کہ یہ سب طلسمات ہے۔ ساری کلفت دور ہو گئی دل کی بے تابی کافور ہو گئی۔

نظر آیا کوثر کی موجوں کا نور نہ ٹھہرے گا دل بے شراب طہور

میاں آزاد اور پیر فرخ نہاد اور وہ دونوں پیاری بہنیں لطفِ بہار اٹھاتی سیر دریا کرتی چلی جاتی تھیں۔ بجرے بہاؤ پر فراٹے سے رواں۔ بادِ بہاری چھاں۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کالی کالی گھٹائیں۔ سپہر آرا کی پیاری پیاری باتیں حسن آرا کی رمز و کنایہ کی گھاتیں۔ بوندوں کا گرنا اور آبِ جوئبار کا جنبش کرنا عجب بہار دکھاتا تھا۔ دریا کا پانی لہریں مارتا ہوا جاتا تھا۔ ایک دفعہ ہی ہوا نے وہ زور باندھا کہ مینڈھا اچھلنے لگا اب بجرے کی یہ کیفیت ہے کہ ڈانواں ڈول تہ و بالا ہو رہا ہے یہ گرا وہ گرا۔ یہ ڈوبا۔ وہ ڈوبا۔ یہ لہر آئی وہ ہو رہا۔ وہ تھپیڑا کھایا یہ آیا۔ پیر مرد بے چارہ گو جہاں دیدہ اور خرانٹ تھا لیکن اس کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ سیر دریا کی کہانیاں سب بھول گئے۔ چہرے پر عرق ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ بدن بھر میں رعشہ۔ حسن آرا کا چہرہ زرد۔ سپہر آرا کا دل سرد۔ دونوں بہنیں ایک دوسرے کو حسرت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں سپہر آرا کی آنکھوں سے جوئے اشک جاری حسن آرا مصروفِ گریہ و زاری میاں آزاد خستہ و خراب با دلِ پر اضطراب حیران و پریشان کہ یا الٰہی کیا برے پھنسے۔ کنارِ دریا کو جو دیکھتے ہیں تو کالے کوسوں بیچوں بیچ میں بجرا جا رہا ہے ایک مرتبہ ہی بجلی اس زور سے تڑپی کہ حسن آرا ڈر کر میاں آزاد سے چمٹ گئیں۔ میاں آزاد اس وقت بے اختیار رو دیے کہ معشوق گلے بھی ملا تو اس نازک حالت میں یہ پہلا ہی موقع تھا کہ میاں آزاد کو کسی نے روتے دیکھا ہو۔ حسن آرا اور میاں آزاد خوب پھوٹ پھوٹ کر گلے مل مل کے روئے۔ اتنے میں ایک دفعہ ہی بجلی لوٹی اور رعد اس زور سے گرجا کہ سپہر آرا ڈر کر دوڑی اور افسوس صد افسوس کہ مارے گھبراہٹ کے ندی میں گر پڑی۔ ڈوبتے ہی پہلا غوطہ کھایا اور لگی ہاتھ پاؤں پھٹ پھٹانے اور بھی نیچے ہو رہی اتنے میں ابھری اور پھر غوطہ کھایا۔ حسن آرا سکتے کے عالم میں میاں آزاد نے جو یہ کیفیت دیکھی تو جھٹ پٹ کپڑے اتار کر دھم سے کود ہی تو پڑے اب حسن آرا بے چاری سمجھی کہ سپہر آرا اور میاں آزاد دونوں کے دونوں ڈوبے۔ لگی دو ہتڑ پیٹنے۔

میاں آزاد نے غوطہ کھایا تو سپہر آرا کی زلفِ پریشاں ہاتھ آئی انھوں نے جھپ سے زلف کو پکڑ کر جھٹکا دیا تو وہ ابھری یہ وہی سپہر آرا ہے جو پردۂ زنگاری کے اٹھتے ہی عجب ادائے دل ربا سے بھاگی تھی۔ یہ وہی حسن آرا ہے جو نامحرم کو مقابل دیکھ کر بدن کو چھپاتی تھی اور بھرتی سے بھاگ جاتی تھی کل یہ پردہ تھا آج گلے لپٹی۔ الغرض میاں آزاد سپہر آرا کو ساتھ لیے ملاحی چیرتے اور کھڑی لگاتے

ہوئے چلے کہ بجرے کی طرف لے چلیں لیکن بجرا ہے کہ ہوا سے باتیں کرتا چلا جاتا ہے اور پانی بلیوں اچھلتا ہے - ایک دفعہ ہی میاں آزاد نے بہ آوازِ بلند پکارا - پیر مرد - پیر مرد - ملاح - ملاح - بجرا روکو - واسطے خدا کے روکو - پیر مرد کے اس وقت ہوش و حواس اڑے ہوئے تھے اور حسن آرا غش میں پڑی تھیں - بجرا خدا کی راہ پر جدھر چاہتا تھا جاتا تھا - ہوا ملاح - اور خدا ناخدا - میاں آزاد گو پیراک بہت اچھے تھے لیکن برسوں سے مشق چھوٹی ہوئی تھی دم پھولنے لگا اتفاق سے ایک بھنور میں پڑ گئے اس کے پانی نے ایسا چکر کھایا کہ یہ بے خود ہو گئے لاکھ طاقت کی مگر ایک نہ چل سکی اور ستم بر ستم یہ ہوا کہ سپہر آرا چھٹ گئی - اور چھٹتے ہی تہ پر تھی - میاں آزاد کی آنکھوں سے پھر بے اختیار آنسو نکل پڑے اور یہ دوسرا مرتبہ تھا کہ میاں آزاد عمر بھر میں کبھی روئے - اب کی یہ بڑی پھرتی سے جھپٹے اور معاً لاش کو ابھارا اور پھر لاد کر چلے مگر بجرے کا کہیں پتہ ہی نہیں - وہاں حسن آرا تختے پر غش میں پڑی ہوئی تھی اور ملاح نے بجرے کو راہ خدا پر چھوڑ دیا تھا آنسو نے پھر پکارا کہ ملاح او ملاح بجرے کو روک لو - دل میں سوچے کہ معلوم ہوتا ہے بجرا غرق آب ہو گیا اور حسن آرا اور ملاح دونوں کے دونوں لقمۂ نہنگ اجل ہوئے اب میں سپہر آرا کو لادے لادے کہاں تک جاؤں اور کیا کروں - لیکن آزاد نے دل میں ٹھان لی کہ چاہے بچوں چاہے ڈوبوں جب تک جان میں جان ہے سپہر آرا کو نہ چھوڑوں گا - نہ چھوڑوں گا - اتنے میں پھر پکارا کہ یارو کوئی مدد کو آؤ - کیا دیکھتے ہیں کہ لب چشمہ سار ایک ٹیکرے پر ایک مقدس بزرگ کھڑا دیکھ رہا ہے اس نے آزاد کو اس حالت زار میں دیکھ کر آواز دی کہ شاباش برادر شاباش - ع - ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند - کارے کردۂ بابا کارے کردہ باشی باش کہ من ہم می رسم - اس کے بعد اس پیرِ مقدس نے کپڑے اتارے اور لنگوٹ باندھ کر دھم سے کود ہی تو پڑا - الا اللہ اس الا اللہ کا سننا اور اس پیر قدسی صفات کا کودنا تھا کہ میاں آزاد کو ڈھارس ہوئی اور تیزی کے ساتھ چلنے لگے پیر مقدس بوڑھا سفید آدمی - دو ہی ہاتھ کمر دی کے لگائے تھے کہ سانس پھول گئی اور پانی نے اس زور سے تھپیڑا دیا کہ پچاس گز کے فاصلے پر ہو رہے اب نہ میاں آزاد کو وہ سوجھتے ہیں اور نہ ان کو میاں آزاد نظر آتے ہیں - ملاح نے اس پیر مقدس کو اس کیفیت میں دیکھ لیا -

اس وقت اس کی آنکھوں میں اندھیر اچھایا ہوا تھا جب سمجھا کہ میاں آزاد نہیں تب تو اس نے آواز دی کہ آزاد بھائی آزاد ارے بھائی ذرا زور کر کے بجرے کی طرف آؤ پیر مقدس نے بڑی کوشش کی کہ بجرے کی طرف جھپٹے مگر نہ جا سکا اتنے میں ملاح نے ڈنڈ وار کو ہاتھ میں لے کر کھینا شروع کیا۔ قریب ہی پہنچ گیا تھا کہ ایک ناکے نے اس بوڑھے بے چارے کو بھاڑ سا منہ کھول کر ہضم کر لیا۔ ملاح نے ڈنڈ وار کو پھینک کر سر پیٹنا شروع کیا۔ ہائے ستم وائے ستم۔ واحسرتا۔ آزاد۔ آزاد۔ آزاد۔ ہائے چل بسے۔ تم بھی چل بسے۔ سپہر آرا بے چاری کا ساتھ دیا۔ یار داغِ جدائی دے گئے۔ آزاد ارے میرے آزاد۔ سپہر آرا پیاری سپہر آرا۔ ہائے ہائے تجھے کس ناز و نعم سے پالا تھا۔ تیرے دم سے گھر کا اجالا تھا۔ پیارے آزاد جواں مرد آزاد۔ اف۔ اف۔ اوف۔ یہ آواز میاں آزاد کے کان میں بھی پڑی۔ لیکن باد کے سبب سے کچھ سمجھ نہ سکے کہ کون ہے سمجھے کہ وہی پیر مقدس جو ٹیلے پر سے کودا تھا غل مچا رہا ہے تھوڑی دیر میں ان کو بجرا نظر آیا تو باچھیں کھل گئیں۔ اب یہ بالکل خستہ اور شل ہو چکے تھے لیکن نہایت ہی استقلال اور جواں مردی سے انھوں نے کھڑی لگائی شروع کی۔ ملاح نے دور سے دیکھا کہ کوئی شخص آ رہا ہے آزاد کو تو یہ سمجھ گئے کہ ڈوب ہی چکے تھے سپہر آرا کے دیکھنے کی ان کو ذرا بھی امید نہ تھی۔ اب ان کو حیرت تھی کہ یا الٰہی یہ ہماری طرح اور کس بے چارے پر مصیبت پڑی کہ اس وقت پیرتا چلا آتا ہے آزاد نے بھی پکارا کہ جیتے بچے شکر ہے اُف ری تباہی اللہ نے عزت بچائی۔ کہو حسن آرا کہاں ہیں۔ پیر مرد نے بغور دیکھا ایں! یہ حسن آرا کا نام کس نے لیا پوچھا کہ آپ کون ہیں۔ آیئے بجرا حاضر ہے۔ ایک سے دو بھلے۔ ہائے واویلا۔ آزاد نے کہا۔ میں آزاد ہوں۔ اتنا سنتا تھا کہ پیر مرد کی باچھیں کھل گئیں سوچے کہ یا الٰہی یہ خواب دیکھ رہا ہوں یا سچ مچ آزاد ہی ہے۔

جب میاں آزاد فرخ نہاد بجرے کے قریب آئے تو پیر مرد یعنی ملاح ملیح نے بڑھ کر ہاتھ پکڑا اور ذرطِ طرب سے تالیاں بجانے لگے آزاد نے سپہر آرا کو بجرے میں لٹا دیا

اور پیر مرد سے کہا کہ آیئے آپ اور ہم ان کو کسی طرح ٹانگیں اور ان کے منہ سے پانی نکالیں یہ اتنی دیر میں کیا جانے کس قدر پانی پی گئیں ہیں۔ پیر مرد اور میاں آزاد نے سپہر آرا

کو خوب مضبوط پکڑا اور ٹانگا تو بہت سا پانی نکلا اس کے بعد بجرے میں لٹا دیا اور بیگ کھول کر کسی دوا کا ایک جام اس کو فوراً پلا دیا۔ اب حسن آرا کی فکر ہوئی۔ وہ بے چاری غش میں پڑی تھی آزاد نے اس کے مُنہ پر خوب پانی کے چھینٹے دیے تو ذرا ہوش آیا۔ مگر آنکھیں بند۔ ہوش آتے ہی پوچھا کہ پیاری سپہر آرا کہاں ہے آزاد جیتے بچے۔ پیر مرد نے پکار کر کہا کہ آزاد تمھارے سرہانے بیٹھے ہیں اور تمھارا سر ان کے زانو پر ہے اور سپہر آرا صحیح سلامت تمھارے پاس لیٹی ہیں۔ اتنا سننا تھا کہ حسن آرا نے میاں آزاد کے زانو پر بوسہ دیا اور یہ پہلا ہی مرتبہ تھا کہ حسن آرا نے اپنے سچے عشق کا حال کسی طرح مُنہ یا زبان یا لب سے ظاہر کیا ہو جب حسن آرا نے آنکھ کھولی اور آزاد کو دیکھا تو کہا۔

حسن آرا۔ آزاد میری روح اگر تم پر سے فدا ہو جائے تو اس وقت مجھے اس سے زیادہ خوشی ہو جس قدر سپہر آرا کے بچ جانے سے ہوئی۔ سنو آزاد میں صدق دل سے کہتی ہوں کہ مجھے تم سے سچا عشق ہے یہ کہہ کر حسن آرا نے آزاد کا ہاتھ چوم لیا۔ اور یہ پہلا ہی مرتبہ تھا کہ میاں آزاد کے ہاتھ پر کسی ہوش کے بوسے کا نشان بڑا ہو۔

اتنے میں دوا کا اثر جو پہنچا تو سپہر آرا بھی آہستہ سے اٹھ بیٹھی اور اٹھتے ہی حسن آرا کو چمٹ کر فرطِ شادی و مسرت سے رونے لگی۔ حسن آرا بھی خوب دل کھول کر گلے ملی اور اشارہ کیا کہ میاں آزاد نے جان بچائی۔ سپہر آرا نے میاں آزاد کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ اور رو رو کر کہا کہ میاں آزاد میں تم پر سے صدقے میں تم پر سے واری ہو جاؤں میں تم پر سے قربان ہو جاؤں۔ تم نے آج وہ کیا جو ساری خدائی میں کوئی ایک اجنبی کے ساتھ نہ کرتا۔ پیر مرد نے سپہر آرا کی پیشانی پر بوسہ دیا اور میاں آزاد کو صدہا دعائیں دیں۔ اس مصیبت ناک کارروائی میں عرصہ گزرا اور وہ ایوانِ کیوان نشان جو دریا کے بیچوں بیچ میں واقع تھا نظر سے اوجھل ہو گیا۔ ہوا اب بند ہو گئی تھی اور دریا میں مینڈھا بھی نہیں اچھلتا تھا۔ بجرا آہستہ آہستہ کنارے پر آ لگا۔ اور سب کے سب اس پر سے اتر پڑے۔

آزاد۔ (گھاس پر لیٹ کر) اُف مر مٹے ارے توبہ! کیا ناشکری کا کلمہ منہ سے نکل گیا۔ (گال پر تھپیڑ لگا کر) یوں کہنا چاہیے کہ جی اٹھے۔

حسن آرا بے شک بے شبہ۔ سپہر آرا کی جان بچائی۔ میری جان بچائی۔ اماں جان

کی جان بچائی۔ اس بے چارے بوڑھے کی جان بچائی اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا۔ تم تو ہمارے لیے مسیحا ہو گئے۔ خدا اس کا تمھیں اجر دے۔

آزاد (ہنس کر) شکر ہے۔

حسن آرا۔ (لجا کر) خیر جان بچائی ہے۔

ملاح ۔ میاں آزاد خدا تم کو ایسا بوڑھا کرے کہ پر پوتے مجھ سے بڑے بڑے تمھارے سامنے کھیلیں میں کچھ اور ہی سمجھا تھا ایک شخص پیرتا ہوا جاتا تھا میں سمجھا تم ہو۔

آزاد۔ ہاں ہاں لو میں تو بھول ہی گیا تھا۔ پھر وہ کہاں گیا۔

ملاح ۔ کیا کہوں اس کو تو ایک ناکہ کھا گیا۔

آزاد ۔ کھا گیا۔ ارے ۔ توبہ! افسوس کیا جری آدمی تھا۔ جب میں سپہر آرا کو لیے ہوئے ملاحی چیرتا تھا تو میں نے غل مچایا یارو دوڑو وہ بے چارہ ٹیلے پر سے دھم سے کودا اور ایک طرف چلا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد تلاطم آب نے اس کو بھی کوئی پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر ہٹا دیا ہائے اب سنا کہ وہ ڈوب گیا۔

سپہر آرا ۔ ڈوب نہیں گیا ناکہ کھا گیا ہائے کیا مرگ مفاجات تھی۔ افسوس یہ مجھ کم بخت کے سبب اس بے چارے کی جان مفت میں گئی۔ میرا دل اس وقت بھر آیا۔ میری آنکھوں میں تاریکی سی چھائی ہوئی ہے۔ ہائے یہ دریا اس کا ستیاناس ہو جائے اس وقت کال نظر آتا ہے اف جس وقت میں اپنا گرنا اور غوطے لگانا یاد کرتی ہوں رونگٹا رونگٹا کھڑا ہو جاتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے جیسے ہی میں گری میرے ہوش اڑ گئے۔ پہلے تو خوب ہاتھ پاؤں مارے مگر پھر جب تہ پر بیٹھ گئی تو منھ میں پانی جانے لگا منہ کو میں نے دونوں ہاتھوں سے بند کیا تو ابھری۔ ابھری تو پھر پانی نے بٹھا دیا۔ پھر مجھے کچھ یاد نہیں۔

حسن آرا ۔ میاں آزاد بڑے گاڑھے وقت میں کام آئے

آزاد ۔ کس طرح کو اپنے حسابوں یقین بھی ہو کہ جیتے بچیں گے دو مرتبہ سپہر آرا ہاتھ سے چھٹ چھٹ گئیں بارے خدا نے بچایا مگر اس وقت میرے بدن کا یہ حال ہے کہ میں ہی جانتا ہوں جیسے کسی کو جینوں کا بخار ہو۔ بس وہی کیفیت ہے۔ شل ہوں مگر شکر ہے

ملاح ۔ اب آپ ذرا سو رہیے تو تھکاوٹ کسی قدر کم ہو جائے اور بیگم یہ لیجیے حاضر

ہے۔ دم کے دم آپ سو رہیں۔

میاں آزاد اور سپہر آرا اور حسن آرا اسی سبزۂ نودمیدہ کے فرش زمردگوں پر لیٹے تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی ہوائے خنک کا چلنا تھا کہ تینوں کی آنکھ لگ گئی۔ ملاح نے ان کی حفاظت کی۔ سوئے تو گھوڑے بیچ کر۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوش ہی نہیں۔ چار گھنٹے کامل سویا کیے اس کے بعد اٹھے تو میاں آزاد نے منہ ہاتھ دھویا۔ حسن آرا و سپہر آرا نے سنگار کیا اور پیر مرد نے کہا کہ ہم کو تو تم اپنے حساب غرقاب سمجھ بیٹھے ہو گے۔

آزاد۔ قبلہ اب یہ تذکرہ ہی جانے دیجیے۔ وحشت ہوتی ہے کتابوں میں کشتیوں کے ڈوبنے کا حال سنا کرتے تھے آج دریا کے مصائب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ خود اپنے اوپر بیتتی اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا۔ اس گفتگو کے بعد پیر مرد نے کہا کہ اس فرح بخش ایوانِ عالی شان میں کیوں کر جائیے گا بجرے پر تو اس وقت سوار ہونا حماقت ہے۔ میاں آزاد نے قہقہہ لگایا اور فرمایا کہ واہ ایسا بھی کیا خوف ہے۔ اب کیا ہر دم طوفان ہی آیا کرتا ہے کچھ حسن آرا اور سپہر آرا نے کہا قسم ہے خدائے پاک کی کہ اس وقت تو ہم بجرے پر نہ چڑھیں گے۔ چاہے اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے۔

آزاد۔ جو اس وقت جھجک گئیں تو عمر بھر خوف ہی دامن گیر رہے گا۔

حسن آرا۔ آپ کی بلا سے۔

سپہر آرا۔ چلیے رہنے دیجیے۔ اب تو مارے تھکاوٹ کے آپ کے بدن میں اتنی سکت بھی نہ رہی ہوگی کہ کسی کی لاش کو دو قدم بھی لے چلیے۔ نا صاحب بندی نہ جانے کی۔ ہے ہے۔ بجرے کی صورت دیکھنے سے بدن کانپتا ہے۔ تم بڑے دلیر ہو۔ ہم تمھیں کبھی نہ جانے دیں گے۔

آزاد۔ واہ۔

سپہر آرا۔ دیکھ لیجیے گا۔ ادھر آپ بجرے پر بیٹھے اور ادھر ہم دریا میں پھاند پڑے۔

آزاد۔ اچھا پھر بجرا پیر مرد لائیں آپ اور ہم کنارے کنارے خشکی خشکی آئیں۔

ملاح۔ جی میں تو فالتو ہوں۔ اچھا تجویز ہے۔

القصہ پیر مرد تو بجرے پر گئے اور یہ تین کے تینوں خشکی کے راستے چلے۔

پیرمرد تو ادھر چشمہ سار میں بجرا چلا رہے تھے ادھر میاں آزاد دونوں شاہدان طناز اور سراپا ناز کے ہاتھ میں ہاتھ دیے ہوئے کنارے کنارے جا رہے تھے۔ دریا کی روانی دیکھ کر سپہر آرا کانپ کانپ اٹھتی تھیں اور حسن آرا صرف آزاد کے چھیڑنے کو نقاب سے منہ ڈھانپ رہی تھیں۔

آزاد۔ بس یہی تو قہر ہے۔ اب ہم سے پردہ کیسا۔

حسن آرا۔ ہم نامحرم سے بات کرنا وضع کے خلاف سمجھتے ہیں۔

آزاد۔ ہاں ذرا اِدھر چار آنکھیں تو کیجیے۔ پھر تو فرمائیے نامحرم۔ ہم نامحرم ہیں۔ کیوں سپہر آرا بیگم۔ ان کی باتیں تو سنو۔ ہمیں نامحرم بتاتی ہیں۔

سپہر آرا۔ آپ اور نامحرم۔ اس وقت تو دریا کو دیکھ کر میں سہمی جاتی ہوں۔ اُف۔ رونگٹا رونگٹا کھڑا ہو گیا۔ اللہ بچائے۔

ملاح ۔ ہمارا بھی خدا حافظ ہے۔

حسن آرا (گھاس پر بیٹھ کر) اُف بھئی ہم سے تو اب ایک قدم نہ چلا جائے گا۔ پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ آپ جائیں ہم نہ جائیں گے۔

آزاد۔ اللہ اللہ آپ اتنی ہوئیں کہ اس چٹیل میدان سنسان بیابان میں تن تنہا گھاس پر لوٹیں۔ چلیے بس اب تھوڑی دور تو ہے ہی ہماری خاطر سے چلی چلو۔

حسن آرا۔ اللہ جانتا ہے جو اٹھا بھی جاتا ہو۔ آپ کچھ فکر کیجیے ہم سے تو ہمسا تک نہیں جاتا۔ آخر چلنے کا کچھ ٹھکانا بھی ہے۔

آزاد۔ اب آپ بجرے پر سوار ہوں میں ساتھ ہوں۔

سپہر آرا (کانوں پر ہاتھ رکھ کر) معاذاللہ۔ خدا کی قسم ہم نہ جانے کے۔ بجرے پر سوار ہوتے کو روح فنا ہوتی ہے بس بجرا دجرا رہنے دیجیے۔

حسن آرا۔ نہیں بہن بجرے پر میں خود ہی نہ سوار ہوں گی۔

یہ گفتگو ہوتی ہی تھی کہ میاں آزاد نے پیرمرد کو کنارے کی طرف پکارا اور کہا کہ بجرا روک کر اتر آؤ۔ جب پیرمرد نے بجرے کو چھوڑا اور کنارے پر آیا تو آزاد نے کہا کہ گھر جا کر گھوڑے یا فنس لے آؤ۔ حسن آرا تھک گئی ہیں۔ مگر واسطے خدا کے سپہر آرا کے ڈوبنے ڈابنے کا حال وہاں کچھ نہ کہنا۔

حسن آرا۔ تم اتنا کہہ دینا کہ کل تک ہم سب آئیں گے۔ اور سب خیریت سے ہیں۔

الغرض پیر مرد تو سواری لینے گئے اور میاں آزاد اور سپہر آرا اور حسن آرا بیٹھے باتیں کرنے لگے۔

نئی فرمائش

جب اس گوہرِ درج رعنائی اخترِ برج خود نمائی کو خواب ناز سے جگایا اور میاں آزاد کے آنے کا مژدۂ طرب انگیز سنایا تو باچھیں کھل گئیں انگڑائی لیتی ہوئی بڑے ناز و ادا سے اٹھیں اور اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی چلیں۔ اصیلوں نے دعائیں دیں اور چٹ چٹ بلائیں لیں۔ عجب ٹھسّے سے وہ نوعروس سرمایۂ ناز میاں آزاد کے قریب آن کر بیٹھی تو لباس گراں بہا سے بہشت کی لپٹیں آنے لگیں۔

آزاد۔ مزاجِ اقدس۔

حسن آرا۔ د۔ دردِ سر ہے۔

آزاد۔ صندلی رنگوں سے ملا دل ملا
دردِ سر کی کس کے ماتھے جائے گی

حسن آرا۔ خیر سے آپ صندلی رنگ بھی ہیں۔

آزاد۔ کوئی سپہر آرا کے دل سے پوچھے۔

سپہر آرا۔ کیا۔ اس میں شک بھی ہے کچھ لاکھوں میں لاجواب کروڑوں میں انتخاب، یہ رخسار ہیں یا گلاب۔ اُف رے حسن اللہ رے آب و تاب اس ادا کے واری۔ اس سج دھج کے صدقے یہ ہٹ دھرمی باجی اچھی نہیں۔

آزاد۔ اے ترکِ غمزہ زن کہ مقابل نشستۂ — در دیدہ ام خلیدہ و در دل نشستۂ

کیا سچ مچ ہماری صورت نہیں بھاتی ایسے نظروں سے گر گئے۔

حسن آرا (مارے شرم کے آنکھیں نیچی کر کے بولیں) اب کوئی اور بھی تذکرہ ہے یا نہیں۔

آزاد۔ آپ کی چشم بیمار جو فردوش و گندم نما و ہوش ربا ہے۔ اصل میں ظالم بلکہ اظلم لیکن ظاہر میں مظلوم نما ہے۔

حسن آرا نے اپنے دستِ نازک سے ایک گلوری بنائی اور اپنے ہی ہاتھ سے

میاں آزاد کو کھلائی۔ اُہو، ہو ہو۔ سپہر آرا بولی لو میاں آزاد نقشہ جم گیا۔ اس پر میاں آزاد نے پاندان چھین کر ایک گلوری خود بنائی اور ہزاروں قسمیں دے دے کر اپنی مطلوبہ مطبوعہ کو اپنے ہاتھ سے کھلائی۔ سپہر آرا نے کہیں دیکھ لیا تو کہتی کیا ہے۔ اب ہمارے کلیجے میں ٹھنڈک پڑی کوئی لاکھ چوری سے پان کھائے لبوں کی لالی کب چھپ سکتی ہے۔ حسن آرا کی پیشانی پر عرق آگیا۔ مگر جب ایک دفعہ چھوٹی بہن کی طرف دیکھا تو مسکرا کر گردن پھیر لی۔ میاں آزاد اس وقت مارے خوشی کے پھولے جامے میں نہیں سماتے تھے۔ چہرۂ گل نار کلیجہ دھڑ دھڑ کر رہا ہے باچھیں کھلی جاتی ہیں اور حسن آرا عرق۔ نیچی نظروں سے تاک جھانک ہونے لگی۔

آزاد۔ اس وقت ہمارے دل کی کلی کھل گئی۔

سپہر آرا۔ کیوں نہیں پھر مُنہ مانگی مراد بھی تو مل گئی۔ اب مٹھائی کھلائیے مُنہ میٹھا کیجیے۔ نہیں میں بھابھی خوری پر کمر باندھوں گی۔

حسن آرا۔ اللہ یہ ان دونوں میں کیا رمز و کنایہ کی باتیں ہو رہی ہیں یہ شیرینی کیسی۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔

آزاد۔ ہم سمجھا دیں کیوں حضور۔

حسن آرا۔ جی نہیں بس معاف کیجیے۔

آزاد۔ آخر ہم کب تک ترسا کریں۔ امتحان دیا پورے اترے اب انعام تو ملے بس اب تکلف برطرف آج میں بے قبولوائے اُٹھوں تو آزاد نہیں۔ ادب آموز فرہاد نہیں۔ ایک حسن گلو سوز اس پر طرہ ناز جگر دوز ؎

آوازۂ حسنت شدہ از ناز دو بالا چوں نغمہ کہ لطفش شود از ساز دو بالا

حسن آرا۔ ہمارا تو اس وقت برا حال ہے نیند امڈی چلی آتی ہے۔ آنکھیں جھکی پڑتی ہیں۔ اف جمائی پر جمائی آ رہی ہے۔ بند بند ٹوٹا جاتا ہے (نیم خمیر ہو کر) اب ہمیں سونے جانے دیجیے۔

آزاد (دوپٹا پاؤں سے دبا کر) بسم اللہ آرام کیجیے جائیے۔ اب جائیے اے صاحب تشریف لے جائیے۔

حسن آرا (تنگ کر) چھیڑ دخانی سے آپ باز نہیں آتے۔ دامن تو دبائے ہیں اور کہتے ہیں جائیے جائیے اب جائیں تو کیونکر جائیں۔

آزاد۔ دوپٹے کو پھینک جائیے۔
حسن آرا۔ بجا۔ یہ کسی اور کو سکھائیے (بیٹھ کر) اب صاف کہہ دوں۔
آزاد۔ ضرور۔ مگر آپ کے تیور اس وقت بے ڈھب ہیں۔ خدا ہی خیر کرے۔ کہ ڈالیے جو کچھ کہنا۔ (خدا کرے میرے مطلب کی بات منہ سے نکلے۔
سپہر آرا۔ آمین۔
حسن آرا۔ آپ لائق فائق علم و ہنر کے شائق مغرور ممدوح زندہ دلوں کی جان و روح۔ نوخیز۔ نوجواں۔ خوش تقریر خوش بیاں۔ فصیح زباں داں۔ نکتہ سنج، مرنجاں مرنج۔ عالی خاندان معالی دودمان۔ فہمیدہ و سنجیدہ۔ حسین و مہ جبین سب کچھ ہیں۔ اور میں تو آپ پر ایسی ریجھی ہوں کہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ فصاحت و بلاغت میں آپ کو سلمان ساؤجی پایا تو حسن و جمال میں یوسف مصری۔

مگر آپ مسافر غریب الوطن اجنبی پردیسی آدمی۔ آپ کا ٹھور نہ ٹھکانا گھر نہ بار۔ خانہ بدوش خانہ برباد۔ خانما خراب۔ میں کسی سے آپ کا ذکر کروں تو کہوں کیا؟ کس کے لڑکے ہیں کس کے پوتے ہیں کس کے نواسے۔ کس خاندان کے ہیں؟ مکان کہاں ہے۔؟ میں بتاؤں گی کیا۔ شہر بھر میں یہی خبر مشہور ہو جائے گی کہ حسن آرا نے ایک پردیسی کے ساتھ نکاح پڑھوالیا۔ جس کے حسب نسب کا پتا ہی معلوم نہیں۔ مجھے تو اس کی پروا نہیں۔ میں تو خوب جانتی ہوں۔ ع

کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

لیکن مجھے ڈر یہ ہے کہ مبادا اس نکاح سے اور تعلیم یافتہ شریف زادیوں کو عوام حقارت کی نظر سے دیکھنے لگیں اور مجھ کو لوگ بد وضع سمجھیں جو مجھ کو مر جانے کے برابر ہوگا۔ بات وہ کرنی چاہیے کہ دھبا نہ لگے اور ہم اور تم لطف سے زندگی بسر کریں۔ اب ساری بات یہ ہے کہ اپنے مشہور کرنے کی فکر کیجیے۔ مشہور کرنے کے یہ معنی نہیں کہ آپ کسی کے گھر پھاندیے اور ڈکیتی میں نام پیدا کیجیے مطلب یہ کہ نیکی کے ساتھ لوگ آپ کو یاد کریں۔

آزاد (خوش ہو کر) چشم ما روشن دل ما شاد۔ کہیے تو آگ میں پھاند پڑوں۔
حسن آرا۔ ماشاء اللہ، کہی بھی تو وہی وحشت کی بات۔ تم آگ میں پھاند پڑو اور مجھے جلاؤ۔ کوئی معقول بات سوچو۔ جس میں نام ہو۔ اگر آگ میں پھاند پڑے اور

بالفرضِ محال بچ بھی گئے تو لوگ آپ کو سڑی سودائی ہی سمجھیں گے۔
سپہر آرا۔ کوئی کتاب تصنیف کیجیے۔
حسن آرا۔ نہیں کوئی حمیت اور بہادری کی بات ہو کہ جو سنے عش عش کرنے لگے۔ اور پھر اچھی اچھی رئیس زادیاں چاہیں کہ ان کے ساتھ میاں آزاد کا بیاہ ہو جائے لیکن اس وقت ہمیں آپ کا ہے کو پوچھنے لگے۔ پھر دماغ ہی نہ ملیں گے۔
آزاد۔ اگر میرے ایسے خیالات ہوں تو خدا مجھے غارت کرے۔
حسن آرا۔ تو سنیے اب روم و روس میں جنگ چھڑنے والی ہے روم کی مدد آپ پر فرض ہے۔ آپ روم کی طرف سے لڑیے۔ اور تیغ بسالت کے خوب جوہر دکھایئے تمغے لٹکائے ہوئے آیئے تو وہ نام ہو کہ ہندوستان بھر میں پھر گھر گھر آپ ہی کے چرچے ہوں اور ہم فخر سے کہیں کہ میاں آزاد ہمارے شوہر ہیں۔
آزاد۔ (ٹوپی اچھال کر) منظور۔ جاؤں اور بیچ کھیت جاؤں۔ اور زندہ رہے تو تم کو پایا۔

سپہر آرا اس تقریر کو سن کر آنسو بھر لائی اور آزاد کے قدموں پر ٹوپی رکھ کر کہنے لگی کہ واسطے خدا کے یہ خیال دل سے دور کرو۔ کجا روم کجا ہندوستان، وہاں تک خیال بھی منزل بہ منزل دم لیتا ہوا جاتا ہے اور میدانِ کارزار کے نام سے میرے ہوش بجاں ہوتے ہیں۔ میاں آزاد نے کہا آپ ابھی بالکل کم سن لڑکی ہیں۔

میاں آزاد وہاں سے رخصت ہوئے کہ کل ملیں گے اور پرسوں کوچ۔

رقص و سرود کی رات اور خوجی سے ملاقات

میاں آزاد چلے تو ایک مقام پر محفلِ رقص و سرود آراستہ تھی اور ایک زن زریں کمر رشکِ قمر لہرا لہرا کر گاتی تھی۔ وہ دھما چوکڑی بچ رہی تھی کہ واہ جی واہ طبلے کی تھپک اور باتوں کی گمک نے ان کو ایسا سرور بخشا کہ محو از خود رفتہ ہو گئے ایک غزل ختم ہوئی دوسری شروع ہوئی۔ دوسری گا چکی تیسری چھیڑی۔ کبھی ٹھمری کبھی ٹپا۔ کبھی خیال کبھی کدرا۔ طبلیے اپنا کمال دکھاتے ہیں۔ سارنگی سنم بپا کرتی ہے۔ میاں آزاد ایک ہی رنگین آدمی جم گئے اب اس وحشت کو دیکھیے کہ غیر کی محفل اور حضرت اہتمام کرتے

ہیں کبھی حقے کی چلم بھرواتے ہیں کبھی گڑگڑی کو تازہ کراتے ہیں کبھی ٹھمری کی فرمایش۔ کبھی حقانی غزل کی۔ دس پندرہ گنواروں نے جو گانے کی آواز سنی تو ہنس پڑے میاں آزاد نے سب کی گردن ناپی۔ الگ الگ۔ باہر سے سنو مالک خانہ نے جو دیکھا کہ ایک شریف سرخ و سفید متین آدمی انتظام میں مصروف ہیں تو ان کو پاس بلایا تپاک سے بٹھایا اور حقہ پلایا۔ اب سنیے کہ تڑکا ہو گیا تب آزاد چیتے کہ ارے نہ تو حسن آرا کے یہاں گئے نہ روم جانے کا بندوبست کیا اور بھور ہو گئی۔

افشانِ چین پریشانی۔ گیسوئے عذار سرگردانی۔ ماشطۂ عروسِ حیرانی۔ دل دادۂ جمالِ جانِ جانی۔ خانماں خراب خانہ برباد میاں آزاد نے رات بھر محفلِ رقص و سرود میں خوب جشن اڑائے اور عنبریں مویاں پری زاد و مطربانِ باربد نژاد نے اپنے اپنے کرتب دکھلائے ارباب نشاط کی خوش الحانی اور قوالوں کی غزل ہائے حقانی نے کانوں کو سرور بخشا۔ اور چراغاں کی بہار اور گل بدنوں کے گل رخسار نے آنکھوں کو نور۔ محفل دولہن کی طرح سجی سجائی۔ لیکن ادھر گجر ہوا شروع ہوا ادھر نوبتی نے صبح کی نوبت بجائی۔ تڑکا ہوتے ہی میاں آزاد کا بھور ہو گیا۔ جان سنسنانے لگی۔ وعدہ کی یاد دل دکھانے لگی۔ بدن پر لرزہ سا چڑھا۔ آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ دل بھر آیا۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ تانوں پر سر ہلانا بھول گئے۔ لطفِ صحبت کرکرا ہو گیا۔ اب نہ وہ رنگ ہے نہ وہ ترنگ ہے۔ وہ جوش و خروش نہ وہ امنگ ہے۔ مت بھنگ عقل دنگ۔ پائے خرد لنگ کیسا ناچ کیسا رنگ میاں آزاد اٹھے اور وہاں سے پریشان نادم و پشیمان با دلِ سرد و آہ دردِ دلِ بیچ راستے میں بصد حسرت و حرماں سوچتے جاتے ہیں کہ اللہ اللہ ہم ایسی صحبتِ بد میں اس درجہ محو اور خود فراموش ہو گئے کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہی ؎

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے   جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

حسن آرا کے دل میں طرح طرح کے خیالات جاتے ہوں گے سپہر آرا کو غش پر غش آتے ہوں گے۔ پیر مرد وجیہ واللہ اعلم کیا سمجھاتے بجھاتے ہوں گے رقیب روسیاہ کچھ اور ہی پٹی پڑھاتے ہوں گے۔ حسن آرا آٹھ آٹھ آنسو روئی ہو گی۔ سپہر آرا رات بھر نہ سوئی ہو گی۔ گیتی آرا کو یہی ذکر جہاں آرا کو یہی فکر ہو گی کہ آزاد کے دل میں کیا سمائی۔ کیا روم چلے گئے اور ہمیں صورت بھی نہ دکھائی۔

میاں آزاد خانہ برباد یہ سوچتے بہ صد حسرت و یاس سراسیمہ و بدحواس جا رہے تھے کہ دفعتاً دیکھتے کیا ہیں کہ ایک پُر بہار کنج میں جھولے پڑے ہیں اور بارہ بارہ تیرہ تیرہ برس کی چھوکریاں پٹیاں جمائے ہاتھ پاؤں میں مہندی رچائے مانگ نکالے گلے میں ہار ڈالے ہوئے پینگ لگا رہی ہیں اور دھانی دھانی دوپٹوں اور لال لال چنری کا جوبن دکھا رہی ہیں اور سب پیاری ادا اور سریلی آواز سے لہرا لہرا کر یوں گا رہی ہیں (ندیا کنارے بیلا کین نے بویا۔ ندیا کنارے بیلا بھی بویا چنبیلی بھی بوئی بیچ بیچ بویا رے گلاب۔ ندیا کنارے) میاں آزاد کو ان پیاری پیاری گوری گوری لڑکیوں کا گانا اور لہرانا ایسا بھایا کہ تھوڑی دیر اس کنج میں ایک درخت کے سایے میں ذرا ٹھہر گئے۔ جب کبھی پینگ رک جاتا تھا تو میاں آزاد خود پینگ لگاتے تھے اور کبھی کبھی گنگناتے بھی جاتے تھے ان کو ان پیاری معصوم لڑکیوں سے ایسی محبت ہو گئی تھی جیسے کسی اپنی سگی چھوٹی بہن کا پیار ہوتا ہے ان کے گانے اور گنگنانے پر وہ کم سن لڑکیاں کھل کھلا کھل کھلا کر ہنس ہنس پڑتی تھیں اتنے میں میاں آزاد کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مجسم شامت پستہ قامت کوتاہ گردن۔ تنگ پیشانی بشرۂ خباثت کی نشانی کھڑا دور ہی سے جھولوں پر نگاہِ بد ڈال رہا ہے جب انھوں نے کئی بار یہ کیفیت دیکھی تو ان سے رہا نہ گیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ایک چپت زناٹے سے جما ہی تو دی۔ ٹیپ کھاتے ہی وہ جھلا اٹھا اور گالیاں دے کر کہنے لگا کہ نہ ہوئی ولایتی اس وقت پاس ورنہ بھٹا سا سر اڑا دیتا اور جو کہیں بھوکا ہوتا تو کچا ہی کھا جاتا اور جو کہیں نشے کی جھانج ہوتی تو گھول کر پی جاتا۔

میاں آزاد نے نشے کا نام جو سنا تو چونکے۔ غور کر کے دیکھا تو سن سے جان نکل گئی۔

یہ میاں خوجی تھے۔ کون خوجی؟ نواب صاحب کے مصاحب کون نواب؟ وہی بٹیر باز۔ کون بٹیر باز۔ وہی صف شکن علی شاہ۔ کون صف شکن علی شاہ۔ وہی جن کی تلاش کو میاں آزاد نکلے تھے چار آنکھیں ہوتے ہی انھوں نے ان پر اور انھوں نے ان پر نظر ڈالی۔

آزاد۔ ایں! بھائی خوجی ہیں۔ اللہ اکبر برسوں کے بعد ملاقات ہوئی مزاج تو اچھا ہے۔

خوجی۔ جی ہاں مزاج تو اچھا ہے لیکن کھوپڑی بھنا رہی ہے واہ استاد بات کرتے ہی گال کاٹ لیا اور تو در کنار۔ علیک سلیک بالائے طاق۔ آتے ہی وہ زناٹے دار تھپ جمائی کہ توبہ ہی بھلی بھلا آخر ہم نے تمہارا بگاڑا کیا تھا۔ اف کھوپڑی کے پرخچے اڑ گئے نہ ہوئی قرولی۔

آزاد (دست بستہ) بھائی معاف کرنا قصور ہوا۔ معاف کرنا۔

خوجی۔ جی ہاں جوتیاں لگائیے اور کہیے معاف کرنا اور دل لگی یہ کہ بیس بیس دفعہ معافی مانگتے ہیں اچھی مزاج پرسی کی کہ آتے ہی تڑسے ایک دھول جمائی وہ تو کہیے کہ مجھے جلدی سے معلوم ہو گیا ورنہ اس وقت میں آپ کو جان سے مار ڈالتا۔ لانا میری قرولی۔

آزاد۔ اس میں کیا شک ہے کہیے آخر آپ آئے کہاں۔

خوجی۔ آپ ہی کی تلاش میں آئے تھے آپ نے ملتے ہی کھوپڑی ہلا دی۔

آزاد۔ نواب تو اچھے ہیں۔

خوجی۔ اجی وہ گئے چولہے میں۔ یہاں سر بھنا رہا ہے۔ اف لے اب چلو تمہارے ساتھ چلیں۔ کچھ تو کھلاؤ یار۔ اس وقت مارے بھوک کے بے دم ہوئے جاتے ہیں۔

آزاد۔ چلیے آئیے بسم اللہ۔ مگر واسطے خدا کے سچ کہنا ہماری گرفتاری کے لیے تو نہیں آئے ہو۔ بھائی ہم ہرگز نہ جانے کے اب یہاں اور ہی دھن ہے۔

آخری ملاقات اور سفر کی تیاری

میاں آزاد خانہ برباد قدم قدم پر آہ سرد بھرتے اور نفس امارہ پر نفریں کرتے میاں فراف کے گھر پہنچے تو وہاں افیونیوں کے پشت و پناہ میاں خوجی وحش اللہ چانڈو کے نشے میں عین پڑے ہوئے ہیں۔ یہ بلا یہاں کہاں سے آئی۔ اے لاحول! بھئی اس نے تو بے طور پیچھا کیا مگر اس وقت پڑا رہنے دو پھر سمجھا جائے گا۔ میاں آزاد پلنگ پر لیٹے تو ادھر ادھر لوٹ مار رہے ہیں مگر سونا حرام۔ نیند نہیں آتی پلک کا جھپکنا مشکل ہو گیا اور ستم پر ستم یہ کہ میاں خوجی ساتھ نہیں چھوڑتے

رات بھر سونے کے عوض رویا کیے یہ سوچ رہے تھے کہ اتنے میں غنچۂ صبح کھل کھلایا اور میاں آزاد کو شوق چرایا کہ چلو حسن آرا سے ملو۔ سچ ہے ؎

علی الصباح چو مردم بہ کار و بار روند　　بلاکشانِ محبت بہ کوے یار روند

چلیے تو ذرّہ ذرّہ گل خیز۔ قطرہ قطرہ بادۂ مسرت سے لبریز۔ بادِ بہار گل فشاں۔ یہ بلبلِ زار مسرت غزل خواں۔ ساغر نوش بدمست غنچے طرب پرست۔ اِدھر سبزے کی لہک۔ اُدھر قطرہ ہائے شبنم کی جھلک۔ میاں آزاد نے ایک بھٹی کے قریب دو شرابیوں کو لڑتے جھگڑتے دیکھ کر کہا کہ خدائی خوار گدھے سوار تم دونوں پر شیطان کی پھٹکار۔ خدا کی مار۔ یہ وضع اور یہ جوتی پے زار۔ سرِ بازار تکرار اور مار دھاڑ۔ ذرا تو دل میں شرماؤ۔ مارے خفت کے زمین میں گڑ جاؤ۔ ان میں سے ایک نے کہا ؎

رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد　　زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

دوسرے نے اس کو چھوڑ کر ان کا پیچھا کیا۔ ان کو پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔ اب سنیے کہ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ میاں آزاد کی ٹوپی اچھال دی۔ میاں آزاد جھلائے اور وہ دونوں بھی طیش میں آئے اور لگا گدا اچلنے۔ آزاد نے چپت لگائی اور دھول جمائی۔ ہات ترے کی تڑ اور پھٹ۔ دھم اور کھٹ۔ تڑاق اور پڑاق۔ بازار میں ہلڑ مچا ہوا۔ تماشائی ٹھٹھ کے ٹھٹھ جمع اتنے میں غل جو ہوا تو میاں خوجی پینک سے چونک پڑے۔ ظراف کی لونڈی نے کہا میاں ایسی نیند لوج کسی بھلے مانس کو نہ آئے۔ آزاد سے باہر گدے بازی ہو رہی ہے اور تم یہاں خراٹے لے رہے ہو اتنا سننا تھا کہ میاں خوجی آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو لٹھ نہ ڈنڈا۔ انھوں نے جھپ سے چانڈو کی نگالی اٹھائی اور لپکے اور لپٹتے ہی غل مچایا کہ ابے او گیدی ٹھہر جا۔ میں آن پہنچا۔ شرابیوں نے جوان پر نظر ڈالی۔ واہ جی واہ کیا قطع شریف ہے۔ ننھے سے آدمی۔ ٹینی مرغے کے برابر قد۔ اور یہ خم اور دم۔ انھوں نے آزاد سے اپنے کو چھڑا کر ان کی خبر لی۔ جھلا کر آپ نے نگالی اٹھائی۔ ایک نے نگالی چھینی اور لگا کھٹا کھٹ جمانے۔ میاں ہی کی جوتی میاں ہی کا سر۔ دوسرے نے کسی سے پوچھا نہ پاچھا۔ جھپٹ کر میاں خوجی کو کاٹ کھایا۔ اتنے میں میاں آزاد نے چپکے سے اپنی راہ لی۔ خوجی بے چارے پٹ پٹا کر اٹھے کچومر نکل گیا۔ مگر واہ رے خوجی۔ پھر بھی

وہی خم دم ہیں وہی تیکھی چتون۔ ماشہ بھر کا تو قدِ شریف مگر اکڑتے ہی جاتے ہیں۔ اور دونوں شرابیوں کو اس طرح گھور رہے ہیں جیسے کھا ہی جائیں گے۔ حوالی موالی حضرت کی قطع دیکھ دیکھ کر لوٹن کبوتر ہوے جاتے ہیں۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ اب خوجی ہیں کہ دنیا بھر کو گالیاں دے رہے ہیں آخر کار جھاڑ پونچھ کر چل دیے۔ لونڈی نے کہا کہ واہ میاں گئے تھے پیٹنے اور الٹے پٹ کر آئے۔ اتنی پڑیں بے بھاؤ کی کہ کھوپڑی گنجی ہوگئی۔ چاند پر ایک بال تک نظر نہیں آتا۔ خوجی بہت ہی جھلائے اور آگ بھبھوکا ہو کر کہنے لگے کہ چپ شہ کارہ تو ہمیں کیا جانے کھوپڑی گنجی کیسی۔ یہ گنجی کھوپڑی کے کیا معنی۔ آخر یہ تو نے کہا کیا ہماری کھوپڑی پر بال تھے ہی کب۔ یہاں پیدائشی ہی ایسے بال ہیں اور صاف چاند تو خوش اقبالوں کی نشانی ہے۔ اس نے قہقہہ اڑا کر کہا اب ہٹو بھی۔ آئے وہاں سے بڑے اقبال مند بن کر واہ کیا بات ہے۔ صورت سے تو پھٹکار برستی ہے اقبال والے بنے ہیں۔ خوجی دانت پیس کر رہ گئے اور بولے بس چلی جا۔ نہ ہوئی جوانی ورنہ کھود کر اسی جگہ دفنا دیتا۔

میاں آزاد کو اس قصہ سے کیا واسطہ وہاں تو اور ہی دھن تھی اور ہی ادھیڑ بن تھی۔ مگر ان کی طبیعت بگڑنے لگی اور رفتہ رفتہ ایسے علیل ہوئے کہ تپ چڑھ آئی۔ اب ایک قدم چلنا بھی دو بھر ہو گیا۔ ناچار پیپل کے درخت کے سایے میں جس کے دھانی دھانی پتیوں کی نمک ریزی ستم ڈھاتی تھی بیٹھے اور ع بیٹھے تو گرے گرے تو بے ہوش۔ حسن اتفاق سے پیر مرد کا اسی دم وہاں گزر ہوا یہ فنس پر سوار چلے جا رہے تھے دور سے دیکھا کوئی سفید پوش خانہ بدوش بے ہوش پڑا ہوا ہے جب قریب آئے تو کہاروں کو حکم دیا کہ فنس رکھ دو۔ بسم اللہ کہہ کر انھوں نے فنس اتاری پیر مرد قریب جا کر جو دیکھتے ہیں تو آزاد ارے۔ معاذ اللہ یہ بے چارہ آزاد ہے۔ اسے خوب ہوا ہم اس وقت آ گئے ورنہ ان کا تو کام ہی تمام ہو جاتا۔ کہاروں نے میاں آزاد کو اٹھایا اور فنس پر لٹایا اور لے چلے پیر مرد پیچھے پیچھے پیادہ پا جانے لگے کہاروں نے جو قدم بڑھایا تو ہوا ہو گئے اور کھٹ سے ایوانِ سپہر تواماں میں تھے اتنے میں پیر مرد بھی کانکھتے کونکھتے پہنچے اور آزاد کی نبض دیکھی تو سرعت پائی۔ محل میں گئے حسن آرا سے کہا کہ جلد پلنگ بچھواؤ میاں آزاد آئے ہیں حسن آرا۔ ہائیں! ہائیں۔ بوڑھے میاں ہوش کی دوا کرو۔ تم تو اس وقت اپنے

آپے سے گزر گئے ہو۔ اے واہ کہنے لگے آزاد آئے ہیں۔ پلنگ بچھواؤ۔ یہ پلنگ کی کیا بات چیت ہے۔

سپہر آرا۔ (گھبرا کر) اچھے تو ہیں۔

پیر مرد۔ بے ہوش پڑے ہیں خدا ہی خیر کرے۔

حسن آرا۔ (ہاتھ مل کر) ہے ہے یہ کیا کہتے ہو۔ پاؤں تلے سے مٹی نکل گئی۔ جی سنسانے لگا۔

سپہر آرا۔ (بدحواس ہو کر) کلیجہ دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ اف ایسی سنائی اللہ ساتویں دشمن کو بھی نہ سنائے۔

پیر مرد۔ کہارو فنس یہاں اٹھالاؤ۔

کہاروں نے فنس اٹھائی اور پلنگ کے پاس لگائی۔ آدمیوں نے مل کر میاں آزاد کو پلنگ پر سلا دیا۔ کمرے میں فقط حسن آرا سپہر آرا دل بہار اور پیر مرد حسن آرا نے جو یہ کیفیت دیکھی تو سن سے جان نکل گئی۔ سپہر آرا کے گلِ رخسار پر آنسو ہی آنسو نظر آتے تھے۔

دل بہار۔ بیوی اس سے کچھ نہ ہونے کا دوا درمن کرو۔ دوڑ دھوپ کرو۔ حکیم جی کو بلاؤ۔ تم سب کے تو جیسے ہاتھ پاؤں بھول گئے۔ (پیر مرد سے) اے جا کر حکیم صاحب کو بلا لاؤ۔

حسن آرا۔ حکیم جی کا یہاں کیا کام۔ اور یوں آپ چاہیں جس کو بلالیں ؎

بیمارِ عشق کا جو نہ تجھ سے ہوا علاج ‏ ‏ کہ اے طبیب تو ہی کہ پھر تیرا کیا علاج

یہ کہہ کر وہ خاتون مہ لقا آہستہ سے پلنگ پر جا بیٹھی اور سپہر آرا پھولوں کی پنکھیا جھلنے لگی۔ حسن آرا نے میاں آزاد کا سر اپنے زانو پر رکھا۔ پیر مرد کسی کام کے لیے باہر چلے گئے۔ دل بہار دوسرے کمرے میں گئی۔ حسن آرا نے فرطِ محبت سے میاں آزاد کی نورانی پیشانی پر بڑے پیار سے بوسہ لیا۔ ہنوز جو بھر بھی پیشانی کے پاس سے نہ ہٹی تھی کہ میاں آزاد نے آنکھ کھول دی اور کہا (ایک اور) حسن آرا کھل گئی سپہر آرا ہنس پڑی۔

آزاد ؎ مرے جنازے کو ان کے کوچے میں ناحق احباب لے کے آئے

نگاہِ حسرت سے دیکھتے ہیں وہ رُخ سے پردہ اٹھا اٹھا کر

سحر ہے نزدیک، شب ہے آخر، سرا سے چلتے ہیں ہم مسافر
جنھیں ہے ملنا وہ سب ہیں حاضر جرس سے کہدو کوئی صدا کر

حسن آرا - کیوں بندہ پرور یہ مکاری! خدا کی پناہ - میری تو بُری گت ہو گئی -

سپہر آرا - چلو بخیر گذشت -

آزاد - ایک اور ایک اور بس ع - یہی درویش کی صدا ہے آج -

حسن آرا - سائیں پھر ما نگیے - بس وہ وقت اور ہی تھا - اب - ع -

ہر روز عید نیست کہ حلوا خورد کسے

آزاد -
میں نے کہا جوان سے کہ شب کو یہیں رہو
آنکھیں جھکا کے بولے کہ کس اعتبار پر

حسن آرا - آپ آخر یہاں تشریف لائے کیوں - چھپائیے نہیں - صاف صاف بتائیے -

آزاد -
اب کہتی ہو کہ تم مری محفل میں آئے کیوں
آتا تھا کون کوئی کسی کو بلائے کیوں
کہتا ہوں صاف صاف کہ مرتا ہوں آپ پر
ظاہر جو بات ہو اسے کوئی چھپائے کیوں

یہاں مارے نقاہت کے جان لبوں پر آ گئی آپ مکر سمجھتی ہیں -

حسن آرا - یہی نقاہت ہے تو ناز کون اٹھائے گا - جور و جفا کون سہے گا -

آزاد - اب کل روانگی کا عزم ہے - کل اگر ٹک جاؤں تو شریف نہیں - روم و روس میں اب کھلم کھلا چھڑ نے والی ہے -

حسن آرا - ہاں حمیت تو اسی کی مقتضی ہے کہ جائیے اور ضرور جائیے -

سپہر آرا - جائیے اور بخیر و عافیت واپس آئیے -

حسن آرا -
بہ سفر رفتنت مبارک باد
بہ سلامت روی و باز آئی

اب ہم کو ایک بات یاد دلانی لازم آئی وہ یہ کہ میاں آزاد سچ مچ بیمار نہیں ہوئے تھے بلکہ بیمار بن بیٹھے تھے وجہ یہ کہ ان کو خوف تھا کہ مبادا اللہ رکھی کا

آنا حسن آرا پر بھی کھل جائے تو پھر قیامت ہی بپا ہو۔ لہٰذا انھوں نے یہ فکر کی کہ علیل ہو کر وہاں جائیں تاکہ حسن آرا ان کی علالت دیکھ کر ترس کھائیں سوچے کہ پیر مرد فلاں سڑک کی طرف سے روز آتے ہیں۔ لہٰذا حضرتِ آزاد موقع کو تاک کر ایک درخت کے نیچے لوٹ گئے کہ گویا جان ہی پر بن آئی۔

حسن آرا۔ اب تو مزاج حضور کا اچھا ہے۔ آخر نصیب اعدا طبیعت ناساز کیوں کر ہو گئی آپ جاتے کہاں تھے۔

آزاد۔ آپ ہی کی قدم بوسی کو آتا تھا۔ اثنائے راہ میں جی گھبرانے لگا اور غش کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ درخت کے سایے میں ذرا دم لینے بیٹھا تو بے ہوش۔ حسنِ اتفاق سے یہ بے چارے ملے ورنہ خدا جانے کیا گت ہوتی۔ اللہ کو کچھ اچھا کرنا منظور تھا۔

دن بھر اور رات بھر میاں آزاد نے وہیں بسر کی اور تڑکے اٹھتے ہی تیاری سفر کی کی کہ اتنے میں میاں خوجی لڑھکتے پڑھکتے پتہ پوچھتے ہوئے آن موجود ہوئے۔

خوجی۔ میاں ہوت ذرا آزاد کو تو بلاؤ۔

دربان۔ کس سے کہتے ہو۔ آئے کہاں سے۔ جاؤ گے کہاں۔ ہو کون۔

خوجی۔ ایں یہ تو کچھ تقریر یا سا معلوم ہوتا ہے۔ ابے اطلاع کر دے کہ خواجہ صاحب آئے ہیں۔

دربان۔ ہونہہ خواجہ صاحب۔ ہمیں تو جولاہے سے معلوم ہوتے ہو۔ بھلے مانسوں کی ایسی صورت ہوا کرتی ہے۔

خوجی۔ اور نہیں تو پھر کیسی ہوا کرتی ہے۔

یہ تقریر میاں آزاد نے سنی تو خوجی کو پردے کے پاس بلا لیا۔

خوجی۔ اجی اک ذرا آئینہ تو بھیج دینا۔ آئینہ بھیجیے گا ذری۔

آزاد۔ یا وحشت یہ آئینہ کیا ہو گا۔ بندگی نہ سلام نہ مزاج پرسی نہ کچھ بات چیت آتے ہی آئینہ یاد آیا۔ بندر کے ہاتھ میں بھلا آئینہ کون دینے لگا۔

خوجی۔ اجی بھیجتے ہو یا دل لگی کرتے ہو۔ دربان سے ہم سے جھوڑ ہو گئی ہے۔ اس وقت مردود کہتا ہے کہ تمھاری صورت بھلے مانسوں کی سی نہیں اب کوئی اس گیدی خر سے پوچھے تو کہ پھر کیا چمار کی سی یا بھیا پاجی کی سی۔ ذرا آئینہ بھیجیے میں دیکھوں تو مجھے خود شک ہو گیا۔

یہ فقرہ جو سنا تو حسن آرا اور سپہر آرا کھل کھلا کر ہنس پڑیں اور آزاد سے کہا کون جانگلو ہے۔

آزاد۔ بھئی اگر سچ پوچھو تو صاف صاف یوں ہے کہ تمہاری صورت سے ایک طرح کا پاجی پن برستا ہے۔ خدا چاہے پاجی بنائے مگر پاجی جیسی صورت نہ بنائے مگر اب اس کا علاج کیا۔

خوجی۔ واہ اس کا کچھ علاج ہی نہیں آپ کے پاس۔ ڈاکٹروں نے مردے تک کے جلانے کا بندوبست کیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ علاج ہی نہیں، دیکھیے ہم بتا دیں گے۔ صورت ہی بدلنی ہے پھر یہ کتنی بڑی بات ہے۔

آزاد۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اینڈا بینڈا علاج ہو اور منہ ہی بگڑ جائے۔ اس سے تو پاجی ہی بنا رہنا بہتر ہے۔

خوجی۔ نا صاحب پاجی نہ بنیں گے۔ پاجی بن کے جیے تو کیا۔

آزاد۔ کل ہم روم جانے والے ہیں چلتے ہو ساتھ۔

خوجی۔ نہ چلے اس پر بھی لعنت۔ نہ لے چلے اس پر بھی (خم ٹھوک کر) ہم خوش ہمارا خدا خوش۔

آزاد۔ مگر وہاں چانڈو نہ ملے گا اتنا یاد رکھیے۔

خوجی۔ اجی افیم ملے گی۔ کہ وہ بھی نہ ملے گی۔ بس تو پھر ہم اپنے چانڈو بنا لیں گے۔ آپ ہماری فکر نہ کیجیے ہمیں ضرور لے چلیے بالضرور لے چلیے۔

آزاد۔ حسن آرا۔ اب رخصت کا وقت قریب آتا جاتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے کہ تم سے مفارقت ہو گی۔ لیکن جواں مردوں کو ان باتوں سے خوف کیا۔ زندگی شرط ہے خدا نے چاہا تو پھر ملیں گے اور جشن کریں گے۔ اب ہمیں جانے دو۔

حسن آرا (ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے)

سپہر آرا۔ (بہن سے چمٹ کر) کچھ تو منہ سے بولو۔ ہائے یہ خاموشی کا کون موقع ہے۔ جو مارے رنج مفارقت کے خاموش ہو تو وہ بات ہی کیوں کرو جس سے دکھ ہو۔

حسن آرا (گال پر ہاتھ رکھ کر) اُف۔ (پھر رونے لگی)

آزاد۔ اُف دل بھر آیا مگر قدم پیچھے نہ ہٹے گا۔ جاؤں اور بیچ کھیت جاؤں۔

سپہر آرا۔ ہائے اندر ر ولا نہیں مانتا اس کو بھی تو سمجھاتے جاؤ۔ یہ کس کا ہو کر رہے گا۔
آزاد۔ ذرا تھوڑی دیر تک یہ بات ہی بھول جاؤ۔ پھر میں ابھی خوجی سے دو دو باتیں کر لوں ؎

رخصت اے زنداں، جنوں زنجیرِ در کھڑکائے ہے
مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

میاں آزاد کے مزاج میں وحشت تو جبلی اور خلقی تھی ہی ان کو ایک جگہ چین کہاں۔ سیماب میں تو پھر بھی سکون ہے ان کی طبیعت کو سکون نہیں۔ اتنے دن یہاں رہے تو جی گھبرانے لگا۔ جنگل کی دھن سمائی۔ صحرا کی یاد آئی۔ اور اس پر طرہ یہ ہوا کہ ان کی معشوقہ مہ لقا حسن آرا نے فرمایش کی کہ روم جایئے اور ترکوں کو روس کی یورش سے بچایئے۔ ایک تو کڑوا کریلا دوسرے نیم چڑھا۔ پھر ان کو قرار کہاں۔ جب انھوں نے دیکھا کہ رخصت کا نام سنتے ہی سپہر آرا ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگی اور حسن آرا کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھ گیا تو سوچے کہ مبادا ان کی پریشانی اور اشک فشانی سے قدم ڈگمگا جائے اور جانے کا نام بھی زبان پر نہ آئے اور خرابی یہ کہ ان کی حالتِ زار دیکھ کر ان سے خود کب جایا جاتا۔ سپہر آرا کو تشفی دیتے یا حسن آرا کی تسلی کرتے آدمی تو ذکی الطبع اور برق دم تھے ہی وہ تدبیر سوچی کہ جو کبھی پٹ ہی نہ پڑے۔ میاں خوجی سے انھوں نے صلاح لی کہ کیوں یار چپ اب اس وقت کیا اصلاح ہے۔ آخر تم توسن رسیدہ گرگ باراں دیدہ خرانٹ فقرہ باز آدمی ہو تم ہی کچھ سوچو۔ مگر وہ رائے دو کہ سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے۔ جاؤ اب تمھاری ہی رائے پر عمل کریں گے۔ اس میں ہر چہ بادا باد۔ خوجی افیمی آدمی ٹرکی کا نام سنتے ہی ہکا بکا ہو گئے ہاتھ پاؤں بھول گئے کہ خدا ہی خیر کرے۔ بھئی ہم سمجھے تھے کہ دل لگی کرتے ہو یہ کیا معلوم تھا کہ سچ مچ۔ میاں تم لاکھ عالم و فاضل سہی پھر لڑکے ہی تو ہو۔ ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی تو پیدایش آپ کی، اور داعیہ یہ کہ ٹرکی جا کر روسیوں سے لڑیں گے۔ اے تیری قدرت میاں ہوش کی دوا کرو۔ عقل کے ناخن لو۔ سوجھی بھی تو کیا سوجھی بے تکی۔ یہ خیال خام پختہ مغزی کی دلیل نہیں ہے قبلہ۔ ایک ذرا سی چنے کے برابر گولی پڑے گی تو تیں سے مر جایئے گا۔ آپ کو کبھی مورچے پر جانے کا شاید اتفاق نہیں ہوا۔ ارے میاں خدا بھلے مانس کو نہ لے جائے۔ غضب کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ گولی پڑی

یہ مر گیا۔ گھوڑے کی پیشانی پر جی دم سے گرا۔ دائیں دائیں کی آواز رعد کی طرح گونجتی ہے قریب سپاہی کھڑا ہے اور ایک دفعہ ہی لوٹ گیا۔ توپ کا گولہ آیا اور اٹھارہ آدمیوں کو گرا دیا۔ گولہ چھٹا اور بہتر ٹکڑے ایک ٹکڑے نے دس دس آدمیوں کو دیکھتے ہی دیکھتے اڑا دیا۔ گویا پیدا ہی نہیں ہوئے تھے اور جو کہیں تلوار چلنے لگی تو اُف اوہ اجل سامنے نظر آتی ہے۔ بے موت جان جاتی ہے۔ کھٹا کھٹ تلوار چل رہی ہے اور ہزار ہا آدمی گرتے جاتے ہیں۔ سو بھئی وہاں جانا کچھ خالا جی کا گھر تھوڑا ہی ہے۔ خدا کے لیے ادھر کا کہیں قصد بھی نہ کرنا اور بندہ تو اپنے حساب جانے والے کو کچھ کہتا ہے ارے توبہ ارے توبہ۔ خدا بھلے مانس کو جنگ کے میدان سے بچائے۔ ہم ایک ترکیب بتائیں۔ آخر منشا تمہارا یہی ہے نا کہ حسن آرا سے وصال ہو مگر بعد نکاح اچھا منظور۔ اور ان ہی کے کہنے سے آپ ٹرکی جاتے ہیں۔ کہیے ہاں۔ خیر تو وہ کام کیوں نہ کیجیے کہ حسن آرا آپ کو خود روکیں اور لاکھوں قسمیں دیں کہ جائیے تو ہمارا مرا ہی دیکھیے آپ وہاں جا کر بیٹھیے اور ہم کو چق کے پاس بٹھائیے اور جنگ کا ذکر چھیڑیے پھر دیکھیے میں کیسی لفاظی کرتا ہوں کہ آپ کا بھی جی خوش ہو جائے۔ جنگ کی مصیبتوں کو اس پیرایے میں بیان کروں کہ دونوں بہنیں کانپ اٹھیں اور ان کو یقین کامل ہو جائے کہ میاں آزاد گئے اور اتنا غفیل ہوئے اور میں صاف صاف کہہ دوں کہ بھائی آزاد ذرا اپنی تصویر کھچوا لو۔ آخراب جدائی کی گھڑی تو سر پر کھڑی ہے۔ دو تین مہینے میں سن لیں گے کہ میاں آزاد نے گولی کھائی اور دم توڑا۔ واللہ جو کہیں یہ تقریر سن پائیں تو حشر تک تمہیں نہ جانیں دیں۔ اور جھپ سے شادی ہو جائے مزے سے چین کرو۔ اور ہمیں بھی نوکر رکھ لو۔ اور روم جانا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ فرض کیجیے کسی مورچے پر گولی لگی اور لوٹ گئے پھر حسن آرا سے کون ملے گا۔ توبہ۔

میاں آزاد جب یہ داستان سن چکے تو بولے کہ بس اب آپ اور کچھ نہ فرمائیے گا۔ ٹرکی جاؤں اور نہ پھر جاؤں دن دھاڑے جاؤں ڈنکے کی چوٹ جاؤں۔ لاکھ میں جاؤں اور کرور میں جاؤں۔ باقی رہا مرنا جینا یہ کسی کے اختیار کی بات تو ہے نہیں۔ مورچوں پر سے لاکھ آدمی کورے آتے ہیں اور ہزاروں راہ چلتے چلتے لوٹ جاتے ہیں۔ اس میں کسی کا اجارہ نہیں حسن آرا۔ ہم سے کہے کہ جاؤ اور ہم اغماض کر جائیں

کیا مجال۔ اور پھر حسن آرا سی پیاری حسن آرا کو ایسا جل دیں اتنا بڑا جل دیں اف۔
جس کو معشوق کیا اس سے یہ فریب۔ ایں جانب تو ہرگز گوارا نہ کریں گے۔ چاہے
ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ آپ میاں ظراف کے یہاں جائیے اور ان سے کہیے
کہ ہم ابھی آتے ہیں آج ہی سفر کا عزم ہے سب سامان درست کر رکھیں۔

پرانے فیشن کے بزرگوار

میاں آزاد اور خوجی باتیں کرتے ہوئے چلے کہ ایک سایہ دار درخت دیکھ کر ذرا دم لینے کو ٹھہر گئے۔ وہاں اتفاق سے ایک پرانے فیشن کے بزرگوار بھی دری بچھائے بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ میاں آزاد سے اور ان سے صاحب سلامت ہوئی تو انھوں نے بھی ان کے قریب بستر جمایا۔ اب باہم باتیں ہونے لگیں۔

بزرگوار۔ کہاں کے عزم ہیں برادر۔

آزاد۔ روم

بزرگوار۔ جزاک اللہ خدا کرے سرخ رو آؤ اور غنیم رو سیہ کو نیچا دکھاؤ۔

آزاد۔ اب تو جاتے ہیں روم کو آزاد   پھر ملیں گے اگر خدا لایا

بزرگوار۔ حمیت اسلام اسی کی مقتضی ہے۔ خدا جمیع اہل اسلام کو بجمعیت سیدِ خیر الانام علیہ التحیۃ والسلام ایسی ہی توفیقِ نیک عطا کرے آمین۔ ومن اللہ الاعانۃ والتوفیق۔ تمھارے چمنِ دل میں گل ہائے توفیقِ نیک مہک رہے ہیں۔ خدا عمر دراز کرے اور درِ سعادت تم پر باز رہے۔ آمین آمین ثم آمین۔ فلک الافلاک تک تمھاری ہمت بلند اور طبعِ ارجمند کا غلغلہ پہنچے گا۔

آزاد۔ فلک الافلاک کے کیا معنے۔

بزرگوار۔ نہ کرسی آسمان ہیں کہ نہیں ہیں۔

آزاد۔ آسمان تو کوئی چیز ہی نہیں ہے بس وہم ہے حد بصر اور انتہائے کائنات الجو کا نام آسمان ہے باقی ڈھکوسلا۔ آسمان جسے آپ کہتے ہیں وہ صرف کائناتِ الجو کی حد ہے باقی خیر صلاح۔

بزرگوار۔ معاذ اللہ۔ آسمان کا مخرج آس اور مان ہے۔ آس مخفف آسیا مان بمعنی

مانند۔ یعنی مانندِ آسیا۔ اس کی گردش بھی چکی کی گردش کی طرح ہے نہ بوضع گردش۔ دولاب وعرش اور اطلس وغیرہ۔ وغیرہ۔ اس کی دو قسمیں ہیں سطح مقعر فلک نہم کو اطلس اور سطحِ محدب کو عرش کہتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ آسمان کوئی چیز ہی نہیں پھر آپ سے کون بحث کرے۔

آزاد۔ چہ خوش چراغ باشد۔ ایک نہ شد دو شد۔ ایک آسمان دوسرے اس کی گردش، سبحان اللہ، گردش زمین کو ہے قبلہ گردشِ فلکی شعرا کا وہم وخیال ہے اور بس جیسے عنقا ویسے گردشِ فلک۔

بزرگ وار۔ ہرگز نہیں استغفراللہ زمین ساکن اور کرہ خاک ہے اور آفتاب دائرہ۔

آزاد۔ یونان کا حکیم محقق اور فیلسوف مدقق فیثاغورث زمین کے سکون کا قائل نہ تھا۔ ان کے بعد جرمنی کے ایک فاضلِ اکمل اور عالم اجل نے نظام فیثاغورث کا سکہ بٹھا دیا۔ اب نظامِ بطلیموس کے چراغ پر زردی چھاگئی۔ اور نظامِ فیثاغورث کوس لمن الملک بجانے لگا۔ آفتاب البتہ ساکن اور مرکز ہے اور اس کے گرداگرد زہرہ اور مشتری اور مریخ اور زحل عطارد زمین اور فولون ہرشل وغیرہ دورہ کرتے ہیں۔ بھلا یہ بات بھی قرینِ قیاس سمجھی جائے گی کہ آفتاب جو زمین سے تیرہ لاکھ حصے بڑا ہے وہ اس قدر جلد زمین کے گرداگرد دورہ ختم کر دے۔ ع ایں خیال است ومحال است وجنوں۔

بزرگ وار۔ اجی یہ علم لائے کس کے گھر سے۔ کسی علم کے موجد ہیں کیا سب اخذ کیا ہوا ہے۔ حکمائے یونان کے جہر لیاقت سے نور اقتباس کیا ہمارا علم خاص ہے۔

آزاد۔ انھیں لچر پوچ پادر ہوا خیالات نے تو ہندوستان کو ستیاناس کر دیا۔ یونان کو آپ اپنا کس دعوے سے کہتے ہیں۔ یونانی بھی تو یورپین ہیں اگر آپ کی ایشیا میں یونان ہوتا تو خیر آپ کو ہنکارنے کا کسی قدر موقع بھی ملتا۔ اب آپ کیا سمجھ کر اپنا قرار دیتے ہیں۔ یونان یورپ میں ہے۔ شاید آپ اس کو بھی اپنے ہندوستان میں سمجھتے ہیں

سبحان اللہ علاوہ کشف وکمالات مورخ ہم بے بدل ہستند۔

بزرگ وار۔ یونانی یورپین کیوں کر ہو سکتے ہیں بھلا۔ آپ جھک مارتے ہیں۔

آزاد۔ بجا ارشاد ہوا قبلہ وکعبہ۔ کیا معقول دلیل آپ نے پیش کی ہے جی پھڑک گیا۔ لطف یہ کہ فیثاغورث بھی یونانی تھا اور حرکتِ زمین کا قائل۔ لیکن آپ لوگ

دقیانوس کے ہم عصر وہی مرغے کی ایک ٹانگ قائم رکھتے ہیں۔ زمین ساکن ہے اور دعویٰ یہ کہ یونانی ایسا ہی لکھ گئے۔ حالانکہ یونان کے اکثر حکما گردشِ زمین کے قائل مگر آپ ایک نہ مانیں گے۔ لاحول ولا قوۃ۔

بزرگ وار۔ شیخ الرئیس کا کلام دیکھیے۔

آزاد۔ اجی آپ ان کے کلام لیموں لگا کر چاٹیے یہاں ان کے قائل ہی نہیں۔ نیوٹن اور ہرسل اور پروفیسر لاکیر اور ریگو کی تصانیف لطیف کو دیکھیے تو آنکھیں کھل جائیں قبلہ۔ جھگڑے گڑے ہوئے ہیں۔ شیخ بے چارے کس میں تھے ان کو کون مانتا ہے معدودے چند دقیانوسی خیالات کے آدمی اور جن بزرگوں کے ہم پیرو ہیں ان کے کلام کی امریکہ اور یورپ کے کل علما، حکما، پیروی کرتے ہیں۔ شیخ تھے کس میں۔ آپ شیخ الرئیس کو لیے پھرتے ہیں۔

بزرگ وار۔ شیخ ابو علی سینا۔!!!

آزاد۔ جی ہاں۔ شیخ۔ شیخ بو علی سینا۔ سنیے قبلہ و کعبہ آپ نے انگریزی پڑھی نہیں کہ آپ اپنے اور ان کے علوم کا باہم مقابلہ کر سکیں۔ بس آپ کی رائے پایۂ اعتبار سے ساقط ہے جن لوگوں نے عربی انگریزی دونوں کو بغور پڑھا ہے اور علوم پر حاوی ہیں وہ ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ جو تحقیق انیق علمائے یورپ نے حال میں کی اس کے مقابل میں تحقیق عتیق ہیچ ہے۔

بزرگ وار۔ یہ آپ نے کیا فرمایا کہ علوم پر حاوی۔ حاوی تو علوم پر کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ جب علم پر آپ حاوی ہو گئے تو علم محوی ہو گیا۔ اور محوی صغیر ہوتا ہے۔ علم دریائے ناپید اکنار ہے جس کی تھاہ ہی نہیں۔ خلاصہ یہ کہ آپ بھی عجیب چیز ہیں۔ نعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

آزاد۔ چہ خوش شیطان کی ایک ہی کہی۔ کیا شیطان کے بھی قائل ہیں۔ اجی قبلہ شیطان کچھ مجسم تھوڑا ہی ہے نفس امارہ ہی شیطان ہے۔

بزرگ وار۔ لاحول ولا لاحول ولا۔ آپ تو دہریے معلوم ہوتے ہیں۔

آزاد۔ میں مومنِ پاک سچا اور پکا مسلمان ہوں آپ مجھے مرتد اور ملحد بناتے ہیں۔ پس بہ موجب حکمِ جناب باری آپ داخلِ معصیت ہو گئے۔

بزرگ وار۔ استغفر اللہ۔ ربی من کل ذنب اتوب الیہ بھلا کیوں صاحب وا رے بہشت اور دوزخ کو بھی مانتے ہو یا اس کو بھی ڈھکوسلا ہی جانتے ہو۔

آزاد۔ قبلہ بہشت اور دوزخ کو دور سے سلام۔ اس وہم میں آپ ہی بڑے ہیں۔ بندہ واجبی ہی واجبی مانتا ہے۔ ہاں اتنا ضرور کہیں گے کہ ڈرپوک آدمیوں کے ڈرانے کے لیے یہ بات خوب ہے اور منہیات اور معصیات سے بھی انسان بچتا ہے۔ شرع والوں نے واللہ باتیں تو خوب نکالی ہیں۔ سب کی سب حکمت پر مبنی۔

بزرگ وار۔ بھلا قوس کی نسبت علمائے فرنگ نے کیا تحقیقات کی ہے۔ میزی میں تو لکھا ہے کہ جب ابر کے عقب میں کوئی مظلم شے مثل کوہ یا ابرِ کثیف ہو تو آفتاب کا نور ابر کو منور کرے گا پس بعینہ آئینہ کا حال ہے کہ اگر آئینہ کی پشت پر کوئی اور شے نہ ہو تو صورت بخوبی مرئی نہ ہو گی یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ اگر جسم شفیف کے عقب میں کوئی جسمِ کثیف ہو تو اس سے شعاع بصر منعکس نہ ہو گی بلکہ خارج ہو جائے گی۔ اسی طرح جب اجزائے رطبہ سے عقب میں کوئی جسم کثیف نہ واقع ہو تو ہماری بصر اس سے خارج ہو جائے گی۔

آزاد۔ الغلط از سرتاپا غلط۔ اگر آفتاب جانب افق قریب مغرب ہو اجی لاحول ولا۔ قریب افق جانب مغرب ہو تو قوسِ قزح مشرق کی سمت ظاہر ہو۔ قس علیٰ ہذا۔ اگر کرۂ شمس جانبِ مشرق قریب افق ہو تو ابر مغرب کی طرف ہو خلاصہ یہ کہ اگر ابر آفتاب کے محاذات میں ہو اس میں سات رنگ ہوتے ہیں۔ احمر۔ کیسری۔ اصفر کبودی۔ نیلگوں۔ اخضر بنفشی۔ قوس قزح شب کے وقت بھی دیکھی ہے۔

بزرگ وار۔ اجی تو آپ کو مرئی نہ ہوئی ہو گی۔ یہاں ضعفِ بصارت قریب بدرجۂ فقدانِ بصارت پہنچ گیا ہے۔ مگر آپ کے علوم اور ہمارے علوم سے بھی اتفاق نہ ہو گا۔

آزاد۔ عرض کروں قبلہ۔ یہ امور علم مناظرہ سے تعلق رکھتے ہیں اور آپ گستاخی معاف اس میں بالکل کورے ہیں۔

میاں خوجی بھی آزاد پر بہت جھلائے کہ تم بالکل دہریوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ ہم تمھارا ساتھ چھوڑ دیں گے ایسے مرتد کے ساتھ رہنا بھی داخلِ معصیت ہوتا ہے۔ آزاد نے کہا آپ بس چپکے بیٹھے رہیے افیون گھول گھول کر آپ پییں۔ چانڈو آپ اڑائیں روزے آپ چپ کر جائیں۔ نماز سے اصولاً واسطہ نہیں۔ عبادت پرستش خاک نہیں

جانتے اور اوپر سے غراتے ہو اور ہمیں کو الٹا زندیق بتاتے ہو۔ خوجی بولے کہ بھئی ایسے مقدس بزرگوں کے سامنے اس قسم کے کلمات زبان پر لانا سوءِ ادب اور خلافِ آداب ہے۔ ان سے تو جب گفتگو کرے وہی پرانے خیالات کی۔ زمین کی گردش غلط آفتاب مرکز نہیں ہے آسمان گردش کرتا رہتا ہے شیطان کا وجود ضرور ہے یہ نہیں کہ شیطان کے بھی قائل نہیں اور آسمان کو بھی حدِ بصر کہنے لگے اور آفتاب کو ساکن اور مرکز بتا دیا لاحول ولا قوۃ۔

الغرض میاں آزاد اور میاں خوجی دونوں چلے۔ اثنائے راہ میں گھوڑوں کو خیز کیا تو دن سے داخل لکھنؤ۔

لکھنؤ

لکھنؤ میں میاں آزاد خانہ برباد اور حضرتِ خوجی افیونیوں کے مسلم الثبوت استاد نے دو دن پڑاؤ ڈالا اور شہر کے دو مختلف مقاموں پر ایک ایک شب بسیرا لیا، پہلی شب آغا میر کی سرا میں بسر کی۔ چوک کی سیر کو گیے تو دیکھتے کیا ہیں کہ دو رویہ بازار آراستہ، دکانیں قرینے سے سجی سجائی، اشیا سلیقے سے چنی چنائی، حلوائی کی دکان شہد و شکر کی کان، تھالوں میں مٹھائی اور اس پر ورقِ نقرہ۔ گاہک پر گاہک آرہے ہیں ایسی پر ایسی ٹوٹے پڑتے ہیں۔ گوٹے والوں کی دکانوں پر بھیڑ بھڑکا ہے۔ کوئی لالہ سے مول تول کرتا ہے کوئی میب جی سے چکاتا ہے۔ صرافے میں کھنا کھن اور چھنا چھن کی آوازیں آتی ہیں۔ دور تک دکان کی قطار ہے اور ہر دکان میں اشرفیوں کا انبار ہے اور جو ہے وہ کامل عیار ہے۔ زبان حال و قال سے پکار رہے ہیں کہ اشرف الانسان بالمال بالکمال۔ دلالوں کی چاندی ہے، دو ایک گاہک مل گئے تو پو بارہ ہیں بازار بھر میں کھڑے چکر لگائے ہیں اس سرے سے اس سرے تک تاکتے جا رہے ہیں۔ جوہری کے دکانچہ جواہر نگار ہیں جواہرات کے ڈھیر لگے ہیں۔ لالہ بنا مل کے دماغ ہی نہیں ملتے۔ جواہر رنگا رنگ اور گوہر شاہوار ولالی آب دار دیکھ کر میاں آزاد کی آنکھیں کھل گئیں۔ لعل گراں مایہ کے نور و ضیا سے چکا چوند کا عالم ہے۔ کہیں یاقوت

رمانی کہیں زمرد و سبز ریحانی۔ بزاز سراپا ناز کی دکان پر وہ متاع دل فریب ہے کہ واہ جی واہ۔ انگریزی ہندوستانی شربتی جامدانی جس قسم کا کپڑا چاہو لے لو۔ چھیٹ۔ ڈوریہ۔ اطلس۔ قاقم سنجاب۔ بانات ہر قسم کا کپڑا موجود مگر بامول دس روپے گز کہیں تو تین روپے گز بیچیں۔ شانے سے شانہ چھلتا تھا۔ بادِ صبا کو بھی دقت سے بار ملتا تھا کمروں کی طرف جو نظر کی تو بشاش ہو گئے مگر میاں آزاد اپنے دل میں سوچے کہ بھئی یہ تو خلافِ تہذیب ہے اس بازار سے آپ کو جلد نکال دینا چاہیے۔ ان کے لیے تو ایک بازار خاص ہونا لازم ہے کہ لوگ وہاں جاتے ہوئے شرمائیں اور مارے خوف و لحاظ کے وہاں جانے سے باز آئیں۔ مسجدوں کو دیکھا تو چھتیں پھٹی پڑتی ہیں۔ ٹھٹھ کے ٹھٹھ جمع ہیں۔ نمازی تلاوتِ قرآن میں مصروف خیر اس طرف کے لطف تو انھوں نے خوب اٹھائے۔ اب دوسری شب کو امین آباد کی سرا میں آئے۔ اللہ اللہ کیا شہر غدار ہے کوسوں تک آباد کروروں مکان پدموں آدمی سنکھوں باشندے۔ اللہ اللہ اور لوگ کہتے ہیں کہ شاہی میں اور بھی زیادہ آبادی تھی اب تو گول دروازے کے سامنے صاف شفاف میدان ہے اور ادھر ادھر اکثر محلے ویران اجڑے ہوئے، مکانات گرے پڑے۔ مگر ہاں صدر کی طرف خوب گل زار ہے صدر بازار اور امین آباد میں وہ رونق ہے کہ وہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ مکانات بھی عمدہ اور پختہ بنے ہیں۔ عمارات عالی شان، بنگلے صاف و شفاف اور باغ اس کثرت سے ہیں کہ اس سرے سے اس سرے تک باغ ہی باغ نظر آتے ہیں۔ سکندر باغ سبزہ زار ہے بادشاہی باغ سراپا بہار ہے اور جس طرف نکل جائیے باغ کثرت سے پائیے۔

الغرض میاں آزاد اور خوجی نے یہاں خوب لطف اٹھایا۔ ہمارے رنگیلے جوان میاں آزاد اور ان کے سیلانی یار جانی میاں خوجی خانہ برباد نے لکھنؤ میں خوب سیر گشت کی خصوصاً لکھنؤ کی عالی شان کوٹھیاں اور خوش نما و دل کش بنگلے اور شاہی ایوان پیہم تواماں اور گل زارِ رشکِ فرخار اور مہوشانِ طرح دار اور جوانانِ طناز باغ و بہار اور امرا کی بارہ دریاں ایسی بھائیں کہ عش عش کرنے لگے محمد و طبلچی کو طبلہ بجانے میں استاد پایا تو خوش الحانی میں صادق علی خاں کو باربد نژاد پایا۔ بابا جی نے وہ ستار بجایا کہ تان سین کو انگلیوں پر نچایا غرنگی مل ہے یا خطِ یونان۔ یا علما فضلا کی کان

جو عالم ہے کملا کی جان و روح ۔معزز و ممدوح مفتی میر محمد عباس صاحب قبلہ کی مصنفات مسلمات کی عرب تک دھوم ہے ۔ مکۂ معظمہ اور مدینۂ منورہ اور کربلائے معلیٰ اور مشہدِ مقدس تک کے بلغا آپ کے کلام فصاحت فرجام کی داد دیتے ہیں ایک ایک فقرے پر احسنت و مرحبا کہتے ہیں جو بلیغ ہے امراء القیس ثانی ہے رشکِ جالینوس یونانی ہے ۔اطبا میں ایک سے ایک برق حکیم مرزا محمد جعفر کی طبابت کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں ہوالشافی نسخے میں لکھنے بھی نہ پائے کہ مریض نے صحت کامل پائی اور شفائے عاجل حکیم سید محمد خاں صاحب کے مجربات علوی خاں دہلوی کے مجربات سے کم نہیں ۔معقولات میں استاد مسلم الثبوت خوش مذاق زندہ دل سعادت مند اور معقول پسند آدمی ہیں حکیم مرزا محمد حسین صاحب اور حکیم محمد ابراہیم صاحب کے گھرانے نے وہ دست گاہ کامل بہم پہنچائی کہ اودھ بھر میں شہرت پائی دور دور تک نام ہوا جو مریض ان سے رجوع لایا فائز بہ مرام ہوا ۔شعرا بھی با کمال ہیں ۔تدبیر الدولہ منشی مظفر علی خاں اسیر لکھنوی اصنافِ سخن پر قادر علم عروض کے ماہر بڑے شاعر غرا سخن داں ۔ خدا خضر و الیاس کی عمر عطا کرے ۔ گو بوڑھے ہو گئے مگر طبیعت جوان ہے ایک ایک شعر سے سچا لطف شاعری ٹپکتا ہے جو سنتا ہے احسنت و مرحبا کہتا ہے اور دادِ سخن دیتا ہے ۔آفتاب الدولہ قلق اس زمانے میں غنیمت ہیں ۔ ناسخ مبرور مغفور کا نام انھوں نے خوب روشن کیا ۔مثنوی فصاحت محتوی وہ تصنیف کی کہ قلم توڑ دیے کیا صاف روزمرہ کا طرزِ بیان ہے کیا بول چال کیا زبان ہے ۔ محمد جان شاد بھی بول چال اور روزمرہ کے استاد ہیں ۔

الغرض جس گلی کوچے کو دیکھتے ہیں کانِ علم جانِ علم روحِ روانِ علم ہے چوک میں جو سیر کرنے گئے تو بے اختیار بول اٹھے ؎

خدا آباد رکھے لکھنؤ کو پھر غنیمت ہے　　　نظر کوئی نہ کوئی اچھی صورت آہی جاتی ہے

ایک دن پہلوانوں کی کشتی پھینتوں کی دھینگا مشتی اور بکیتوں کی کثرت اور پھکیتوں کے کرتب اور بنوٹیوں کے کمال دیکھے تو گردن ہلائی کہ ہاں ابھی بانکوں سے لکھنؤ خالی نہیں ہے ۔ تنگ پٹکا اور یہ ہوئے رنگ پٹکا اور وہ اچک گئے ۔ تراش خراش کا بھی لکھنؤ پر خاتمہ ہے ۔یہاں کی مشاطہ گانِ چابک دست کی قسم کھانی چاہیے وہ وہ گر یاد ہیں کہ واہ جی واہ ہندوستان کا فرانس لکھنؤ ہے وہاں مہینے میں ایک فیشن بدلتا ہے تو یہاں ہفتے

میں پانچ۔ میاں آزاد اور خوجی لطف تماشہ دیکھتے ہوئے چلے جاتے تھے کہ اثنائے راہ میں ایک صاحب نئی وضع اور انوکھی قطع کے نظر سے گزرے۔ حیرت ہوئی کہ الٰہی یہ کس فیشن کے آدمی ہیں بالکل نئی گڑھنت ہے اب ان حضرت کی قطع ملاحظہ فرمائیے کہ از سرتا پا زرد اندر زرد۔ ڈھیلے پائچوں کا پاجامہ زعفرانی کچل لیٹ کا تین کر توئی والا انگرکھا۔ کیسری دوپلی نکے دار ٹوپی، بسنتی کاندھوں پر بہت بڑا اچھکے کا رومال، عشاق زار کے چہرے کی رنگت اور ان سب میں لچکا ٹنکا ہوا۔ ماشاءاللہ حسن شریف جمل وششش۔ نازم بہ ایں ریش فش۔

آزاد۔ کیوں بھئی خوجی بھلا بھانپو تو یہ کس ولایت کے ہیں۔

خوجی۔ خراسانی سے معلوم ہوتے ہیں۔ یا کابل کے ہوں۔

آزاد۔ کابلیوں کی یہ قطع کہاں۔

خوجی۔ واہ خوب سمجھے۔ ارے یہاں کیا کابل میں نہیں ہوتے۔

آزاد۔ (قہقہہ لگاکر) ذرا حضرت کی چال تو دیکھیے گا۔ کیسے کندھے جھاڑتے ہوئے یو قدمے چلے جاتے ہیں کبھی پاپوش زریں پر نظر ہے کبھی رومال پھڑکاتے ہیں۔ کبھی انگرکھا چمکاتے ہیں کبھی لچکے کی جھلک دکھاتے ہیں چمکتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ اس داڑھی مونچھ کا بھی خیال نہیں۔ یہ لمبی داڑھی خرگوش کی جھاڑی اور یہ لچکے کی گوٹ لاحول ولا قوۃ۔

خوجی۔ آپ کو واللہ ذرا چھیڑ دیجیے تو دل لگی ہی ہی۔

آزاد۔ یا حضرت آداب عرض ہے واللہ آپ کے لباس فاخرہ پر تو وہ عالم ہے کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی ہے۔ پائے نظر پھسلا جاتا ہے۔

زرد پوش (شرما کر) اجی ایک وجہ خاص ہے۔

آزاد۔ وجہ خاص کیا۔ کیا کسی سرکار سے وردی ملی ہے یار سچ کہنا استاد کسی نائی سے تو نہیں چھین لائے۔

زرد پوش (اپنے خدمت گار سے) رمضانی ذرا بتا تو دینا ہمیں اپنے منہ سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔

رمضانی۔ حضور میاں کا نکاح ہونے والا ہے مانجھے کے کپڑے پہنے ہیں رسم ہے حضور۔

آزاد - لاحول ولا قوۃ - رسم کی ایک ہی کہی - کہاں کی رسم کہنے لگے رسم ہے - واہ جی اچھی رسم ہے - یہ بدعت ہے یا رسم ہے - داڑھی مونچھ والے آدمی اور لچکا بنت پٹھا لگا کر کپڑے پہنے ہیں - معاذ اللہ یہ بھائی دلہن کے لیے ہیں یا آپ سے مچھاکڑ بیگ کے لیے - واسطے خدا کے ان کپڑوں کو اتارو مردوں کی پوشاک پہنو - لاحول ولا قوۃ -

زرد پوش - یہ تو سب ہی پہنتے ہیں -

خوجی - ذری ہم سے تو چار آنکھیں کیجیے - ہاں صاحب کون سب پہنتے ہیں آخر؟ آپ نے کن سب کو دیکھا ہے - ہم کو سکھاتے ہو تمہارے ہی سے دو چار زنانِ منتری پہنتے ہوں گے - ورنہ باوضع اور سنجیدہ اور متشرع لوگ ایسی وضع کے قریب جانا داخلِ گناہ سمجھتے ہیں -

آزاد - ارے یار تم کو شرمانا چاہیے یا بڑانا چاہیے - استغفر اللہ آپ اکڑے جاتے ہیں - شاباش بے حیا کی بلا دور -

میاں آزاد اور خوجی آگے بڑھ گئے - اور حضرتِ زرد پوش اور ان کا خدمت گار صاحبِ تن و توش ایک گلی میں کترا گئے - تو راہ میں خدمت گار نے یوں سمجھانا شروع کیا -

خدمت گار - میاں سچ تو کہتے تھے - ذری دل میں سوچیے تو جس گلی کوچے میں آپ نکل جاتے ہیں لوگ تالیاں بجاتے ہیں انگلیاں آپ پر اٹھاتے ہیں اور قہقہہ لگاتے ہیں

زرد پوش - ہنسنے دو جی - ہنستے ہی گھر بستے ہیں - من ضحک ضحک -

خدمت گار - آپ تو عربی بھی پڑھے ہیں - میں جاہل آدمی ہوں - مُل بری بات بری ہی بات ہے - ہم غریب آدمی تو ایسے کپڑے پہنتے ہی نہیں - اور آپ لوگ رئیس اور پڑھے لکھے مُل -

زرد پوش - مُل وُل میں نہیں جانتا - تم غریب غربا ایسے کپڑے لاؤ کہاں سے جو پہنو - اچھا چل کر میاں سے پوچھیں گے دیکھیں بھلا کیا کہتے ہیں وہ تو ثقہ اور مسن ہیں جو کہیں وہ منظور -

خدمت گار - اچھا ہزار بات کی تو ایک بات آپ نے یہ کہہ دی لیجیے گھر بھی آگیا اور بڑے صاحب بھی ٹہل ہی رہے ہیں -

زرد پوش - ابا جان آج ہم کو ایک بدمعاش نے رلا رلا دیا -

بیہ فرتوت۔ کون بدمعاش۔ تم نے کچھ چھیڑا ہوگا ایک ہاتھ سے تو تالی بجتی ہی نہیں۔ اہا ہا ہا۔ میں سمجھا اس تمھاری الو کی قطع پر تو کہیں نہیں ہنسے۔ بھئی ہم بھی ان سے متفق ہیں۔ ہم خود تم سے کہنے کو تھے کہ بیٹا اس وضع کو نہ اختیار کرو۔ مگر تمھاری لمان سے بہت ڈرتے ہیں وہ بڑی تنک مزاج ہیں اور ہم کو تو ذرا ذرا سی بات پر بے ہی ڈالتی ہیں سو بھئی اگر تمھارا جی چاہے تو ان کپڑوں کو اتار ڈالو اگر نہ اتارو تو باہر نہ جاؤ ورنہ مفت میں اپنے کو ہنسوانا کونسی دانائی ہے۔

میاں آزاد اور میاں خوجی راہ میں باہم قہقہہ اڑاتے اور رسوم مذموم ہند پر لعن کرتے اور لاحول پڑھتے ہوئے جا رہے تھے تو ایک وضع دار اور طرح دار جوان سے انھوں نے پوچھا کہ کیوں حضرت جب آپ کی شادی ہوئی تھی تو زرد کپڑے آپ نے بھی پہنے تھے اس نے کہا لاحول ولا قوۃ یہ زنان منتریوں کو مبارک رہیں یہاں دو انگل ہر دم میان سے باہر رہتی ہے۔ آپ نے کسی زنان منتری کو دیکھا ہوگا۔ کہیں کسی اور سے یہ سوال نہ کر بیٹھیے گا۔ اور مشفق رسموں کی نہ کہیے بعض آدمیوں کے یہاں یہ رسم ہے کہ دلہن کا جوتا دولہا کی کھوپڑی پر تڑسے لگاتے ہیں۔ جو دولہا ثقہ ہوا تو خیر جوتی چھوا دی اور جو وہ ٹھٹھول ہنسوڑ بگڑے دل ہوئے تو پھر وہ اور ان کا سر اور گرگابی۔ مگر بانکے آدمی تو سر کاٹ کر پھینک دیں۔

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک موگرڈی سامنے سے آرہی ہے بڑی بیش بہا فٹن۔ دو کمیت دو رکابی گھوڑیاں جتی ہوئی ہیں۔ دونوں برق۔ ہوا پیچھے وہ آگے جائیں۔ شیر گردوں کو طرارہ بھر کے ٹاپیں مار آئیں۔ کوچ مین سر مندیل کھوپڑی پر جمائے ہوئے کوچ بکس پر بیٹھا ہوا ہائیٹ کر رہا ہے اور تین نوجوان رئیس بڑے ٹھسے اور کر و فر سے بیٹھے ہیں۔ تینوں عینک باز تینوں طناز اور خوش انداز شان ریاست جبین مبین سے عیاں طنطنۂ امارت چہرۂ نورانی سے نمایاں۔ اتنے میں ایک بگنٹ بگھی کھڑکھڑاتی ہوئی سامنے سے آئی دو جوان رئیس بہ صد شان و آن بان متمکن ہیں مگر دونوں عینک باز۔ سونے کی تیلیاں اور نازک تال اس کے بعد تین چار گھوڑوں پر سوار جوان اور گل فام نظر سے گزرے۔ کوئی جماتا ہے کوئی قدم دکھاتا ہے۔ کوئی کڑکڑاتا ہے کوئی چمکاتا ہے اور ان میں بھی دو عینک باز۔ تب تو میاں آزاد نے کہا کہ کیوں بھیا خوجی یہاں یہ عینک کا فیشن نیا دیکھنے میں آیا جسے دیکھو عینک باز۔

دانا بینا آدمی اور اندھے بننے کا شوق چرائے۔ بینا سے نابینا بن جائے لاحول ولا۔ خوجی بولے کہ ابی ابھی آپ نے دیکھا ہی کیا ہے اس کو بھی جوان عاشق تن ایک سجاوٹ اور بناوٹ سمجھتے ہیں اور چار دن میں دیکھ لیجئے گا کہ رنگین طبع آزاد مزاج عورتیں بھی عینک چڑھانے لگیں گی۔ یہ تو فیشن ہے بھئی۔ یہ بھی وضع داری ہے۔

ہوٹل

میاں آزاد خانہ برباد یہاں بستر جمانے یا کسی مکان کا قبالہ لکھوانے تو آئے نہیں تھے۔ راہ راہ آئے۔ دو تین دن رہے چلے گئے۔ لکھنؤ کے اسٹیشن پر پہنچے تو وہ چہل پہل، وہ بھیڑ بھڑکا، وہ دھکم دھکا کہ شانے سے شانہ چھلتا تھا۔ برہمن دیوتا ڈول لیے کھٹ کھٹاتے چلے جاتے ہیں۔ جل ٹھنڈے۔ کٹورا الگ کھنک رہا ہے میاں بہشتا مشک یا مشکیزہ لیے ہوئے چہل قدمی کر رہے ہیں۔ ایک سمت ساقی دو سیرا خمیرہ بھر کر گڑگڑی لیے گڑگڑا رہا ہے وہ مشک بو کہ دماغ طبلہ عطار ہو رہا ہے۔ چبوترے کے سامنے کمہار برتن چن کر بیٹھا بیچ رہا ہے مٹی کے کھلونوں پر وہ جوبن کہ باہر والے بصد شوق خریدے جاتے ہیں۔ خریداروں پر خریدار ٹوٹے پڑتے ہیں۔ پیسا پھینکا اور حقہ لیا۔ ادھر میاں بہشتا نے تازہ کر دیا اور ساقی نے چلم تیار کی دھواں دھار اڑانے لگے۔ کھٹک نے آواز لگائی۔ گلابی میوہ شہتوت امرس ہے آم کے رسول کا قلمی آم کے رسوں کا۔ فقیر محمد خاں کے باغ کا سفیدہ۔ بنارس کا لنگڑا۔ چار باغ کا بمبئی۔ رنگترے۔ سنگترے۔ کولے۔ انناس۔ نارنگیاں۔ شریفہ۔ امرود۔ سیب جو چاہیے خرید لیجیے، ایک طرف حلوائی کی دکان مٹھائی کے خوان۔ برفی کے تھال۔ ورق نقرہ لگے ہوئے پستے کی ہوائیاں۔ لوہے کے چراغ لٹکے ہوئے ہیں۔ دکان جھک جھک کر رہی ہے۔ اتنے میں آواز آئی بسکٹ لے لو بسکٹ۔ کباب کلیجے۔ ادھر ادھر گھومے تو ٹوپی والا سامنے آن موجود ہوا۔ دو پلی ٹوپیاں ترچھی جامدانی چکن مری کے کام کی کڑھی، مندیل گول ٹوپی۔ نئے نئے فیشن نرالی اور انوکھی وضع کی ٹوپیاں جھڑا جھڑ دکھا رہا ہے اور گاہک پر گاہک بصد شوق دام چکا رہا ہے۔ دس پانچ ہاتھوں ہاتھ بک گئیں دور دور تک مسافر بستر جمائے کوئی زمین پوش کوئی دری بچھائے بیٹھا ریل کی راہ تک رہا ہے۔

کوئی گنوار اکڑوں بیٹھا اناپ شناپ بک رہا ہے میاں آزاد اپنے دل میں سوچے کہ اللہ اللہ ریل کا اسٹیشن کیا خاصہ میلہ ہے کچھ ٹھکانا ہے یہ بھیڑ یہ دھوم یہ رونق بھئی واہ رے لکھنؤ واللہ ایسا اسٹیشن کبھی دیکھا نہ سنا۔ میاں آزاد ٹہلتے ہوئے اسٹیشن کے اندر گئے ہوٹل دیکھا تو باچھیں کھل گئیں۔ اہو ہو ہو کیا صاف و شفاف ہے ہر شے قرینے سے چنی ہوئی در و دیوار سے صفائی برس رہی ہے ہر سمت نور کا عالم ہے اس سرے سے اس سرے تک میز اور اس کے گرد اگرد کرسیاں گلاس چنے ہوئے۔ لمپ اور کنول ہر طرف روشن ہیں میاں آزاد بھی کرسی پر جا کر ڈٹ گئے۔ کھانا لاؤ مگر شراب کا لگاؤ نہ ہو۔ لحم خوک قریب نہ آنے پائے۔ ایک چپراسی صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے چوب داروں کی سی پگڑی باندھے ہوئے سامنے آن کھڑا ہوا حضور شراب تو نہ ہو گی مگر اور کیا آپ نے حکم دیا۔ میاں آزاد نے کہا لحم خوک (آہستہ سے) یعنی سور کا گوشت نہ ہو (چپراسی) نا عضور کیا مجال۔ یہ کہہ کر چپراسی نہایت ہی قیمتی بیش بہا پلیٹوں میں طرح طرح کا انگریزی کھانا لایا میاں آزاد نے چھری کانٹے سے خوب مزے سے چکھا اور سوڈا واٹر اور لیمونڈ پیا اور باہر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ میاں خوجی بھی بستر جمائے ہوئے پراٹھے اور کباب کلچے چکھ رہے ہیں۔

آزاد۔ واہ استاد تم تو خوب مزے سے کباب اڑا رہے ہو

خوجی۔ پھر کوئی شراب والے کوئی کباب کھائے۔

آزاد۔ ایں! شراب! لاحول ولا قوۃ۔ اے میاں شراب کس نے منہ لگائی یہ کس کی شامت آئی یہاں دختِ رز سے واسطہ ہی نہیں رکھتے۔ بنت العنب کے عاشقِ دل دادہ کوئی اور ہی ہوں گے۔ ع کردم ز شرابِ ناب توبہ۔

خوجی۔ اور آگے تو کہیے ع۔ کردم ز شرابِ ناب توبہ۔ اور آگے ع وز کردۂ ناصواب توبہ۔

آزاد۔ قسم قرآن کی کس مردک نے شراب کا ایک قطرہ بھی چھوا ہو۔ شراب پی ہو تو سور ہی کا گوشت کھایا ہو۔

خوجی (مسکرا کر) تسلیم ایک نہ شد دو شد آپ نے سور کا گوشت بھلا کب چھوڑا ہو گا۔ واللہ مانتا ہوں۔ کہنے لگے شراب پی ہو تو سور کا گوشت کھایا ہو معقول۔ یہ تو آپ تب کہیں جب اس کو حرام یا مکروہ بھی سمجھیں۔ آپ دونوں کو حلال اور اس کے استعمال

کو سنمسن سمجھتے ہیں۔ یار آج تو تم نے غضب ہی کر دیا۔

آزاد۔ ارے بھئی آخر کیا کیا کچھ کہو گے بھی یا لاحی ہی ستانے جاؤ گے۔ سبحان اللہ۔ قسم لو جو ہم نے شراب کو ہاتھ بھی لگایا ہو یا سور کے گوشت کی صورت بھی دیکھی ہو۔

خوجی۔ ہاں یہ آپ نے خوب کہی کہ سور کے گوشت کی صورت نہیں دیکھی ہوگی۔ مگر یار مزہ تو خوب چکھا ہوگا اور شراب کو ہاتھ آپ کیوں لگانے لگے بگالی ہو گی ظالم۔ اور آپ کی قسم کا کس مردود کو اعتبار ہے۔ قسم کو تو آپ مانتے ہی نہیں مجھے آج تک بھی نہیں معلوم ہوا کہ آپ کا دین و ایمان کیا ہے تمہارا تو بابا آدم ہی نرالا ہے۔ خیر جی لبنی اپنی سب بھگت لیں گے ہم کو اس بکھیڑے سے کیا واسطہ۔

آزاد۔ نہ ہاری مانتے ہو نہ جیتی۔

خوجی۔ مانیں کیا خاک۔ مانیں کیا۔ ہم نے اپنی آنکھوں دیکھا کہ چھری کانٹا کھٹا کھٹ چل رہا ہے۔

آزاد۔ تو بھائی چھری کانٹے سے کوئی شراب پیتا ہے۔

خوجی۔ ہم کیا جانیں۔ ہماری جانے جوتی کہ شراب کیوں کر پیتے ہیں یہ کسی اپنے ایسے مے گسار بادہ خوار سے تحقیقات کیجیے افسوس واللہ بس تم گئے گذرے ہائے ستم۔ خیر مضیٰ مامضیٰ۔

آزاد۔ آپ ایک کام کیجیے ہوٹل میں جاکر۔

خوجی۔ لے لاحول۔ اے لاحول۔ خدا ایسی جگہ کسی سچے اور پکے مسلمان کو نہ لے جائے تو بہ توبہ۔ ہوٹل میں اور ہم جائیں۔ لاحول ولا قوۃ بس آپ ہی کو مبارک۔ رہے قبلہ بندہ در گزرا۔

میاں آزاد ٹہلنے لگے اور خوجی نے کباب کلچوں پر خوب ہتھے لگائے جب صفا چٹ کر چکے تو حلوائی کی دوکان سے برفی لائے اور افیون کے نشے میں ٹونگا رنے لگے تو اتنے میں ایک صاحب باریش دراز یک مشت و پنجاہ انگشت نے میاں آزاد کو مخاطب کر کے کہا کہ کیوں حضرت آپ کا اسم مبارک۔ یہ بولے میاں آزاد۔ وہ مسکرائے اور اور کہا کہ ہاں واللہ۔ آپ کے قد و قامت اور وضع قطع پر یہ نام موزوں ہے۔ آزادی اور آزادہ روی صورت سے برستی ہے ملت گیا ہے۔

حضرت بندہ مسلمان ہے اور مسلم ایمان ہے۔ پابند شرع۔ آپ کا اسم شریف

جناب مولوی صاحب۔
مولوی صاحب۔ اسم شریف تو جمیر پر رکھیے اس وقت مجھے افسوس کرنے دیجیے۔
آزاد۔ بسم اللہ آپ افسوس کر لیجیے بلکہ رو دیجیے۔ مگر سنیے تو ابھی محرم الحرام کے دن قریب ہیں خوب پیٹ بھر کر رو لیجیے گا ایسی بے تابی کیا ہے۔
مولوی صاحب۔ آپ مسلمان اور پابند شرع اپنے آپ کو بتاتے ہیں اور ہوٹل میں جاکر شراب خانہ خراب استعمال میں لاتے ہیں۔ عیاذاً باللہ مرد خدا آخر انجام کی بھی فکر ہے۔ یا سگِ دنیا ہی بنے رہو گے۔

آزاد۔ قبلہ بس اب کیا کہوں۔ بجز سکوت کے اور کوئی کلمہ زبان پر نہیں آنے پاتا۔ لاحول ولا قوۃ۔
مولوی صاحب۔ بے ادبی معاف۔ لاحول تو آپ اپنے ہی اوپر پڑھتے ہیں۔ آپ سے حرکتِ شیطانی ہی ایسی سرزد ہوئی۔ مگر بہ حمد اللہ کہ آپ کا نفسِ لوامہ آپ کو ملامت تو کرتا ہے۔
آزاد۔ مولانا خدا کی قسم۔ میں نے ہوٹل میں صرف کھانا کھایا مگر وہ اغذیہ جو شرع کی رو سے حرام نہیں۔ پس نظرِ انصاف سے دیکھیے تو اس میں قباحت ہی کیا ہے۔ آخر روم میں بھی صغیر و کبیر اور بڑے بڑے علمائے نحریر عیسائیوں کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں پھر یہاں ہندوستان کے مسلمان اسے داخلِ گناہ کیوں سمجھنے لگے میں نے کیا کفر کیا کہ مردود اور مطرود اور زندیق اور ملحد اور مرتد بنایا جاتا ہوں۔
مولوی صاحب۔ مجھ سے سنیے میں عرض کروں نہ۔ ہوٹل میں جانا اہل اسلام کے لیے مستحسن نہیں جو کھانا آپ نے ہوٹل میں چکھا ہے۔ اگر باہر منگوا کر اور فرش بچھوا کر چکھتے تو چنداں مضائقہ نہ تھا گو یہ بھی معیوب تھا مگر اس درجہ نہیں۔ پھر آپ لاکھ قسمیں کھائیے قرآن اٹھائیے یقین کس ملعون کو آتا ہے کہ آپ نے شراب نہیں پی یا سور کا گوشت نہیں کھایا۔ کاجل کی کوٹھری میں جو جائے گا وہ منہ کالا کر کے آئے گا۔ کوئلوں کی دلالی میں ہاتھ کالے ہی ہوتے ہیں۔ روم کی نہ کہیے۔ شاہِ ایران مزے سے شرابِ ناب اور بیش بہا برانڈی اڑاتے ہیں۔ پھر اس سے بادہ خواری کا جواز نہیں ثابت ہوتا۔ رومی لاکھ عیسائیوں کے ساتھ لقمے لگائیں اور بے تکلفی سے کھائیں۔ ہم کو تو ایسا نہ چاہیے۔ ہمارے رسوم

کے خلاف ہے۔ آپ کو روم میں رہنا ہے یا ہندوستان میں روم کی بات روم کے ساتھ۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے خیالات کا تذکرہ ہے یا روم یا رومیوں کی عادات کا۔ آخر باہر بھی تو کباب کلچے شیرمال۔ پراٹھے۔ باقرخانی۔ روغنی روٹی ڈبل بسکٹ سب ہی کچھ بکتا ہے پھر وہاں کھانے میں کون بہتری تھی۔ مفت میں اپنے آپ کو نکو بنانا اور ہنسوانا کون سی دانائی ہے۔

آزاد۔ حضرت وہاں اوّل تو کھانا عمدہ لذیذ۔ دوسرے مقام صاف۔ جس لطف سے ہم نے وہاں کھانا کھایا وہ یہاں کجا۔ قلی کھڑا پنکھا جھل رہا ہے۔ صاف ستھرا پنکھا جھل رہا ہے بیٹھیں صاف میز۔ شفاف چار چار چپراسی خدمت کے لیے کھڑے ہیں یہاں یہ باتیں کجا۔ لاحول ولا قوۃ۔

مولوی صاحب۔ کھانا عمدہ تو آپ سمجھتے ہوں گے۔ باقی رہا پنکھا ایک پیسہ دے دیجیے۔ گھنٹہ بھر پنکھا جھلوا لیجیے اور صفائی کو مسافرت سے کیا کام۔ سوائے ازیں یہاں بھی کوئی غلیظ شے نہیں یوں وحشت کی بات ہی اور ہے۔ خیر حضرت آپ جانیں آپ کا کام جانے ؎

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند

جوانانِ سعادت مند پندِ پیرِ دانا را

مانو یا نہ مانو۔ اس سے یہاں غرض نہیں ماننا نہ ماننا آپ کے ہاتھ ہے ہم نے کہہ دیا۔

میاں آزاد نے اپنے دل میں سوچا کہ آج سے ایسی حماقت نہ کریں گے کہ ڈنکے کی چوٹ ہوٹل میں جائیں۔ اور مفت میں اپنے آپ کو ہنسوائیں یوں تو ہمیں اختیار ہے کہ چاہے ہوٹل میں جائیں یا جو کھائیں مگر خاموشی کے ساتھ یہ نہیں کہ اسٹیشن بھر میں گھومے پھرے کہ ہے ہم بھی ہیں پانچوں سوار دل میں۔

خوجی۔ کیوں بھلا خیر۔ ایک ہمیں کو آپ الو بناتے تھے۔ اب تو ایک مولوی صاحب نے آپ کو قائل کر دیا۔ ہات ترے کی اور ہوٹل میں کھاؤ۔ اور ایک ان پر کیا فرض ہے۔

ریل کا سفر

میاں آزاد اور خوجی بڑی دیر تک اسٹیشن پر ٹہلا کیے۔ ایک کانسٹبل سے پوچھا کہ کیوں جی آج ریل کو دیر کیوں ہوئی۔ اب تک تو روانہ ہو جایا کرتی تھی آج ابھی تک آئی بھی نہیں۔ آخر ماجرا کیا ہے کیا وقت بدل گیا۔ کانسٹبل نے کہا کہ آج تار آیا ہے کہ ایک جگہ ریل لڑ گئی۔ ایک مسافر گاڑی ادھر سے آتی تھی اور ایک مال گاڑی ادھر سے جاتی تھی گارڈ شراب کے نشے میں ایسا چور ہوا کہ کچھ خبر ہی نہ رہی اس کو تار دیا گیا تھا کہ خبردار فلاں اسٹیشن سے آگے تیزی کے ساتھ نہ بڑھنا اور فلاں پٹری سے نہ لے جانا گارڈ تو اس وقت نشے میں غین تھا ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ ریل کو تیز کر ہی دیا اور اسی پٹری پر چلائی جس پر جانے کی ممانعت کر دی تھی۔ ریل تو لے چلے جب پل کے پاس پہنچے تو مسافر گھڑگھڑاہٹ کے سبب سے جاگ اٹھے اور جیسا قاعدہ ہے ان میں سے اکثر دریا کی کیفیت دیکھنے لگے، ویسے ہی ادھر سے مال گاڑی نمودار ہوئی۔ اب ڈرائیور لاکھ لاکھ روکتا ہے مگر ممکن کہاں ریل کا دفعتہً روک لینا کچھ ہنسی ٹھٹھا تھوڑا ہی ہے۔ خلاصہ یہ کہ عین پل پر دونوں ریلیں ٹکرائیں کئی منٹ تک دونوں انجن لڑتے رہے اور چونکہ دفعتہً لڑ گئے اس تصادم سے سخت نقصان جان و مال ہوا۔ دو آدمی ریل پر سے دریا میں غڑاپ غرق آب۔ پانچ آدمی نہایت ہی زخمی ہوئے اور پندرہ بیس آدمی باہم ایسا ٹکرائے کہ ان کے سر اور دھڑ ہاتھ پاؤں آپس میں خوب لڑے۔ کسی کا کان کٹ کے الگ۔ کسی کی ناک ندارد۔ کسی کا چہرہ بگڑ گیا۔ کسی کا ہاتھ ٹوٹا۔ کسی کا سر پھوٹا۔ ستم برپا ہو گیا۔ بس قیامت ہی ہو گئی تو اس سے ریل وہاں رک گئی ہے۔ اب کوئی چار گھنٹے کی دیر ہوئی انجن گیا ہے بس دم کے دم میں آئی وہ دیکھیے گھنٹی بجی۔ ٹھناٹھن۔ اب تیار ہو رہیے اور چلیے۔

میر میاں آزاد اور خوجی سوار ہوئے اور ریل تھوڑی دیر میں چلی۔ تو ان کے کمرے میں کئی آدمی بیٹھے تھے۔ انھوں نے سب سے پوچھنا شروع کیا کہ کیوں بھئی قطب کا مینار دہلی میں کس نے دیکھا۔ اب سب خاموش ہیں۔

ایک۔ حضرت ہم تو عمر بھر آگرے میں رہے دلّی جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا ہمارے

یہاں نیل کا بیوپار ہوتا ہے۔

دوسرے۔ ہم گنوار آدمی قطب کے مینار کو کیا جانیں دیہاتی بھائی۔ گئے تو دہلی ہم تین چار بار اور وہاں دو دو چار چار دن رہے بھی مگر منار دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوئی اور کون جاتا مفت کی جھنجھٹ۔

تیسرے۔ دلی ہم گئے تھے سنہ ۱۲۷۵ھ میں اس کو کوئی اکیاون برس کا عرصہ ہوا جب ہم لڑکے سے تھے۔ اٹھارہواں انیسواں سال تھا۔ وہاں چھ سات مہینے رہے۔

چوتھے۔ قطب کا مینار ہم نے دور سے دیکھا ہے۔ پاس سے دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔

پانچویں۔ ہمارا مکان دادرے میں ہے۔ پُل دلی جانے کا اتفاق نہ ہوا نہ ہوا۔

میاں آزاد اپنے دل میں ہنسنے لگے کہ لاحول ولا قوۃ واہ رے ہندوستان۔ اتنے آدمیوں میں سے کسی نے قطب کا مینارہ دیکھا ہی نہیں اور لطف یہ کہ ایک حضرت دادرے کے رہنے والے ہیں جو دہلی کے پڑوس ہے لیکن مینار آج تک نہیں دیکھا بلکہ دہلی ہی نہیں گئے اور دو ایک صاحب جو گئے وہ قطب کے مینار کو دیکھنے نہ گئے ایک بزرگ واہ نے دور سے مینار دیکھا مگر پاس نہ پھٹکے۔ ایک ذات شریف امیر آدمی ہیں۔ مگر تمام عمر آگرے میں رہے اتنی توفیق بھی نہ ہوئی کہ چلو بھئی دہلی تو ہو آئیں۔ لاحول ولا قوۃ۔

میاں آزاد خانہ برباد اور افیمیوں کے استاد میاں خوجی بدنہاد دوسرے دن پھر نواب نام دار والا تبار کے عالی شان اور سپہر تواماں ایوان میں جا ڈٹے۔ دونوں وقت ملتے یارانِ سرپل گپ کے یابو کو خوش بیانی کے میدان میں سرپٹ دوڑا رہے تھے اور ایڑ پر ایڑ لگا رہے تھے کہ اتنے میں موذن نے اللہ اکبر کا نعرہ مسجد سے بلند کیا۔ اب سنیے یہاں جتنے ذات شریف بیٹھے ہیں سب جھنڈے تلے کے شہدے چھٹے ہوئے گرگے۔ ایک بولا روزہ افطار کرنے کا وقت آگیا۔ دوسرے نے کہا جی ہاں آگیا۔ چنیا بیگم کہاں ہیں۔ اس پر ایک فرمایشی قہقہہ پڑا۔

نواب۔ قسم قرآن کی ہمیں آج تک یہ معلوم ہی نہ ہوا کہ روزہ رکھنے سے فائدہ کیا ہوتا ہے۔ مفت میں اپنے آپ کو ہلاک کرنا کون سا ثواب ہے۔ بھئی واللہ جو آج تک ہماری سمجھ میں بھی آیا ہو۔ ہم تو حافظ شیراز کے چیلے ہیں۔ انہیں کی بیعت لائے۔ وہ بھی روزہ نماز کے پابند نہ تھے۔

آزاد - آفریں کیا خوب بات کہی ہے - صاد ہے پیرو مرشد سہ

روش او مسجد سوئے خانہ آمد پیر ما　　چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما

با مریدان رو بسوئے کعبہ چوں آریم چوں　　رو بسوئے خانۂ خمار دارد پیر ما

مصاحب - چوں آئیم خوں - واہ واہ کیا کلام ہے -

رفیق - دوست از مسجد - ان لفظوں کو تو دیکھیے -

خوشامدی - اچھی شعریں ہیں - سعدی بڑے شاعر تھے اور علما تھے -

میر صاحب - اور سنا علم موسیقی میں بھی دخل تھا - بھاگ کی دھن پر سر دھنتے تھے -

راوی - اوہھا جی - واہ ری صحبت - ایک سے ایک زباں داں اور طلیق اللسان بذلہ سنج و لطیفہ گو ہے - اور چشم بد دور شعر و سخن میں کتنا عمدہ مذاق ہے - خدا چشم زخم حوادث سے بچائے تعریف بھی کی تو بھونڈی - سچ ہے سہ

صائب دو چیز می شکند قدر شعر را　　تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس

مصرع ہے کہ - ع با مریداں رو بسوئے کعبہ چوں آریم چوں - اس کو فرماتے ہیں کہ چوں آئیم خوں - اور فرمایا کہ کیا کلام تھا - تھا کی ایک ہی کہی - اب شاید مفقود ہو گیا ہے - دوسرے صاحب نے فرمایا کہ از مسجد - اے سبحان اللہ روش کو دوست اور مسجد کو مسجد ا ور طرہ یہ کہ دوست از مسجد انھیں الفاظ کی تعریف ہو رہی ہے - تیسرے صاحب بولے اچھی شعریں ہیں - شعر کو ان حضرات نے مونث کر دیا اور ی - ن سے اس کی جمع بنائی اور اس پر ستم یہ کہ ان اشعار کو سن کر سعدی شیرازی کی توصیف کر رہے ہیں گویا سعدی کا کلام ہے جس پاگل کو اتنا بھی نہ معلوم ہو کہ حافظ کا کلام ہے یا سعدی کا وہ مدح کرنے کا کیا دم بھرے ؟ کس مزے سے اکڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ سعدی بڑے علما تھے ماشاء اللہ سعدی تو خیر علما تھے ہی آپ بھی چشم بد دور بڑے بلغا بڑے کملا بڑے شعرا اور بڑے فضلاء ہیں - لا حول ولا - لاحول ولا - یہ تو تھا ہی ایک صاحب شیخ جی کی قوالی کے بھی مداح ہیں - انھوں نے کسی تذکرہ ہی میں دیکھا ہو گا کہ شیخ علیہ الرحمۃ بھاگ کی دھن پر سر دھنتے تھے (چلو سو رہو آدھی رات بھئی)

مصاحب - خداوند - میں پوچھتا ہوں کہ آخرش اس فاقے سے فائدہ ہی کیا ہوتا ہے -

نواب - (مسکرا کر) کیا خوب اے یہ تو کسی روزہ دار سے پوچھو مجھ سے اس کی تحقیقات فضول ہے - یہاں جب سے پیدا ہوئے قسم لیجیے جو کبھی ایک دن بھی فاقہ

کیا ہو۔ ارے میاں اوّل تو روزہ رکھنا اپنے آپ کو ہلاک کرنا ہے۔ پھر بھوک میں نماز اور عبادت اور پرستش کی کس کو سوجھتی ہے توبہ توبہ کیجیے۔ دوسرے یہ کہ جب دن بھر کڑاکے کا فاقہ کیا ہو تو رات کو شل ہو کر سو رہے اور یار لوگ تو سحرگہی الگ اڑاتے ہیں اور شام کو الگ دو تین سیر ستیاناس کرتے ہیں۔ مگر ہاں دو چار مولوی بڑا ریاض کرتے ہیں۔ کھاتے بھی کم ہیں اور سوتے بھی نہیں اور دن رات عبادت ہی کیا کرتے ہیں مگر ایسے ہیں کہ مجھ سے کہیے تو انگلیوں پر گن لوں۔

رفیق۔ بجا ارشاد ہوا پیر و مرشد۔ اور یہ دیکھیے آپ ہی کے نمک کی قسم ہے کہ دن رات کھانے ہی کی فکر رہتی ہے چار بجے اور لونڈی پر بڑنے لگیں۔ بے بھاؤ کی۔ اٹھتے جوتی اور بیٹھتے لات۔ لہسن لا۔ پیاز بگھار۔ کباب پکیں۔ میٹھے ٹکڑے پکیں۔ الہٰی توبہ۔

ہندو مصاحب۔ جی ہاں ہمارے یہاں بھی برت رکھتے ہیں لوگ مگر ہم نے تو ہر برت کے دن گوشت چکھا۔

رفیق۔ شاباش ہے لالہ۔ شاباش۔ واللہ کیا پکا مذہب ہے تمھارا۔

نواب۔ تربیت یافتہ ہیں نہ بھئی کچھ گنوار جاہل تو ہیں نہیں۔

لیموں نچوڑ۔ واہ حضور کیا خوب بات پیدا کی۔

راوی۔ اس تعریف کے قربان۔ پیدا حضور نے کیا اپنی ایسی تیسی کی کہنے لگے کیا خوب بات پیدا کی۔

خوجی۔ قسم حسین کی۔ کیا خیالات ہیں حضور کے۔ واہ وہ بات پیدا کی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔

مصاحبین (قہقہہ لگا کر) واہ حضرت واہ کیا تعریف کی ہے۔ کہنے لگے توبہ ہی بھلی۔ واری تری توبہ ہی بھلی یہ توبہ ہی بھلی کی ایک ہی کہی۔ حضرت کسی جنگل میں حضور تولد ہوئے تھے آپ نے تو وہ بات کہی کہ توبہ ہی بھلی۔ یار خدا کے لیے ذری سمجھ بوجھ کے بولا کرو۔

رفقا۔ اے حضرت بولیں کیا بس اب بولنے کے دن گئے برسات ہو چکی نہ۔

خوجی۔ (دو ڈانو ہو کر) میاں ایک ایک آدھ۔ یا کہو جو کبھی لڑیں۔ ہم اس میں بھی بند نہیں۔ میاں سنو۔ یہاں عمر بھر رئیسوں امیروں نوابوں ہی کی صحبت میں رہے۔ تم لوگ ابھی کچھ دن سیکھو۔ ابھی بچے ہو جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش۔ ابھی خدا جھوٹ نہ بلوائے تو دودھ کے دانت بھی نہ ٹوٹے ہوں گے۔ آپ اور ہم برمنہ آئیں

شانِ خدا ۔

بُت کریں آرزو خدائی کی
شان ہے تیری کبریائی کی

واللہ ایک بار ہمارے نواب صاحب کے یہاں ایک ذات شریف تشریف لائے۔ بڑے طرح دار اور زبان آور میاں آزاد ان کا نام تھا۔ آتے ہی فقرہ بازی کرنے لگے۔ بس قبلہ میں نے جو آڑے ہاتھوں لیا تو جھینپ کر نوک دم بھاگے واللہ ہے وہ آڑے ہاتھوں لیا کہ ان کی نانی ہی مرگئی۔ آزاد آزاد بڑے آزاد بنتے تھے۔ ایسے جھینپے کہ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ نواب کے یہاں جو آیا اس نے مُنہ کی کھائی۔ دم دبا کر بھاگا۔ میرے مقابلے میں کوئی ٹھہرے تو بھلا۔ لے بس آپ ایک کو بلاییے۔ دو دو چونچیں ہوں بھئی پالی سے نوک دم نہ بھاگے تو مونچھیں منڈوا ڈالوں۔

مصاحب ۔ (آگے بڑھ کر) آئیے بس آئیے دو دو نہیں چار چار چونچیں ہہی۔ آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ بندے کی زبان بھی وہ زبان ہے کہ کترنی کو مات کرے زبان آگے جاتی ہے۔ لفظ پیچھے رہے جاتے ہیں۔

خوجی ۔ زبان کیا چرخا ہے رانڈ کا۔ واہ ری زبان فرمائشی زبان ہے۔ مگر خدا جھوٹ نہ بلائے تو۔ رے اور زے اور ڑے اور ٹے زبان سے نہ نکلتا ہوگا۔ روٹی کو تو حضور روتی کہتے ہوں گے۔

مصاحب ۔ جب خدا جھوٹ نہ بلوائے نا۔ آپ اور جھوٹ نہ بولیں۔ واہ وضع کے خلاف ہے۔ ماشاء اللہ آپ کو وضع کا کس درجہ خیال ہے جب سے ہوش سنبھالا کبھی سچ بولے ہی نہیں عمر بھر میں ایک دفعہ دھوکے سے سچ نکل گیا تھا جس کا آج تک افسوس ہے۔

خوجی ۔ اور وہ واقعہ میں بتاؤں جب آپ سچ بولے تھے ایک شخص نے ان کے باپ کا نام پوچھا انھوں نے جلدی میں صاف صاف بتا دیا۔ اس کا آج تک رنج ہے۔

اس پر سب کے سب ہنس پڑے اور خوجی مونچھوں پر تاؤ دینے لگے مصاحب ایک چھٹے ہوئے گرگے وہ کب جھینپنے لگے۔ جب محفل سے نکالے گئے تب تو جھینپے نہیں اب بھلا کیا شرمائیں گے۔ شرم چہ کتی ست کہ پیش مرداں آید باش۔ جھینپیں تو نواب کی محفل سے نکالے جائیں اسی دم گردن ناپی جائے۔ اور چلتے پھرتے نظر آئیں۔

خوجی - کیوں حضرت کچھ فرمایئے تو آپ تو خاموش ہی ہو رہے۔
مصاحب - اجی تم گو کھوں سے کیا بحث کریں۔
خوجی - گالیاں دیجیے گالیاں - پانی پی پی کر کوسیے۔ پنجے جھاڑ کر لڑنے لگیے -
لاحول ولا قوۃ۔

سرائے میں خوجی اور بوا زعفران

ایک دن پچھلے پہر سے کھٹملوں نے میاں خوجی کی ناک میں دم کر دیا بدن بھر کا خون جونک کی طرح پی لیا - اب وہ ادھر سے کروٹ لیتے ہیں تو انھوں نے ادھر کا ہم چمنی کر دیا اور اُس طرف پھرے تو اس طرف خون کے فوارے بہنے لگے۔ حضرت بہت ہی جھلائے افیمی آدمی چار پہر آنکھوں میں کٹی پچھلے سے ذرا آنکھ لگنے کو تھی کہ کھٹملوں کا خدا بھلا کرے انھوں نے انگر کھا لہو لہان کر دیا - ایک دفعہ پینک میں آئے تو ان حضرات نے پنڈلیوں کو بھڑ کی طرح بھنبھوڑ کھایا - اور انھوں نے پینک سے چونکتے ہی غل مچایا کہ لانا میرا قرابینچہ! یہ ہانک جو انھوں نے لگائی تو آس پاس والوں کی نیند حرام ہو گئی - معاً چور کا گمان ہوا - لینا لینا جانے نہ پائے - چور چور چور ارے میاں کہاں کدھر کس رخ لینا پکڑ لیا ہے - دیکھو گانسے رہنا کھڑے رہو خوب کھدیڑو بھئی مسافرو ہوشیار - اپنے اپنے مال کی حفاظت کرو - اب سرا بھر میں ہلڑ مچا ہوا ہے - ہڑ بونگ کا عالم - کوئی آنکھیں ملتا ہوا اندھیرے میں ٹٹولتا ہے کوئی دیدے پھاڑ پھاڑ کے اپنی گٹھری کو دیکھ رہا ہے کوئی مارے ڈر کے آنکھیں بند کیے ہوئے دبکا پڑا ہے منکتا تک نہیں - میاں خوجی نے جو لینا لینا جانے نہ پائے چور چور کی آواز سنی تو خود بھی غل مچانا شروع کیا کہ رہائیں ہائیں! خبردار جانے نہ پائے لانا میری قرولی - او چور او گیدی - ٹھہرا رہنا کہ میں بھی قرولی لے کر آن پہنچا - یہ خبر ہی نہیں میاں کو کہ یہ شگوفہ حضرت ہی نے چھوڑا ہے فرماتے ہیں کہ ٹھہرا رہنا - میں بھی قرولی لے کر آتا ہوں - دیکھیے دیکھیے آپ اپنی داڑھی کی طرف دیکھیے غصے کو تھوک دیجیے - قد تو حضور کا ماشاء اللہ پون انچ کا اور خم و دم یہ کہ قرولی لے کر

آن پہنچے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو قرولی کی حضرت نے کبھی عمر بھر صورت نہ دیکھی ہوگی مگر بات بات پر قرولی اور قرابینچ کی فکر رہتی ہے کوئی اس مسخرے سے اتنا تو پوچھے کہ اب قرابینچ کا فیشن کہاں شیر پنجہ باندھے آپ نے کس کو دیکھا قرولی کس کی کمر میں نظر آئی مگر ان کو تو بک دینے سے مطلب ہے۔ خیر۔ میاں خوجی جو گرمائے تو چھپر کھٹ سے اٹھ ہی کھڑے ہوئے اور لپک پڑے۔ اب آؤ دیکھتے ہیں نہ تاؤ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہے ہیں کہ لینا لینا لینا۔ اس معقول لینے کے عوض کہیں دینے نہ پڑ جائیں لپکے تو بھٹیاری کو ڈپٹ لیا اور فرمایا کہ تو ہی چور ہے۔ بھلا بے بھلا پکڑ لیا حریف کو۔ بھٹیاری نے کہا میاں کچھ خبر ہے۔ ہوش کی باتیں کرو اتنے میں آپ نے دوڑنا شروع کیا۔ پینک میں سوجھ گئی کہ چور آگے بھاگا جاتا ہے۔ دوڑتے دوڑتے ٹھوکر جو کھاتے ہیں تو اڑاڑا دھوں۔ میاں خوجی اپنی شامتِ اعمال سے گرے بھی تو کہاں جہاں کمہار کے ہنڈے رکھے تھے۔ گرنا تھا کہ کئی ہنڈے چکنا چور ہوگئے کمہار نے للکارا کہ چور چور، یہ اٹھنے ہی کو تھے کہ اس نے آن کر دبوچ لیا اور پکارنا شروع کیا کہ ارے دوڑو چور پکڑ لیوں مسافر اور بھٹیارے اور بھٹیاریاں اور حوالی موالی سب کے سب دوڑے پڑے۔ کوئی ڈنڈا لیے ہے کوئی لٹھ باندھے کوئی بید گھماتا ہے کوئی لکڑی ہلاتا ہے مگر افسوس کہ میاں خوجی کے پاس قرولی نہ قرابینچہ۔ اندھیری رات گھٹا ٹوپ اندھیرا چوطرفہ چھایا ہوا کسی کو کیا معلوم کہ یہ چور ہے یا میاں خوجی بگڑے دل آدمیوں کو شکار ہاتھ آیا خوب بے بھاؤ کی حضرت پر پڑنے لگیں۔ یار لوگوں نے تاک تاک کر زناٹے کے ہاتھ لگائے اب خوجی کی سٹی بیٹی بھولی نہ قرابینچہ یاد آیا نہ قرولی۔ جب خوب پٹ پٹا چکے تو ایک مسافر نے کہا کہ بھئی ذرا ٹھہرو تو یہ تو خوجی ہیں جو اس کوٹھری میں پانچ سات روز سے ٹکے ہوئے ہیں چراغ جلایا گیا تو معلوم ہوا کہ تیرہ صدی کے بالشتیے میاں خوجی ہی ہیں کمہار کو لوگوں نے للکارا کہ چھوڑ دے بے یہ چور نہیں چھوڑ دے۔ ہنڈوں کے دام ہم دیں گے۔

الغرض بعد خرابی بصرہ میاں خوجی کی جان بچائی مگر کب جب کچومر نکل گیا۔ انجر پنجر الگ ہوگئے۔ جب یارانِ سرپل نے چپت گاہ کو خوب سہلا دیا۔ تو میاں خوجی چلے۔ میاں آزاد سے بھی کسی نے کہہ دیا کہ تمہارے ساتھی خوجی چوری کی علت میں

پھنسے ہیں کسی مسافر کی ٹوپی چرائی تھی۔ سو اس نے پکڑ لیا۔ دوسرے نے آن کر کہا کر نہیں یہ نہیں ہوا۔ ہوا یہ کہ ایک کمہار کی ہنڈیاں چرانے گئے تھے غل ہاگ ہو گئی۔ بھئی واہ جتنے منہ اتنی ہی زبانیں اور اتنی ہی باتیں اسی دم کی بات اور مختلف روائتیں متھو ہو گئیں۔

میاں آزاد کو بڑا ہی بر معلوم ہوا کہ ہمارا ساتھی اور چوری کی علت میں مانو ہو مگر یہ بات ان کو جچی نہیں۔ سوچے کہ خوجی ایسے آدمی نہیں وہ چوری چکاری کیا جانیں وہ تو بس فقرہ بازی ہی خوب جانتے ہیں اور بھلا چوری چکاری بھی کرتے تو ہنڈیوں کی خیر۔ انھوں نے دل میں ٹھان لی کہ چلیں اور خوجی کو نلوہ بچا لائیں۔ ورنہ آزاد نہیں۔ چارپائی سے اترے اور پانڈی ہاتھ میں لی کہ جو بولے گا اس کو مزا چکھاؤں گا۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ خوجی صاحب جھومتے ہوئے چلے آتے ہیں۔ اور بڑبڑاتے جاتے ہیں کہ ہات ترے گیدی کی بڑا آزاد بنا ہے۔ ایسے آزاد بہت دیکھے ہیں مردود چارپائی پر پڑا خرخر کیا کیا اور ہماری خبر ہی نہیں۔ اب بڑبڑاتے ہوئے میاں آزاد کی گلی تک چلے آئے مگر آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ اتنا بھی نہ سوچا کہ آزاد کھڑے ہیں جب قریب پہنچے تو میاں آزاد نے یوں کہا۔

آزاد۔ خیر ہم کو تو پیچھے گالیاں دیجیے گا اب یہ بتاؤ کہ ہاتھ پاؤں تو نہیں ٹوٹے۔

خوجی۔ ہاتھ پاؤں ٹوٹنا۔ یہ لوہے کی سلاخیں ہیں۔ آپ اس وقت ہوتے تو دیکھتے کہ بندہ درگاہ نے کیا کیا جوہر دکھائے پچاس آدمی گھیرے ہوئے تھے۔ پورے پچاس۔ ایک کم نہ ایک زیادہ۔

راوی۔ درست اس وقت آپ کو اتنا ہی تو ہوش تھا کہ آدمی گننے بیٹھتے پہلے یہ تو فرمائیے کہ پڑیں کتنی۔ آدمی بھی مکھی کے جوڑ ہوئے کہ غول میں چھپاک سے گن لیے مارے چیتوں کے بولا تو گئے تھے۔ مگر بے حیا کی بلا دور۔ جھاڑ پونچھ کر پھر موجود۔

خوجی۔ واللہ میں اس وقت پھلجھڑی بنا تھا۔

راوی۔ لے صل علی واللہ آپ آدمی کیا دمڑی کے پٹے باز ہیں۔ زبان البتہ پھلجھڑی کو بھی مات کرتی ہے۔

خوجی۔ بس یہ کیفیت تھی کہ دس آدمی اس شانے کو اور دس ہی اس شانے کو پکڑے ہوئے تھے اور میں جو پھرا تو کسی کو انٹی دی دھم سے زمین پر گرا۔ کسی کو

کوٹھے پر لاد کر مارا کھٹ سے چھپر کھٹ کی پٹی پر۔ دو چار میرے رعب میں آگر تھرتھرا کر گر ہی تو پڑے دس پانچ کی ہڈی پسلی چکنا چور کر دی یہ ڈھیکلی کھائی وہ ہو رہا ادھر نکلا اُدھر ابھرا۔ گھس بیٹھ میر تو آپ جانیے این جانب برق دم میں ہی جو سامنے آیا نیچا دکھایا جو منہ چڑھا منہ کی کھائی۔

راوی۔ اور ایک صاحب آپ کے رعب میں آگر کمہار کے ہنڈوں پر بھی تو گر پڑے تھے۔ واہ رے بنو ٹیپے تیری بھی آج دھوم ہے۔

خوجی۔ خدائی بھر میں کوئی ایسا چوٹ دار آدمی دکھا تو دیجیے۔

راوی۔ حضرت خدائی بھر کا حال تو خدا ہی کو خوب معلوم ہے مگر اتنی گواہی تو ہم بھی دیں گے کہ آپ سا بے حیا بے غیرت جوتی خور اس بھر میں تو اس سرے سے اس سرے تک رئی ہمیں نظر نہیں آتا اس ڈینگ پر پھٹکار لے لعنتِ خدا۔

خیر میاں آزاد اور خوجی اس وقت سو رہے اور دوسرے روز شام کو نواب صاحب کے ہاں پہنچے۔

آزاد۔ پیر و مرشد رخصت ہونے آیا ہوں۔ زندگی ہے تو پھر ملوں گا۔ ورنہ یہ آخری الوداع ہے۔

نواب۔ کیا کوچ کی تیاریاں کر ہی دیں۔ بھئی جب واپس آؤ گے تو ملاقات ضرور کرنا بھول نہ جانا۔

آزاد۔ بھلا یہ آپ کے فرمانے کی بات ہے۔

خوجی۔ غلام بھی رخصت ہوتا ہے۔

نواب۔ آپ تو واللہ بڑے ہلسوڑ آدمی ہیں کہیے اب بشرط خیریت کبھی ملیے گا بھی۔

خوجی۔ خدا لائے گا تو آؤں گا حضور۔

داروغہ۔ میاں خدا کرے سب سے پہلے انھی پر گولی پڑے بلکہ گولہ اور وہ بھی بم کا گولہ۔ اب خدا اس منحوس کی صورت نہ دکھائے اور نہ اس مردک کو یہاں لائے۔

الغرض آزاد اور خوجی نواب صاحب سے رخصت ہوئے۔

نواب۔ فی امان اللہ خدا بخیریت پہنچائے اور واپس لائے۔

خوجی۔ داروغہ جی خدا حافظ۔

داروغہ نے کہا میاں آزاد کو امام ضامن اور خوجی کو شیطان کو سونپا۔ آزاد اور خوجی رخصت ہوئے تو پھاٹک سے باہر نکل کر میاں خوجی نے کہا بھئی ذرا ٹھہرے رہنا میں ابھی ابھی آیا۔ آپ کو جو وحشت نے گھیرا تو پہنچے زنانی ڈیوڑھی پر۔

خوجی۔ دربان سے بیارچے ذرا بوا زعفران کو نہیں بلا دیتے

دربان تھا گنوار کا لٹھ گو گھنا آدمی اس نے ان کو تپائی دی کہ آپ بیٹھیے۔ یہ بیٹھے تو پینک میں سر یہ چلا وہ چلا۔ اب کوئی دم کے دم میں زمین دوز ہوا چاہتا ہے۔ اتنے میں دربان نے آواز دی کہ بوا زعفران بوا زعفران۔ اجی بوا زعفران۔ اے بوا زعفران۔ بوا زعفران بولیں۔ اے ہے تو کچھ کہو گے بھی یا بوا زعفران ہی پکارتے جاؤ گے۔ دماغ کے کیڑے تک چاٹ گئے۔

دربان۔ اجی آپ کے لڑکے وہ۔ تو یہ تمھارے میاں آئے ہیں۔

دربان بے وقوف نے پہلے لڑکے کہہ کر میاں کا لفظ جو کہا تو گھر بھر کی عورتیں کھل کھلا کر ہنس پڑیں اور بیگم صاحب ہنستے ہنستے بولیں کہ اچھے گنوار کو ڈیوڑھی پر بٹھا ہے۔ اس نے پھر غل مچایا کہ اجی بوا جی آئیے دیکھیے تو ان کا حال کیا ہے ابھی تو خاصے بھلے چنگے تھے۔ ابھی کچھ سے کچھ ہو گیا۔ بوا زعفران سے اور ان کے میاں سے لاگ ڈانٹ تھی وہ جو گھبرائی ہوئی آئی تو ان کو دیکھا کہ تپائی پر بیٹھے پینک میں جھوم رہے ہیں۔

اب یہ لطیفہ بھی سننے کے قابل ہے کہ بوا زعفران کے میاں کی بھی بعینہٖ یہی قطع مبارک تھی۔ خوجی سے بالکل مشابہ ذرا فرق نہیں وہی سوا بالشت کا قد۔ وہی دبلے پتلے ہاتھ پاؤں اور طرہ یہ کہ افیون بھی پیتے تھے اور زعفران ان سے روز کہا کرتی تھی کہ تم افیون کھانا چھوڑ دو۔ وہ کب چھوڑنے والے تھے بھلا۔ اسی سبب سے دونوں میں دن بھر نہیں بنتی تھی آخر کار ایک روز اس کے میاں نے کہا کہ اچھا آج سے اگر ہم کو پینک میں دیکھو۔ تو گن کر پانچ سو جوتے لگاؤ اور جو بھول جاؤ تو پھر سر سے گنو۔ زعفران نے جو باہر آ کر دیکھا تو حضرت موجیں لے رہے ہیں جل بھن کر خاک ہی تو ہو گئی اور جاتے ہی میاں خوجی کے بیٹے پاڑ کر ایک دو تین چار پانچ دھپیں تڑاتڑ لگا ہی تو دیں۔ خوجی کا نشہ ہرنا ہو گیا۔ مار کے آگے بھوت ناچے چونک کر فرماتے کیا ہیں۔

خوجی۔ لانا تو ولائیتی قرولی۔ ارے ان سرائے والوں نے تو ہماری کھوپڑی پلپلی کر دی۔

راوی۔ چہ خوش ابھی اپنے نزدیک آپ سرا ہی میں رونق افروز ہیں۔ واہ ری افیم یہ جو نہ کرے وہ تھوڑا ہے۔ بوا زعفران نے ایک دفعہ ہی پچ کچا کر چکٹ دی تو حضرت کی روح پر صدمہ ہوا اور ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہا۔ مگر وہ حبشن دیوتی نواب کے یہاں قیمیں کھا کھا کر ہتنی بنی پھرتی تھی۔ یہ بے چارے سوا بالشت کے آدمی اس نے ان کو چرمر کر ڈالا۔ مگر یہ قرولی ہی مانگا کیے اتنے میں غل غپاڑے اور دھر پکڑ کی آواز جو بلند ہوئی تو اصیلیں مغلانیاں ماما چھو چھو لونڈیاں سب باہر نکل آئیں اور بیگم صاحب اور عصمت النسا بیگم اور گیتی آرا بیگم سب کے سب پردے کے پاس دوڑیں کہ دیکھیں کیا ہو رہا ہے۔

بیگم صاحب۔ بوا زعفران آخر یہ ہے کیا۔ روئی کی طرح اس بے چارے کو تُوم کے دھر دیا۔ واہ۔

عصمت النسا بیگم۔ اوئی نوج ایسی جورو کسی کی ہو۔ ہاتھ ہی ٹوٹیں مردار کے ادھ مرا ہی کر ڈالا شیخ سدو تو نہیں سر پر سوار ہے وہ موا تو آپ ہی زندگی سے بےزار ہے۔ اس لئے اوپر سے دو چار لاتیں لگا دیں۔

مغلانی۔ حضور زعفران کا قصور نہیں یہ اس مردوے کا قصور ہے جو جُروا کے ہاتھ بک گیا ہے (خوجی کا کان پکڑ کر کہا پھٹے سے منہ جروا کے ہے جوتیاں کھاتے ہو اور ذرا چوں نہیں کرتے)

خوجی۔ جروا! ہائے افسوس۔ اجی یہ جورو کس مردک کی ہیں۔ خدا خدا کرو۔ بھلا میں اس ہڑدنگی دیو کی بچی کالی کلوٹی ڈائن کے ساتھ بیاہ کرتا۔ یہ اس کو اس کو سوجھی گیا کہ مار کے بھرکس نکال دیا۔ اور دانت کٹکٹا کر بوٹیاں تک نوچ ڈالیں یہ ہے کون بلا میرے تو حواس بجا نہیں۔

بوا زعفران نے جو یہ باتیں سنیں تو وہ آواز ہی نہیں۔ وہ لب و لہجہ ہی نہیں۔ غور کر کے دیکھتی ہے تو میاں فریاں کوئی نہیں یہ تو کوئی اور ہی ہے۔ ع کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ چہرہ زرد ہو گیا اور دانتوں کے تلے انگلی دبا کر خاموش ہو رہی۔

مغلانی۔ لے ہاں یہ ہے کون چمپا کے ابا تو نہیں ہیں۔

عباسی (ہنس کر) اے واہ بوا زعفران۔ اب تو راہ چلتوں کو بھی بنانے لگیں ذری پہنچانو تو یہ ہیں کون۔

فرخندہ۔ اوئی یہ تو بیچارے نواب صاحب کے یہاں دن رات بنے رہتے تھے یہ یہاں کیسے آئے۔ اے زعفران آخرش یہ تم کو سوجھی کیا ذری مشال (مشعل) جلا کر دیکھو تو چھمیا کے ابا بھی ہیں۔

بیگم صاحب نے بھی خوب لے دے کی اور اصیلوں اور مغلانیوں نے تھوڑی تھوڑی کہہ کر بوا زعفران کو رلا ہی چھوڑا۔ وہ اور بھی چور بن گئی کہ ناحق ایک بے چارے کی آبرو لی اور کھوپڑی کی کھوپڑی گنجی کر ڈالی۔ اتنے میں نواب صاحب سے کسی نے جا کر ساری داستان کہہ دی اور محفل بھر میں حاضرین جلسہ پیٹ پکڑ کر ہنسنے لگے کہ بھئی واللہ یہ نئی روایت ہے۔ اس پر میاں ندرت بولے کہ بھئی ان کو یہاں تک تو لاؤ۔ دیکھیں تو ہیں کون بزرگ۔ خدمت گار پہنچے اور میاں خوجی کو لے آئے۔

حاضرین۔ ایں!! ارے میاں یہ تو خوجی ہیں لاحول ولا قوۃ۔

ہنسی کے سمندر پر ایک اور تازیانہ ہوا اور کل حاضرین ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ گئے۔ اب ادھر نواب صاحب اور ان کے مصاحب قہقہہ لگاتے ہیں ادھر گھر سے قہقہہ کی صدائیں بلند ہیں اور خوجی اپنے دل میں خفیف کہ یکے نقصانِ مایہ و دیگر شماتتِ ہمسایہ ایک تو خوب پٹے دوسرے اب۔ ع لوگوں کو شگوفہ ہاتھ آیا۔ نواب صاحب نے زعفران کو اندر سے بلوایا۔ مگر خدمت گار نے کہا کہ حضور وہ تو نہیں آتیں پردے کے پاس کھڑی رو رہی ہیں۔

خوجی۔ اس مکر کو دیکھیے گا حضور۔ رونا ہم کو چاہیے۔ الٹا وہ رو رہی ہیں۔

ندرت۔ بھئی تم کو میاں بنایا۔ رونے سے بکھی گئی گزری۔

نواب۔ زعفران کی سزا ہم نے یہ تجویز کی ہے کہ خوجی کو دے دی جائے۔

خوجی۔ بس غلام کے حال پر رحم کیجیے۔ معاف فرمائیے مجھے۔ بندہ درگزرا غضب خدا کا اس دیلو کی بچی کے ساتھ اور میں شادی کروں خدا بچائے۔ خدا ہر آفت سے محفوظ رکھے۔ میاں کے دھوکے میں تو اس نے ہمارے ہاتھ پاؤں ڈھیلے کر دیے۔ اور جو کہیں سچ مچ میاں ہی ہوتے تو معاذاللہ چٹنی ہی کر ڈالتی کیا کیجیے کچھ بس نہیں چلتا ورنہ نوابی ہوتی تو اتنی قرولیاں بھونکی ہوتیں کہ مر بھر یاد ہی تو کرتی۔ یہاں

کوئی ایسے ویسے نہیں ۔ گھانس نہیں کھودا کیے ہیں ۔ چکلہ داریاں ۔ کمیدانیاں رسالداریاں کیا کیے ہیں ۔

راوی ۔ اے صلِّ علی ۔ بے شک حضور نے کمیدانی بھی کی اور چکلہ دار بھی تھے دڑ گلے والی پلٹن کے رسالدار آپ ہی تھے مگر بوا زعفران نے رسالداری سب خاک میں ملا دی ایک نہ چلی ۔

نواب ۔ اور وہ آپ کے ساتھی میاں آزاد کہاں ہیں ۔

خوجی ۔ پھاٹک کے اس طرف پل پر بیٹھے ہیں ۔

ندرت ۔ میاں دیکھو پھاٹک سے نکل کر پل پر میاں آزاد بیٹھے ہیں ان کو ذرا لپک کر بلا لانا ۔

میاں آزاد آئے تو روشن علی نے ان کو ساری داستان سنائی ۔ اور آزاد خوب کھل کھلا کر ہنس پڑے ۔

آزاد ۔ کہیے قرولی اس وقت یاد نہ آئی ۔

دربان ۔ جی ہاں قرولی تو یاد آئی تھی اور بڑا غل غپاڑا مچایا تھا اور سرا کا نام لیتے تھے کہ سرا والوں نے تو کھو بڑی بلبلی کر دی ۔ جب آنکھ کھلی اور بوا زعفران کو دیکھا تو نشہ ہرن ہو گیا اور اس نے اس دھوکے میں کہ اس کے میاں ہیں بڑی گت بنائی پھر محفل بھر میں ایک فرمائشی قہقہہ پڑا اور مصاحب مارے ہنسی کے لوٹنے لگے ۔

آزاد ۔ آخر یہ وہاں کیا کرنے گئے تھے ۔

داروغہ دکھپریل سے دوڑتے ہوئے آئے کیا ہوا کبھی کیا ہوا خیر باشد کس پر پڑیں نزوا ترڑ ۔

نواب ۔ آپ کے دوست میاں خوجی پر ۔

داروغہ اور میاں خوجی میں تو لاگ ڈانٹ تھی ہی انھوں نے جو یہ خبر سنی تو بہت ہی خوش ہوئے اور بآواز بلند کہہ اٹھے کہ خوجا اسی لائق ہے میں بہت خوش ہوا ۔

روشن علی ۔ اجی سیے تو لوٹنے لیے ۔ حضرت ڈیوڑھی پر پہنچے تو تیاری دیکھ گئے ۔ دربان سمجھا کہ بوا زعفران کے میاں ہیں اس نے آواز دی کہ بوا زعفران تمھارے میاں ہیں ۔ اس نے باہر آ کر دیکھا تو پینک میں اور اس کو افیم سے تھی نفرت بس پھر اللہ دے اور

بندو لے پیچھے پڑ کر خوب تڑاتڑ لگائیں۔ آپ اس سے اتنا بھی نہیں کہتے کہ میں تیرا میاں نہیں ہوں۔

داروغہ (بہت خوش ہو کر) سزا۔ اس گیدی خر کی سزا (کان میں جھک کر) کیوں اماں بچہ چپتیائے گئے نہ۔ اور عطر مانگو۔

الغرض بڑی دیر تک اندر باہر دونوں جگہ قہقہے پر قہقہے پڑے اور آخر کار میاں آزاد اور خوجی از سر نو نواب صاحب اور حاضرین جلسہ سے رخصت ہوئے اور چلے۔ اثنائے راہ میں میاں آزاد مارے ہنسی کے بے تاب ہو گئے اور ایک بار خواجہ صاحب فرمانے لگے میں کہ میں نے بھی وہ وہ چٹکیاں لی ہیں کہ زعفران بھی یاد ہی کرتی ہوں گی۔

راوی۔ ذرا ادھر تو چار آنکھیں کیجیے۔ اے پھٹکار دستی پٹی تو بھولی ہوئی تھی مگر اکڑنا نہ چھوڑا۔ واہ رے حیادار۔

آزاد۔ میاں ڈوب مرو جا کر۔ ایک چلو پانی کافی ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ ایک عورت سے ہاتھا پائی میں جیت نہ پائے۔

خوجی۔ جی وہ عورت سو مرد کے برابر ہے چمٹ پڑے تو آپ کے حواس بھی فقرو ہو جائیں۔

جہاز پر سوار ہونے کے شرائط

میاں آزاد اور خوجی سرا پہنچ کر چلنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ گوشت اور روٹی اور باقر خانی اور کباب کی فکریں ہونے لگیں اور لد پھند کر اسٹیشن پر چلے۔

خوجی۔ یا خدا بچائیو۔

آزاد۔ ایں خیر باشد کیا شیطان نے انگلی دکھائی یا بوا زعفران یاد آئیں۔

خوجی۔ اجی حضرت یہ تو فرمائیے کہ آپ چلتے کہاں ہیں۔ اف میدانِ جنگ میں گولیوں اور چھروں کے منہ میں خدا ہی خیر کرے۔ یار ایک چنے کے برابر گولی میں تو کام تمام ہو جائے گا۔ بھائی کہا مانو۔ حسن آرا سے درگزرو۔

آزاد۔ بہت خوب اب بس اب زیادہ بک بک نہ کیجیے۔

خوجی - حضرت بنیے چلنے کو تو ہم چلتے ہیں مگر اتنی شرطیں قبول کیجیے تو بسم اللہ ورنہ ع - بندہ رخصت می شود اللہ نگہبانِ شماست - کہیے تو کہ چلوں - ایک ایک شرط منظور ہوگی ورنہ آپ اپنی راہ لیں - میں اپنا راستہ لوں۔

شرط اول - قرولی ہم کو ضرور دیجیے اور ایک قرابینچہ بھی - ہمارے پاس رہے۔ چلے ہیں تو مورچے پر آپ اور ایک پھول کی چھڑی تک پاس نہیں۔

دوم - برس بھر کے صرف کے لیے افیم اپنی جانب کو دیجیے میں اپنے لادے لادے پھروں گا - ورنہ جمائیوں پر جمائیاں آئیں گی اور بے موت انتقال ہو جاؤں گا۔ آپ تو عورتوں کی طرح نشے کے عادی ہی نہیں مگر بندہ درگاہ بے افیم پیے ایک قدم نہ چلیں گے - وہاں پردیس میں افیم ملے یا نہ ملے کہاں ڈھونڈتے پھریں گے۔

سوم - اتنا بتا دیجیے کہ وہاں لوا زعفران کی سی ڈنڈ پیل پنجہ کش ریونیاں تو نظر نہ آئیں گی - ہوں تو بندہ ابھی سے رخصت ہوتا ہے - خدا حافظ - اف فوہ - واللہ کیا کس کس کے لاتیں لگائی ہیں اور کیا تان تان کے مکے بازی کی ہے کہ پلیتھن ہی نکال ڈالا۔ روح پر صدمہ ہے واللہ روح پر۔

چہارم - سرائیں اب ہم تمام عمر نہ اتریں گے اور جو جہاز پر کمہار ہوئے تو ہم بس ڈوب ہی مریں گے - اجی اتفاق ہے ہم ٹھہرے آدمی بھاری بھرکم کہیں پاؤں پھسل گیا اور ایک آدھ ہنڈا لوٹ گیا تو کمہار انجر پنجر ہی الگ کر دے گا - لہٰذا کمہاروں کی صحبت آج سے الغلط۔

پنجم - جس رئیس کی صحبت میں بزاز آتے ہوں گے وہاں نہ جائیں گے نہ جائیں گے - اس میں لالہ نین سکھ ہوں یا لالہ بلدیو - اجی بزاز تو ٹھہرے - زمین کے گز سب کہیں گھوما چاہیں - مگر ہم بہت دیکھ کر جائیں گے۔

ششم - جہاں آپ جاتے ہیں وہاں کانجی ہوس تو نہیں ہے کہ گدھے کے دھوکے میں کوئی ہم کو کان پکڑ کے کانجی ہوس پہنچائے - ذرا یہ دریافت کر لیجیے گا۔

ہفتم - ٹٹو پر سوار نہ ہوں گے اس میں چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔

ہشتم - میٹھے پلاؤ روز پکیں۔

نہم ہم کو میاں خوجی نہ کہنا جناب خواجہ صاحب قبلہ کہا کیجیے - یہ خوجی کیا معنی۔

دہم ۔ مورچے پر ہم نہ جائیں گے ۔ بس باورچی خانے کا انتظام ہمارے تعلق رہے ۔ اور لوٹ مار میں جو کچھ ہاتھ آئے وہ بھی ہماری تحویل میں دیا جائے ۔

یازدہم ۔ حسن آرا کے نام ایک خط روز لکھنا اور ہر خط میں ہماری طرف سے بندگی بلکہ دعائے خیر ۔

دوازدہم ۔ گولی کھانے کے تین گھنٹے قبل اور مرنے کے دو گھڑی پیشتر ہمیں اطلاع کر دینا ۔

سیزدہم ۔ جو ہم خدانخواستہ داخلِ خلد بریں ہوں تو لاش کو ہندوستان میں پہنچوانا اور جہاں والدِ مبرور کی لاش دفن ہے وہاں ہی دفنانا لیکن ہم کو خود ہی نہیں معلوم کہ پدر بزرگوار مرے کب اور دفنائے کہاں گئے اور تھے کون ۔ آپ ذرا پتہ لگا لیجیے گا ۔ اور تربت پہلو بہ پہلو بنوائیے گا ۔ اگر ان کی تربت نہ ملے تو کسی قبرستان میں جا کر جو سب سے بہتر قبر بنی ہو اس کے قریب ہم کو بھی دفنانا اور لکھ دینا کہ یہ ان کے والد ماجد کا مزار شریف ہے ۔

چہاردہم ۔ پینک کے وقت ہم کو ہرگز نہ چھیڑنا ۔ اس وقت یہاں استغراق کی کیفیت ہوتی ہے ۔ اتنی شرطیں اگر بسر و چشم قبول ہوں تو چشم ما روشن دلِ ما شاد خانۂ احسان آباد ورنہ خوجی نہ میاں آزاد ۔

آزاد ۔ ۱ ۔ گیارھویں شرط بسر و چشم منظور ۔

۲ ۔ بارھویں شرط بڑی کڑی ہے ۔ مرنے کے دو گھڑی پیشتر کہہ دیں گے کہ اب چل چلاؤ لگ رہا ہے مگر گولی کھانے کے تین گھنٹے قبل بتا دینا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے ۔

۳ ۔ اور بھائی سنو ۔ خواجہ صاحب تو ہم سے نہ کہا جائے گا ہم تو خوجی ہی خوجی کہا کریں گے ۔

۴ ۔ ہاں یہ شرط کیے لیتے ہیں کہ نہ تو وہاں بوا زعفران ہوں گی نہ بزاز نہ کانجی ہوس ۔ آپ خوب مزے سے جہاں چاہیے گھانس چریے کوئی چوں تک تو کرے گا نہیں ۔ اور کمھار کا تو جہاز پر عکس نہ پڑنے پائے گا ۔

۵ ۔ ایک قرولی ایک قرابین ایک پتھر کلا ایک دھرتی دھمک توپ آپ کو خرید دیں گے آپ مزے سے توپ کاندھے پر لادے یا ہاتھ میں لیے جہاں چاہیے دابیے ۔

۶ ۔ ایم بمبئی میں آپ کی پیٹھ پر لاد دیں گے ۔ گھبرائیے نہیں کہیے اب تو جیسے گجو رہا اب بھی رہیے گا ۔

خوجی۔ بسم اللہ کر کیجیے۔

میاں آزاد۔ لائے اس بت کو التجا کر کے
کفر توڑا خدا خدا کر کے

اب راستے میں راگ نہ لائیے گا۔

خوجی۔ ایک بات اور رہ گئی۔

آزاد۔ بس لگے ہاتھوں وہ بھی کہہ ہی ڈالیے۔

خوجی۔ میں اپنی دادی جان سے تو پوچھ لوں۔

آزاد۔ معاذ اللہ کیا ابھی وہ زندہ ہیں جیتی جاگتی عاقبت کے بوریے سمیٹنے آئی ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو آپ کوئی پچاس کے پیٹے میں ہوں گے اور وہ نیک بخت اس حساب سے کم سے کم کیا ڈیڑھ سو برس کی بھی نہ ہوں گی۔

خوجی۔ میاں اپنا کام کرو۔ میں دل لگی کرتا تھا۔ ان کی تو ہڈیوں تک کا پتا نہ ہوگا۔

ایک کنجوس رئیس سے ملاقات

الغرض میاں آزاد اور خوجی صاحب نے اسباب کسا اور اسٹیشن پر داخل ہوئے۔ میاں خوجی کو روپے دیے کہ ٹکٹ لاؤ۔ حضرت جا ڈٹے اور جس وقت گھنٹی ہوئی ٹھن ٹھن اور کانسٹبل نے کہا کہ کانپور کے مسافرو چلو ٹکٹ بٹ رہا ہے خوجی بھی لپکے اور وہ ریلا آیا کہ خدا کی پناہ۔ ایک ایک پر دس دس گرے پڑتے ہیں۔ بیسواڑے کے دس بارہ کشیدہ قامت جوانوں میں حضرت خوجی جو پھنسے تو کچلنے لگے۔ وہ ڈنڈپیل کیم و شیحم کرارے جوان۔ یہ بے چارے نیم جان۔ قد ماشاء اللہ پون انچ کا۔ بہت ہی گھبرائے اور یار لوگ جو بھرا بھروا کر ہنس دیے تو ان کے ہاتھ پاؤں گویا شکنجے میں کس گئے۔ جب کچلنے لگے تو غل مچایا کہ لانا قرولی دو ایک کو تو یہاں ہی شہید کردوں۔ اتنا سننا تھا کہ بھیڑ کائی کی طرح پھٹ گئی اور میاں خوجی ڈراتے ہوئے ٹکٹ کی کھڑکی کے پاس پہنچے۔

خوجی۔ بابو صاحب ٹکٹ دیجیے۔

بابو۔ گول مت کرو۔ غل مت کرو۔

خوجی - اجی غل تو سنتے ہو۔ مگر اس غول بیابانی پہ نظر ہے۔

بابو۔ چپ۔

خوجی - چپ! یہ چپ کیسی؟ ٹکٹ دیتے ہو یا میں اسٹیشن ماسٹر سے رپٹ بولوں پھر۔

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ پھر ریلا آیا وہ ریل پیل کہ میاں خوجی کے پنتھر ہی بگڑ گئے۔ رپٹ وپٹ سب بھولے اور کوئی بیس قدم پیچھے ہو گئے۔ خیر بعد خرابی بصرہ خدا خدا کر کے ٹکٹ ملے اور جا کر ریل پر بیٹھے۔ ریل چلی تو میاں خوجی کو آزاد نے جگایا کہ اٹھیے جناب خواجہ صاحب کان پور آگیا۔

خوجی - واللہ بھئی واہ ری ریل۔ ایک ہی مرتبہ کی پینک میں کان پور پہنچ گئے۔

خوب جواب دیا

ریل سے اترے تو میاں آزاد کو ان کے ایک دوست مل گئے۔

آزاد۔ میرزا صاحب آداب عرض ہے۔

میرزا۔ بندگی۔ اخاہ - آپ ہیں کہیے مزاج شریف۔

آزاد۔ الحمد للہ۔ اب فرمائیے فروکش کہاں ہو جیے گا۔

میرزا صاحب نے کہا ہمارے ایک حبیب لبیب کا فلاں مقام پر مکان ہے۔ آپ ایک گھنٹے میں وہاں آئیے تو ملاقات بھی ہو اور مزے سے آرام بھی کیجیے وہ مشہور رئیس ہیں۔

ایک گھنٹے میں میاں آزاد اور خوجی ان رئیس کے یہاں گئے۔

آزاد۔ (خدمت گار سے) ہیں تشریف رکھتے ہیں۔

خدمت گار۔ جی ہاں جائیے وہ کمرے میں تشریف رکھتے ہیں۔

آزاد (کمرے میں گھس کر) آداب بجا لاتا ہوں۔

رئیس۔ آپ کہاں سے آئے۔

آزاد۔ السلام علیک۔ آئیے مصافحہ تو کر لیں۔

رئیس۔ بندگی آپ کہاں سے آئے۔

آزاد - حضرت اس کمرے بھر میں ایک تو کرسی اس پر آپ ڈٹے بیٹھے ہیں کچھ بیٹھنے کو منگوائیے تو عرض کروں۔

رئیس - (جھلاکر) کچھ بیٹھنے کو لاؤ ان کے لیے۔

خدمت گار نے دوسرے خدمت گار سے کہا کرسی اٹھا لاؤ۔

رئیس (خفا ہو کر) کرسی نہیں میک ڈنبر لاؤ۔ بدتمیز۔ وہ مونڈھا جو سامنے پڑا ہے اٹھا دے۔

آزاد - (مونڈھے پر بیٹھ کر) کیوں قبلہ یہ میک ڈنبر کیسا ہوتا ہے۔

رئیس - آپ کوئی قاضی ہیں۔

آزاد - جی ہاں۔

رئیس - اور اوپر سے کہتے ہو جی ہاں۔

آزاد - مگر سخت تعجب ہے کہ آپ اور اپنے لنگوٹیے یاروں کو بھول جائیں۔

رئیس (سرخ ہو کر) لنگوٹیے یار کیسے۔

آزاد - ابے لٹورے ہم کو بھول گیا۔ یاد ہے جب گومتی کے سامنے میدان میں بانے کی کنکیاں ہم سے آپ سے لڑی تھیں اور میدان بدا گیا تھا اور ادھر سے ہم نے ماہی جال کی گون دو بنی لنگیا جھپکائی ادھر سے آپ نے جھنڈی دار کل بنی بڑھائی اور ہم نے آپ نے کتنے مارے اور غوطہ دے کر جو گھسا دیتا ہوں تو وہ کاما تب کے بھاگے آج ملے ہو۔ مگر واللہ ہو حیادار کہ اب تک چار آنکھیں نہیں کرتے۔

خوجی - مگر حضور یہ بھی سات تار پر ہمیشہ گنڈے والا بھیڑیا ہی آڑایا کیے اور کیوں نہ ہو پھر میاں ولائیتی کے شاگرد ہیں۔ مگر عقل ذرا موٹی ہے۔

اب وہ چکر میں آئے کہ یہ دونوں کون ہیں بھئی کہاں سے آئے ہیں ایک تو کہتا ہے میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ دوسرا میاں ولائیتی کا شاگرد بتاتا ہے۔ یہ دونوں کچھ عجیب آدمی معلوم ہوتے ہیں۔

آزاد - کہو۔ بھئی اب تو پہچانا۔ کیوں چڈا اگل خیرو۔

رئیس - یہ تو میری لمبی سفید داڑھی۔ اور تم کہتے ہو کہ جھنڈی دار پتنگ لڑاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ سات تار پر گنڈے والا اڑایا تھا مجھے حیرت ہے کہ تم ہو کون۔

آزاد۔ واہ استاد اس تجاہلِ عارفانہ کے صدقے۔ اجی ہم وہ ہیں جس کے ساتھ تم میاں عبداللہ کی دکان پر چانڈو کے چھینٹے پیا کرتے تھے۔ بھئی ہم نے چانڈو بازی چھوڑ دی۔ مگر یار تم ہوا کرتے ہو۔ اس پیرانہ سالی میں بھی چانڈو ہی پیے جاتے ہو جب ہی بن بلاؤ کا سا چہرہ بن گیا۔ اتنا کہنا تھا کہ رئیس آگ ہو گئے۔ للکارنے ہی کو تھے کہ آزاد نے ایک اور نقرہ چست کیا۔

آزاد حضرت تکلیف نہ ہو تو یہ دو پیسے کسی کو دیجیے کہ پیسے کی گلوری اور پیسے کا حقہ لے آئیے

رئیس۔ بس چلیے یہاں سے ٹہلیے آپ نے کسی کو گلگڑوا یا تنبولی مقرر کیا ہے۔ چلیے چلیے۔

آزاد۔ اور یہ چونی لیجیے اپنی دوکان سے گرما گرم کباب اور شیرمال منگوا دیجیے۔

تب تو رئیس سمجھے کہ یہ بھی کوئی ہیں ایسے ویسے کا یہ دم خم کجا۔ پوچھا کہ آپ ہیں کون بزرگ۔ اور کہاں سے تشریف لائے ہیں۔

آزاد۔ بس ہاں اب آپ نے آدمیت سیکھی۔ اب شرفا کی طرح پر بات چیت شروع کی بندہ آپ کے دوست اور اپنے یار میرزا عبدالستار کے پاس آیا ہے۔ مگر مرد خدا ذرا تو اخلاق سیکھو آخر آدمیت بھی کوئی شے ہے یا ہر دم مرکب وحشت ہی پر سوار رہتے ہو بھلے مانسوں سے بھلا کہیں بھلے مانس یوں ملا کیے ہیں جس طرح آپ ہم سے ملے ہیں لاحول ولا قوۃ۔

رئیس ۔ واللہ ہم کو اتنی عمر میں ایک آپ ہی گرو ملے۔

آزاد ۔ پھر حضرت ہر فرعونے را موسائے۔

راوی ۔ اخلاق بھی کیا چیز ہے۔ صاحبِ خلق ہر دل عزیز ہے۔ اخلاق تمغائے انسانیت ہے۔ اخلاق جوہرِ اہلیت ہے۔ جس انسان میں خلق نہیں وہ گل ہے جس میں بو نہیں اور گل ہے جس میں کیفیتِ سرور یک مو نہیں کج اخلاق آدمی کو ہمیشہ خبیث ہی پایا جو ملاقات کو گیا وہ برا ہی کہتا آیا۔ خوش اخلاق کو نعمت عظمیٰ اور عطیہ کبرائی سمجھنا چاہیے۔ اگر ہم کسی سے غرور یا تکبر کے ساتھ پیش آئے تو اس کی گرہ سے کچھ نہ جائے گا مگر ایک تو ہماری عادت خراب ہو جائے گی دوسرے رفتہ رفتہ ضعیف الاعتقاد آدمی پھر سویرے سویرے نام نہ لیں گے کہ بھئی ایسا

نہ ہو کہ کھانا نہ ملے لاحول ولاقوۃ۔

میاں آزاد کچھ مانگنے تو گئے ہی نہ تھے۔ ان کو کسی کی پرواہ ہی کیا تھی کسی کے نوکر نہ چاکر۔ نوکری کے طالب نہ زر کے خواہاں۔

میاں آزاد نے اس رئیس کو ایسا آڑے ہاتھوں لیا اور اس درجہ خفیف کیا کہ وہ بے چارے گردن نیچی کیے ان کے آوازے چپ چپ سنا کیے اور ان کے پٹھو میاں خوجی بھی ہاں میں ہاں ملایا کیے میاں آزاد کی آنکھیں راستہ دیکھتے دیکھتے پتھرا گئیں۔ مگر ان کے دوست میرزا صاحب نہ آئے۔

آزاد سوچے کہ میرزا تو ہم سے بھی بڑھ کر آزادہ رو ہیں خدا جانے کہاں رہ گئے اب چلنا چاہیے۔ خوجی سے کہا کہ اڈے پر سے گاڑی تو لاؤ۔

خوجی۔ گاڑی۔ لاحول ولاقوۃ۔ اجی اس شیطانی چرخے پر جائیے گا اپنے میزبان سعادت اقبال نشان کی پالکی گاڑی نہ لے لیجیے۔ بس اسٹیشن میں ہم کو اتار دے۔ بات کرتے تو گاڑی وہاں سے پہنچ جائے گی۔

رئیس۔ گھوڑا لنگ کرتا ہے اور بابو آج شل ہو گیا ہے۔ کرایہ کی گاڑی منگوائے دیتا ہوں۔

میاں آزاد اور خوجی کا بمبئی میں داخل ہونا

اور ہنستی کیا ہوں بن آئے ہو لنگور سے
ڈاڑھی منڈواؤ میں باز آئی خدا کے نور سے

چرخ چنبری لاکھ چرخ کھائے گردون گرداں ہزار گردش میں آئے۔ زمانہ کروڑ جتن کرے کہ وحشی مادر زاد افیونیوں کے مسلم الثبوت استاد میاں خوجی سا دوسرا پیدا تو کرے کیا مجال۔ ادھر کی دنیا چاہے ادھر ہو جائے مگر خوجی اپنی آپ ہی نفیہ بنے رہیں گے۔ غصہ تو ان کی گھٹی میں تھا۔ بات ہوئی اور تنک گئے۔ ذرا کسی سے چھیڑ ہوئی اور چتون پر میل آگیا اور قرولی تو بات بات پر نکلتی تھی۔ کنجڑوں سے تکرار ہوئی اور بھنڈوں پر فرضی قرولی حضرت تیز کرنے لگے

بز قصاب سے کئی بار چھیچھڑوں پر چھڑی چلی ایسی قرولی بھی کسی نے کم دیکھی ہو گی۔ جس پر غصہ آیا فوراً فرمایا۔ او گیدی نہ ہوئی نوابی ورنہ اتنی قرولیاں بھونکتا کہ لاش پھڑکنے لگتی۔

الغرض میاں آزاد اور خوجی ہرشٹ کے ملک سے بمبئی میں آئے جب بمبئی میں داخل ہوئے تو شہر پناہ کے پاس دونوں میں نوک جھونک ہو گئیں۔

آزاد۔ چلو کسی اچھی سرا میں چل کر بسیرا لیں۔

خوجی۔ کہنے والے اور چلنے والے دونوں کی ایسی تیسی۔ کیوں بچہ یہی وعدہ پورا کرتے ہو۔ وہ قرولی تو خریدتے ہی رہے اور افیم کے لیے کبھی پورے سو گنڈے نہ دیئے۔ اب یہ وعدہ خلافی کرتے ہو۔ اسی سے تو ہم نے پہلے ہی قول لیا تھا کہ چاہے آسمان کی جگہ زمین اور زمین کے مقام پر آسمان آجائے مگر اس جانب سرا میں قدم نہ رکھیں گے۔ سانپ کا کاٹا رسی سے ڈرتا ہے۔ اس دن کمھار والے نے اتنی بے بھاؤ کی لگائیں کہ بس ہمارا ہی سر جانتا ہے۔

آزاد۔ اجی اب دنیا بھر کی سراؤں میں کمھار ہی کمھار تو ہیں وہ باتیں کرتے ہو کہ گدھوں کو بھی ہنسی آئے۔

خوجی۔ اچھا تو اس شرط پر چلتے ہیں کہ رات کو کسی پیڑ پر بسیرا لینا۔

خوجی کی درگت

آزاد اور میاں خوجی دونوں چلے تو سرا میں کھٹ سے داخل ایک کوٹھری میں جا کر میاں خوجی تو مزے سے چھپر کھٹ پر دراز ہوئے۔ چاروں شانے چت میاں آزاد خانہ برباد بھی دوسری کھٹیا پر لمبے ہو کر خراٹے لینے لگے۔ خوجی فلسفی آدمی نیند کہاں۔ بس کوئی دم آنکھ جھپکتے ہی نہیں پائی۔ آزاد نے تکیہ پر سر رکھا تو نیند ہاتھ باندھے آن موجود ہوئی۔ خوجی نے جو ان کی یہ کیفیت دیکھی تو آپ ہی آپ کہنے لگے کہ ارے میاں آزاد گزر گئے بے چارے خوب آدمی تھے۔ افسوس ابھی بیٹھے باتیں کرتے تھے ابھی ندارد۔ ع افسوس کہ از میان برخاست۔

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کشیدہ قامت بلند و بالا شیطان کی خالہ سامنے سے چمکتی دمکتی ہوئی آتی ہے۔ مگر قد کوئی سات فٹ کا نصف انچ کم نہ جو بھر زیادہ۔ آستینوں کی پھنسی ہوئی کرتی اور وہ چستی اور پھرتی کہ الاماں - چادر سبز پہنے سبز، انِ چمن کو شرماتی ناز سے قدم بڑھاتی ہوئی میاں خوجی کی طرف آنکلی۔ خوجی نے اس کی طرف نظر ڈالی تو اس نے ایک ترچھی چتون سے ان کو دیکھا اور اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی چلی چلی تو حضرت نے سیٹی بجائی اور سیٹی کی آواز سنتے ہی وہ ان کی طرف جھک پڑی اور چھما چھم کرتی ہوئی کوٹھری میں اتراتی چلی آئی۔ اب میاں خوجی کے حواس پیترا ہوئے سوچے کہ اگر آزاد کی آنکھ کھل گئی تو لے ہی ڈالیں گے کہ اللہ اللہ اب آپ کو بڑھاپے میں بڑے شوق چرائے اور جو کہیں وہ سمجھ گئے تو پھر ہم کو چرمر ہی کر ڈالیں گے اور ہم بس انہیں اور تمہیں ہی چاٹ کر رہ جائیں گے اشارے سے کہا کہ ذری آہستہ بولو۔ اس نے کہا کیا منہ سے کچھ سر سے کھیلو منہ سے بولو۔

خوجی (منہ پر انگلی رکھ کر) چپ چپ -

عورت - اے واہ - اچھے ملے۔ کیا چپ شاہ کا روزہ ہے -

خوجی۔ (اشارے سے) میاں آزاد سوئے ہوئے ہیں۔

عورت - ان کا لحاظ کرتے ہو کیا باپ ہیں تمھارے۔

خوجی - (ہاتھ جوڑ کر) واسطے خدا کے چپ بھی رہو۔

عورت - چلو ہم تم دوسری کوٹھری میں چل کر بیٹھیں۔

خوجی اور وہ عورت جس پر میاں صاحب کا دل آیا تھا چلے اور ایک کوٹھری میں یوں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

خوجی - آپ کا نام۔

عورت - کیسر

خوجی - (کانپ کر) سچ کہنا۔ زعفران کی ہمشیرہ جان تو نہیں ہو -

عورت - اللہ جانتا ہے کتنے وجیہ نوجوان ہو - اور خدا پاک کی قسم کیا ہاتھ پاؤں پائے ہیں۔ مگر داڑھی منڈوا ڈالو۔

خوجی - (اکڑ کر) ابھی کیا جوانی میں دیکھنا ہم کو۔

راوی۔ کیا خوب ابھی جوانی شاید پھر آنے والی ہے، کچھ او پر پچاس کا سن ہوتے آیا سن شعر ع بپنجاہ و شش نازم بہ ایں ریش فش۔ واہ رے بُزا خفش۔ اسی عورت نے آپ کو انگلیوں پر نچانا شروع کیا کہ ماشاء اللہ کیا ہاتھ پاؤں ہیں لیکن آپ سمجھے کہ سچ مچ رنڈی بجھ ہی گئی تو اور بھی بہرنے لگے اور شیخیت میں آن کر فرماتے کیا ہیں کہ ابھی کیا ابھی تو دودھ ہی پیتے ہیں۔ بڑھ کر جوانی میں دیکھنا کہ کچھ اور ہی عالم ہوگا۔ اب جنازے پر جوانی کو یاد کیجیے گا۔ ارے دان کہیں آب رفتہ پھر جو میں آیا ہے۔

عورت۔ ڈیل ڈول کتنا پیارا پایا ہے۔ اور نکھ سکھ سے کتنے درست ہیں اشاء اللہ جی خوش ہو گیا۔ مگر داڑھی منڈوا ڈالو۔

خوجی۔ (دونوں بازوؤں کو پھڑکا کر) اور جو میں ورزش کروں تو نیدی لنڈہور کو لڑا دوں۔

عورت۔ ذرا کان تو پھٹپھٹا ڈالو۔ شاباش ہے۔

خوجی۔ ایک بات کہوں برا تو نہ مانو گی۔

عورت۔ جو برا مانوں گی تو ذرا کھوپڑی سہلا دوں گی۔ چلو چھٹی ہوئی۔

خوجی۔ (ہاتھ جوڑ کر) جان بخشی کرو تو کہوں۔

عورت۔ کیا بھٹیارے یا بھٹیاری یا کسی اور کی جان لو گے آخر صاحب یہ جان بخشی کیسی۔ اچھا جو تمھیں کہنا ہو وہ کہو۔ مگر داڑھی صفاچٹ ہو۔

خوجی۔ خون معاف ہو۔

عورت۔ چپت لگا کر۔ ابے بھکوے خون کیسا۔

راوی۔ بات ترے کیدی کی لے اوڑے کا۔ پڑی نا ایک زناٹے کی۔ واللہ یہ تو زعفران کی ہمشیرہ جان ہی نکلیں چپت بازی ہونے لگی۔ خوجی سر کی خیر مناؤ جب نہیں تو اب بھی۔

خوجی۔ یہ دھول دھپا شریفوں میں بھلا کہاں جائز ہے۔

عورت۔ شریف تم موئے کو کون نگوڑی سمجھتی ہے (ٹوپی پھینک کر ایک اور چپت جمائی۔ چٹاخ)

راوی۔ ہاں اب کی البتہ چٹاخ کی آواز گونجی کیوں ہم نہ کہتے تھے کہ خوجی کے سر کی سلامتی نہیں جب نہیں تو اب بھی ع چور جاتے رہے کر اندھیاری

عورت۔ آنکھیں کیا نیلی پیلی کرتا ہے پھوڑ دوں دونوں دیدے۔

راوی۔ واہ واللہ ابھی انکھ پھوڑ سے آنکھ لڑائی۔ خدا چشم زخم حوادث سے بچائے۔ جسم بھر میں اس نے دیدہ و دانستہ عین آنکھ ہی پر نشتر لگانا چاہا۔

عورت کیا آنکھ پھوڑ ٹڈا ہے۔

خوجی۔ اب ہمارا مطلب تو اس جھنجھٹ میں خبط ہوا جاتا ہے۔ اب یہ بتاؤ کچھ مانگیں تو دو گی۔

عورت۔ ہاں کیوں نہیں (کان پکڑ کر ایک ادھر دوسرا ادھر گیا معنے بولتے ہیں) آپ چیستانیں بجھواتے ہیں۔

خوجی۔ (گھبرا کر) ہم مانگتے ہیں کہ قول دو۔

عورت۔ دیا۔

خوجی۔ پھر مکرنے کی نہیں سند و ند۔

عورت۔ نہ۔

خوجی۔ میں کہتا ہوں پھر۔

عورت۔ بسم اللہ۔

خوجی۔ کہنا یہ ہے کہ مگر کہتے ہوئے دل کانپتا ہے۔

عورت۔ اب ہیں تم کو ٹھیک نہ بناؤں کہیں۔

خوجی۔ شادی کر لو میرے ساتھ۔

راوی۔ اہو ہو ہو۔ ارے واہ رے خوجی۔ اچھا شوق چرایا۔ یہ جب ہی جوتیاں کھاتے جاتے تھے اور منکتے تک نہ تھے کانوں کان خبر بھی نہ ہوئے۔ مگر جناب خواجہ صاحب شادی کا شوق تو چرایا۔ اب ذرا اس کشتی گیر کے خیچے بھی تو دیکھیے دیو کی بچی سامنے ڈٹی کھڑی ہے۔ گولا ڈنگ ذرا اس کے خیچے اور ڈنڈ پیل تو اچھی طرح ملاحظہ فرمائیے آپ کو وہ پھینکے تو گیند کی طرح لڑھکتے جائیے

اور پھر قد تو ناپیے آپ کوئی پونے پانچ انگل اور وہ پورے سات فٹ ہے۔ اتنی بڑی لمبی عورت تو آنکھوں نے دیکھی نہ کانوں نے سنی۔ خوجی چار بالشت وہ ہشت مشت۔ خوجی دبلے پتلے لاغر وہ لحیم شحیم۔ فربہ و جسیم۔ وہ ڈنڈ پیل کشتی گیر۔ یہ آج مرے کل دوسرا دن مگر خوجی کی آنکھوں پر شیطان نے پٹی باندھ کر پٹی پڑھا دی کہ بس ساری خدائی میں حور ہے تو یہ ہے اور دور

از قصور ہے تو یہ ہے۔ میاں خوجی کا اور اس کا مقابلہ جیسے پدی اور شہباز یا ٹینی مرغ اور طاؤس طناز۔ اور لطف یہ کہ ابھی چپتیائے گئے ہیں لیکن ایسے ریجھے کہ بیاہ، ہی بیاہ پکارنے لگے۔

خوجی ۔ تمھارے ساتھ بیاہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔

عورت ۔ اے ابھی تم بچے ہو۔ دودھ کے دانت تک ٹوٹے نہیں بیاہ کیا کروگے بھلا۔

خوجی ۔ واہ وا۔ میرے دو بچے کھیلتے ہیں۔ ابھی تک ان کے نزدیک لونڈے ہی ہیں، ہم۔

عورت ۔ پھر اس کی نہ کہیے۔ میرا بھی تو ایک بچہ کھیلتا ہے۔

خوجی ۔ لاحول تو بس معاف کیجیے۔

عورت ۔ آ گئے نا جھانسے میں۔ اتنا نہ سمجھے کہ ابھی آپ ہیں آپ بچہ ہوں لڑکوری کیونکر ہو سکتی تھی بھلا۔

خوجی ۔ سن شریف

عورت ۔ بارہ اور پانچ کے ہوئے۔

راوی ۔ کیا بھولی بنتی ہیں بارہ اور پانچ باون ہوئے۔

خوجی ۔ بارہ اور پانچ سترہ۔

عورت ۔ پھر اس عمر میں کہیں لڑکا بھی ہوا ہے۔

خوجی ۔ (دست بستہ) کہنا مانو نکاح پڑھوالو۔

عورت ۔ کچھ کمائی دمائی تو نکال اور داڑھی منڈوا۔

خوجی ۔ دس روپیہ دے کر) لو یہ حاضر ہے۔

عورت ۔ دیکھوں۔ اونھ ہاتھی کے منہ میں جیرا۔ اچھا خیر۔

خوجی ۔ لو یہ پانچ اور لو۔ اس کے کپڑے بنوانا۔ مگر میری دھجیاں نہ اڑانا۔ میں زمین کا گز بن جاؤں گا اور تم کو بیگم بنا کر رکھوں گا۔

عورت (کان پکڑ کر) ایک شرط سے شادی کروں گی۔

خوجی ۔ منظور۔

راوی ۔ ایں اچھی منظوری ہے۔ ابھی شرط سنی، ہی نہیں اور منظور کرلی۔

عورت ۔ صبح تڑکے سویرے منہ اندھیرے اٹھ کر مجھے جھک کے سات بار سلام کرنا اور میں سات چپتیں لگاؤں گی ۔

خوجی ۔ اجی بلکہ اور دس ۔

راوی ۔ شاباش ۔ حاتم ایسے ہی ہوتے ہیں بلکہ اور بیس کھوپڑی کچھ کرایے کی تھوڑی ہی ہے لاحول ولا قوۃ ۔ شادی ابھی منزلوں دور ہے پہلی ہی منزل ہے اور اس قدر سختی کے ساتھ قول لیا جاتا ہے اور کھوپڑی سب کے پہلے ہی تاکی گئی ۔

خوجی ۔ (اچھل کر) چاند سی بیوی پائی ۔

راوی ۔ چاند گنجی ہوگی ۔

عورت ۔ اچھا اسی بات پر ایک پنجہ اور دائیں ہاتھ سے نکالو ۔

خوجی ۔ لو یہ پانچ اور لو ۔ تمھارے دم کے لیے سب کچھ موجود ہے ۔

راوی ۔ بجا ہے مال مفت دلِ بے رحم ۔ نواب کے وارونہ سے رقم کی رقم ہمکا کر پٹیل لائے ہونہ ۔

عورت نے جھپ سے میاں خوجی کو گود میں اٹھالیا اور بغل میں دبا کر لے چلی تو خوجی بہت ہی چڑاہے ۔ لاکھ ہاتھ پاؤں مارے ہزار زور کیے مگر اس نے جو دبایا تو اس طرح لے چلی جیسے کوئی چڑی مار جانوروں کو پھڑپھڑاتے ہوے لے چلے اب سارا زمانہ دیکھ رہا ہے کہ خوجی پھڑکتے ہوئے جاتے ہیں اور وہ کشیدہ قامت عورت چھم چھم کرتی ہوئی اور پھرتی کے ساتھ قدم دھرتی ہوئی یہ گئی وہ گئی ۔ ایک مقام پر خوجی بھاگ نکلنے کو تھے مگر اس نے پھر چپڑ غٹو کیا ۔

خوجی ۔ اب چھوڑتی ہے یا نہیں ۔ مگر داڑھی میں بچا ہی لوں گا ۔

عورت ۔ ایں ! ہوش کی دوا کر مردوے ۔ میں اب عمر بھر تو چھوڑنے کا نام لوں گی نہیں ۔ تم بھلے مانسوں کی بہو بیٹیاں چھوڑ دینا کیا جانیں بس ایک کے ہو رہیں ۔ بھاگ کے کہاں جاتے ہو میاں ۔

خوجی ۔ میاں ابھی سے کیوں کر ہو گئے ۔

عورت ۔ بس اب زیادہ ٹراؤ گے تو میں اسی وقت چپت بازی شروع کر دوں

گی۔ (گودی سے اتار کر، بھلا تم بھاگ تو جاؤ۔

خوجی۔ یارو کیا اندھیر ہے میں کچھ قیدی ہوں۔

عورت۔ (چپت دے کر) اور نہیں کون ہے تو۔ آخر تو ہے کون۔ اب کیا میں کہیں جانے بھی دوں گی۔

خوجی پیچھے ہٹنے لگے تو اس نے پٹے پکڑ کر خوب بے بھاؤ کی لگائیں۔ اب یہ جھلائے اور غل مچایا کہ کوئی ہے۔ لانا قرولی۔ تماشائی بازاری ارد گرد ٹھٹ کے ٹھٹ لگائے کھڑے ہنس رہے ہیں۔

ایک۔ کیا ہے میاں کیا ہے کیا۔ یہ دھرڈ پکڑ کیسی۔

عورت۔ آپ کوئی قاضی ہیں۔ یہ ہمارے میاں ہیں ہم چاہیں چپتیائیں چاہے دھپیائیں پھر کسی کو کیا۔

خوجی۔ واہ تو میاں بس دھپیانے ہی بھر کے ہیں۔

دوسرا۔ ان کو بغل میں داب کر کہاں لے چلیں۔

عورت۔ جدھر سینگ سمائے۔

خوجی۔ ہائے نہ ہوئی قر۔ ۔ ۔

کانسٹبل۔ کیا! قرولی۔ پہلے لیسنس تو دکھاؤ۔ پھر کرولی نکالو۔ ہونھ جہاں رو گردن دابے گروہاں اٹھائے لیے جات ہے وہ کرولی نکارت ہیں۔

تیسرا۔ ارے واہ رے بے غیرت جوانے دبایا اور دھپیایا اور تو دم بخود کھڑا ہے۔

چوتھا۔ تو حضرت کرے کیا۔ وہ ٹھری پچ ہتھی ڈنڈ پیل۔ یہ بے چارے دبلے پتلے مریل آدمی۔ پھر اس دیونی سے عہدہ برآ کیوں کر ہو سکیں۔

خوجی۔ بھائیو میری جان بچاؤ۔

لوگ۔ بیاہ کیوں کیا تھا۔

عورت۔ میاں بیوی کے جھگڑے میں آپ لوگ نہ پڑیں۔

خوجی۔ میاں کون مردود ہے۔

عورت۔ تو مردود اور کون۔

خوجی۔ خدا کی مار جو اس کے ساتھ نکاح بھی ہوا ہو۔

عورت - بھلا پھر میں یوں ہی ان کو بغل میں دبوچ کر لے آتی -

لوگ - جیسے بلّی اپنے بچوں کو مُنہ میں دبا کر گھر لے جاتی ہے -

کانسٹبل - یا جیسے دائی بچوں کو گود میں لے کر تماشا دکھلاتی ہے -

خوجی - یارو ذرا میاں آزاد کو سرا سے بلانا -

عورت - ہاں یہ کہیے اب آپ کی کچھ اور نیت ہے -

پھر گود میں اٹھا کر لے چلی - مشک دریاؤ ٹھنڈا پانی - مشک دریاؤ ٹھنڈا پانی - تماشائی اور بازاری اور حوالی موالی ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ گئے اور خوجی ایسے جھلائے کہ بوٹیاں نوچ ڈالتے تھے مگر قرولی میان ہی میں ہے -

لوگ - اجی بس جاؤ بھی - عورت ذات سے جیت نہیں پاتے - بس عزت ڈبو دی بالکل - لاحول ولا -

خوجی - اجی اس عورت پر علی کی سنوار - یہ مردوں کے کان کاٹتی ہے -

عورت (جھلا کر) ہاں کوسنے بھی لگے اب - اچھا -

اچھا کر کے جو اس نے دبایا تو میاں خوجی نے خوب غل مچایا -

خوجی - ارے یارو کیا شہر شملہ ہے ایک عورت ڈائن ایک بھلے مانس کو مارے ڈالتی ہے اور کوئی مُنہ سے بچاؤ تک نہیں کرتا - یارو خدا کے لیے بچاو بللہ بچاؤ - لیکن داد رے میں واڑھی بچا ہی لی -

اتنے میں میاں آزاد جو بے دار ہوئے تو خوجی غائب غلّہ - اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا کہیں پتہ ہی نہیں خوجی خوجی خواجہ صاحب اجی جناب خواجہ صاحب - ایں جواب ہی نہیں دیتے - ارے میاں کہاں ہو - وہ ہوں تو بولیں - وہ تو بازار میں اضحوکہ روزگار بن گئے ہیں - بھٹیاری نے کہا کہ (میاں خوجی بزار کی طرف گئے تھے) میاں آزاد بازار گئے کر دیکھیں کیا افتاد پڑی دیکھا تو دنگ ہو گئے - للکار کر کہا کہ چھوڑ دے - اس نے خوجی کو چھوڑ دیا اور سلام کر کے میاں خوجی سے کہا کہ حضور میرا انعام ہو - میں بہروپیا ہوں - خوجی - ع - کاٹو تو لہو نہیں بدن میں - پچیس تیس روپے گئے اور اُلّو کے اُلّو بنے -

ہمارے اولی مولی خبطا ہولا کوچہ گرد خانہ برباد میاں آزاد اور احمقِ مادر زاد میاں خواجہ صاحب گرتے پڑتے لپ جھپ قدم دھرتے چوٹ کھائے ہوئے

ہرن کی طرح طرارے بھرتے بازار سے بھاگے تو شہر بھر کے لونڈے لاڑے میپے ساتھ پیچھے پیچھے تالیاں بجاتے جاتے ہیں۔ حضرت خوجی۔ اپنے حساب تو لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہیں مگر پاچہ ماشاء اللہ لعبتانِ چین کی طرح پاؤں دھرتے ہیں۔ کمر دوہری ہوئی جاتی ہے۔ اور خلقِ خدا قدم قدم بر پھبتیاں سناتی ہے۔

ایک بولا کہو۔ چنڈا گل خیرو چاندسی بیوی نے چاند گنجی کردی نا کیوں۔ ہات ترے کی۔

دوسرا قہقہہ لگا کر کہتا ہے کہ اچھی بیوی پائی کہ گرہ ہی سے کچھ کھو بیٹھے۔ تیسرے بگڑے دل نے پوچھا کہو استاد کھوپڑی کی اب کیا کیفیت ہے۔ چوتھا بولا مُیاں صندلی رنگ معشوق سے دل کیا ملایا کہ دردِ سر خریدا۔

خوجی بے چارے کو راستہ چلنا دوبھر ہو گیا۔ جدھر نکل جاتے ہیں آوازوں کے چھرے چلتے ہیں پھبتیوں کی بوچھار ہوتی ہے۔ بیوی سے میٹھی میٹھی باتیں بھی نہ ہونے پائی تھیں کہ تلخ کلامی نصیب ہوئی۔ دل ہی دل میں سب کو صلواتیں سناتے اور چپکے چپکے کوستے اور بڑبڑاتے جاتے تھے، اس دانتا کلکل میں آئے حواس اور بھی غائب ہو گئے۔ ابھی غنچہ دہن گل بدن کے سامنے کا شوق چرایا کہ یار لوگوں کو شگوفہ ہاتھ آیا۔ چوطرفہ چل پون مچی ہوئی ہے۔ دو چار آدمیوں نے بہروپیے کی تعریف کی۔ تو خوجی جل بھن کے خاک ہو گئے وہ تو کہیے کہ خیر سے قرولی میاں ہی میں تھی ورنہ خون کی ندیاں بہنے لگتیں اب کسی سے بولتے ہیں نہ چالتے ہیں دم دبائے ڈگ بڑھائے آنکھیں جھکائے گردن نیوڑھائے پٹا توڑ بھاگ رہے ہیں اور قطع شریف دیکھ کر لوگوں کو اور بھی ہنسی آتی تھی اور ان کی ہنسی ان کو خون رلاتی تھی ع۔ وائے بے دردی کوئی تاپے کسی کا گھر جلے۔

نیا شہر غریب الوطن آدمی۔ گلی کوچوں سے ناواقف بات کرنے کی قسم کھائی۔ بولے اور شامت آئی۔ سرا کا رستہ یاد نہیں گھومتے گھومتے شہر بھر کے صدقے ہوتے بارے خدا خدا کر کے سرا میں بلا کی طرح نازل ہوئے تو یہاں بھی تالیاں بجنے لگیں۔ یہ پسینوں میں عرق عرق جو ہے ندامت میں ازپا تا فرق

غرقِ نیم کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھانوں میں ایک چھپر کھٹ پر دراز ہوئے کئی بھٹیاریوں نے حضرت کو آن کر گھیر لیا ایک سبز پوش نے مسکرا کر کہا کہ گاج پڑے ایسی عورت پر جو بے نکاح پڑھوائے میاں کو گود میں اٹھائے اور بازار بھر میں ہنڈوائے۔ خوجی اس تقریر پر لوٹ پوٹ ہو گئے اور بھانپ گئے کہ یہ ہے کہیں ہماری ہی طرف کی ورنہ یہ لفاظی اور لسانی کجا۔ اتنے میں میاں آزاد بھی آئے اور خوجی کی چارپائی پر بیٹھے۔

آزاد۔ (سبز پوش سے) کیوں بی خیر تو ہے۔ آج بال بکھرے بکھرے کیسے ہیں کیا خوجی کے پٹنے کا ماتم کرتی ہو۔

سبز پوش۔ (مسکرا کر) بناوٹ سجاوٹ تو میری گھٹی میں پڑی ہے۔ روز کنگھی چوٹی کی فکر رہتی تھی مگر جب ہم نے دیکھا کہ خوجی ہم پر نظر ہی نہیں ڈالتے تو پھر ہم سوچے کہ کس کا نکھار اور کہاں کا سنگار۔ انھیں کا آج سوگ کیا ہے۔ جب سے آئے مُنہ سے بولے نہ سر سے کھیلے اچھی مرمت کر دی گئی۔ نہیں تو یہ سرا بھر کو سر پر اٹھاتے تھے۔ بار بار اتنا غل مچاتے تھے کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ وہ قرولی جہاں کی تہاں ہی رہی۔ توبہ توبہ۔

آزاد۔ پٹنے کا تو انھیں خوف نہیں کئی جگہ دھپیائے گئے ہیں۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ بواز عفران نے ان کی کھوپڑی پلپلی کر دی تھی۔ مگر ان کا قاعدہ تھا کہ پٹ پٹا کر جھاڑ پونچھ کر اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ آج کیا جانے کیا سبب ہے کہ انتہا کے ملول معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کہہ کر آزاد چلے گئے۔

بے چارے بے بس میاں خوجی نیب کے پیڑ کے سایے میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کھا رہے تھے فقرے باز ہنسوڑ بنا رہے تھے سدا کی بھٹیاریوں نے ایسا انگلیوں پر نچایا کہ خدا کی پناہ۔ مگر انھوں نے جو سوں کھینچی تو منکے تک نہیں۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک نوجوان رعنا بلند و بالا جوڑی پہنچے کی کمر سے لگائے مرو ہی لٹکائے اودی پگڑی سر پر جمائے بانکی ترچھی وضع بنائے اونچی بنا ہوا اور خوب تنا ہوا جوانی کے جوش میں اکڑتا آتا ہے۔ بھٹیاریاں غور سے تاکنے لگیں چھپ چھپ کے جھانکنے لگیں سمجھیں کہ مسافر ہے۔ چو طرفہ سے غل مچایا۔ آسمان

سر پر اٹھایا کہ میاں ادھر آؤ یہاں بستر جماؤ میاں مسافر دیکھو صاف ستھرا مکان ہے میاں سپاہی پکریا کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاں ہے ذرا تو تکلیف ہو گی نہیں۔

سپاہی بولا کہ ہمیں بازار سے کچھ سودا خریدنا ہے۔ کوئی ہمارے ساتھ چلا چلے تو سودا سلف خرید کر ہم آجائیں۔ جوان آدمی اور بلا کا حسین پھر آپ جانیے کہ حسن تو وہ شے ہے کہ چٹکیوں میں رنگ جما لے سب کی سب بے جھجک اس کے ساتھ جانے پر راضی ہوئیں۔ ایک بولی چلیے ہم چلتے ہیں۔ دوسری نے کہا لونڈی حاضر ہے۔ تیسری چمک کر بڑھی کہ میں جاؤں۔ سپاہی نے کہا کہ پرائی عورت کو بیچ بازار میں لے جانا رسوائی ہے کوئی پڑھا لکھا مرد چلے تو ہم پانچ روپے وہیں ابھی چہرہ شاہی خاصے کھرے چمکتے دمکتے گنوا لے۔ میاں خوجی کے کان میں پانچ چہرہ شاہی کی جو بھنک پڑی تو کلبلا کر اٹھ بیٹھے اور کہا کہ کہیے تو میں چلوں۔ مگر پانچوں نقد گنوا دیجیے بندہ اسیٹھ سے منزلوں بھاگتا ہے پیچھے جوتی بیزار نہ ہو۔ سپاہی نے جیب سے کھن کھن کر کے پانچوں گن دیئے۔ روپے تو خوجی نے ٹینٹ میں رکھے اور مال و اسباب بھٹیاری کو سونپ کر سپاہی کے ساتھ چلے اب بازار میں جس طرف سے حضرت نکل جاتے ہیں غول کے غول جمع ٹھٹ کے ٹھٹ اور حوالی موالی انگلیاں اٹھاتے ہیں کہ یہ وہی جانگلو ہے جس کو بہروپیا عورت کا بھیس بدل کر گودی میں اٹھا لایا تھا اور راہ میں خوب گدیایا تھا۔ غٹ کے غٹ پلے پڑتے ہیں اور تماشائی ایک دوسرے سے لڑتے ہیں جیسے دیکھو قہقہہ اڑاتا ہے لوٹن کبوتر ہوا جاتا ہے۔ بھئی واللہ اچھا فقرہ کیا۔ خدا کی قسم خوب جھانسا دیا۔ اچھی جورو پائی خوب ہی گت بنائی کھوپڑی ہی جانتی ہوگی چھٹی کا دودھ یاد آگیا ہوگا۔ واللہ کتنے بھولے بھالے ہیں سیدھے جیسے تکوا۔ جب چاروں طرف سے یاران سرپل چھاؤں آئے تو خوجی بہت ہی جھلائے اور غل مچا کر ایک ایک کو ڈانٹنے لگے کہ بس اب زبان سے کوئی کلمہ نکلا تو برس ہی پڑوں گا ایک ایک سے میدان میں لڑوں گا (سپاہی سے) حضرت ذرا قرابینچہ تو دیجیے گا اور یہ مبرا گنا تو لیجیے گا یہ کہہ کر خوجی نے کمر کسی اور

کٹارا لے کر پینترا بدلا اور ٹھاٹھ سے سامنے کھڑے ہو گئے اے کیوں نہ ہو میرے شیر۔ اس بات کے صدقے۔ قرولی، قرابنچہ، سرو ہی، پتنچہ نہیں نہ سہی۔ افیونی کی خیر رہے کٹارا کیا کم ہے۔ ہتھیار ہو یا نہ ہو کیا غم ہے۔ اتنے میں ایک شخص نے جھپٹ کر کیلی جو کی تو کٹارے کے دو ٹکڑے ایک تو وہ لے بھاگا دوسرا میاں خوجی نے لپک کر اٹھایا اور سینکڑوں گالیاں دینا شروع کیں۔ سپاہی نے ارد گرد کے بگڑے دل بے فکروں کو للکارا۔ اور خوجی کو تنو تھمبو کر کے سمجھایا، چلتے چلتے ایک افیونی کی دکان پر پہنچے اب تو میاں خوجی کی جان میں جان آئی چنیا بیگم پائی باچھیں کھلی جاتی ہیں جمائیوں پر جمائیاں آتی ہیں۔

سپاہی۔ کہو بھئی جوان۔ ہے شوق۔ پلواؤں۔

خوجی۔ اے میں تیری زبان کے قربان اور اس دکان کے صدقے اس افیون کے واری۔ چنیا بیگم میری پیاری۔

سپاہی ــــ شوقین آدمی ہو۔

خوجی۔ اجی میں تو اس پر عاشق ہوں۔

سپاہی نے میاں خوجی کو خوب افیم پلوائی اور اس ڈال کے ٹوٹے نے جو چسکی لگائی تو غٹ غٹ کر کے پیتا ہی گیا جب خوب سرور گھٹے اور نشے جمے تو سپاہی نے ان کو ساتھ لیا اور لے چلا۔ اثنائے راہ میں خوجی سے یوں میٹھی میٹھی باتیں ہوئیں۔

خوجی۔ افیم پلائی ہے تو پھر مٹھائی بھی کھلواؤ۔ کھلواؤ احسان کرے تو پورا۔

سپاہی۔ ابھی ابھی لو چار گنڈے کی بیج میل مٹھائی حلوائی کی دکان سے لاؤ۔

خوجی (خوش ہو کر) ؎

کیا بادۂ گل گوں سے سرور کیا دل کو   آباد رکھے داتا ساقی تری محفل کو

حلوائی کی دکان سے میاں خوجی نے لڑ لڑ کے خوب مٹھائی لی اور چنگیل لے کر جھومتے ہوئے چلے اب مارے بھوک کے راستے ہی میں چپکے چپکے ڈلیاں نکال کر کھانی شروع کر دیں۔ سپاہی کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا مگر دیدہ و دانستہ آنکھ بچا لیتا تھا۔ خوجی نے تھوڑی دیر میں آدھی چنگیلی خالی کر دی۔

سپاہی۔ مٹھائی سے بوجھ معلوم ہوتا ہو تو مجھے دے دو۔

خوجی ۔ جی نہیں حضرت ۔ میں تو ایک ہنڈی اٹھانے کا دم رکھتا ہوں آپ پاؤ بھر مٹھائی کو بوجھ سمجھتے ہیں۔

سپاہی ۔ کیا کسی کہار کی نسل سے ہیں آپ۔

خوجی (سنا نہیں مگر جواب تڑ سے دیا) جی ہاں جی ہاں جی ہاں کہہ کر ایک ڈلی اور منہ میں رکھ لی، اتنے میں سپاہی نے مزدور کے ایک لونڈے کو بھی ساتھ لیا اور چلتے چلتے ایک بزاز کی دکان پر پہنچے خوجی اور وہ دونوں بیٹھے۔

بزاز ۔ حکم ۔ کیا خریداری ہو گی۔

سپاہی (خوجی کی طرف اشارہ کر کے) ان کے انگرکھے کے برابر جامدانی دیجیے۔

خوجی نے انگرکھے کا نام اور جامدانی کا لفظ سنا تو جامے میں پھولے نہ سمائے۔

بزاز ۔ اچھا ۔ حضور ۔ اپنے انگرکھے کے ماپ کے (موافق) لیں تو کچھ ہمیں بھی مل رہے اور (خوجی کی طرف دیکھ کر) ان کا تو انگرکھا اور پائجامہ اور اچکن سب گج بھر میں تیار ہے۔

سپاہی ۔ تم کو اس سے کیا مطلب بڑے چھچھالیے ہو۔

خوجی ۔ (پونڈا ٹیک کر) نکالو جامدانی نکالو بہت باتیں نہ بناؤ۔

بزاز ۔ لیجیے کیا جامدانی ہے ۔ اول نمبر ۔ بہت بڑھیا ۔ مول تول دس روپے گز نہیں سات روپے گز کو آئے گی۔

سپاہی نہیں ہم پانچ روپے کو لیں گے۔

بزاز ۔ اب تکرار کون کرے آپ چھ کے دام دیں۔

سپاہی ۔ اچھا دو گز اتار دو۔

بزاز ۔ لیجیے اور یہ الپاکا ہے ۔ سات آنے دیا۔

سپاہی ۔ اچھا دس گز یہ بھی اتار دو۔

سپاہی نے بزاز سے سب ملا کر کوئی پچیس روپے کا کپڑا لیا ۔ میاں خوجی کی یہ کیفیت کہ پینک میں غین ۔ سر کی خبر نہ پاؤں کی ایک دفعہ ہی پینک میں آئے تو سر قدم بوسی کو چلا ۔ مزدور کا لونڈا چال دیکھ کر ہنس پڑا تو حضرت جاگ اٹھے مگر پھر آنکھیں جھپک گئیں سر کھمبے کی طرف چلا اور کھٹاک سے بولا ۔ تو کھوپڑی سہلاتے ہوئے پھر آنکھ بند ۔ اپنے آپے میں تو تھے ہی نہیں وہ تو افیم کے بس میں تھے۔

میاں سپاہی جب خوب لے دے چکے تو گٹھا باندھ کر لونڈے کو دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

بزاز۔ کہاں۔

سپاہی۔ گھر۔

بزاز۔ گھر۔

سپاہی۔ ہاں۔

بزاز۔ اور دام۔

سپاہی۔ آ کر دیں گے۔

بزاز۔ واہ۔

سپاہی۔ ارے بھئی کچھ چوروں سے بیوپار ہے۔

بزاز۔ جمانا (زمانہ) ناجک (نازک) ہے۔

سپاہی۔ (خوجی کی طرف دیکھ کر) ہمارا سالا بیٹھا ہے ہم ابھی آئے۔

وہ تو لے دے کر اور خوجی کو سالا بنا کر چل دیے۔ اب خوجی جو پینک سے چونکے سپاہی نہ مرد ور کا لونڈا۔ فقط خوجی اور ان کا یونڈا۔ چلے تو بزاز نے گردن ناپی۔ کہاں چلے آپ۔ کہاں چلے کہاں۔ ہم کیا کسی کے غلام ہیں۔ گلام نہیں اور ہو کون۔ تمھارے بہنوئی تم کو بٹھا کر کپڑا لے گئے ہیں۔ تب تو خوجی چکرائے ابے کیسے بہنوئی اس نے کہا بس بے تنے نکرنا میاں۔ سالے ہو ان کے کہ نہیں۔ اتنے میں ایک شخص نے کہا کہ یہ خط وہ یہاں پھینک گئے ہیں۔ خوجی جو اس رقعے کو پڑھتے ہیں تو یہ لکھا تھا۔

رقعہ

ہات ترے کی! بوں کھ گیا ناجھانسا۔ دیکھ اب کی پھر پھانسا۔ تب کی بیوی بن کے چپتیا دیا۔ اب کی میاں بن کے غپا دیا۔ بڑے مزے سے حضرت مٹھائی ٹونگتے آتے تھے گویا ہم اندھے تھے۔

خوجی ارے کر کے رہ گئے واہ رے بہروپیے۔

میاں خوجی چکر میں کہ اچھا گھن چکر بنایا۔ سالا کا سالا بنا گیا اور رعپا جو دیا وہ گھاتے میں۔ خیر اور تو جو ہوا وہ ہوا اب یہاں سے چھٹکارا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ بزاز دس ہم ٹٹروں ٹوں بھٹیل۔ پھر یہاں جان نہ پہچان۔ اور قرولی پاس نہیں برے پھنسے زمانے بھر کے نیارے ہے اور ہمیں کو جھانسا دیا۔ ایک دفعہ ہی آپ نے آنکھیں نیلی پیلی کیں اور مارے غصے کے منہ لال چقندر ہو گیا۔ حضرت نے آؤ دیکھا نہ تاؤ کتارا تان کے پیترا بدل کے کھڑے ہو گئے اور بزاز کو کتارا دکھا کر کہا کہ دوں ایک؟ بزاز نے جوان کے قد و قامت اور ہاتھ پاؤں اور ڈیل ڈول پر نظر ڈالی تو ہنس دیا اور کتارے کے جواب میں اس نے گز اٹھایا۔ آئیے آپ کا گنا ہمارا گج۔ خوجی بہت ہی بگڑے اب قسمیں کھاتے ہیں کہ بھائی میں تو اچھی طرح اس کی صورت سے بھی واقف نہیں مجھے کیوں پھانستے ہو۔

بزاز بولا جب تک آپ کے بہنوئی نہ آئیں گے میں دکان سے ہلنے تو دوں گا نہیں۔

اتنے میں ایک شخص نے آن کر بزاز کو سات روپے دیے اور کہا بیچے کپڑا پھیر دیا ہے اور کہا ہے کہ ہمارے سالے کو چھوڑ دو بزاز نے روپے گن لیے اور خوجی کو آزاد کیا۔ بارے خدا خدا کر کے اس جھنجھٹ سے جان تو بچی سالے بنے بنے۔

میاں آزاد اور ایک بتِ تند خو

ادھر تو یہ باتیں ہو رہی تھیں ادھر میاں آزاد غائب ان سے ایک شخص نے کہا یا حضرت آج میلا دیکھنے نہ چلیے گا۔ وہ دھوم دھڑکے کا میلہ ہوتا ہے کہ اہو، ہو ہو ایک ایک مہ پارہ جادو نگاہ رشکِ مہر غیرتِ ماہ ؎

ناز سے پائنچے اٹھائے ہوئے　　شرم سے جسم کو چرائے ہوئے

نشۂ بادۂ شباب سے چور　　چال مستانہ حسن پر مغرور

انکھڑیاں قہر کی لگاوٹ باز　　مست صہبائے غمزہ و انداز

سینکڑوں بل کمر کو دیتی ہوئی — جانِ طاؤس و کبک لیتی ہوئی

نازِ معشوقانہ اور اندازِ دل ربایانہ سے چوطرفہ پھرتی ہیں اور ان برق وشوں کے حسنِ گلو سوز سے عشاقِ زار کے دل پر بجلیاں گرتی ہیں۔ چلیے اور میاں خوجی کو ساتھ لیجیے۔ یہ بھی عاشقِ تن رنگیلے چھیل چھبیلے جو نہی آزاد نے کہا بولے چلیے ہم تیار ہیں مگر خوجی اس وقت اور ہی ادھیڑ بن میں ہیں میاں آزاد خوب نکھرے اور سج دھج کر اکڑتے ہوئے چلے۔ واللہ ایسا بے فکرا کبھی نہیں دیکھا میلا ٹھیلا تو کوئی ان سے بچنے ہی نہیں پایا تھا۔ کوئی پچاس قدم کے فاصلے پر گئے ہوں گے ایک جھروکے سے آواز آئی کہ ؎

خدا جانے یہ آرایش کرے گی قتل کس کس کو — طلب ہوتا ہے شانہ آئینے کو یاد کرتے ہیں

میاں آزاد نے جو اوپر نظر کی تو ع سبحان اللہ شان تیری اب قدم نہیں ٹھٹا دفعتہً دروازہ خوجی کی آنکھ کی طرح بند ہو گیا وہ معاملہ ان کی دل کی گرفتاری کے واسطے کمند ہو گیا۔ آزاد متحیر کہ الٰہی یہ چھلاوا تھا سحر تھا ٹونا تھا آخر تھا کیا۔ پل مارنے کی دیر ہوئی اور وہ چاند سا مکھڑا گہن میں آگیا۔ ایک مرتبہ سہ منزلہ کی ایک کھڑکی سے وہ چہرۂ نورانی پھر نظر آیا۔ آزاد بول اٹھے کہ وہ اس ماہ تاباں نے جلوہ دکھایا مگر پھر غائب ہائے ستم۔ آزاد جوشِ شوق اور بڑے ذوق سے بولے کہ ؎

دیدار می نمائی و پرہیز می کنی — بازارِ خویش و آتشِ ما تیز می کنی

پھر مجھے لے چلا وہیں دیکھو — دلِ خانہ خراب کی باتیں

آزاد کے ساتھی نے جو یہ رنگ دیکھا تو آہستہ سے کہا کہ حضرت بس کہہ دیا اس پھیر میں نہ پڑیے گا۔ کانٹے میں الجھنا ہو تو بسم اللہ ورنہ آگے قدم بڑھایئے الا اللہ۔

آزاد۔ حضرت آج تو بعد مدت چاند سی صورت نظر آئی ہے بس اب تو کر گزرنے کی دھن سمائی ہے۔ وہ معشوق ہیں عاشق وہ عذرا ہیں وامق وہ شیریں ہیں فرہاد وہ پری زاد ہیں قیدِ عقل سے آزاد۔

اتنے میں دیکھا کہ پھر وہ معشوق سیم غبغب، بتِ شکر لب۔ غیرتِ لعبتانِ چیں گل اندام نازنیں بے حجاب و برافگندہ نقاب جھروکہ پر بہ صد ناز و انداز

کھڑی ہوئی میاں آزاد کی آنکھ اس آہو چشم کی نسوں پر واز اور لگاوٹ باز انکھڑیوں سے لڑی ہوئی۔ اس نے ایک عجیب ادا سے دل ربا یانہ اپنی بانکی مہری سے جو نگھر کر اس کے سامنے کھڑی تھی کہا کہ فنس تیار کراؤ، ہم میلے جائیں گے۔ میاں آزاد نے بہ آوازِ بلند کہا کہ۔ ع۔ ستم ست اگر ہو۔

حضرت ایک برجستہ شعر حسب حال پڑھنے کو تھے مگر رعب حسن سے تم ست اگر ہو کہہ کر رہ گئے۔ ان کا دوست ایک ہی کائیاں سمجھ گیا کہ اس ترکِ زریں کمر رشکِ قمر کا رعب جم گیا تو بگڑی ہوئی بات بنائی اور یوں ہانک لگائی۔ لکنت کا برا ہو جس نے میرے یار کی زبان بند کر دی تو وہ نوعروسِ سرمایۂ ناز بہ صد انداز کیا کہتی ہے ؎

زلکنت نیست گر حرفش بلب دیر آشنا گردد سخن گر ز زباں صد بار گردد تا جدا گردد

طوطی سخن ہے اور شکرستاں دہن ہے۔ بھلا طوطی شکر فشاں کہیں شکرستاں سے باہر بھی آتی ہے۔ خیر اب تو بندی سیرِ چمن کو جاتی ہے اور میری شوخی ان حضرت کے گھورنے پر مسکراتی ہے۔

یہ نکتے اور لطیفے جو سنے تو میاں آزاد کے۔ ع۔ سمندِ عشق پہ اک اور تازیانہ ہوا۔ دلِ نخچیر تیرِ ادائے جانانہ ہوا اور حضرت ہزار دل سے مثل عندلیب اس گل بدن کے عاشقِ زار ہوئے۔

دم کے دم میں وہ صورت پھر غائب ہوگئی۔ اب میاں آزاد کی بے قراری اور گریہ وزاری کا بحرِ مواج لہریں مارنے لگا۔ اس سمند کا اور چھور ہی نہیں۔ کھڑکیاں اور دریچے سب بند ہو گئے۔ اب آزاد چکرائے کہ یہ ماجرا کیا ہے مگر سوچے کہ ؎

نہیں روزن جو قصرِ یار میں پروا نہیں ہم کو نگاہِ شوق رخنہ کرتی ہے دیوارِ آہن میں

اس صنم جادو جمال زہرہ تمثال کا در تھا اور میاں آزاد کا سر تھا کبھی دروازہ دھم دھمایا کبھی غل مچایا۔ کبھی کنکر پھینکے۔ کبھی پتھر پھینکے۔

اتنے میں اوپر سے ایک وصلی گری۔ میاں آزاد وحیِ آسمان سمجھ کر جھپٹے۔ اٹھا کر پڑھتے ہیں تو جلی قلم سے لکھا تھا کہ ع۔ کلوخ انداز را پاداشِ سنگ ست

آزاد نے اس تحریر کو چوم لیا۔ اور بوسہ لے لے کر یوں کہنا شروع کیا۔
آزاد۔ ان حرفوں کے صدقے ع فدائے جنبشِ دستِ حنائی۔ سواد نامہ نے آنکھوں کو نور بخشا۔ یہ مستی داد نے دل کو سرور بخشا۔ جذبِ دل کے طفیل، ہم انشاء اللہ ان پیارے پیارے ہاتھوں کو بھی چوم لیں گے۔
یہ وصلی در پردہ وصال کی خبر دیتی ہے۔ خوش نویس ہاتھوں کی بلائیں لیتی ہے۔
اب حیرت ہے کہ الٰہی میں جواب بھیجوں تو کیوں کر بھیجوں۔ خاک ہو کر صبا کے ہم راہ جاؤں مگر ہمارا غبار تو ضعف کے سبب سے وہاں تک جا ہی نہ سکے گا ؎

تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ می دانی   طپیدنِ دلِ مرغانِ رشتہ بر پارا

اور کلوخ اندازی اسی لیے تو لی ہی ہے کہ سر کے سودا کا سنگ سے علاج ہو ذرا تو تسکینِ مزاج ہو سزا دیجیے تو سزا ہے اور انتقام لیجیے تو روا ہے لیکن۔ ع عاشق کی سزا جو بولو چھتی ہو ؎

مشکیں زلفوں سے مشکیں کسواؤ   کالے ناگوں سے مجھ کو ڈسواؤ
تلوار سے قتل ہو جو منظور   ابرو کے اشارے سے کرو چور
زنداں میں جو زندہ بھیجنا ہو   اپنے دلِ تنگ میں جگہ دو

یہ عشق فتنہ پرداز شمع فرد زیر پردہ راز ہے۔ آج دلِ دیوانہ ایک پری سے ہم دم و ہم ساز ہے۔
اتنے میں ایک اور وصلی اڑ کے گری۔ اور میاں آزاد نے جھپٹ کر اٹھائی پڑھا تو یہ مصرعہ لکھا تھا۔ ع۔ دل لگی کرتی ہیں پریاں مرے دیوانے سے۔ آزاد پڑھتے ہی اچھل پڑے۔ مرے دیوانے ابو صاحب اب ہم ان کے ہو گئے۔ اب اپنے دیوانے کی فکر کیجیے (کھڑکی کی طرف نظر کر کے) حضور آپ اپنے دیوانے کا خیال رکھیے۔ اپنا کہ کر اغیار سے نہ ہنسوانا ماشاءاللہ اللہ اپنے دیوانے سے اس درجہ بے خبر۔ زلف کی زنجیر ہو تیر کا نخچیر ہو میرا علاج ہل سکتا ہے۔ عنابِ لب اور شربتِ دیدار گل رو اور قند لب شکر ہو گیا۔ مگر آنکھیں کھول کھول بند دریچوں پر نظر ڈالتا ہوں ؎

ہم ایسے ہو گئے اللہ اکبر اے تری قدرت — ہمارے نام سے اب ہاتھ وہ کانوں پہ دھرتے ہیں

اتنے میں ایک مہری اندر سے آئی اور میاں آزاد کو دیکھ کر مسکرائی۔ اشارے سے کہا کہ آئیے ہاتھ سے بتایا کہ جلدی جلدی قدم بڑھائیے۔ میاں آزاد با دلِ شاد خنداں و فرحاں مہتابی پر پہنچے۔ تو دماغ رشکِ ختن ہو گیا۔ سینہ چمن چمن ہو گیا۔ دیکھا کہ ایک عربدہ جو صنم عنبریں مو رشکِ ناہید۔ غیرتِ خورشید دلہن بنی ہوئی ایک نازک کرسی پر بہ صد شان برنائی و خود نمائی عجب ٹھسّے کے ساتھ بیٹھی ہے۔ میاں آزاد کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا انھوں نے بیٹھتے ہی کہا کہ نقشِ مراد کرسی نشیں ہوا۔ تیرِ دعا بہدفِ اجابت قریں ہوا۔

نگار خانہ صبح ست ایں نہ رخسار ست — نگاہ کن ورق سادہ راچہ پرکار ست

وہ بت پندار ایک دل ربا شوخی کے ساتھ مسکرائی تو میاں آزاد کی زبان پر یہ بیت آئی ؎

چو خوں بہا طلبند از تو کشتگاں در حشر — تبسّمے کن و بگذر ہمیں ادا کافی ست

مہری نے جو سامنے کھڑی تھی آزاد کی طرف مخاطب ہو کر کہا آہستہ آہستہ گفتگو کیجیے بیوی نازک مزاج ہیں طبع نازک پر یہ آواز گراں گزرے گی آزاد نے آہستہ سے کہا کہ ؎

میر بجدا ز تصور نظارہ خاطرت — گل ہم بہ رنگ و بوی تو نازک مزاج نیست

نازک بدن۔ (یعنی وہی دلہن) فرمائیے کیا مطلب ہے۔ دور دور کی ملاقات یا وصال۔

آزاد۔ ملاقات نہ وصال۔ فقط نظارۂ جمال۔ ع اے گل بہ تو خرسندم تو بوئے کسے داری۔ اب سنیے کہ اس دل آرام گل فام کی شکل و صورت بعینہ خاتونِ بہ لقا حسن آرا کی سی تھی۔ وہی شباہت وہی حسن و جمال وہی گلاب سا چہرہ وہی خال۔ سرِ مو فرق نہیں۔ میاں آزاد کو اپنی پیاری حسن آرا یاد آئی اور بے ساختہ یہ مصرع زبان سے نکلا۔ ع۔ اے گل بہ تو خرسندم تو بوئے کسے داری۔

نازک بدن۔ معلوم ہوتا ہے آپ چوٹ کھائے ہوئے ہیں کسی کے جعدِ مشکیں میں دل پھنسا ہے۔ ناگنی زلف نے ڈسا ہے ؎

کھلتے ہیں کچھ اشتیاق کے طور — رخ میری طرف نظر کہیں اور

آزاد۔ برسوں حسن و عشق کے پھیر میں رہے ہمیں اپنی عاشقی پر ناز تھا اور ہم بنکارتے پھرتے تھے۔

مروڑوں کان کو مجنوں کے مثلِ طفلِ شریر — عجب نہیں یہ جنوں کی بزرگواری سے

لیکن اب تو ایک حسین مہ جبین سے دل ملایا ہے بس اسی کے بیاہنے کا شوق چرایا ہے۔

نازک بدن۔ پھر ہم سے واسطہ۔ حرمت میں داغ لگانے سے رہے۔ شادی ہو۔ بسم اللہ۔ ورنہ تشریف لے جائیے۔

آزاد (نیم خیز ہو کر) خدا حافظ۔

نازک بدن۔ (دامن پاؤں تلے دبا کر) اللہ ری تنک مزاجی اف ری عالی دماغی ہم غیب کا حال بھی بتا سکتے ہیں۔ کہیے آپ کا کچا چٹھا کہہ چلوں۔ مگر ہٹ دھرمی کی سند نہیں۔

آزاد (بیٹھ کر) بسم اللہ۔

نازک بدن۔ میاں آزاد آپ کا نام ہے اور حسن آرا۔

آزاد۔ (متحیر ہو کر) ایں! یہ کیا اسرار ہے۔

نازک بدن۔ کیوں کیا پتے کی کہی ہے۔

آزاد۔ (دم بہ خود حیرت زدہ)

نازک بدن۔ (ہاتھ میں ہاتھ دے کر) حسن آرا میری چھوٹی چچا زاد بہن ہے۔ ڈیڑھ برس سے میں نے اسے نہیں دیکھا مگر دوسرے تیسرے خط ضرور آتا ہے لیجیے حسن آرا کا خط ملاحظہ فرمائیے۔

آزاد خط لے کر چومنے لگے (سر پر رکھا آنکھوں سے لگایا) خط کو پڑھا تو یہ لکھا تھا۔ میری پیاری بہن۔ اللہ وہ دن دکھائے کہ تمھاری بہن تمھارے وصال کے نشے میں جھومتی ہو۔ تم ان کو اور وہ تم کو مارے خوشی کے چومتی ہو۔ ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھائیں ہنسیاں دل لگیاں ہوتی جائیں۔ اب دردِ دل سنو۔ یہاں ایک جوان پری زاد میاں آزاد آئے تھے جوان صالح و پاک باز ہیں۔ فصحائے نامی سے دم ساز ہیں۔ اصرار کیا کہ نکاح ہو۔ ساعتِ سعد کو بیاہ ہو۔ میری شامت زبان سے نکل گیا کہ روم جائیے نام کر کے آئیے اور تمغے لٹکائیے تو کیا مضائقہ

وہ تو ایک دھن کا آدمی ہے معاً منظور کر لیا اور چل کھڑا ہوا۔ اب فراق مارے ڈالتا ہے۔ دل قابو میں نہیں۔ تم خوب جانتی ہو۔ کہ میں ابھی ناکردہ کار ہوں۔ ع۔ عشق کے صدمے اٹھانے کو جگر بھی چاہیے۔ یہاں جگر پاش پاش ہو گیا اور ابھی بسم اللہ ہی ہے۔

وہ بمبئی کی راہ سے روم جائیں گے۔ تم سرا میں پتا لگا کر ان کو بلوانا اور میرا خط پڑھ کر سنانا اور اتنا ضرور کہنا کہ کیا مروت اسی کی مقتضی ہے کہ مجھ شہیدِ خنجر ادا کشتۂ تیغ وفا کو تڑپاؤ۔

تصویر شناخت کے لیے بھیجتی ہوں۔ میرا حال میرا اللہ ہی جانتا ہے۔ سپہر آرا۔ روز طعنے دیتی ہے کہ ایسی ہی محبت پھٹی پڑتی تھی تو بھیجا کیوں۔ شہر بدر کیوں کیا۔ مگر دل گواہی دیتا ہے کہ آزاد پیارے آزاد سرخ رو آئیں گے۔ آمین آزاد خدا کی قسم تمھاری تصویر ہر دم رو برو رہتی ہے۔ مگر ؎

یکے زبان و ہزاراں شکایت ست مرا | توشاذری کہ غم بے نہایت ست مرا

حسن آرا

آزاد — نامۂ اغیار مرا یاد نمود ست | حیف ست کہ چوں من بنود نامہ سیاہی

مگر واہ رے اشتیاق۔ اور اف رے دردِ فراق، ہم بمبئی میں داخل نہ ہونے پائے اور نامۂ شوق آ گیا سچ ہے ؎

اللہ ری ہوائے لبِ بام قصرِ یار | اڑ کر کبوتر آگے گیا ہے نسیم سے
عشق بلبل میں اثر ہے تو قفس میں آتش | بوئے گل پھاند کے دیوارِ گلستاں آئی

میاں آزاد نے۔ مانگا کاغذ دوات و خامہ۔ لکھا جھٹ پٹ جواب نامہ لفافہ بند کیا اور فوراً ڈاک خانہ بھیجا۔

نازک بدن۔ حسن آرا تڑپ رہی ہے آپ کی تحریرِ سحر تخمیر سے ذرا تسلی ہو گی سپہر آرا حیران ہے کہ اس کے جنون کا علاج کیا کرے۔ مگر ؎

بیماریٔ عشق لا دوا ہے | اس باغ کی اور ہی ہوا ہے
مجنوں ہو اگر تو فصد لیجیے | سایہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجیے
کچھ روگ جو در پئے غش ہو | درماں کے لیے دوا دوش ہو

آخر بہ توجہی سے اپنے ہے تنگ ایسا نہ ہو لائے اور کچھ رنگ
یاد آئیں جو ابروانِ خم دار رہتے نہ کہیں گلے پہ تلوار
وہ سبزۂ خط جو یاد آئے جھنجھلا کے کہیں نہ زہر کھائے
کر یاد کہیں چہِ ذقن کو کودے نہ کنویں میں باؤلی ہو
دیوانے کی مطلق العنانی ہے باعثِ مرگِ ناگہانی

مرگ ناگہانی کا کلمہ سن کر میاں آزاد کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اور اشکوں کا تار بندھ گیا۔ ہائے یہ اشک نہ تھے بلکہ ترجمانِ دل جگر خوں ہو کر آنکھوں کی راہ نکلا۔ وائے ستم۔

نازک بدن۔ اب آپ ہمارے یہاں ٹھہریں اکثر علما اور باحمیت اہل اسلام آپ کی زیارت کے مشتاق ہیں۔ ایک دن جلسۂ عام منعقد ہوگا اور آپ کی خدمت میں باحمیت مسلمان اسپیچ دیں گے۔ جہاز کا بندوبست کر دیا جائے گا۔ مگر اب تک آپ نے یہ نہ پوچھا کہ ہم نے آپ کو پہچانا کیوں کر۔ ہم نے سرا میں آدمی بھیجا تھا اور اس نے آپ کو بغور دیکھا تھا۔ اس وقت اس نے مجھ سے آن کر کہا کہ وہی صاحب آ رہے ہیں میں آپ کو آزماتی تھی کہ دیکھوں کتنے ہیں۔ بیاہ کا ذکر میں نے اسی سبب سے چھیڑا تھا اگر آپ عشق ہی ظاہر کرتے جاتے تو میں حسن آرا کو لکھ بھیجتی کہ ؎

نشاید ہوس باختن باگلے کہ ہر بامدادش بود بلبلے

لیکن آپ نے میری صورت دیکھتے ہی کہا کہ۔ ع۔ اے گل بہ تو خرسندم تو بوئے کسے داری۔

آزاد۔ پھر میں یہاں ہی اٹھ آؤں۔

نازک بدن۔ ضرور۔

آزاد۔ شاید آپ کے اعزہ میں سے کوئی بدظن ہو جائیں

نازک بدن۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ ہندوستان کی کوئی نیک شریف زادی اس طرح بے دھڑک کسی غیر اور نامحرم کو اپنے ہاں نہ بلوائے گی جس طرح میں نے آپ کو بلوایا کیا مجھے ناموس و ننگ کا خیال نہیں۔ کیا میں نہیں جانتی کہ میرے میاں غیر مرد کو اس بے تکلفی کے ساتھ میرے قریب بیٹھے دیکھیں گے تو آنکھوں سے خون

ٹپکنے لگے گا۔ مگر وہ تو خود اس وقت تمھاری تلاش میں نکلے ہیں۔ حسن آرا نے تو خطوں کی بھرمار کردی اور ان کو قسمیں دے دے کر لکھا ہے کہ آزاد کو ضرور ڈھونڈھ نکالو۔ آتے ہی ہوں گے دیر سے گئے ہوئے ہیں۔ اب آپ تو جائیں نہیں میرے آدمی کو بھیج دیجیے وہ اسباب لے آئے۔

آزاد۔ اچھا ذرا دوات کاغذ تو منگوائیے میں اپنے ساتھی کے نام رقعہ لکھ بھیجوں۔

ایک عورت نے قلم دوات کاغذ سامنے رکھ دیا اور میاں آزاد نے یہ رقعہ لکھا۔ خواجہ صاحب بہادر۔ اسباب درباب لے کر اس آدمی کے ساتھ چلے آئیے۔ سرا میں رہنا تم کو، ہم کو دونوں کو شاق گزرتا ہے یہاں حسنِ اتفاق سے حسن آرا کی بہن مل گئیں۔ یار ہیں قسمت کے دھنی۔ ہم تم دونوں۔ بس اب آؤ اور یہاں ہی بستر جماؤ اور ایک مژدہ طرب انگیز بھی سناتا ہوں کہ افیم کی دکان بھی یہاں سے قریب ہے۔ وہ ہنسی آئی باچھیں کھل گئیں۔ اِستاد آزاد خانہ برباد۔

خوجی کی حماقت

خوجی نے مارے وحشت کے دل میں ٹھان لی کہ جو آئے گا خوب غور سے دیکھوں گا اور للکاروں گا بھلا اب کی چکما چل جائے تو ٹانگ کی راہ نکل جاؤں دو دفعہ جانے کیا اتفاق ہوا کہ وہ چکمہ دے گیا۔ یہاں اڑتی چڑیا پکڑنے والے ہیں۔ ہم بھی اگر یہاں رہتے ہوتے تو اس مردود بہروپیے کو چچا ہی بنا چھوڑتے۔ وہ غچا دیتا کہ عمر بھر یاد ہی تو کرتا مگر خیر۔ ع پھر سمجھیں گے اضطراب کیا ہے، سامنے ایک گھسیارا گھانس کا گٹھا سر پر لادے پسینے میں عرق عرق آن کھڑا ہوا۔ میاں خوجی کی کوٹھری کے قریب ایک ٹٹو سرا میں بند تھا وہ سمجھا انھیں کا یابو ہے تو ان سے یہ گفتگو ہوئی۔

گھسیارا۔ گھانس تو نہیں چاہیے۔

خوجی۔ (غور کر کے دیکھا) چل اپنا کام کر ہمیں گھانس وانس کچھ نہیں چاہیے گھانس کوئی اور کھاتے ہوں گے۔ ہم اپنے غم میں آپ کا بیدہ۔ گھسیارا دور تھا اس نے اچھی طرح سنا نہیں کہ میاں خوجی نے کیا جواب دیا تو پھر پوچھا کہ صاحب

پچھ گھانس ہو گئے۔ خوجی سمجھے کہ بہروپیا ہے، چل بے چل ہم پہچان گئے ہم سے بہت چلکے بازی نہ کرنا بچہ اب کوئی حرکت سرزد ہوئی تو پلیتھن ہی نکال ڈالوں گا اب جاتا ہے یا آنکھیں دکھاتا ہے۔ تیرے بہروپیے کی دم میں رستا ہے۔ ہر روز عید نیست کہ حلوا خورد کسے۔ شامتِ اعمال سے گھسیارا بہرہ تھا وہ سمجھا کہ بلاتے ہیں ان کی طرف آنے لگا۔ بس تب تو میاں خوجی غصہ ضبط نہ کر سکے اور چلا اُٹھے کہ او گیدی بس آگے نہ بڑھنا نہیں تو سر تن سے جُدا ہو گا یہ کہہ کر حضرت لپکے اور گٹھا پکڑ کر چاہا کہ اس کو چپت لگائیں اس نے جو زور کیا کہ چھڑا کر بھاگ نکلے تو میاں خوجی مُنہ کے بل دھم سے زمین پر آ رہے اور گٹھا جو گرا تو حضرتِ خواجہ صاحب نیپ ہی گئے اور گٹھے کے بوجھ سے ایک لڑھکنی کھائی بھٹیاریوں نے دوڑ کر گٹھے کو پاؤں سے دبانا شروع کیا اور خوجی نے اس کے اندر سے غنغنانا شروع کیا ابے او گیدی اتنی قرولیاں بھوکوں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔ مردک نے ناکوں دم کر دیا۔ خیر بعد خرابیِ بصرہ آپ گھانس کے نیچے سے برآمد ہوئے تو گرد میں لت پت۔ بھٹیاریوں نے بڑی ہمدردی سے گرد جھاڑی گرد کیا جھاڑی یہ کہیے کہ گرد جھاڑنے کے حیلے خوب مرمت کر دی ایک نے اِدھر سے گدا جمایا۔ دوسری نے اُدھر سے چپتیایا۔ ابھی گرد جھاڑی خوجی بہت ہی جھلائے مُنہ پھلائے بیٹھے تھے کہ میاں آزاد نے جس آدمی کو سرا بھیجا تھا وہ رقعہ لیے ہوئے آیا اور لوگوں سے پوچھ کر ان سے کہا کہ چلیے آپ کو آزاد نے بلایا ہے۔

خوجی۔ کس سے کہتے ہو۔ ارے اب کی نامہ بر بن کر آیا تب کی گھسیارا بنا تھا۔ پہلے عورت کا بھیس بدلا پھر بیا ہی چل بھاگ مردود۔

نامہ بر۔ رقعہ تو پڑھ لیجیے۔

خوجی۔ میں جلتی بلتی لکڑی سے داغ دوں گا نامعقول۔ مجھے کوئی لونڈا مقرر کیا ہے کیا۔ ایسے بہروپیے یہاں جیب میں پڑے رہتے ہیں۔

نامہ بر چل دیا۔

میاں آزاد خانہ برباد نے تو اپنے اپیچی دوست میاں خوجی کے پاس آدمی بھیجا تھا کہ ان کو مع بوریا بندھنے اور تنگ تو بڑے کے لے آئے مگر وہ

بیرنگ واپس آگیا۔ خوجی نے اس کو ایسا للکارا اور وہ ڈانٹ بتائی کہ اس کے حواس پیترا ہوئے اور بگٹٹ بھاگا تو گھر پر آن کر دم لیا۔ ہانپتے ہانپتے ڈیوڑھی سے اس نے پکارا کہ بوا زیبن۔

زیبن۔ اسباب لے آئے ہو نا۔

آدمی۔ کہاں کا اسباب وہ تو کاٹنے دوڑے۔ یہ دیکھو قرآن کی قسم جو ذری اور بولوں نا تو وہ چلکٹت دے کہ کان ہی اڑا لے جاے اور بس کنکٹا ہی رہ جاؤں وہ تو کچھ الول جلول سا بکنے لگے کچھ سنک سی ہے۔

زیبن۔ چل مسخرے بہت کھلی بازی نہیں اچھی، ہوتی بتاؤ بتاؤ بھلا یہ دل لگی کا کون موقع ہے۔

آدمی۔ زیبن کی کٹیلی آنکھوں کی قسم وہ نہیں آئے۔ دور ہی سے وہ ڈانٹ بتائی کہ میں دم دبا کر بھاگا پیچھے پھر کے دیکھتا تو وہ لے ہی پڑتے قسم خدا کی وہ تو کوئی سودائی سا معلوم ہوتا ہے۔ سرا بھر میں سب کے سب اس کو بناتے اور انگلیوں پر نچا رہے تھے۔

نازک بدن۔ رجب اسباب لے آیا۔

رجب۔ بیگم صاحب کچھ پوچھیے نا۔

آزاد۔ کیوں کیوں۔

رجب۔ حضور وہ تو کچھ جھنجھلائے سے معلوم ہوتے ہیں۔ میں لاکھ کہا کیا انھوں نے ایک تو سنی نہیں۔ بس دور ہی دور سے گیدڑ بھبکیاں بتایا کیے کچھ عجیب آدمی ہیں۔

آزاد۔ خط کا جواب لائے۔

رجب۔ غریب پرور کہتا جاتا ہوں کہ قریب بھٹکنے تو دیا نہیں جواب کس سے لاتا۔ وہ تو جھلائے ہوے سے بیٹھے تھے اور ارد گرد لوگ ان کو بنا رہے تھے ٹھگنے سے آدمی دبلے دبلے ایم بہت پیٹتے ہیں۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ نازک بدن کا شوہر آگیا۔ زیبن نے صحن میں سے پکارا کہ بیگم صاحب لیجیے میرزا صاحب آگئے۔

بیگم - (وہی نازک بدن) کہو میاں آزاد سے تو کہیں مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔
میرزا صاحب - شہر بھر گھوم آیا۔ سیکڑوں چکر لگائے مگر نہ ملے نہ ملے سرا میں گیا

تو وہاں خبر ملی کہ آئے ہیں۔ ایک شخص بیٹھے ہوئے تھے ان سے پوچھا تو بڑی دل لگی ہوئی جیسے ہی میں قریب گیا اور وہ کلبلا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ کون آپ کون - میں نے کہا یہاں میاں آزاد نامے کوئی صاحب تشریف لائے ہیں۔ بولے کہ پھر آپ سے واسطہ - میں نے کہا صاحب آپ تو کاٹے کھاتے ہیں۔ آخر میں نے کیا آپ کو گالی دی تھی۔ تو بہ غور دیکھ کر کہنے ہیں دارے اس بہروپیے نے تو ہماری ناک میں دم کر دیا۔ ہاری مانتا ہے نہ جیتی۔ تو پھر آیا۔ آج بھلے مانس کی صورت بنا کر آئے ہیں کل گھسیارے بنے تھے۔ پرسوں کیا جانے کیا بنے تھے) غرض کہ ایسی ایسی الول جلول واہی تباہی تقریر انھوں نے کی کہ توبہ ہی بھلی۔ میں کچھ جو سمجھا ہوں کہ یہ بک رہا ہے۔ آخر کار ایک عورت۔ نے مجھ سے کہا کہ یہ ایک بڑی سودائی آدمی ہیں ان کے منہ نہ لگیے ان کو ایک بہروپیا کئی بار ستا چکا ہے۔ ایک دفعہ عورت بن کر آیا تو حضرت کو شادی کرنے کا شوق چرایا۔ اس نے گود میں اٹھایا اور جھپ سے لے بھاگا اور سارے بازار میں ہنڈایا۔ دوسری مرتبہ سپاہی بن کر آیا اور ان کو جھانسا دے کر بزاز کی دکان پر بٹھلا اور کئی روپیے کا مال لے کر چلتا ہوا اور بزاز سے کہ گیا کہ یہ ہمارے سالے ہیں ان کو بٹھلائے جاتے ہیں اب ان کی یہ کیفیت ہے کہ جو ان کی کوٹھری کی طرف سے نکل جاتا ہے اس کو ڈپٹتے ہیں کہ تو بہروپیا ہے بھلا بے بھلا۔ ہم نے پہچان لیا اس وقت اگر ان کا باپ بھی آئے تو اس کو بہروپیا سمجھیں۔ اسم مبارک حضرت کا خوجی ہے ایسی قطع کبھی کسی کی کم ہوگی۔ اوّل تو بالشتیے دوسرے افیمی۔

بیگم - ذرا اوپر تو آؤ دیکھو ہم نے میاں آزاد کو یہیں بلوالیا۔ نہ کہو گے۔

میرزا صاحب کھٹ کھٹ کرتے ہوئے کوٹھے پر آئے۔

آزاد - کھڑے ہو کر، آیئے بغل۔

میرزا صاحب - (بغل گیر ہو کر) بسم اللہ حضرت آنکھیں ترستی تھیں آپ کی زیارت کو، بارے الحمد للہ کہ سعادت زیارت نصیب ہوئی

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

میں تو سرا ابھی گیا تھا مگر وہ آپ کے رفیق ڈانٹنے لگے سمجھے کہ یہ بھی بہروپیا ہے۔

آزاد۔ وہ ایک سودائی آدمی ہیں لیکن یہ مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ اس بہروپیے نے پھر غیا دیا۔

میرزا صاحب۔ اب آپ آرام سے بیٹھیں۔ اچھی طرح تشریف رکھیں۔

بیگم۔ (اپنے شوہر میرزا صاحب سے) میاں آزاد کو بڑا کھٹکا تھا کہ ایسا نہ ہو تم آن کر ہم پر خفا ہو۔ اور نامحرم کو یہاں دیکھ کر بد دماغ ہو جاؤ۔ (مسکرا کر) یہ کبھی مرہٹوں کے ملک میں نہیں رہے۔

میرزا صاحب۔ (آزاد سے) حضرت ہم عرصۂ دراز تک دکھن میں رہے ہیں۔ پردے کا چنداں خیال نہیں اور پھر آپ سے حسن آرا نے آپ کی سفارش کی ہے۔

آزاد۔ آپ کی نوازش۔

میرزا صاحب۔ خدا گواہ ہے۔ اس وقت آپ کی ملاقات سے طبیعت اس درجہ محظوظ و مسرور ہوئی کہ ع۔ دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من۔ اب آپ آج تو آرام فرمائیے کل اکثر علما فضلا آپ سے ملاقات کریں گے۔ ازبس مشتاقِ زیارت ہیں۔

آزاد۔ ضرور ملوں گا۔

میرزا صاحب۔ جہاز کا بندوبست بھی خاکسار بعنوان مناسب کر دے گا۔

آزاد۔ ہاں ضرور۔ اب میں بے قرار ہوں کہ اڑ چلوں۔

میرزا صاحب۔ انشاء اللہ ایک جلسۂ عام یہاں منعقد ہونے والا ہے جس میں علمائے بمبئی آپ کو ایڈریس اور اہل اسلام شریک جلسہ ہو کر دعائے خیر دیں گے۔ خدا آپ کو اس ارادے میں کامیاب کرے۔ آمین ثم آمین۔

ادھر میاں خوجی اپنے دل میں سوچے کہ عزت بھی ڈوب ہی گئی ہمشیخت میں بٹا لگا بڑھی ہی گرکری ہوئی کوئی ایسا چکما بہروپیے سے کرنا چاہیے کہ وہ بھی

عمر بھر یاد کرے کئی گھنٹے تک اسی میں غلطاں پیچاں رہے حتی کہ افیم کھانا تک بھول گئے کہ اتنے میں میرزا صاحب کا آدمی آیا اور میاں آزاد کا خط دکھایا پہلے تو خوجی جھجکے کہ یہ بہروپیا ہے مگر بغور دیکھا تو لفافہ پر میاں آزاد کے دستخط پائے لیا اور پڑھا۔ خواجہ صاحب میں نے سنا کہ بہروپیے نے جس کے ساتھ آپ نکاح کرنا چاہتے تھے آپ کو خوب ہی جھانسے دیے اور آپ پھر اس کے چکمے میں آ گئے۔ لاحول ولا قوۃ۔ خیر وہ تو جو ہوا سو ہوا۔ اب اس آدمی کے ہم راہ تشریف لائیے۔ ورنہ پھر وہ آپ کو دھوکا دے گا اور آپ کو کرتے دھرتے کچھ نہ بن پڑے گی۔ بھائی کہا مانو آؤ اور جلد آؤ۔ اور ضرور آؤ۔ مگر خرابی تو یہ ہے کہ تم نے آدمی کو دور سے دیکھا اور للکارنا شروع کیا کہ بھلا بے بھلا بہروپیے ہم پہچان گئے خدا خیر کرے۔ میں جانتا ہوں کہ اب مجھی کو آنا پڑے گا۔ خیر۔ ہر چہ بادا باد۔ آزاد

خوجی نے یہ خط پڑھ کر کل اسباب خدمت گار کے سپرد کر دیا اور کہا۔ ان سے کہہ دینا کہ ہم تھوڑی دیر میں آتے ہیں آپ مطمئن رہیں مگر ہم کو پتا بتا دو۔ خدمت گار نے ٹھیک ٹھیک پتا بتا دیا۔

میاں خوجی کا جھانسا دینا

خوجی ایک شخص سے بہروپیے کے مکان کا پتا پوچھ چکے تھے پوچھتے پوچھتے بہروپیے کے مکان پر داخل ہوئے۔ اس وقت حسنِ اتفاق سے بہروپیا گھر میں نہ تھا اور بہروپیے کی بیوی کو ضرورت تھی کہ اپنے جان پہچان کے پاس تیس روپے بھیجے وہ پارسل بنا کر اور سی کر رکھ چکی تھی اور لونڈی کو سکھا دیا تھا کہ جو کوئی پڑھا لکھا ادھر سے نکلے تو اس سے پارسل کا لفافہ لکھوا لینا۔ لونڈی کھڑی راہ دیکھ رہی تھی۔ میاں خوجی تو اس تاک میں تھے ہی کہ کسی ڈھب سے لونڈی ہم کلام ہو اور لونڈی اس فکر میں کہ کوئی منشی یا مولوی ملیں تو مزے سے لفافہ لکھوا لوں خوجی سے اور اس میں یوں گفتگو ہوئی۔

خوجی۔ (لونڈی سے) کیوں جی ذری پانی نہیں پلاتی ہو۔

لونڈی یہ سنتے ہی پھول گئی لومنہ مانگی مراد پائی۔ جو دل میں آرزو تھی وہ برآئی اور خوش ہوکر بولی کہ میاں بیٹھو پانی پیو۔ گلوری کھاؤ۔ حقہ گڑگڑاؤ۔ میں ابھی لائی۔ دوڑتی دوڑتی گھر میں گئی اور ہنس کر بیوی سے کہا کہ لو اب کیا چاہتی ہو۔ میں پانی لیے جاتی ہوں آپ جھپ سے ایک گلوری بنا رکھیے ایک منشی جی کو بڑی دور سے پھانس پھونس کر دم دھاگا دے کے گانس لائی ہوں۔ دو آنے پر راضی ہوئے ہیں۔ واہ ری لونڈی۔ ایسی طرار لونڈی بھی کم دیکھی ہوگی۔ کہنے لگی۔ پھانس پھونس کے دم دھاگا دے کے گانس لائی ہوں اور بڑی دور سے اور مزہ یہ کہ دو گنڈے کی رقم بھی اینٹھی۔ لونڈی اس قدر گھبرائی ہوئی تھی کہ جس آفتابے میں پان بھیگ رہے تھے وہی جلدی سے اٹھا لے گئی۔ پانی کھاری اور کڑوا جیسے نیب پانچے ایک ہاتھ سے اٹھائے دوسرے ہاتھ میں کٹورا لیے ہوئے باہر پہنچی۔

لونڈی۔ لیجیے میاں پیجیے

خوجی۔ (ہنس کر) لاؤ تم بڑی نیک بخت ہو بوا۔

لونڈی۔ اے واہ لوگ تو ہو سالے بٹھاتے ہیں میں نے اتنا سا پانی پلایا تو کیا احسان کیا۔

خوجی نے کٹورے سے پانی پیا تو غل مچایا کہ ارے غضب کیا زہر ملا لائی ہو مار ہی ڈالا۔ لاحول ولا قوۃ۔ (اپنے دل میں) یہ سچ ہے واللہ قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ بہروپیے کی لونڈی نے تو اس کے بھی کان کاٹے۔ خیر لونڈی جھٹ پٹ اندر گئی اور صراحی سے ٹھنڈا ٹھنڈا پانی لائی میاں خوجی نے پیا تو جان میں جان آئی اتنے میں گلوری تو بیوی نے بنا ہی رکھی تھی لاکر میاں خوجی کو دی چباتے ہی اگل دی منہ ہی کاٹ ڈالا۔ چونا ہی چونا لگا لائی ہو۔ ارے توبہ (دل میں) یہ اس بہروپیے کی بیوی تو لونڈی کی بھی خالہ ہے بڑی بی تو بڑی بی چھوٹی بی سبحان اللہ۔ دونوں بس کی گانٹھ۔

اتنے میں لونڈی اندر سے پارسل لائی اور کہا کہ میاں اتنا ہم پر احسان کرو کہ اس پارسل کا لفافہ لکھ دو۔

خوجی۔ لفافہ اچھا۔ کہاں جایئے گا کس کے نام ہے کون بھیجتا ہے کچھ معلوم بھی تو ہو یا انگریزی ہی تباہی جہاں چاہوں بھیج دوں۔

لونڈی۔ میں بیوی سے سب حال پوچھ لوں تو بتاؤں۔ آپ بیٹھے رہیے گا پارسل مجھے دے دیجیے ابھی ابھی آئی۔ (پردے کے پاس سے) میاں جانا نہیں میں صدقے۔ ایک گوری اور کھلاؤں گی۔

خوجی۔ اچھا اچھا جاؤ۔ (دل میں سوچ کر) اف فوہ کیا کائیاں لونڈی ہے۔ پارسل جھپاک سے لے ہی بھاگی نہیں تو اس وقت پارسل ہی اڑا دیتا۔ لونڈی اندر سے پارسل لے آئی اور بیوی یعنی بہروپیے کی جورو نے پردے کے پاس سے پتا بتا دیا۔ میاں خوجی نے پتے اور نشان کی دم میں رستا باندھا اپنا نام اس پر جلی قلم سے لکھ دیا۔

بعز اسمۂ در بلدہ بمبئی محلہ بھنڈی بازار بر دولت خانہ میرزا اسد بیگ صاحب در جہ خاص میاں آزاد سیاح مادر زاد نزد جناب قبلہ و کعبہ میاں خواجہ بدیع صاحب مد ظلہ مشرف باد۔

یہ لفافہ لکھ کر حضرت نے لونڈی کو دیا اور اپنی راہ لی۔ لونڈی نے فوراً ڈاک خانے میں پارسل دی اور رجسٹری کرا کے چلتی ہوئی۔ واہ ری لونڈی۔ میاں خوجی کو پتا معلوم ہی تھا پہنچے تو وہاں بڑی دل لگی ہوئی۔ دوسرے دن کوئی دوپہر دن چڑھے ڈاک کا ہرکارہ لال لال پگیا جمائے چونگہ دبائے میرزا صاحب کے مکان پر آیا۔

ہرکارہ۔ (میرزا سے) آپ کے یہاں کوئی کھوجی ٹکے ہیں۔

میرزا۔ کون۔ کھوجی ایجی یہاں کھوجی کا کیا کام۔

خوجی۔ ہاں ہاں جی ہمارے نام پارسل آیا ہوگا (اٹھ کر پارسل لیا دستخط کیے اور ہرکارہ روانہ باشد۔)

اب آزاد متحیر کہ اس مردک کے پاس پارسل کہاں سے آیا ہوگا۔ پڑھا تو سخت متحیر ہوئے کہ قبلہ و کعبہ لکھا ہے اور پتا ٹھیک ٹھیک۔

ادھر بہروپیا جو گھر میں گھسا تو بیوی نے کہا لو تم لفافہ نہیں لکھتے تھے ہم نے لکھوا لیا اور جھپ سے پارسل بھجوا دی۔

لونڈی۔ ایک ٹھگنے ٹھگنے دبلے پتلے آدمی تھے افیم کی پینک میں اونگھتے جاتے

تھے انھوں نے لکھ دیا۔

بہروپیا۔ (ہاتھ مل کر) ارے! افسوس اف، مار ڈالا۔ دے گیا چکما۔ ہو نہ ہو، وہی سرا والا خوجی ہوگا بس غضب ہی ہو گیا۔

بیوی۔ خیر تو ہے۔

بہروپیا۔ کچھ نہ پوچھو۔

بیوی۔ یہ افسوس کیسا۔ جلد حال بتاؤ۔ کلیجہ الٹا جاتا ہے۔

بہروپیا۔ تم سے کیا بتاؤں۔

بیوی۔ کیا ایسی بات ہے کہ مجھ سے کہنے کی نہیں کیا کوئی جل دے گیا یا کسی عزیز کی سنائی سن کر آئے ہو۔

بہروپیا۔ بس چپ رہو۔ اللہ نہ کرے۔

بیوی آخرش یہ ماجرا کیا ہے۔ کسی سے لڑ کے آئے ہو۔ تم نے نہ لکھا ہم نے دو گلوری دے کر اس سے لکھوا لیا۔

بہروپیا۔ غضب کیا۔

بیوی۔ کچھ کہو گے بھی یا یہی کہے جاؤ گے کہ غضب ہوا۔ غضب کیا آخر معلوم تو ہو کر کیا غضب ہوا اور کس نے غضب کیا۔

ادھر خورشید گیتی افروز نے پردہ مشکیں میں اپنی نورانی صورت چھپائی اور لیلئ شب لاکھوں پری چہرہ سہیلیوں کو جلو میں لے کر آئی۔ ادھر موا، نا محمد آزاد فرخ نہاد نے ترکی ٹوپی سر پر جمائی اور کوٹ پتلون ڈانٹ کر لیس ہوئے۔ میرزا صاحب بھی کپڑے وپڑے پہن ڈٹ گئے مگر خوجی ابھی سنگار ہی کر رہے ہیں۔ آئینہ سامنے رکھا ہے۔ ٹوپی دی اور چھینک پڑی۔ الغرض چلے تو کس قطع سے اکگلابی پگڑی سر پر۔ اور ایک ڈھیلی اچکن پرانی فیشن کی در بر عقیق کا کنٹھا ہاتھ میں لیے چست گھٹنا پہنے اور ایک بڑا موٹا ڈنڈا لیے۔

راہ میں کہیں میاں خوجی کو استنجے کی ضرورت ہوئی اور ایک گلی میں جا کر بیٹھے۔ اتفاقِ وقت اور شامتِ اعمال ادھر سے ایک کانسٹبل بھی چلا آتا تھا۔

جاگو جاگو۔ رات کے سونے والو۔ جاگو۔ اندھیری ہے۔ خوجی کو جو اس نے دیکھا تو پہلے جھجکا۔ پھر للکارا۔

کانسٹبل۔ کو ہے رے۔ ارے تین کون ارہس۔

خوجی۔ ہوں۔ ہوں۔ ہونھ۔

کانسٹبل۔ ارے یہ تو منہ ہی سے ناہیں بولت ہے۔

خوجی۔ واللہ استنجے کے لیے بول کا لفظ اچھا ذومعنی ہے۔ (کھڑے ہو کر) ابے ہم شاشیدن کا صیغہ گردان رہے ہیں اور تو ڈپٹتا ہے۔ کانسٹبل بسواڑے کا گنوار۔ گردانے کا لفظ جو اس نے سنا تو سمجھا کہ یہ کہنا ہے کہ گردنی دوں گا۔ چھتری آدمی۔ بس آگ ہی تو ہو گیا۔ جیسے جلتے جلتے توے پر پانی چھڑک دیا۔ بڑھ کر ان کا ٹیٹوا لیا اور ایک پٹخنی بتائی۔ پھر کس کر ایک لات جو جماتا ہے تو خواجہ بدیع صاحب نے لڑھکنی کھائی۔ اور ایک دفعہ ہی غل مچایا کہ ہات تیرے گیدی کی۔ لانا تو قرابینچہ۔ ٹھہر میں نکالتا ہوں قرولی۔ مردک نے وہ جھٹکا دیا کہ پیٹ کا پانی تک ہل گیا۔ اس نے اوپر سے ایک رول جمایا۔ دن سے کرولی لاوت ہیں سرو۔ نکال کرولی۔ نکال۔ (ایک اور لات جمائی)

خوجی۔ او گیدی۔ میں پہچان گیا۔ او بہروپیے۔ ذرا مجھے کرتو گنے دے۔ آج سپاہی بن کر آیا۔ اس دن مولوی صاحب بنے تھے۔

کانسٹبل نے ان کا ہاتھ پکڑا اور کہا چل چوکی پہ۔ راہ میں اپنا باوان کوٹ

اور کمل اور بکری کے لیے گھانس اور بلّی کے لیے چھیچھڑے سب ان پر لاد دیے۔ جناب خواجہ بدیع صاحب کی روح پر صدمہ مگر خیر سے سمجھے ابھی تک بہروپیا ہی ہیں۔ چوکی پر لے جا کر اس نے کہا کہ۔

کانسٹبل۔ حولدار صاحب۔ ہجور۔ یو سارچور تین دن سے محلے میں ہلا مچائے ہے نتھن پران کر دہس۔ آج سنار کے موہارے گٹی مارے بیٹھا گلی تاکت رہا ہے کہ جھوں گلی پر پہنچوں جائے۔

حولدار۔ (خوجی سے) ابے تو کون ہے

خوجی۔ (پینک میں)

کانسٹبل۔ (چپت جماکر) بولت ناہیں ہے سسر (ایک اور زناٹے کا ہاتھ دیا)
خوجی۔ (چونک کر) ہات ترے بہروپیے کی۔ مردک نے ناکوں دم کر دیا۔
حولدار۔ کہو کہاں سینددینے کی فکر تھی۔ کچھ یاروں کا بھی حصہ ہے یا۔ الگ ہی الگ یہ تنہا خوری اچھی نہیں۔
خوجی۔ (چونک کر) ایں! ایں گلِ دیگر شگفت۔ آزاد۔ آزاد۔
کانسٹبل۔ حولدار صاحب کی بات کا جواب دے۔ (رول لگاکر) تین دن سے نتھن پران کر دہس۔ پار سال یو سار کلوار کے گھر پیٹھا را ہے۔ اب کی سنار کا تاکس۔
حولدار۔ ہاں آج کل اس کے یہاں مال بھی بننے کو آیا ہے۔
خوجی۔ یار ایک ذری حقہ تو بھروانا۔ لاؤ تو ڈانٹ کے ایک توا۔
کانسٹبل (کان پکڑکے) مسکھری (تمسخری) کرت ہے۔
خوجی۔ (خوجی اچھل کر) لانا قرولی۔ آنتیں نکل پڑیں گیدی کی۔ یہ کہ کر خوجی جو جھپٹے کہ بھاگ جاؤں تو ٹانگیں تو ماشاءاللہ پون پون انچ کی تھیں ہی کانسٹبل نے گردن ناپی خوجی ذرا اور جھپٹے کر اتنے میں ایک حوض کے اندر دونوں کے دونوں فڑاپ۔ خوجی افیمی آدمی۔ سردی کا وقت نشے میں خوب گٹھے ہوئے۔ سرور جمے ہوئے۔ پانی کے نام سے روح لرز جاتی تھی۔ حوض میں جو لڑھکے تو بس ستم ہی ہوگیا۔ لیکن۔ ع۔ خود تو ڈوبیں گے مگر یار کو لے ڈوبیں گے۔ کانسٹبل بہت ہی جھلایا کہ بے طور لڑھکے مارو دی وردی سب لت پت۔

مانجھی سے سوال و جواب

خوجی نے ایک دن کہا۔ ارے یار دکیا اندھیر ہے۔ تم روم چلتے چلتے بیچ بیچ کہاں پھرتے ہو کہیں پارسی کے ہاں پریوں کے جوبن لوٹے کہیں قاضی القضات حضرت مولانا محمد عبدالقدوس صاحب سے غامت علمت فہو علمت کیا۔ اتنے دن تک ان ہی کے ہاں پڑے رہے اور پھر ایک ہو تو کہوں دو ہوں تو چپ رہوں تین ہوں تو گنوں چار ہوں تو شمار کروں جب ہر مقام پر ایک نئی

چھیل چھبیلی پر ریجھے تو کہاں تک گنوں بھئی میں تو بکتے بکتے دیوانہ ہوگیا۔ اُدھر مس ورجینا پر دل آیا۔ ادھر نظیر بیگم نے بھایا۔ یا الٰہی مگر افسوس ہے کہ تم کو اپنی بات کا ذرا پاس نہیں کسی سے وعدہ کیا ہے پھر پورا کرنا چاہیے یا نہیں۔ اب آخر روم کب جاؤ گے عاقبت میں یا حشر کے دن اجی بس اب اسپاچ بھی سنا اور دعوتیں بھی چکھیں اب بقچہ سنبھالو اور چلو سیدھے۔ اب چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے ہم ایک نہ مانیں گے چلیے اٹھیے۔ کوچ بولیے۔

آزاد۔ میرزا صاحب اتنے دنوں میں خوجی نے ایک یہی بات تو بکی کہی۔ اب جہاز کا جلد انتظام کیجیے۔

میرزا۔ اجی حضرت تیاری کیجیے۔ بس اب آپ چلیے۔

خوجی۔ قبلہ پہلے یہ بتائیے کہ کتنے دن کا سفر ہے۔

آزاد۔ اس سے واسطہ۔

خوجی۔ اور سنیے۔ اس سے کچھ واسطہ ہی نہیں۔

آزاد۔ بھئی ہم کبھی جہاز پر سوار ہوئے ہوں تو بتائیں۔

خوجی۔ جہاز ہائے غضب۔ کیا تری تری جانا ہوگا۔

آزاد۔ اجی اور نہیں تو کیا خشکی خشکی۔ آپ ابھی تک اسی بھروسے تھے بہت جلد چونکے۔

خوجی۔ میری تو روح لرزنے لگی بھیا میں نہ جانے کا۔ بابا من نمی رفتم ولاحول۔ من نخواہم رفت۔

آزاد۔ اجی ولے برندش کا معاملہ ہو تو سہی۔ چلو وہاں ترکی عورت کے ساتھ تمھارا بیاہ کرا دیں گے۔

خوجی۔ خشکی خشکی چلو تو بھائی میں چلوں گا۔ سمندر میں جاتے پاؤں ڈگمگاتا ہے۔

میرزا۔ جناب خواجہ صاحب آپ کو شرم نہیں آتی۔ اتنی دور تک ساتھ آئے اور اب ساتھ چھوڑے دیتے ہو۔ ڈوب مرنے کی بات ہے۔

خوجی۔ کیا خوب یوں بھی ڈوبوں اور وہاں بھی ڈوبوں۔ تو یہ اس قدر ضد کیوں کرتے ہیں۔ خشکی ہی خشکی کیوں نہیں چلتے۔

میرزا۔ آپ بھی واللہ نرے چونچ ہی رہے عجب آدمی ہو بھئی۔ خشکی کی راہ

سے کتنے دن میں پہنچو گے بھلا۔ کچھ ٹھکانا ہے۔ کجا بمبئی کجا قسطنطنیہ آپ بھی طرفہ معجون ہیں۔ پرسوں جہاز پر سوار ہوں دن سے روم داخل۔ خشکی کی راہ ایک ہی کہی۔

خوجی۔ اب آپ سے حجت کون کرے آپ تو ہاری مانتے ہیں نہ جیتی جہاز کا کون اعتبار۔ اور جو ڈوب گیا ذرا کسی سوراخ کی راہ سے پانی آیا اور بس پہنچے جہنم سیدھے ع۔ چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی۔ ذرا ہوا تیز چلی اور بیچ کے عوض بلوریب پہنچے۔

آزاد۔ تو نہیں چلو گے نہ۔ صاف صاف بتا دو۔ ابھی سویرا ہے۔

خوجی۔ چلیں تو بیچ کھیت اور ڈنکے کی چوٹ مگر پانی کا نام سنا اور روح تحلیل ہو گئی۔ بھلا کیوں صاحب یہ تو بتائیے کہ سمندر کا پاٹ گنگا کے پاٹ سے کوئی دونا ہوتا ہو گا یا کچھ کم و بیش۔

میرزا۔ جی بس اور کیا چلیے آپ کو سمندر دکھلائیں نہ۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ہے۔

خوجی۔ بس کیوں صاحب شہید مردوں سے بھی دل لگی۔ ہم کرلے چلیے اور جھپ سے چپیر ڈغو کر کے جہاز پر بٹھا دیجیے۔ ایک شرط سے چلتے ہیں بیگم صاحب ضمانت کریں ہمارے سر کی قسم کھائیں کہ زبردستی نہ کریں گے کہ خواہ مخواہ ہی جہاز پر جاؤ۔

آزاد۔ کیا خوب آپ کیا اور آپ کا سر کیا چلیے ہم بیگم صاحب سے کہلوائے دیتے ہیں۔ آپ اور آپ کے باپ دونوں کے سر کی قسم کھالیں تو سہی۔

میرزا۔ اچھا چلیے وہ ضمانت کر دیں گی۔ آئیے اٹھیے۔

میرزا صاحب اور میاں آزاد دونوں مل کر گئے اور ان سے کہا کہ واسطے خدا کے اس سڑی ایمی خبطی خوجی سے اتنا کہہ دینا کہ تو جہاز دیکھنے جا یہ ہوگ۔ زبردستی سوار نہ کریں گے بیگم صاحب نے جو ساری روایت سنی تو خوب کھل کھلائیں اور تنک کر بولیں کہ ہم نہ کہیں گے کہ آپ لوگوں نے ذرا سی بات نہ مانی۔ اچھا خیر پردے کے پاس بلالو۔

خوجی۔ (پردے کے پاس سے) آداب بجا لاتا ہوں حضور۔

جواب کون دے بیگم صاحب تو مارے ہنسی کے لوٹی جاتی ہیں اور میاں آزاد

کے خیال سے اپنی بے تکلفی اور چلبلاہٹ پر کسی قدر شرماتی ہیں۔ مگر لجاتی بھی ہیں۔ اور کھل کھلاتی بھی ہیں شرم اور ہنسی دونوں نے مل کر رخساروں کو اور بھی سرخ کر دیا۔ اس وقت تغیر رنگ نے عجب جوبن دے دیا۔ اتنے میں خوجی نے یہ ہانک لگائی کہ آداب بجالاتا ہوں حضور، غلام کو کیوں یاد فرمایا ہے۔

میرزا۔ وہ کہتی ہیں کہ ہم ضمانت کیے لیتے ہیں۔

خوجی۔ آپ رہنے دیجیے انھیں کو کہنے دیجیے۔

بیگم ۔ خواجہ صاحب بندگی آپ کیا پوچھتے ہیں۔

خوجی۔ اے حضور مجھ کو جہاز دکھانے لیے جاتے ہیں۔ جاؤں یا نہ جاؤں۔ جو حکم ہو بجالاؤں۔

بیگم ۔ کبھی بھولے سے نہ جانا۔ نہیں پھر کے نہ آؤ گے اور جو کہیں وہ موا بہروپیا مل گیا تو بس بن گئی بات۔

خوجی۔ آپ ان کی ضمانت کرتی ہیں۔

بیگم ۔ میں کسی کی ضامن وامن نہیں ہوتی۔ زر دیجیے ضامن نہ ہوجیے۔ یہ ڈبو ہی دیں گے۔ موئی قرولی رکھی ہی رہے گی۔

خوجی۔ چلیے بس حد ہوگئی۔ اب ہم نہ جانے کے۔

آزاد۔ بھائی تم ذرا ساتھ چل کر سیر تو دیکھ آؤ۔

خوجی۔ واہ اچھی سیر ہے۔ کسی کی جان جائے آپ کے نزدیک سیر ہے۔ اس جانے والے پر تین حرف۔

خیر تنتو تھمبو کر کے میرزا صاحب اور میاں آزاد خوجی کو لے چلے، چلتے چلتے جب ساحلِ بحر پر پہنچے تو خوجی نے نظر بھر کے سمندر کو دیکھا دیکھتے ہی دو چار قدم پیچھے ہٹے اور چیخ پڑے پھر دس پانچ قدم پیچھے کھسکے اور رونے لگے۔

خوجی۔ اف خداوند بچائیو۔ یا خدا بچا یہ ملک الموت ہے یا سمندر۔ لہریں دیکھتے ہی کلیجے کو کسی نے مسوس لیا۔

میرزا۔ کیا لطف ہے۔ خدا کی قسم جی چاہتا ہے پھاند ہی پڑوں۔ اوہو ہو ہو۔

خوجی۔ (میرزا کا ہاتھ پکڑ کر) کہیں بھولے سے پھاندنے واندنے کا قصد بھی نہ کرنا۔ حیادار کے لیے ایک چلو کافی ہے۔

آزاد - عجب مسخرہ ہے بھئی - ایک آنکھ سے روتا ہے ایک آنکھ سے ہنستا ہے -

خوجی - آپ تو کہتے تھے کہ گنگا کے برابر پاٹ ہے - معاذاللہ کچھ ٹھکانا ہے - اور چھور ہی نہیں - چلتے چلتے پاؤں کے پرخچے اڑ گئے - وہاں کہتے تھے کہ بس تھوڑا سا ہی تو فاصلہ ہے ان فقرہ بازوں سے خدا سمجھے اور اتنی دور سواری پر آئے ورنہ کیا جانے کیا ہوتا -

اتنے میں دو چار ملاح سامنے سے آئے خوجی نے جو ان کو غور سے دیکھا تو بنسے - پچھنے - میرزا صاحب سے پوچھا کہ یہ کون ہیں - بھئی ان کی تو کچھ وضع ہی نرالی ہے - انھوں نے کہا یہ ملاح ہیں دن رات سمندر ہی میں رہتے ہیں جب دیکھیے جہاز پر -

خوجی - بھلا یہ ہماری بولی سمجھ لے گا - اردو جانتا ہے کہ نہیں -

میرزا صاحب - ہاں ہاں جانتا کیوں نہیں ہے ہزاروں ہندوستانیوں کو لے گیا ہے اردو خوب سمجھتا ہے -

خوجی - (ایک بوڑھے ملاح سے) کیوں میاں مانجھی تمہارے باپ کہاں مرے تھے -

بہی میں رہے ہے -

میرزا - جناب خواجہ بدیع صاحب آپ اپنی طرف دیکھیے گا درگزر کیجیے بدتمیز ہے -

خوجی - خیر آپ لوگوں کی خاطر ہے ورنہ ادھیڑ کے دھر دیتا پاجی کو - (اکڑ کر) مجھے بھی کوئی اور سمجھا ہے یہاں صیف اللہ کے اکھاڑے میں کشتی لڑا کیے ہیں - دل لگی ہے کچھ کہنے لگا - دت واہ اچھی دو دبک ہے اس وقت آپ لوگ بیچ میں نہ پڑیں تو پھر کس ہی نکال دیا ہوتا -

میرزا - ذری غور سے دیکھیے کہیں بہروپیا تو نہیں ہے ہم تو جانتے ہیں وہی گیدی ہے -

یہاں سے گھر چلے تو راہ میں دیکھا کہ ایک درخت کے سایے میں دو گھوڑے کھڑے ہیں - ایک پر نوجوان یوروپین جنٹل مین دوسرے پر ایک نازک کمر پری پیکر لیڈی - یہ دونوں وہی ہیں جو میاں آزاد کو اس دن ملے تھے - ناظرین کو یاد ہو گا کہ جنٹل مین نے بیوی سے کہا تھا کہ میں نے ایک ایسی بری چہرہ دیکھی جو اس

اسٹیشن بھر میں فرد ہے اور جس کے مقابلے میں کل حسن لیڈیوں کا گرد ہے۔ اس پر وہ تنکیں کہ کیا کہا۔ انھوں نے بات بنائی۔ بھانپ گئے کہ بیوی نے برا مانا۔ کہا کہ وہ اسٹیشن بھر میں اپنی آپ ہی نظیر ہے۔ مگر تم سے دوم نمبر پر ہے۔ وہی دونوں آج پھر ملے میاں آزاد سے اس جنٹل مین نے انگریزی میں گفتگو کی۔

جنٹل مین۔ اس درخت کا کیا نام ہے آپ جانتے ہیں کچھ۔

آزاد۔ برگد۔ برگد کا درخت ہے۔

جنٹل مین۔ وہ نہیں۔ یہ یہ۔

میاں آزاد علوم و فنون شاعری نثاری وغیرہ میں تو برق تھے مگر علم نباتات میں بالکل کورے بغلیں جھانکنے لگے۔

آزاد۔ اس کا نام مجھے خود نہیں معلوم ہم لوگ ذرا ان باتوں کی طرف کم توجہ کرتے ہیں۔ یہاں علم نباتات میں کسی کو عبور نہیں۔

جنٹل مین۔ ولایت میں اس کا بڑا چرچا ہے (اردو میں) ہم اپنے ملک کی گھاس پھوس پیڑ جڑی بوٹی پہچانتا ہے۔

خوجی۔ ولایت کا گھسیارا معلوم ہوتا ہے یا مالی ہوگا۔

جنٹل مین۔ (اردو میں) چڑیا کا علم جانتا ہے آپ۔

آزاد۔ جی نہیں یہ علوم یہاں سکھائے نہیں جاتے۔

جنٹل مین۔ چڑیا کا علم ہم خوب جانتا ہے۔

خوجی۔ چڑی مار ہے لندن کا۔ بس قلعی کھل گئی۔

وہ دونوں تو گھوڑوں کو کڑکڑا کر ہوا ہو گئے۔ ادھر آزاد اور میرزا صاحب کے پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑ گئے۔

آزاد۔ اف فوہ۔ واللہ لٹا دیا۔ بڑی خرابی سے ہنسی ضبط ہو سکی۔ چڑی مار اور گھسیارے کی ایک ہی کہی۔ انھیں باتوں سے تو ہندوستان تباہ ہے۔

میرزا۔ جی اور نہیں تو کیا۔ علم نباتات پڑھے تو مالی اور گھسیارا کہلائے۔ علم الطیور کا شوق کرے تو چڑی مار کی پھبتی ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ جہاں خوجی سے لوگ ہوں وہاں ترقی ہو چکی۔

بمبئی سے بھی کوچ

میاں آزاد اور میرزا صاحب اندر بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک شخص نے باہر سے آواز دی۔ میرزا صاحب نے زبمن سے کہا کہ جاؤ دیکھو تو

ماںجھی۔ ساگر (سمندر) جہاز پر۔

خوجی۔ ہوں۔ اور دادا۔

ماںجھی۔ وہ بھی جہاز پر۔

خوجی۔ ہوں اور چچا وچا

ماںجھی۔ وہ بھی سمندر میں۔

خوجی۔ بھلا تم کہاں مرو گے۔

ماںجھی۔ اب یہ کون جانے کسی کو اپنے مرنے کا حال کیا معلوم مگر مریں گے اسی سمندر ہیں، ہم بھی۔

خوجی۔ پھر بھلا تمہارے کنبے کے اتنے مرے اور تم خود بھی وہیں مرنے والے ہو تو اس سے پرہیز کیوں نہیں کرتے کوئی اور پیشہ کرو۔

ماںجھی۔ آپ کے باپ کہاں مرے تھے میاں۔

خوجی۔ ہمارے شہر میں اور کہاں مرتے۔

ماںجھی۔ اور دادا تمہارا کہاں مرا تھا۔

خوجی۔ وہ بھی شہر میں مرے تھے۔ قبرستان میں ان کی بھی لاش ہے۔

ماںجھی۔ اور چچا وچا سب کہاں مرے۔

خوجی۔ سب وہیں مرے۔ کئی قبریں اب تک موجود ہیں۔

ماںجھی۔ (گردن ہلا کر) پھر آپ اس شہر کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ جہاں آپ کے باپ اور دادا اور چچا اور سب عزیز مرے۔

خوجی۔ واہ۔ واہ۔ شہر کے چھوڑنے سے کیا مرنے سے بچ جائیں گے۔ ہم چاہے جہاں رہیں مریں گے ضرور، مرنا برحق ہے۔ چاہے یہاں سے لندن جائیں چاہے روم و شام بدھر جائیں ملک الموت سے بھلا کوئی بچ سکا ہے۔ دغہ علاج موت

نہ کردند روسیاہ شدند۔

مانجھی۔ پھر میں اپنا پیشہ کیوں چھوڑنے لگا۔ بھلا۔ جب موت سے بچ ہی نہیں سکتا کوئی۔ تو میں پیشہ کیوں چھوڑوں۔

خوجی۔ آپ منطق بھی پڑھے ہیں معلوم ہوتا ہے۔ اچھی دلیل پیش کی۔

مانجھی۔ کیا۔ میں سمجھا نہیں۔

خوجی۔ اجی تم خوب سمجھتے ہو۔ مگر شکل و صورت سے تو ہم سمجھے تھے کہ جانگلو ہے لیکن تم تو خوب اردو بولتے ہو۔

مانجھی۔ میں جبل پور کا رہنے والا ہوں باپ دادا سب نے یہی پیشہ کیا۔

آزاد۔ کہیے خواجہ صاحب جھیپے تو نہ ہوں گے آپ۔ سچ کہنا کیا جواب دیا۔ واہ رے مانجھی۔ کہیے اب تو تشفی ہوئی۔ چلیے گا جہاز پر۔

خوجی۔ ہاں ضرور سو کام چھوڑ کر۔ نہ چلنا کیا (مانجھی سے) کیوں بھئی ہم کو پاؤں پاؤں تو نہ چلنا ہوگا کسی مقام پر۔

مانجھی۔ ہونہہ۔ کیا دھرتی پر چلنا ہے۔

خوجی۔ بھلا افیم کھانے کی تو جہاز پر ممانعت نہیں ہے۔

مانجھی۔ نہیں بہت سے آدمی افیم گھول کر پیا کرتے ہیں جس کا جو جی چاہے کھائے۔

خوجی۔ اے میں تیری زبان کے قربان۔ واہ میری جان۔ بس چنیا بیگم پاس ہوں تو مزے ہیں۔ بھلا کیوں میاں جہاز پر کوئی جگہ ایسی بھی ہے جہاں سے سمندر نظر ہی نہ آئے اور ہم آرام سے بیٹھے رہیں سچ بتانا استاد۔ اجی ہم پانی سے بہت ڈرتے ہیں بھائی۔

مانجھی۔ ہم آپ کو ایسی جگہ بٹھا دیں گے جہاں پانی آسمان کچھ سوجھ ہی نہ پڑے۔

خوجی۔ صدقے۔ قربان۔ بڑے دوست ہو ہمارے۔ ایک بات اور بتا دو۔ گنڈے ملتے جائیں گے راہ میں یا ان کا کال ہے۔

مانجھی۔ گنڈے وہاں کہاں۔ کیا کچھ منڈی ہے۔ اپنے ساتھ چاہے جتنے لے چلیے۔

خوجی۔ ہاں گنڈیریاں تازی تازی کھانے میں نہ آئیں گی بھلا۔ حلوائی کی دکان تو ہوتی ہوگی آخر یہ اتنے شوقین افیمی جو جاتے ہیں تو کھاتے کیا ہیں۔ سنکھیا کھا جا۔

برفی - پیڑے - لڈو - یہ سب ملتا ہے یا ندارد۔
مانجھی - اجی جو چاہو ساتھ رکھ لو۔
خوجی - اور جو منہ ہاتھ دھونے کو پانی کی ضرورت ہو تو کہاں سے آئے۔
آزاد - پاگل ہے کون مسخرہ اتنا نہیں سمجھتا کہ سمندر میں جاتا ہے اور پوچھتا ہے کہ پانی کہاں سے آئے گا۔ سب پانی پیئں گے تم پیاسے مروگے دشت کربلا ہے احمق۔
خوجی - تو آپ کیوں الجھ پڑے آپ سے پوچھتا کون گیدی ہے۔ (ملاح سے) کیوں جی بھلا ہم گنے یہاں سے باندھ لے چلیں اور گنڈیریاں بنائیں اور جہاز پر چوسیں مگر چھلکے پھینکیں گے کہاں آخر، ہم تو صبح وشام دو چار پونڈے کھایا چاہیں پھینکیں کہاں۔
آزاد - یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے ہم بتادیں گے آپ بدحواس نہ ہوں۔
خوجی - اس کی تو ممانعت نہیں ہے کہ کوئی پینگ میں نہ ہو۔
مانجھی - (ہنس کر) نہ۔
خوجی - اور جو قرولی باندھے ہو تو ہرج تو نہیں ہے کچھ یا مثلاً قرابینچہ ہو۔
مانجھی - چاہے جو ہو توپ نہ ہو اور تار پیڈو نہ ہو تلوار ہو کٹار ہو چاہے جو ہو مگر لایسنس ضرور ہونا چاہیے۔
خوجی - ہوں۔ دیکھیے ایک بات معلوم ہوئی نہ اچھا یہ سب تو ہوا۔ اب دو دو باتیں اور ہو جائیں ایک تو یہ بات پوچھنی ہے کہ بہروپیے تو جہاز پر نہیں چڑھنے پاتے۔
مانجھی - چاہے جو سوار ہو۔ دام دے سوار ہولے کسی کا دہ نہیں۔ ئل۔
خوجی - اجی ئل کو ڈالو بھاڑ میں ہمارے سوال کا جواب دو کمھار تو نہیں ہوتے۔
مانجھی - آج تلک کوئی کمھار گیا نہیں۔ یاد نہیں پڑتا۔
خوجی - لے میں تیری زبان کے پھر قربان بڑی ڈھارس ہوئی خیر کمھار سے تو بچے۔ باقی رہا بہروپیا۔ اس گیدی کو سمجھ لوں گا۔ اتنی قرولیاں بھوکوں گا کہ یاد ہی تو کرے۔ آخر حوض میں گرا ہی دیا۔
مانجھی - اتنی باتیں تو کسی نے بھی نہ پوچھیں تھیں۔ اب کچھ اور پوچھو گے۔

خوجی - ہاں بس ایک بات اور وہ بھی دو پٹی پر تو قید نہیں ہے کہ صبح و شام ہر شخص ضرور ہی نہائے۔ اگر یہ قید ہوئی تو جانے والے پر تین حرف ہم کوئی جیل خانے میں ہوں گے

ما نجھی - آپ چاہے عمر بھر نہ نہائیں۔

خوجی - اے میں تیری زبان کے قربان۔

مانجھی - افیم بہت کھاتے ہو معلوم دیتا ہے۔

خوجی - (مسکرا کر) ہاں خوب پہچان گئے۔ آپ قیافہ شناس بھی ہیں خیر سے یہ تم کیوں کر بوجھ گئے بھائی۔ شوق ہو تو گھولوں۔

مانجھی - ت ت - بس الگ رہو۔ ہم افیم کو چھوتے تک نہیں۔

خوجی - (بگڑ کر) ادگیدی ٹکے کا آدمی تم اور جھک مارتا ہے نکالوں قرولی۔

آزاد - ہاں ہاں خواجہ صاحب دیکھیے دیکھیے جانے دیجیے گا۔ ذری قرولی میاں

کون ہے میاں خلیفہ بوں تو کہنا اس وقت ہم خط نہ بنوائیں گے۔ تیسرے پہر کو آجائیے۔ زیبن آٹا گوندھ رہی تھی اچھا کہ کر خاموش ہو رہی اس نے پھر باہر سے آواز دی۔ اور ساتھ ہی خدمت گار نے بھی پکارا۔ تب تو زیبن کو مجبور ہو کر اٹھنا ہی پڑا مگر ناک بھوں چڑھائی۔ بڑ بڑاتی اور خدمت گار کو بے نقط سناتی ہوئی اٹھی۔ بجلی پڑ جائے ایسی نوکری پر جو ہے میری ہی جان کا گاہک جسے دیکھو میرا ہی دشمن، واہ ایک کام چھوڑ دوسرے پر بیگ۔ اب کی چاند ہو تو میں تنخواہ لے کے اپنے گھر بیٹھ رہوں۔ کیا نگوڑی نوکری کا بھی کچھ کال ہے۔ زیبن کا قاعدہ تھا کہ کام سب کرتی تھی مگر بڑ بڑا کر۔ ہزاروں باتیں بنا کر۔ بات بات پر تنک جانا تو گویا اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ ع - ناز بر آں کن کہ خریدار تست۔ اپنے کام میں برق تھی۔ اس سے اس کی خاطر بھی ہوتی تھی۔ الغرض منہ پھلا کر اور آٹے کو پٹک کر زیبن باہر گئیں۔ پہلے تو جاتے ہی خدمت گار کی خوب لے دے کی۔ کیا گھر بھر میں میں ہی اکیلی ہوں جب پکارتا ہے مجھی کو پکارتا ہے موئے الّو کے منہ میں نام پڑ گیا ہے۔ خدمت گار کی جانی دشمن۔ بات بات پر للکارا کرتی تھی خیر زیبن اور خدمت گار میں جھج چلا کی۔ اس کے بعد خدمت گار نے کہا کہ یہ آئے ہیں میاں سے جا کر ان کا پیغام کہ دو۔ مگر ذرا سمجھ بوجھ کر کہنا سب باتیں سن لو اچھی طرح اور میاں سے کہ دو کہ جی چاہے تو باہر ہی آن کر سن

لیجیے۔ زیبن اندر آئیں۔
میرزا صاحب۔ کون ہے۔ کون آیا کون ہے۔
زیبن۔ وہ آیا ہے۔ ملاح یا جانے کون۔
میرزا صاحب۔ کہتا کیا ہے۔
زیبن۔ حضور وہ کہتا ہے کہ آج جہاز روانہ ہوگا۔ ابھی دس گھنٹے کی دیر ہے تیار ہو رہیے۔

بیگم نے جو جہاز کا لفظ سنا اور معلوم ہوا کہ آج ہی جہاز روانہ ہوگا تو بس دھک سے رہ گئیں۔ چہرے کی سرخی خیر باد کہ گئی زردی نے اپنا عمل کر لیا۔ کلیجہ دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ آنکھوں سے حسرت ٹپکتی تھی۔ ضبط نہ کرتیں تو آنسو جاری ہو جاتے مگر بہت ہی سنبھالا اور حسرت کے ساتھ میاں آزاد کی طرف دیکھنے لگیں۔ آزاد آپ جانیے جہانیاں جہاں گشت پرلے سرے کے تجربے کار آدمی بیگم کے دل کی بات چٹکیوں میں تاڑ لی۔ مگر دم بخود۔

میرزا۔ (آزاد سے) لیجیے صاحب۔ اب کوچ کی تیاری کیجیے۔
آزاد۔ بسم اللہ۔ تیار مستعد۔ یہاں کچھ بڑا لمبا چوڑا سامان تو کرنا نہیں خیمہ خرگاہ نہیں۔ ایک بیگ ایک دری۔ ایک آفتابہ۔ ایک لکڑی چلیے۔ اللہ اللہ خیر صلاح۔ جس وقت کہیے چھپ سے موجود۔ میرا سامان سب لیس ہے۔ وقت پر دن سے اٹھ کھڑا ہوں گا۔ آپ کچھ فکر نہ کیجیے۔
خوجی۔ (پردے کے پاس سے) یہاں بھی مضمون واحد ہے ایک ڈبیا ایک پیالی چانڈو پینے کی ایک نگالی ایک کٹارا ایک دونا مٹھائی کا ایک چاقو ایک قرولی بس اللہ اللہ خیر صلاح۔ توپ بندوق کٹار تلوار وہاں مول لے لیں گے۔ بندہ بھی کیبل کانٹے سے درست ہے۔

اس تقریر پر میاں آزاد اور میرزا اسد بیگ صاحب دونوں ہنس پڑے۔ خوب ہی کھل کھلائے۔ مگر بیگم صاحب کے لب پر ہنسی نہ آئی بلکہ انھوں نے ایسی صورت بنائی کہ ان کے میاں بھی سمجھ گئے اور ہنسی کو بہت ضبط کیا۔ میرزا صاحب خوب جانتے تھے کہ ان کی بیوی پاک دامن ہیں اور اس سے بھی واقف تھے کہ حسن آرا

میاں آزاد پر عاشق ہیں پھر ان سے یہ کیوں کر ممکن تھا کہ وہ اپنی بیوی سے بدظن ہو جاتے سمجھ گئے کہ اتنے دن میاں آزاد یہاں رہے ہیں اب ان کی جدائی شاق کیوں کر نہ گزرے۔ خیر اشارے سے بیوی کو سمجھایا۔ لیکن اس وقت تو قلب کا کچھ عجب ہی حال تھا اور اس بے قراری سے سچا عشق ظاہر ہوتا تھا جس کو میاں آزاد اور میرزا صاحب دونوں بھانپ گئے میرزا باہر گئے کہ اس آدمی سے گفت گو کریں اور یہاں میاں آزاد اور بیگم صاحب اکیلے رہ گئے۔ کچھ دیر تک بیگم نے مارے رنج کے سر تک نہ اٹھایا اور آزاد بھی سمجھے کہ اگر میں تشفی کا ایک کلمہ بھی کہوں گا تو یہ بے اختیار رو ہی دیں گی۔ لہٰذا انھوں نے لب تک نہ ہلائے۔ مگر رنگ و رخسار کے متغیر ہونے اور ٹھنڈی سانسیں بھرنے سے ان کے دل پر بڑا اثر ہوا۔

تھوڑی دیر کے بعد بیگم نے سر اٹھایا اور آزاد سے مخاطب ہوئیں۔

بیگم - بس زبان بند ہو گئی۔

آزاد - آپ گھبرائیے نہیں میں جلد واپس آؤں گا۔

بیگم - (آہ سرد کھینچ کر) ہائے اگر اتنی تشفی کر دو تو میں جی اٹھوں۔

آزاد - استقلال کو ہاتھ سے نہ دیجیے آپ کو تو حسن آرا کی وجہ سے مجھ سے محبت ہو گئی ہے مجھ کو دیکھیے کہ تیرِ عشق کی خلش سے کیسے کیسے کرب سہ رہا ہوں مگر اف تک نہ کیا حسن آرا ہی کی حالت پر نظر ڈالو۔ اس بے چاری پر میری جدائی نے کیسی بجلی گرائی۔ کیا نوبت آئی۔ لیکن مستقل مزاج ہے۔ انھیں موقعوں پر انسان کو استقلال کے ساتھ کام کرنا چاہیے۔ صبر۔ صبر۔

بیگم - کہنا آسان کرنا مشکل ہے۔ اف اندھیرا سا چھا گیا۔ کیا آج ہی جاؤ گے اف آج ہی۔

آزاد - ابھی میں کیوں کر سمجھاؤں۔

بیگم - تمھارے جانے کے بعد میری کیا کیفیت ہو گی اور اب ہم تمھیں دیکھیں کیوں کر

آزاد - انشاء اللہ زندگی ہے تو ہنسی خوشی پھر ملیں گے۔

بیگم - منزلوں کا سفر کانے کو سوں مجھے تو جیسے مایوسی سی ہے میں تو سب کچھ مان جاؤں پر جب دل بھی مانے اس اندر والے کو کون سمجھائے۔ کوئی تدبیر بن ہی نہیں پڑتی

اللہ میں کیا کروں۔

اتنے میں میرزا صاحب نے باہر سے آکر کہا کہ صبح کو گجردم جہاز روانہ ہو گا۔ خدا کرے بخیر و عافیت واپس آئیے اور ہم بھی شریک تقریب سعید ہوں۔

آزاد۔ السعی منی والاتمام من اللہ۔

بیگم۔ یوں جانے کو تو سب ہی جاتے ہیں، حج کو لاکھوں مرد و عورت ہو آئے مگر اتنی دور جانا اور لڑائی میں شریک ہونا۔ بس یہی خیال تو مارے ڈالتا ہے۔

آزاد۔ یہ سچ ہے مگر۔

کشتگانِ خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر ست

بیگم ۔ واپس آنے کی تو بہت کم امید ہے نہ۔ جہاں گولا چلتا ہو وہاں کسی کا بھی بس نہیں چل سکتا۔ اتنی سی جان گولے کو بھلا روک سکتی ہے کہاں۔

آزاد۔ لاکھوں آدمی جو جنگ میں شریک ہوتے ہیں اور مورچے پر جاتے ہیں کیا سب کے سب مر ہی جاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا اور پھر یہ بھی تو سوچیے کہ قضا کا وقت کوئی ٹال ہی نہیں سکتا۔ پھر جیسے یہاں ویسے وہاں دونوں مقام یکساں ہیں۔ اب اس کا خیال نہ کیجیے اور خدا کی مرضی پر شاکر رہیے۔

بیگم ۔ (آہ سرد کھینچ کر) ہاں ۔

میرزا بھئی میرا تو دل گواہی دیتا ہے کہ آپ سرخ رو ہی ہو کر آئیں گے۔ آج تو آپ جاتے ہیں مگر خدا وہ دن جلد دکھائے گا کہ پھر اسی مکان میں ہوں گے انشاء اللہ۔

انسان کو خدا کے معاملات میں ذرا بھی دخل نہیں۔ انسان کرتا کچھ ہے نتیجہ کچھ اور ہی نکلتا ہے۔ سوچتا کچھ ہے ہوتا کچھ اور ہی ہے۔

اور موت کا حال ظاہر ہے کہ جن لوگوں کی زیست سے ہاتھ دھو بیٹھے اور سمجھ گئے کہ اب ان کا بچنا غیر ممکن ہے وہ دم کے دم میں خاصے ہٹے کٹے نظر آئے اور جو اچھے بھلے چنگے تھے وہ بات کی بات میں چل بسے۔ سپاہیوں نے زخم کھائے گولے کھائے گولیاں کھائیں تلواروں سے بدن چھلنی ہو ہو گئے مگر بقید حیات موجود ہیں اور ایسا بھی اکثر ہوا کہ ایک گولی قریب سے بھی نہ نکلی۔ لیکن ٹھوکر کھائی اور مر گئے جنگ پر جانے سے یہ نتیجہ نکالنا کہ خواہ مخواہ مر ہی جائیں گے فضول ہے اور یوں تو آب حیات کسی نے پیا ہی نہیں کہ وہ عاقبت کے بوریے بٹورے۔ طفل مکتب تک جانتا

ہے کہ ہر ذی روح کے لیے موت ہے۔ اس سے نہ کوئی بچا نہ کوئی بچے گا۔ اس وقت ان باتوں کے تذکرے سے بجز اس کے کہ میاں آزاد بے چارے کا دل چھوٹا پڑ جائے اور کوئی نتیجہ نہیں۔ ہم پر فرض ہے کہ اپنے اس معزز مہمان کی روانگی کے وقت ہنسی خوشی ان کو روانہ کریں اور خدا سے دعا مانگیں کہ جس کارِ خیر کے لیے جاتے ہیں اس کو بہ حسنِ لیاقت انجام دیں تاکہ ان کا ساری خدائی میں نام ہو اور حسن آرا پیاری ان کے ساتھ چین سے بسر کریں۔ اب ہمارے رونے دھونے یا رنج کرنے اور ٹھنڈی سانسیں بھرنے سے کیا ہو سکتا ہے کچھ بھی نہیں۔ بھلا میاں آزاد کو تم روم جانے سے باز رکھ سکتی ہو، ممکن نہیں۔ پھر اپنے رنج و حسرت کے اظہار سے ان کو ملول و مغموم کرنا فعلِ عبث ہے یا نہیں۔

بیگم۔ میں کیا کروں یہ سب باتیں تو میں بھی جانتی ہوں مگر سمجھاؤں کسے پھوٹ پھوٹ کے رونا آتا ہے ضبط کر رہی ہوں۔

آزاد۔ آپ میرا کہا مانیے تو خوب رو لیجیے تاکہ بخار چھٹ جائے رونے کا ضبط اچھا نہیں رونے کے ضبط کرنے میں قلب پر ایک قسم کی حرارت ہو جاتی ہے خفیف سا بخار آتا ہے اور انسان پریشان ہو جاتا ہے مگر دل کو خوب مضبوط رکھو اور سمجھاؤ کہ خوف کیا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے جنگ ہوا ہی کی ہے اور آدمی مورچوں پر جایا ہی کیے ہیں ایک میں ہی اکیلا تھوڑا ہی جاتا ہوں جب تک آپ دل کو ڈھارس نہ دیں گی دہلیز کے باہر قدم رکھنے کا نہیں ایسا نہ کیجیے کہ مفت میں میری بدنامی ہو اور میں روم جانے سے محروم رہوں۔ خدا نے چاہا تو بہت جلد آن کر آپ کی زیارت حاصل کروں گا۔ اب آپ یا تو خوب رو لیجیے یا ہنس دیجیے۔ میری تسلی اسی میں ممکن ہے۔ اب آپ کو اختیار ہے۔ میں اصرار نہ کروں گا کہ مبادا طبعِ نازک پر گراں گزرے۔ پہلے ہی دن زیبن مجھے للکار چکی ہیں کہ بیوی نازک مزاج ہیں زور زور گفتگو نہ کیجیے۔

بیگم۔ زیبن۔ زیبن۔ پانی لاؤ۔ منہ دھلاؤ۔

میرزا۔ جی خوش ہو گیا۔ واللہ اس وقت جی خوش ہو گیا۔

آزاد۔ ہاں علیٰ ہذا القیاس۔ بس اب منہ دھو کر گلوریاں بنائیے۔ خود بھی کھائیے اور میرزا صاحب کو بھی کھلائیے۔

میرزا۔ زیبن پانی لاؤ۔ سنتی نہیں ہو تو تم میں عیب ہے کہ صبح کا کام شام کو اور شام کا صبح کو کرتی ہو لاؤ پانی جھٹ پٹ۔

زیبن۔ توبہ اب آکو چھیلوں یا پانی پلاؤں۔

الغرض زیبن حسب دستور دل ہی دل میں برا بھلا کہتی ہوئی اٹھیں اور پانی لے گئیں۔ بیگم نے منہ دھویا اور گلوریاں بنا کر میرزا صاحب اور میاں آزاد کو دیں اور آہستہ سے کہا کہ اب میں کوئی ایسا کلمہ زبان پر نہ لاؤں گی جس سے میاں آزاد کو یا ان کو رنج ہو یا جس سے میرے رنج کا اظہار ہو۔ باہر سے خوجی نے آواز دی۔

خوجی۔ مولانا محمد آزاد صاحب کہیے اب چلنے کا وقت قریب آیا۔ کچھ خواجہ بدیع کی بھی فکر ہے۔ وہ قرولی لیتے ہی لیتے رہ گئے۔ افیون کا کیا بندوبست کیا ہے۔ یار کہیں ایسا نہ ہو کہ افیم راہ میں نہ ملے اور ہم جیتے جی مرمٹیں۔ ذری زیبن کو بازار تک بھیج کر بونڈے کی پھاندی اور کوئی ساٹھ ستر کتارے تو نازک نازک سے منگوا دیجیے۔ میرا بھائی نہیں میں جیتا نہ پھروں گا۔

زیبن۔ ہاں زیبن ہی تو گھر بھر میں فالتو ہے لپک کر بازار سے لے کیوں نہیں آتے کیا چوڑیاں ٹوٹ جائیں گی۔ یا پاؤں کی مہندی چھٹ جائے گی۔ اور افیم لینے میں عورت ذات کہاں جاؤں گی بھلا۔

بیگم۔ (آزاد سے) راستے میں اس سڑی کے سبب سے خوب چہل پہل رہے گی۔ جی تو نہ گھبرائے گا۔

آزاد۔ ہاں مگر دیکھیے کیا کیا حماقتیں کرتے ہیں۔ خدا ہی خیر کرے لیے جاتا ہوں کہ شاید غم غلط ہو۔ مگر خوف معلوم ہوتا ہے۔

خوجی۔ اچھا پھر مورچے پر ہماری کیفیت دیکھیے گا ابھی جو چاہے کہہ لیجیے۔ آپ سے سو قدم آگے ہی رہوں تو سہی۔

میرزا۔ اس میں کیا شک ہے جناب خواجہ صاحب اور جو غنیم کی طرف کوئی بہروپیا ہوا تو پھر کیسی ٹھہرے گی۔

خوجی۔ سچ کہتا ہوں کہ اتنی قرولیاں بھونکی ہوں کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ مجھے بھی کوئی ایسا ویسا سمجھے ہیں آپ۔ دگلے والی پلٹن میں رسالدار تھا۔ بندے نے اودھ میں خدا جانے کتنی گڑھیاں فتح کر لیں۔

بیگم ۔ کیا گڑھیاں فتح کریں۔ اے واہ (مسکراکر) گڑھیاں فتح کرنا خوب بات ہے تم کو بھی اپنی زبان سے کہنا نہیں ہے۔

خوجی ۔ حضور آپ تو میاں آزاد کے کہنے میں جاتی ہیں اور مجھ کو خواہ مخواہ بناتی ہیں۔ گڑھی سے مطلب تھا اس کی جمع گڑھیاں ہوئی یا نہیں، ہوئی۔ فرمائیے پھر گڑھیاں کیا معنی۔ ہم بھی کسی زمانے میں رسالدار بہادر رہتے اور اب پھٹے حالوں ہیں تو کیا ہوا۔

بلبلو کس کو دکھاتی ہو عروجِ پرواز ہم بھی اس باغ میں تھے قید سے آزاد کبھی

بیگم ۔ اے رسالدار صاحب آپ کی قرولی کیا ہوئی۔ مورچہ کھا گئی ہو تو ذری صاف کر لیجیے ایسا نہ ہو مورچے پر میان ہی میں رہے۔

زیبن ۔ کمیدان صاحب ہمارے لیے وہاں سے کیا سوغات لائیے گا۔

خوجی ۔ اجی جیتے آئیں تو یہی بڑا تحفہ ہے۔ یہاں تو بدن کانپ رہا ہے بلا کا سامنا ہے۔ اف خدا ہی بچائے۔

بیگم ۔ (آزاد سے) خط و ط بھیجا کیجیے گا یا نہیں یا ترسائیے گا۔

آزاد ۔ ضرور بھیجوں گا۔ نہ بھیجنا کیا معنی۔

الغرض چلنے کا وقت آ گیا اور میاں آزاد نے اپنا اور خوجی کا اسباب باندھا بگھی تیار ہوئی۔ سب سامان چوکس سب لیس بیگم صاحب نے پھرتی کے ساتھ چار گرہ سبز اطلس لے کر اور بیب سیا اور اس میں ایک اشرفی رکھ دی مہر شاہی ضرب مرشد آباد، امام ضامن کی اشرفی تو تیار ہوگئی۔ جس وقت میاں آزاد نے چلنے کے لیے لکڑی اٹھائی اس وقت بیگم بے چاری بے اختیار رو دی مگر دل کو تھام لیا اور پھر منہ دھویا۔ چلتے وقت میاں آزاد نے کہا کہ دیکھیے بیگم صاحب اب اس وقت دل کو قابو میں رکھیے ورنہ راہ میں دو چار روز تک میرا برا حال ہوگا۔ اگر مجھ سے واقع میں دلی محبت ہے تو میرا کہا مان لیجیے غم کو اپنے قریب آنے ہی نہ دیجیے میں آج سے خط پر خط بھیجوں گا۔ خاطر جمع رکھیے اور حسن آرا کے نام بھی خطوط کا تار باندھ دوں گا۔ بیگم صاحب نے بڑھ کر اپنے پیارے پیارے اور نازک ہاتھوں سے امام ضامن کی اشرفی باندھ دی اور کہا کہ امام ضامن کی ضامنی۔ جس طرح پیٹھ دکھاتے ہو اسی طرح منہ بھی دکھاؤ اور اللہ کرے منہ مانگی مراد پاؤ۔

آزاد ۔ خدا حافظ۔

بیگم کی پریشانی ناگفتہ بہ۔ آنکھیں لہو کی بوٹیاں روتے روتے سرخ ہو گئیں، قلب کی عجب کیفیت تھی۔ حرکت سست۔ دل دھڑک رہا تھا اور بے قراری ہر گھڑی ترقی پر تھی۔ مگر عورت تھی فہمیدہ یہ شعر پڑھ کر خاموش ہو رہی ؎

دل میرود ز دستم صاحب دلاں خدا را ۔۔۔ دردا کہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا

امیاں آزاد اور میرزا صاحب اور خوجی جا کر بگھی پر بیٹھے بگھی روانہ ہونے کو تھی کہ میاں آزاد نے کہا ارے ۔ لاحول ولا قوۃ ۔ لکڑی بھول آیا۔ آپ ٹھہریں میں اندر سے ابھی ابھی آیا یہ کہ کر میاں آزاد بگھی سے اترے اور جلدی جلدی اندر گئے، واہ استاد۔ ہم سمجھ گئے ع تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے ۔ اندر جو حضرت پہنچے تو دیکھا کہ بیگم کے بال پریشان ہیں اور وہ گھبرا رہی ہیں مگر زیبن سمجھاتی ہیں کہ بیوی روئیں نہیں اللہ چاہے تو ایک دو ہی مہینے میں آجائیں ۔ آزاد کو جو دیکھا تو ان کی باچھیں کھل گئیں ۔

آزاد ۔ دیکھیے بیگم صاحب اس وقت آپ کو یقین واثق ہو گیا تھا کہ اب جب تک میں روم سے واپس نہ آؤں گا آپ میری صورت نہ دیکھیں گی مگر خدا نے مجھ کو اور آپ کو پھر ملایا۔ بس اسی طرح خدا پر شاکر رہیے (قدموں پر گر کر) بیگم صاحب خدا کے لیے، رنج نہ کرنا، ہمارا ہی خون پیے جو غم کرے ۔ اب مجھے جب تک یقین نہ دلاؤ گی میں زمین سے نہ اٹھوں گا۔

بیگم ۔ (زمین سے اٹھا کر) میں جس کی کہو قسم کھاؤں کہ اب میرے دل کو بڑی ڈھارس ہوئی خدا تم کو واپس لائے اور خیر و عافیت سے تم پھر بمبئی میں آن کر ہمارے یہاں رہو۔

آزاد ۔ اب میں رخصت ہوتا ہوں ۔ خدا حافظ۔

بیگم ۔ امام ضامن کے حوالے کیا ؎

بسفر رفتنت مبارک باد ۔۔۔ بہ سلامت روی و باز آئی

زیبن سے کہا کہ وہی مچھلی خدمت گار کو دے کر کہہ دے کہ دروازے پر کھڑا رہے جس وقت میاں آزاد دروازے کے باہر قدم رکھیں سامنے کر دے اور دیکھتا رہے کہ کوئی عورت سامنے نہ آنے پائے۔

آزاد۔ لکڑی لے کر جھٹ پٹ باہر پہنچے اور بگھی پر سوار ہو کر ساحلِ بحر کی طرف چلے تو اثنائے راہ میں میرزا صاحب سے انھوں نے کہا کہ واسطے خدا کے اپنی بیوی کو خوب سمجھاتے رہیے گا آپ کا ذمہ ہے۔

خوجی نے بے ڈھب بے ڈھب سوال ابھی سے شروع کر دیئے۔

خوجی۔ ہمیں کوئی نہانے کو کہے گا تو ہم قرولی ہی بھونک دیں گے۔

میرزا صاحب۔ تو جب کوئی کہے نہ۔

خوجی۔ ہاں بس اتنا یاد رکھیے گا ذری۔

میرزا۔ کچھ زبردستی تو ہے نہیں۔ چاہے نہائے چاہے نہ نہائے کچھ کسی کا اجارہ ہے۔

خوجی۔ دیکھیے ہم پھر جتائے دیتے ہیں کہ ہم گنا چوس چوس کر سمندر کے باپ میں پھینکیں گے۔ اور کوئی بولے گا تو ہم دبوچ بیٹھیں گے۔ ہاں ایسے ویسے نہیں یہاں۔

آزاد۔ اجی اب زیادہ فکر نہ کیجیے میں نے سب بندوبست کر لیا ہے۔

خوجی۔ آپ کے انتظام کو بس دور ہی سے سلام ہے۔

میرزا۔ اجی نہیں گھبراتے کیوں ہو۔

خوجی۔ خدا کرے افیم روز کی روز ملتی جائے۔

آزاد۔ افیم منوں ٹنوں لیجیے۔ یہ کیا بات ہے۔

خوجی۔ اور قرولی۔

آزاد۔ واہی ہو خاصے۔

خوجی۔ واہ کیا شرافت ہے آپ کی گالیاں ہی دینے لگے واہ قبلہ۔

میرزا۔ اجی اب خدا کا نام لو۔ اول جلول باتیں نہ کرو۔

اسکندریہ کی بزم آرائیاں

میاں آزاد کا نام دور دور تک مشہور ہو گیا تھا اور اکثر لوگ ان کی ملاقات کے شائق تھے مالٹا کے اخبار میں تو ان کی تعریف درج ہو چکی تھی۔ اسکندریہ کے اخبار بھی ان کی توصیف سے مالا مال تھے۔ جس اخبار کو کھولو جس میگزین کو پڑھو

آزادی: آزاد کا ذکر خیر ہے۔ اسکندریہ کے ایک ہوٹل میں میاں آزاد مع خوجی کے فروکش ہوئے کھانے کا وقت آیا تو خوجی رنگ لائے۔

خوجی۔ لاحول ولاقوۃ۔ یہاں کھانے والے کی اپنے حساب ایسی تیسی ہم کوئی بات خلافِ شرع نہ کریں گے۔ چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ ذرا سی تکلیف کے لیے ہم اپنا مذہب نہ دیں گے۔ آپ شوق سے جائیں اور مزے مزے کھائیں ہم در گذرے۔

آزاد۔ اور افیم کھانا خلاف شرع نہیں ہے۔

خوجی۔ ہرگز نہیں۔ اور اگر ہے بھی تو کیا فرض ہے کہ ایک امر خلاف شرع کریں تو کل امور شرع کے خلاف ہی کریں۔

آزاد۔ ابے تو نامعقول یہ کس گدھے نے تجھ سے کہا کہ یہاں کھانا کھانا شرع کے خلاف ہے۔ میز، کرسی دیکھی اور بک اٹھے کہ شرع کے خلاف ہے۔ اس میں کیا ہے۔ صاف ستھرا مقام۔ مسلمان پکانے والے۔ مگر خبط کا کیا علاج ہے۔

خوجی۔ وہ خبط ہی سہی۔ آپ رہنے دیجیے ہونہہ۔!!!

آزاد۔ ہونہہ! ہونہہ کیا معنی۔ کھانا کھاؤ۔ نہیں تو جہنم میں جاؤ۔

خوجی۔ جہنم میں وہ جائیں گے جو یہاں کھائیں گے اور ایں جناب سیدھے بہشت میں دندنائیں گے۔

آزاد۔ جی اس میں کیا شک ہے اور وہاں افیم کہاں سے آئے گی۔؟

خوجی۔ ہم کسی نان بائی کی دکان پر کباب اور روٹی یا باقرخانی اور گوشت یا پلاؤ مول لے کے کھائیں گے مسلمانوں ہی کا تو ملک ہے۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دو ترکی آئے اور اپنی کرسیوں پر بیٹھ کر مزے سے کھانے لگے آزاد کی چڑھ بنی۔ پوچھا کہیے خواجہ بدیع صاحب مزاج مقطع بول گیدی! اب شرمایا یا نہیں۔ شرم چہ کتی ست کہ پیش مرداں آید۔ کیا اب بھی وہی خم دم ہیں۔ جھینپو جھینپو۔ مجھ سے نہ کہو۔ دل میں ذرا شرماؤ۔ بیٹھے سے منہ۔

خوجی نے پہلے تو کہا کہ یہ مسلمان نہیں ہیں پھر کہا شاید ہوں کوئی ایسے دیسے۔ آزاد نے کہا ایسے ویسے نہیں۔ خاص الخاص ترک اور روم میں سب میز، کرسی پر نصارا کے ساتھ کھاتے ہیں۔ خوجی کو اب تک اس بات کا یقین نہ آیا۔ غور سے دیکھا کیے۔ کہا

شراب ان لوگوں نے نہیں مانگی اگر مسلمان ہیں، تو مذہب کے خلاف کرتے ہیں ذرا
ان سے بال وپر تو ملاؤں۔

خوجی (ترکوں کے پاس جاکر) کیوں حضرت آپ کا نام کیا ہے۔

ایک ترکی - احمد آفندی۔

خوجی - اور آپ کا اسم شریف۔

دوسرا ترکی - عبدالصمد۔

خوجی - دولت خانہ - بیت شریف۔

ایک ترکی - خاص استنبول۔

خوجی - اور آپ؟

دوسرا ترکی - میں اڈریا نوبل کا باشندہ ہوں مگر دس بارہ برس سے سفر میں ہوں ہندوستان میں دو برس رہا کلکتہ گیا۔ بمبئی لاہور- دہلی اور چین میں رہا اور عدن میں رہا- فرانس گیا انگلستان میں چھ مہینے رہا۔

خوجی - آپ لوگ یہاں ہوٹل میں کھانا کھاتے ہیں۔

احمد آفندی - برابر۔

خوجی - شرع کے خلاف نہیں ہے۔

عبدالصمد - شرع کے خلاف؟ واہ شرع کے خلاف کیوں۔

احمد آفندی - آپ کا اسم شریف۔

آزاد - میاں آزاد۔

احمد آفندی اور عبدالصمد دونوں اٹھ کھڑے ہوئے مصافحہ کیا اور کہا- آخاہ میاں آزاد تمھیں ہو۔

آزاد - آپ کہاں سے جانتے ہیں مجھے۔

عبدالصمد - آپ شہرۂ آفاق ہیں۔

خوجی (آہستہ سے) شیطان کے بڑے بھائی یہی تو ہیں۔

احمد آفندی - آپ کا بڑا نام ہے۔

عبدالصمد - بڑی خوشی ہوئی اس وقت کہ آپ سے ملاقات ہوئی آپ بڑے جواں مرد ہیں۔

آزاد - آخر آپ سے کہا کس نے۔

احمد آفندی - اخبار سے۔

آزاد - ہم کون ہیں۔

احمد آفندی - آزاد - جو ایک عروس سرمایۂ ناز کے عاشق زار ہیں اور اس ہتھ تو رما کے سبب سے ٹرکی جاتے ہیں - ہم سے سنیے۔

خوجی - (متحیر ہو کر) آپ سے کس نے کہا۔

احمد آفندی - اخبار۔

عبد الصمد - آپ چل کر ہمارے ملک کے کانسل سے تو ملیے۔ وہ بھی آپ کے نام نامی سے واقف ہو گئے ہیں - ضرور چلیے۔

آزاد - حاضر ہوں - مگر رسائی وہاں تک محال ہے۔

عبد الصمد - آپ کے لیے اور رسائی کی ضرورت - آپ کا نام نیک ایسا مشہور ہے کہ جہاں چاہیے چلے جائیے بے جھجک ہم آپ کو لے جائیں گے۔

تھوڑی دیر کے بعد آزاد نے کپڑے بدلے اور ان دونوں رؤسائے ٹرکی کے ہم رکاب کانسل سلطنت روم کی خدمت میں مستفید ہونے چلے - آزاد نے اثنائے راہ میں کہا کہ گو میں نے ہندوستان میں ہر قسم کی تعلیم پائی ہے اور ان امور کو خوب سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن پھر بھی اگر کوئی خاص طرز ملاقات ہو تو اطلاع دیجیے۔

احمد آفندی نے بیان کیا کہ کونسل ممدوح بڑے سادہ مزاج آدمی ہیں آپ چاہے سلام بھی نہ کریں۔ ان کو اس کی کچھ پرواہ نہیں۔ وہ خود ایک دن آپ کا تذکرہ کرتے تھے۔

میاں آزاد جو وہاں پہنچے اور احمد آفندی نے جاتے ہی کہا (میاں آزاد آپ ہی کا اس) تو کانسل ممدوح نے بڑے تپاک سے مصافحہ کیا اور پوچھا کہ آپ عربی بول سکتے ہیں۔ میاں آزاد نے عربی میں جواب دیا۔

کانسل - آپ کی ملاقات سے ہم بہت خوش ہوئے۔

آزاد - عنایت بندہ پروری۔

کانسل - جزیرہ پیرم کے پاس آپ کا جہاز غرق ہو گیا تھا۔

آزاد - جی ہاں۔

کانسل - آج ہم نے تار میں پڑھا۔

آزاد - بڑی تباہی آئی۔
کانسل - آپ کی بڑی تعریف ہے اب آپ کب جائیں گے۔
آزاد - بہت جلد۔
احمد آفندی - حسنِ اتفاق سے ہوٹل میں ملاقات ہوئی۔
آزاد - اب جنگ کا کیا حال ہے۔
کانسل - اب روس نے اشتہار جنگ دے دیا ہے! دریائے پرتھ سے روسی لشکر عبور کرتا ہے اور ہماری باٹری اکثر مقامات پر ان پر آگ برساتی ہے خصوصاً اڈیسہ کے پاس۔

بہت عرصے تک کانسل اور آزاد اور احمد آفندی اور عبدالصمد میں ٹرکی کی نسبت گفتگو رہی۔ اس کے بعد میاں آزاد سے کانسل نے کہا کہ آپ میرے ساتھ ہوں۔ آزاد نے بہ خوشی منظور کر لیا۔

احمد آفندی اور عبدالصمد شام کے وقت میاں آزاد کو اسکندریہ کی سیر کے لیے لے گئے۔ اس شہر میں میاں آزاد نے یورپ اور ایشیا کے مختلف اقوام کے لوگ دیکھے۔ ٹرکی کے افسرانِ اعلیٰ اور قسطنطنیہ کے عمائد اور روؤسا جو وہاں تشریف رکھتے تھے ان کی خدمات ہمایوں میں بھی میاں آزاد نے نیاز حاصل کیا۔ اور جو شخص ان سے ملا تپاک ہی کے ساتھ پیش آیا۔

حضرت خواجہ بدیع صاحب کو میاں آزاد ہوٹل ہی میں چھوڑ گئے۔ خوجی سوچ کر بیٹھے بیٹھے مکھیاں کب تک مارا کریں گے آؤ دیکھیں کوئی ہندوستانی بھائی ہوں تو گپیں اڑیں۔ اِدھر اُدھر ٹہلے آخر کار ایک ہندوستانی سے ملاقات ہوئی علیک سلیک کے بعد چہ مے گوئیاں ہونے لگیں۔ خواجہ صاحب نے پوچھا کیوں بھئی اسکندریہ میں افیم ملتی ہے۔ کوئی چانڈو خانہ ہے کہیں مدک اڑتی ہے۔ چرس کی لو آسمان کی خبر لاتی ہے یا نہیں۔ ایک دم سے تین چار سوال کیے اور اس بے چارے کو دم بھی نہ لینے دیا وہ ان کے بھی استاد نکلے۔ کسی بات کا جواب ہی نہ دیا۔ خوجی تیکھے آدمی۔ ان کو بھلا یہ تاب کہاں کہ کسی سے سوال کریں اور وہ جواب نہ دے۔ بگڑ کھڑے ہوئے قسم خدا پاک کی بس اس وقت لاش پھڑک رہی ہوتی واللہ لاش پھڑکتی ہوتی۔ ہونہہ۔ خواجہ

بدیع کو کیا وہ سمجھے ہیں۔۔ نہ ہوئی قدرلی ورنہ تماشا دکھا دیتا۔ انھوں نے جو اس قدر وحشت کی لی تو وہ بے چارہ سمجھا کہ یہ پاگل ہے اگر بولوں گا تو خدا جانے کاٹ کھائے۔ چکت دے چوٹ کرے یا لڑ پڑے اس سے بہتر یہی ہے کہ چپکے ہو رہو۔ اس کے سکوت سے میاں خوجی سمجھے کہ دب نکلا اور بھی اکڑ گئے اُس نے جو اس زپولے کو اکڑتے دیکھا تو سمجھا کہ اب چوٹ کیا ہی چاہتا ہے ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ پیچھے ہٹنا تھا کہ میاں خوجی اور بھی شیر ہو گئے۔ مگر کندھے تول تول کے رہ جاتے تھے۔ پوچھا بھلا ٹھنڈا پانی بھی یہاں مل سکتا ہے مگر اس قدر سرد ہو کہ دانتوں میں لگے وہ جھٹ پٹ آبِ سرد لا یا لے آیا۔ خوجی نے پیا تو آبِ حیات کا مزہ پایا۔ پانی ہے یا آبِ زندگانی ہے۔ مانگ کیا مانگتا ہے؟

اللہ اللہ۔ اب میاں خوجی اپنے وقت کے بادشاہ ہو گئے مانگ کیا مانگتا ہے۔ اف ری تری سخاوت اس آدمی کو اور بھی یقین ہو گیا اس شخص کو خلل دماغ ضرور ہے حالت تو اس درجہ ردی ہے اور حاتم کی قبر پر لات مارنے کو مستعد ہیں۔ اس سے مانگوں تو کیا مانگوں۔ اس کے پلے ٹکا تو ہے نہیں خوجی نے پھر اکڑ کر کہا کہ مانگ کچھ۔ جو جی چاہے سو مانگ۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا یہ جو ہاتھ میں ہے دے دیجیے۔ خوجی کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ ارے غضب۔ او ظالم! خدا تجھ سے سمجھے جان تک مانگتا تو ہیں دریغ نہ کرتا۔ چنیا بیگم نہیں دی جاتی۔ اس کو اگر اتنا معلوم ہوتا کہ حضرت خواجہ صاحب کے دستِ مبارک میں افیم ہے اور افیم پر حضرت ہزار جان سے عاشق ہیں تو کچھ اور مانگ لیتا۔ مگر شامتِ اعمال پھر خوجی تنتے ہوئے بولے ؎

جو چاہے سو مانگ آتش درگاہِ الٰہی سے
محروم کبھی پھرتے دیکھا نہیں سایل کو

اس شخص سے پوچھا کہ تم یہاں کب سے ہو کیا کام کرتے ہو۔ نام کیا ہے۔ باشندے کس صوبے کے ہو اس نے جواب دیا حضرت میں یہاں ہوٹل میں نوکر ہوں میرا نام نہور خاں، امروہے کا رہنے والا ہوں۔

خوجی۔ اخاہ۔ یہ امروہہ بھی امروہہ نہ۔

نہور خاں۔ یہ کون۔

خوجی۔ (جھلا کر) اجی وہی۔ لاحول۔ مراد آباد کے پاس جو ہے۔

تہور خاں - جی ہاں -

خوجی - یہاں کب سے ہو؟

تہور خاں - ابی سینیا کی لڑائی کے وقت سے -

خوجی - بھلا اس ہوٹل میں مسلمان لوگ کھاتے ہیں -

تہور خاں - برابر کیوں -

خوجی - ہم تو نہ کھائیں -

تہور خاں - پہلے میں سمجھا تھا کہ آپ کوئی پاگل ہیں مگر اب تشفی ہو گئی۔

خوجی نے وہ وہ مجنونانہ حرکتیں کیں کہ ہوٹل والوں کو دل لگی ہاتھ آئی۔ بگڑے دل تو ہر شہر اور ہر ملک میں ہوتے ہیں۔ دو ایک دل لگی بازوں نے مسکوٹ کی کہ خوجی کو چھیڑنا چاہیے۔ اس ہوٹل میں ایک شخص اس کام پر مقرر تھا کہ پنکھا قلیوں کی نگرانی کرے یہ شخص بونا تھا۔ خاص قاہرہ کا رہنے والا لوگ سوچے کہ اس بونے اور خوجی سے پکڑ ہو تو خوب بات ہے بونا بڑا شریر آدمی تھا پرلے سرے کا ٹھیلا لوگوں نے اس سے جا کر کہا کہ چلو تمہاری کشتی بدی گئی ہے۔

بونا - چلو چلو -

لوگ - وہ دیکھو ایک آدمی ہندوستان سے آیا ہے -

بونا - جوڑ تو اچھی ہے -

لوگ - پھر جٹ جاؤ -

یہ سن کر میاں خوجی کے قریب گیا اور جھک کر سلام کیا۔ خوجی نے جو دیکھا کہ ایک شخص ہم سے بھی اونچے ہیں تو اکڑ کر اور اینڈ کر آنکھوں سے سلام کا جواب دیا۔ بونا اپنے دل میں سوچا کہ ٹھر جا جاتا کہاں ہے تو بھی جو بچا بنا کر چھوڑوں ادھر ادھر دیکھ کر ایک دفعہ ہی موقع جو پایا تو میاں خوجی کی ٹوپی اتار کر چٹاخ سے ایک دھول جمائی اور ٹوپی پھینک کر بھاگا مگر ذرا ذرا سے پاؤں بھاگ کے جاتا کہاں - خوجی بھی جھپٹے آگے آگے وہ بونا پیچھے پیچھے میاں خوجی - او گیدی. او مردک نہ ہوئی قرولی، واللہ اس دم بھونک ہی دیتا پخ سے قرولی بھونک دیتا - تھوڑی دیر میں بونے نے کہا کہ اب سانس نہیں لی جاتی - اور خوجی نے لپک کر ہاتھ پکڑا -

خوجی ۔ کیوں بے۔

بونا۔ (منہ چڑھانے لگا)

خوجی ۔ اب بولو۔

بونا۔ (پھر منہ چڑھایا)

اتنے میں خوجی کو غصہ آیا تو حضرت نے بھی ایک دھپ جڑ ہی تڑ سے بڑی اور چٹاخ کی آواز گونجنے لگی۔

خوجی۔ اور لے گا۔

بونا۔ (اپنی زبان میں) چھوڑ۔ نہیں مار ہی ڈالوں گا۔

خوجی۔ ہات تیرے کی ۔

بونا۔ آج رات کو گلا گھونٹوں گا۔

خوجی ۔ (دھپ جما کر) اوگیدی۔

بونا۔ دو ہو گئیں۔

خوجی ۔ دے ماروں اٹھا کر۔

بونا۔ رات ہے اور تم اور میں۔

خوجی ۔ (گھونسا لگا کر) ہات تیرے کی۔

خوجی نے جھلا کر بونے کو اٹھا کر دے مارا۔ چاروں شانے چت۔

خوجی ۔ (اکڑ کر) وہ مارا۔

اور لے گا۔ خوجی سے یہ باتیں۔

میاں آزاد احمد آفندی کے ساتھ ہوٹل میں آئے اسباب لیا اور خوجی سے کہا آج شب کو یہاں ٹھہرو۔ میں کانسل کے یہاں مدعو ہوں جب جہاز پر سوار ہوں گا تم کو بلوا لوں گا۔ خوجی اس وقت زمین پر قدم نہیں رکھتے تھے عمر بھر میں انھوں نے آج پہلے ہی مرتبہ ایک آدمی کو نیچا دکھایا تھا۔

خوجی ۔ اس وقت ایک کشتی اور نکالی۔

راوی ۔ (اور) کے لفظ نے پھڑکا دیا گویا کئی کشتیاں اور بھی نکالی تھیں۔

آزاد ۔ کشتی! کیسی ۔ ؟

خوجی - کشتی کیسی کیا معنی۔ کیسی ہوتی ہے کشتی؟
آزاد - معلوم ہوتا ہے پٹے ہو۔
خوجی - اس پٹنے والے کی ایسی تیسی اور کہنے والے کو کیا کہوں۔
آزاد - کشتی نکالی۔
خوجی - ارے میاں بولتے نہیں۔
تہور خاں - ہاں حضور یہ سچ کہتے ہیں۔
خوجی - لو۔
آزاد - (تہور خاں سے) کیا ہوا کیا۔
تہور خاں - جی یہاں ایک بونا ہے اس نے ایک دھول لگائی۔
آزاد - دیکھا نہ میں تو سمجھا ہی تھا کہ پٹے ہوں گے۔
خوجی - سن تو لو۔
تہور خاں - بس دھول کھا کر یہ لپکے - اس کو گئی چپتیں لگائیں اور اٹھا کر دے پٹخا۔
خوجی - وہ پٹخنی بتائی ہے کہ یاد ہی تو کرتا ہوگا - دو مہینے تک کھٹیا سے نہ اٹھ سکے گا۔
تہور خاں - بجا ہے وہ دیکھیے سامنے اکڑ رہا ہے۔
آزاد - ہی ہے وہ تو اس وقت بھی اکڑ رہا ہے تم تو کہتے تھے کہ دو مہینے تک اٹھ ہی نہ سکے گا۔
خوجی - ہوا تو چلنے دو۔

الغرض میاں آزاد اسباب لے کر احمد آفندی کے ساتھ کانسل کے ہاں گئے شب کو میاں خوجی ہوٹل میں سوئے کوئی نو بجے رات کو اٹھے تو دیکھا کہ لیمپ گل ہو گیا انھوں نے پکارا کوئی ہے پانی پلاؤ - ایک آدمی نے دروازہ کھولا پانی دیا گلاس رکھ کے خوجی نے پہلا لیٹ رہے ' سننے میں اس کمرے میں چٹاخ کی آواز گونجی - ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ آواز کیسی تھی یہ میاں خوجی کی کھوپڑی پر دھول لگی تھی - آگ بھبھوکا ہو کہ خوجی اٹھے تو دیکھا کہ ایک پستہ قد آدمی بھاگا جاتا ہے۔
خوجی - ارے لاحول - یہ تو وہی بونا مردک معلوم ہوتا ہے پانی اسی نے پلایا تھا اور چپت بھی اسی نے جڑدی - او گیدی کیا نڑ کا نہ ہوگا ذبح کر کے رکھ دوں تو سہی -

یہ کہ کر خوجی کمرے میں آئے تھوڑی دیر میں ایک شخص آئے جس کے ہاتھ میں ایک قیمتی لالٹین تھی - خوجی کے کمرے کا دروازہ کھولا - ایسا روشنی نہ رد دار ابھی تو ہی

بجے ہیں۔ ایک آدمی بد حرماند کیا خوجی اٹھ بیٹھے۔

خوجی۔ او گیدی پھر آیا۔

اس شخص نے تہور خاں اور دو تین اور راہیوں سے پوچھا کہ یہ کون ہے۔ لوگوں نے بیان کیا صاحب کوئی پاگل سا معلوم ہوتا ہے خوجی نے اشارے سے بتایا کہ وہ بونا ہم کو دق کرتا ہے تہور خاں نے اس شخص کو حکم دیا کہ جو یہ کہیں اس کا ترجمہ کر کے ہم کو بتاؤ۔ یہ شخص ہوٹل کا مینیجر تھا غل کی آواز جو سنی تو آیا کہ دیکھوں ماجرا کیا ہے۔ بونا بلوایا گیا آتے ہی مینیجر نے اپنے ہاتھ سے تھپڑ لگایا۔ اب سنیے کہ ادھر تو مینیجر صاحب کمرے سے باہر گئے اور ادھر خواجہ بدیع صاحب کو دست آنے شروع ہوئے وجہ یہ کہ پانی میں بونے نے حمال گوٹا ملا دیا تھا اثر دکھایا ہی چاہے ہوٹل کے نوکروں نے مینیجر کو جگایا۔

مینیجر۔ کیا ہے۔

نوکر۔ ایک آدمی ماندا ہو گیا ہے۔

مینیجر۔ کیا ہیضہ ہوا۔

نوکر۔ جی نہیں۔ دست آتے ہیں۔ اب تک کوئی گیارہ دفعہ گیا ہوگا۔

مینیجر۔ وقت کیا ہے۔

نوکر۔ دو بجے

مینیجر۔ تم لوگ موقوف کر دینے کے قابل ہو۔ اب تک کیوں نہ اطلاع دی

نوکر۔ ابھی دن جگایا۔

مینیجر۔ چپ شور! ڈے سے کہو ڈاکٹر صاحب کے نام خط لکھے۔

ڈے کلرک کا نام تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے نام خط بھیجا ایک گھنٹے کے عرصے میں تشریف لائے

ڈاکٹر۔ اس کو کسی نے حمال گوٹا دیا ہے۔ برا حال ہے۔ دست بہت آئے۔

مینیجر۔ یہ شارب (ابھر آب)

ڈاکٹر نے نسخہ لکھا اور حکم دیا کہ ابھی دوا لاؤ اور پلا دو۔

ٹرکی کے کانسل کے یہاں میاں آزاد فرخ نہاد ایک صاف شفاف اور رفیع و

دسیع کمرے میں آرام کر رہے تھے کہ دفعتہً ایک گھنٹی زور سے بجی کہ میاں آزاد کی آنکھ کھل گئی۔ اور انھوں نے سنا کہ ایک شخص ان کو کمرے کے باہر بلاتا ہے۔ پوچھا کون۔ کہا حضور کا خادم۔ ہوٹل سے ایک آدمی آیا ہے اور آپ کو بلاتا ہے۔

میاں آزاد نے کہا لاحول ولاقوۃ۔ مدت کے بعد آرام کے ساتھ سونا نصیب ہوا تھا۔ اس خوجی مردک کے سبب سونے نہ پائے۔ بلاؤ صاحب بلاؤ وہاں پھر جھگڑے ہوں گے کسی سے عجب پاگل ہے نالائق خدا سمجھے اس سے بھلا اس وقت آدھی رات ڈھل گئی پوچھیے یہاں کیا کام تھا میاں آزاد اٹھ کر باہر گئے تو دیکھا کہ دو آدمی کھڑے ہیں ایک کانسل کا نوکر جس کو انھوں نے میاں آزاد کی خدمت کے لیے مقرر کیا تھا اور دوسرا کوئی اجنبی تھا جس کو میاں آزاد نے پیشتر کبھی نہیں دیکھا تھا۔

آزاد۔ (اپنے دل میں) ہیں سمجھے تھے کہ میاں خوجی ہوں گے۔

اجنبی۔ ہوٹل سے آیا ہوں۔ مینیجر نے بھیجا ہے اور یہ چٹھی دی ہے۔

آزاد نے خط لیا پڑھا تو رنگ فق ہو گیا۔

مسٹر آزاد۔ جس شخص کو آپ چھوڑ گئے تھے وہ گیارہ بجے رات سے علیل ہو گئے ہیں اب تک چودہ دست آچکے۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے ہے کہ اگر دو چار دست اور آئے تو یہ مر جائیں گے۔ آپ آئیے آپ کے دوست کی بھی یہی خواہش ہے ہمارے نزدیک اب یہ بڈھا آدمی دو چار گھنٹے کا مہمان ہے۔

(آپ کا دوست مینیجر ہوٹل الخ)

آزاد۔ (اپنے دل میں) اور سنیے ابھار رنگ لائے چلتے چلتے دغا دے گئے۔ اب نہ بچیں گے جب ڈاکٹر نے جواب دے دیا تو پھر کیا ہو سکتا ہے افسوس۔

نوکر۔ حضور گاڑی بھی لیتا آیا ہوں۔

آزاد۔ ہم کپڑے پہن لیں تو ابھی چلتے ہیں۔

کپڑے پہن کر میاں آزاد گاڑی پر سوار ہوئے گھوڑے ہوا ہوئے اور دن سے ہوٹل میں داخل۔ میاں آزاد نے دیکھا کہ کمرے میں خوجی لیٹے ہیں اور مینیجر اور ڈاکٹر سر بالیں کرسیوں پر بیٹھے ہیں آزاد کو دیکھ کر خوجی نے سلام کیا۔ اور کہا الوداع۔

خدا کرے تم ٹرکی سے سرخ رو آؤ اور حسن آرا بیگم کو عقدِ نکاح میں لاؤ
اس کے بعد یہ پڑھنا شروع کیا۔

ہیچ دانی کہ ماکیسیم وشما | سایۂ نور آفتاب خدا
سایۂ آفتاب سایۂ اوست | تابشِ نور ہست عین ضیا
نیست خورشید از شعاع بعید | نیست سایہ ز آفتاب جدا

یہ پڑھ کر تین بار کلمہ پڑھا۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

آزاد۔ (ڈاکٹر سے انگریزی میں) بچنے کی امید ہے یا نہیں۔

ڈاکٹر۔ بہت کم۔

آزاد۔ عارضہ کیا ہے ہیضہ ہے یہ ہوا کیا دفعۃً۔

ڈاکٹر۔ جمال گوٹا۔

مینیجر۔ جی نہیں دست آگئے کسی وجہ سے۔ مگر بچنا محال ہے۔

آزاد۔ افسوس صد افسوس۔ کہاں پر ساتھ چھوٹا۔

خوجی نے آزاد سے بہ منت وسماجت کہا کہ اس وقت سورۂ یٰسین کسی سے پڑھوائیے آزاد نے مینیجر سے کہا کسی حافظ کو بلوائیے۔ چنانچہ ایک شخص یمن کے باشندے ملا فرقان بلوائے گئے خوجی کے قریب بیٹھ کر انھوں نے سورۂ یٰسین قراءت کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔

آزاد۔ لاکھوں عیب اس شخص میں ہیں مگر اپنے مذہب کا پکا۔ شرع کا پابند۔ روزہ دار۔ شب زندہ دار۔ مگر افسوس۔

خوجی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

پہنچی نہ راحت ہم سے کسی کو ایسے اذیت کوش ہوئے
جان پڑی تب بارِ شکم تھے مر کے وبالِ دوش ہوئے

آزاد۔ اجی تم دو دن میں اچھے ہو جاؤ گے سمجھے۔

خوجی۔ اجی واہ میں مروں یا جہنم میں جاؤں مگر بھائی واسطے خدا کے ذرا جان کا خیال رکھنا۔ ایسا نہ ہو کوئی جلتا ہو تم آگ میں پھاند پڑو۔ خدا تمھارا حافظ و ناصر

ہے ہم تو اب چلتے ہیں خطا معاف اب تک ہنسی خوشی تمھارا ساتھ دیا اب مجبوری ہے۔

صبح کے وقت میاں آزاد خوجی کو کانسل کے ہاں لے گئے اور کہا کہ یہ شخص میرا رفیق قدیم ہے جب میں ہندوستان سے چلا تو اس نے میرا ساتھ دیا اب یہاں آ کر سخت علیل ہو گیا ڈاکٹر کی رائے ہے کہ چار روز میں اگر بچ گیا تو خیر ورنہ اس کے مر جانے میں کوئی شک نہیں۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو اور آپ بہ دل اجازت دیں تو اس کو یہاں چھوڑ جاؤں۔ اگر صحت پائے تو آپ از راہِ نوازش اس کو جہاز پر ہندوستان واپس بھیجیے گا۔ کمال ممنون ہوں گا۔ کانسل نے کہا یہ بات ہی کون ہے جو آپ اس قدر منت وسماجت کرتے ہیں آپ ان کو یہاں چھوڑ جائیے دو آدمی ان کی خدمت کے لیے تعینات رہیں گے ڈاکٹروں کی قلت نہیں ہر طرح آرام کے ساتھ بقیہ عمر بسر کریں گے۔ آپ مطمئن رہیے اب آپ کے لیے بہتر ہے کہ جلد جائیے اور ضرور جائیے دریائے پرتھ سے لشکر روس یہاں عبور کرنے کو ہے بڑی سخت جنگ ہو گی خدا خیر کرے دیکھیے کیا انجام ہوتا ہے۔

آزاد نے خوجی کو سمجھایا کہ اب مجبور ہو ہم کو تمھارا ساتھ چھوڑنا پڑتا ہے، کل صبح کو جہاز روانہ ہو گا تم یہاں رہو اور چین کرو۔ دو آدمی تمھاری خدمت کے لیے مقرر ہوں گے ڈاکٹر صبح وشام آکر دیکھیں گے تمھارا نقصان ہی کیا ہے۔

خوجی نے کہا بہ درجہ مجبوری رہنا پڑتا ہے ورنہ میرا تو یہی دل چاہتا ہے۔ بقول۔

حب الوطن از ملکِ سلیماں خوشتر — خارِ وطن از سنبل وریحاں خوشتر
یوسف کہ بہ مصر بادشاہی می کرد — می گفت گدا بودن کنعاں خوشتر

اگر نہ رہوں تو کیا کروں آج مرا کل دوسرا دن یہ تو بے حیائی کا جینا ہے ایسے جینے پر لعنت یہاں چاہے دس خدمت گار ہوں چاہے بیس بے کار محض۔

مگر آب و دانہ کی بات ہے ہم کو یہاں کی مٹی گھسیٹ لائی۔

آزاد۔ ابھی نہیں۔

خوجی۔ نہیں کیا معنی۔

آزاد۔ آج کے چوتھے روز دندناؤ گے دیکھ لینا ڈنڈ پیلتے ہو گے۔

خوجی۔ خدا کے اختیار ہے۔

آزاد ۔ تمہارا مکان کہاں ہے خواجہ صاحب ۔
خوجی ۔ میں اصل باشندہ گجرات کا ہوں مگر کان پور آگرہ اس طرف رہنے کا زیادہ اتفاق ہوا۔
آزاد ۔ ارے یار دیکھیے کب ملاقات ہوتی ہے ۔
خوجی ۔ ایک بات یاد رکھنا نہ ٹرکی میں سب سے مل جل کے رہنا شکر رنجی نہ ہونے پائے واسطے خدا کے باتفاق رہنا ۔ جوتی پیزار لڑائی جھگڑے سے مطلب بر آری معلوم ۔ اور کبھی خواجہ بدیع کو بھی یاد کرنا ۔ ہائے افسوس ۔ یار جدائی ایسی شاق گزرتی ہے کہ بس کیا بتاؤں ۔
آزاد ۔ جب بیماری سے صحت پاؤ گے تو ہندوستان چلے جانا ۔
خوجی ۔ ہونھ ۔ ارے میاں دم کا یہاں بھروسا نہیں ہے ۔

خوجی سے رخصت ہو کر میاں آزاد روانہ ہونے کو تھے ۔ خوجی نے آبدیدہ ہو کر کہا کہ اب میں بعد صحت کیا کروں گا ۔ کانسل نے تشفی دی اور کہا آپ نہ گھبرائیں ہم آپ کے لیے ہر قسم کا بندوبست کر لیں گے ۔ آپ مسٹر آزاد سے کچھ نہ کہیے اگر آپ اچھے ہو گئے تو آپ کے وطن آرام کے ساتھ آپ کو بھیج دیں گے ۔ خوجی کو ان کلمات سے بڑی خوشی حاصل ہوئی آزاد سے ہاتھ ملایا اور روتے روتے کہا کہ اب وقت رخصت دو باتیں سن لیجیے ۔ ایک یہ کہ وہاں سب سے مل جل کر رہنا ۔ دوسرے یہ کہ بے وجہ جان کو معرض خطر میں نہ ڈالنا ۔

میاں خواجہ بدیع صاحب

میاں خواجہ بدیع صاحب اسکندریہ میں چین سے رہے ٹرکی کے کانسل متعینہ مصر نے ان کی بڑی خاطر کی ۔ خوجی تیسرے چوتھے سلام کر لیتے تھے بندرہ روز میں خوجی خاصے ماشے بھلے چنگے ہو گئے ۔ اسکندریہ کی حضرت نے خوب سیر کی جب کئی روز تک اچھے رہے ۔ بیماری نے بالکل مفارقت کی تو ایک دن کانسل کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ اب فدوی حضرت کے اقبال سے صحیح ہو گیا ۔ عوارض نے پیچھا چھوڑا ۔ امیدوار ہے کہ اجازت دی جائے دریافت کیا گیا کہ سائل کس امر کی اجازت چاہتا ہے کہا صرف یہ چاہتا ہوں کہ آزاد کے پاس بھیج دیا جاؤں ۔ کانسل نے حکم دیا کہ جو جہاز قسطنطنیہ جاتا

ہو اس پر خوجی بھیج دیئے جائیں۔ سفرِ خرچ کے علاوہ زرِ نقد اور کپڑا بھی ان کو دیا جائے
ایک دن خواجہ بدیع صاحب لڑھکتے پڑھکتے چلے جاتے تھے کہ مالٹا کی ایک عورت نے ان کو دیکھا (دو ماشے کا قد) اور دبلے پتلے ہاتھ پاؤں دیکھ کر مسکرائی میاں خوجی اور بھی تن گئے اب اکڑتے ہی جاتے ہیں۔ زمین پر قدم ہی نہیں رکھتے۔ سمجھے کہ عورت ہم پر ریجھ گئی۔ دل ہی دل میں سوچتے جاتے تھے کہ واللہ۔ واہ رے ہم جس ملک میں جاتے ہیں انگلیاں اٹھتی ہیں۔ چھوٹے بڑے سب ہمیں کو دیکھتے ہیں۔ وہ عورت اور غور سے دیکھنے لگی۔ اور حضرت کے اکڑنے پر خوب ہی کھلکھلائی آپ سوچے کہ یہ نخرے کرتی ہے شاید اس ملک کی یہی ریت ہو کہ جوان طناز اور خوب رو کو دیکھا اور ہنسنے لگی۔ اور ماشاء اللہ آپ کے طناز اور وجیہ ہونے میں شک بھی نہ تھا اور کسی کو ہوتا یا نہ ہوتا خواجہ صاحب کو تو ذرا بھی نہ تھا یہ اپنے کو کلے ٹھلے کا گھبرو ہی سمجھتے تھے۔ عورت کو کھلکھلاتے ہوئے پایا تو شوق چرایا کہ اس سے چہل ہو۔ قریب جاکر اور منہ بنا کر غور سے دیکھا عورت کو اور بھی ہنسی آئی۔ اس پر خوجی اکڑ کر بولے (نہ ہوئے میاں آزاد) ورنہ حسن آرا تک کو بھول جائے۔ واہ کیا پری ہے اور مجھ گھبرو کو دیکھ کر کھلی جاتی ہے۔ اشتیاقے کہ بہ دیدارِ تو دارد دلِ من

دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من

یہ شعر بڑے سوز و گداز سے حضرت نے پڑھا مگر خیر سے کتنا حسب حال ہے کھڑے دیکھ رہے ہیں مگر۔ ع۔

اشتیاقے کہ بہ دیدارِ تو دارد دلِ من

کی اچھی ہانک لگائی۔ قریب جاکر عورت سے پوچھا۔

چہ نامے کہ مولائے نام تو ام   درم ناخریدہ غلامِ تو ام

وہ اور بھی ہنسی۔

اتنے میں دس پندرہ رہ رو بھی جمع ہو گئے۔ خوجی کی انوکھی قطع اور قد و قامت اور اکڑنا برزنا اور مسکرانا اور اینڈنا جو دیکھتا تھا ہنس دیتا تھا اور خوجی کو یقین واثق ہو گیا تھا کہ ہمارے حسن و جمال پر نظر ڈال کر یہ لوگ خوش ہو رہے ہیں۔ آپ نے کڑک کر فرمایا۔

می رسد ایں صدا بگوشِ جہاں　　از پسِ پردۂ جہاں ہر دم
غیر او نیست در سرائے وجود　　بحقیقت کسے دگر موجود

کوئی پوچھے ان اشعار کا یہاں کیا موقع تھا بھلا۔ مگر پوچھے تو بلا پوچھے کس سے قرولی کھانا منظور ہو تو خوجی سے بھڑ پڑے۔ خواجہ صاحب ایسے مزے میں آئے کہ حوالی موالی اور حاضرین کو ڈپٹنے لگے ایک سے کہا تو یہاں کیوں کھڑا رہے بے؟ دوسرے کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔ جا یہاں سے برابر۔ تیسرے سے خطاب کر کے بولے اوگیدی جاتا ہے یا نکالوں قرولی۔ چوتھے سے پہلے ہو کر کہا یہاں کیا تماشا ہے دیکھ۔ ارد گرد کے لوگ سمجھے کہ مسخرہ ہے کوئی بعض بعض کو گمان ہوا کہ دیوانہ ہے جوں جوں خوجی صاحب بگڑتے تھے حوالی موالی اور بھی بناتے اور کھلکھلاتے تھے۔ آپ نے عورت کی طرف مخاطب ہو کر اشارے سے کہا۔ چلو ہم تم اس طرف چلیں۔ اس پر اور بھی قہقہہ پڑا۔ اور سب نے چٹکیوں پر اڑایا۔ اتنے میں دو تین عورتیں اور بھی کھڑی ہو گئیں۔ تب تو خوجی مونچھوں پر تاؤ دینے لگے۔ اللہ اللہ ہم بھی اتنے ہوئے اب عورتیں ہم پر ریجھنے لگیں۔ اے تیری قدرت، خوجی اور عورتیں ان پر ریجھیں۔ شانِ خدا۔ خوجی تماشا بن گئے۔ بار بار اکڑنا اور بھی لطف دکھاتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس عورت نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ خوجی مسکرائے مسکرانا تھا کہ اس نے ایک دھول جمائی۔ ہاتھ چھڑانے ہی کو تھے کہ پیچھے سے کسی نے ایک چپت اور جڑی تیسرے نے چپکے سے دھپ جمائی۔ ادھر دیکھتے ہیں تو ادھر سے پڑتی ہے اور ادھر نظر اٹھاتے ہیں تو ادھر سے تڑ تڑ کی آواز آتی ہے۔ سمجھے کہ ہم پر جو عورت عاشق ہوئی تو یہاں کے باشندے جل مرے اور جب عورت نے وفورِ عشق اور بڑے پیار سے ہمارا ہاتھ پکڑ لیا تو یہ لوگ اور بھی جل بھن کے خاک ہو گئے۔

عاشقاں کشتگانِ معشوق اند　　بر نیاید ز کشتگاں آواز

عاشقوں کی تو یہ کیفیت ہوتی ہی ہے اور ابھی کیا ہے۔

آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

میاں خواجہ بدیع صاحب سوچے کہ افیم کھانے کا وقت آن پہنچا اگر گھر جاتے ہیں تو یہ عورت چھوٹتی ہے اور اگر یہاں پینے کی خواہش کریں تو پانی ندارد رہے اشارے سے حضرت نے پانی مانگا کٹوری میں دیا گیا۔ افیم گھول پی اور باواز بلند عورت

کی طرف مخاطب ہو کہا۔

شانہ ٹوٹا تارِ گیسوئے معنبر توڑ کر پھل نہیں پاتا کوئی شاخِ صنوبر توڑ کر

اس موزونیٔ طبع کے صدقے۔ کیا برجستہ پڑھ دیتے ہیں۔ تک ملے یا نہ ملے۔ بوجھوں تو موے گا۔

خواجہ صاحب نے پھر اشارا کیا کہ چلو ہم تم اور طرف چل کھڑے ہوں عورت مسکرا دی۔ اتنے میں کسی نے پیچھے سے چٹکی لی تو خوجی صاحب نے پلٹ کر دیکھا تو وہ بونے ایک وہی ذات شریف جنھوں نے پانی کے ساتھ ہوٹل میں جمال گوٹہ پلا دیا تھا دوسرے ان کے کوئی یارِ وفادار تھے خوجی نے اپنے پرانے دوست کو گھور کر دیکھا اور ڈپٹ گئے کیوں بچہ اپنی شرارت سے باز نہیں آتے۔ ابھی ایک کشتی نکال چکا ہوں اب آج پھر سر کھجایا ہے۔ ہڈیاں چلچلانے لگیں۔ میرے بھی ہاتھ میں کھجلی ہو آئی ہے۔ جھپٹ کر میاں خوجی نے ایک چپت جڑ دی۔ دونوں بونے چمٹ گئے خوجی نے کہا ایک ہاتھ ایک۔ ایک۔ ایک۔ مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔ خوجی جھلا گئے ایک بونے کی گردن دبائی اور زور سے پٹخنی دی۔ چاروں شانے چت۔ وہ مارا وہ مارا کہہ ہی چکے تھے کہ دوسرے بونے نے ٹانگ پکڑ کر کھینچ لیا اور لڑکھڑا کر خوجی گرے مگر بونا بھی ساتھ ہی گرا۔ حوالی موالی خوب ہنسے۔ قہقہے پر قہقہہ پڑا اور خوجی زمین سے اٹھ کر خوب ہی اکڑے۔ ہات تیرے گیدی کی اب ہم تو نہتے لڑتے ہیں اور جو کہیں قرولی ہوتی تو توبہ ہی بھلی۔

خوجی (عورت سے) کیوں سچ کہنا کیسی آنٹی دی ہے۔

عورت۔ (اشارے سے) شاباش بڑے پہلوان ہو۔

خوجی۔ پھر اب بھی ہماری شادی نہ ہو تو ڈوب مرنے کا مقام ہے۔

دونوں بونے ہنسنے لگے۔

خوجی۔ جاؤ۔ جوتے خورے زمانے بھر کے۔ بے حیا۔ نامعقول۔

بونوں نے دور جا کر خوجی پر ڈھیلے پھینکے۔

خوجی۔ لو جانِ من اب تو تمھارے دیوانے پر کلوخ اندازی بھی ہونے لگی۔

لاکھ ہو گردشِ ایام یہ حاضر ہے مدام\
انس رکھتی ہے نہایت شبِ ہجراں ہم سے

راوی ۔ یہ شعر بھی کس درجہ حسب حال ہے بالکل چسپاں ۔

عورت تھوڑی دیر میں چل دی تھی خوجی بادلِ پر درد اٹھے اور جہاں ملکے تھے وہاں جاکر سوچنے لگے کہ یہ عورت بے طور ہم پر ریجھی ہے خدا نے چاہا تو صبح شام ہی نکاح ہو جائے۔ انشاء اللہ۔ پھر میاں آزاد البتہ کہیں کہ ہاں بھئی خوجی کا دے کردہ۔

لوگوں نے جاکر حضرت کانسل سے بھی جڑ دی کہ یہ میاں خوجی کوئی مسخرے ہیں شہر میں جس طرف جاتے ہیں انگلیاں اٹھتی ہیں آدمی کیا تماشا ہے کانسل نے ان کو بلایا۔

خوجی ۔ سات بار سلام کر کے حاضر ہے غلام۔

کانسل ۔ اب کیا چاہتے ہو۔

خوجی ۔ پیرو مرشد۔ ع باز ہوائے چمنم آرزوست۔

کانسل ۔ ہندوستان جانے کا ارادہ ہے؟۔

خوجی ۔ ہاں حضور۔

امیروں کا کھلونا، چھوٹا موٹا بونا

میاں آزاد فرخ نہاد ہر مرنجی بھائی کی کوٹھی میں بآرام تمام بیٹھے ناول پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص نے دفعتہً غل مچا کر کہا داو گیدی۔ ہولی قرولی، آزاد کے کان کھڑے ہوئے۔ ایں یہ کس کی آواز آئی بھئی۔ قرولی اور گیدی میاں آزاد سخت متحیر ہوئے۔ اٹھنے کو تھے کہ دیہر آواز آئی، قسم خدا کی کٹار اکھینچ ماروں گا گیدی!

آزاد ۔ کوئی ہے۔

چپراسی ۔ حکم حاضر ہوں۔

آزاد ۔ یہ باہر کیا غل مچ رہا ہے۔

چپراسی ۔ ایک پستہ قد سا آدمی ہے کہتا ہے کوٹھی کے اندر جانے دو۔

آزاد ۔ آنے دو۔

چپراسی نے اس آدمی سے جاکر کہا اچھا چلیے اندر چلیے تشریف لائیے تو۔ آزاد

نے ہنس کر کہا اخاہ خوجی ہیں آؤ بھئی خوب آئے۔
خوجی۔ شکر ہے کہ تم کو صحیح و تندرست پایا۔
آزاد۔ سخت مصیبت میں مبتلا ہوئے تھے۔

آزاد نے مختصر طور پر سب حال بیان کیا کہ اتنے عرصے تک قید خانے میں رہے چھ چھ دفعہ تحقیقات ہوئی جرم کچھ ثابت نہ ہوا مگر اتفاق وقت اور شامت اعمال قید سے رہائی نہ ہوئی آخر کار وزیر جنگ کی خدمت میں عرضی بھیجی خدا خدا کر کے اب رہائی پائی۔

خوجی نے بہ استقلال یہ ساری داستان سنی اور کہا سچ کہنا اس وقت ہوش ٹھکانے ہیں یا نہیں۔ آزاد نے قسم کھائی تو خوجی کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا۔ پوچھا صاف صاف بتاؤ کس جرم میں ماخوذ ہوئے تھے بتاؤ ٹھیک ٹھیک کل حال مو بہ مو کہنا آزاد نے کہا ایک عورت کے پھیر میں۔

خوجی بہت ہی محظوظ ہوئے اور بھانپ گئے کہ اس نوجوان جمیلہ کو ضرور عقد نکاح میں لائیں گے تھوڑی دیر غور کر کے میاں آزاد سے پوچھا ہاں یہ بتاؤ کہ قید کیوں کر ہوئے۔ یہ تو کوئی جرم نہیں کہ آپ نے شادی کرنا قبول نہ کیا۔ آزاد نے ساری داستان بیان کی تو خوجی نیلے پیلے ہوئے۔

خوجی۔ سنا میاں ہم تمہارا بدلا لیں گے۔ کل امور اور امور کی تہ سمجھ گئے ہیں یہ اس ہوش کا کام نہیں ہے کسی نے ورغلا دیا ہے مطلب یہ کہ کسی کی سکھائی پڑھائی تھی۔ مگر اس مردود سے ہم انشاء اللہ کھرے کھرے بدلا لیں گے اخوہ۔ اتنے دن قید خانے میں بھی رہے۔ افسوس صد افسوس بڑا رنج ہوا اس وقت واللہ کمال افسوس ہوا

آزاد۔ چلئے اب افسوس نہ کیجیے مضی ما مضیٰ۔

خوجی نے کہا کہ ہم خوب بن ٹھن کے بیٹھتے ہیں شام کو ہمیں ان کے پاس لے چلیے دیکھتے ہی عاشق نہ ہو جائے تو سہی۔ مگر استاد شرط یہ ہے کہ قرولی ہمارے پاس ضرور ہو ورنہ بے قرولی کے ہم سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ آزاد نے کہا کیا لڑیئے گا۔ بولے نہیں صاحب لڑنا کیسا۔ بے قرولی کے جو بن نہیں۔ ہم تو اچھی بن کے جانا چاہتے ہیں نہ آپ یہ باتیں کیا جانیں ٥

تمہاری تیغ کا منہ چڑھ کے لے لیا بوسہ
کبھی نہ آپ سے ہم دب کے بانکپن میں رہے

آزاد۔ خوب کیا برجستہ شعر فرمایا ہے اور حسبِ حال۔

خوجی۔ اور نہیں کیا۔ یہاں تو بس یہ جانتے ہیں کہ

الٰہی یہ کس کو لکھا خطِ شوق
کہ دل کی تڑپ نامہ بر ہو گئی

آزاد۔ یہ شعر اور بھی حسبِ حال ہے۔

اتفاق سے میڈا بھی انا البرق کہتی ہوئی تشریف لائیں۔

آزاد۔ لو وہ خوذ آگئیں۔

خوجی۔ ارے غضب ہو گیا۔

آزاد۔ یہ کیوں۔

خوجی۔ اجی بنے ٹھنے ہوتے تو زبجتی۔

حضرت نے وحشت میں آن کر ہوٹل کی ایک میز کا کپڑا اوڑھ لیا اور تولیا سر میں باندھا اور ایک چھری (فورک) ہاتھ میں لے کر اکڑوں بن کے کھڑے ہوئے۔

آزاد نے استادہ ہو کر میڈا سے مصافحہ کیا۔ میڈا کا جوبن دیکھ کر خوجی ہزار جان سے عاشق ہو گئے اور بڑے غور سے گھورا کیے۔ آزاد سے کہنے لگے قسم خدا کی وہ جھمکڑا ہے کہ دید نہ شنید۔

بصورتِ تو بتے کمتر آفرید خدا — تراکشیدہ و دست از قلم کشید خدا
چو کرد وصفِ تو بر صفحۂ وجود رقم — صد آفریں ز زبانِ قلم شنید خدا

میڈا نے جوان پر نظر ڈالی تو عجیب الخلقت آدمی دیکھ کر مسکرا دی۔

خوجی از بس محظوظ ہوئے۔

خوجی۔ کیوں میاں آزاد سچ کہنا۔ اِن جناب کے دیکھتے ہی کھل گئیں نہ۔ واہ رے ہم۔ جو عورت دیکھی ہے گھنٹوں گھورا کرتی ہے جوانی کی امنگ اور حسنِ گلو سوز بھی کیا چیز ہے۔

من نگویم کہ یار کشت مرا — دلِ بے اختیار کشت مرا

میڈا نے آزاد سے پوچھا یہ کون شخص ہے آزاد نے کہا یہ ایک پاگل ہے اس کو یہ خبط ہے کہ جو عورت مجھ کو دیکھ لیتی ہے ریجھ جاتی ہے تم ذرا اس کو بناؤ اس وقت میڈا شوخ تو تھی ہی اتنی شہ پا نے ہی خوجی کو خوب بنایا شارے سے اپنے قریب بلایا۔ حضرت ریشہ خطمی ہو گئے، مسکراتے ہوئے گئے۔ اور قریب جا کر کرسی پر جا ڈٹے۔

میڈا۔ (ہاتھ میں ہاتھ دے کر) آپ کا نام کیا ہے

خوجی (آزاد سے) سمجھاتے جاؤ جی۔

آزاد نے سمجھانا شروع کیا۔ یہ جو کہتی تھی ان کو سمجھاتے تھے اور وہ جو کچھ کہتے تھے ان کو سمجھاتے تھے۔

خوجی۔ (توند پر ہاتھ رکھ کر) منظور۔

میڈا۔ آپ شراب پیتے ہیں۔

خوجی۔ ہاں۔ نہیں مگر اچھا نہیں نہیں۔

آزاد۔ مرد آدمی ایک بات کہو تو میں سمجھاؤں! یہ نہیں اور ہاں اور مگر اور اچھا کیا معنی؟

خوجی۔ کہو افیم پیتا ہوں۔

میڈا۔ یہ آپ کا گلاب سا چہرہ کمھلا جائے گا۔ افیم نہ پینا چاہیے شراب پیو گے؟

میڈا نے خوجی کا ہاتھ چوم لیا۔ اللہ اللہ اب کیا پوچھنا ہے اب تو دماغ عرشِ بریں پر ہے۔ مزاج ہی نہیں ملتا۔ کھلے جاتے ہیں۔ اکڑے اور آزاد کی طرف گھور کر دیکھا اور کہا۔ کیوں استاد۔ سچ کہنا ہم کیسے جوانِ رعنا ہیں اور تس پر ابھی بنے ٹھنے نہیں۔ ورنہ سینکڑوں بار ہاتھ چوم لیتی۔ واہ رے ہم۔

آزاد۔ چین لکھتا ہے۔

خوجی۔ چلو چلو نظر نہ لگاؤ واہ۔

میڈا۔ آپ کا نام کیا ہے نام بتائیے۔

آزاد۔ (اردو میں) ان کا نام خوجی ہے۔

خوجی۔ (بگڑ کر) کس مردود کا نام خوجی ہے۔ حضور مجھے لوگ خواجہ بدیع صاحب کہتے ہیں۔

میڈا۔ اہو ہو کیا پیارا نام ہے۔

خوجی (زمین دوز ہو کر سلام کیا) کیوں کتنی تعریف کی ہے نام کی نہ کہو گے اور جو خوجی

میڈا۔ آپ کچھ تھوڑا تھوڑا گانا بھی جانتے ہیں۔؟

آزاد۔ انکار نہ کرنا۔ کہو ہاں جانتا ہوں ضرور۔

خوجی۔ ہاں اور ناچنا بھی جانتا ہوں ضرور۔

میڈا۔ اوہو او ہو ہو۔ تو پھر ناچو۔

خوجی نے ناچنا شروع کیا۔ میڈا اور آزاد کی یہ کیفیت کہ مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔

میڈا۔ اف بس اب ختم کرو۔

میڈا تھوڑی دیر میں ہوٹل سے گئیں۔ تو میاں خوجی کے دماغ عرشِ بریں پر تھے زمین پر قدم ہی نہیں رکھتے تھے میاں آزاد نے کہا خواجہ صاحب ذرا ادھر تشریف لائیے۔ فرمایا ہشت۔ پھر آزاد نے کہا قبلہ ذرا اس طرف مخاطب ہوجیے۔ آپ نے کہا دہشت۔

آزاد۔ اب ایک کام کیجیے کہ خوب بن ٹھن کے جائیے خوب نکھر کر جس میں وہ بھی کھل جائیں کہ ہاں ایسا جوان دیکھا۔

خوجی۔ ہونھ شانِ خدا۔ آپ اور ہم کو سکھائیں۔

آزاد۔ سنا ہیں پیر شو بیاموز۔

خوجی۔ افسوس کہ تم نے ہمیں ابھی پہچانا ہی نہیں کمال افسوس کا مقام ہے۔

آزاد۔ اجی ہم نے آپ کی ذات تک پہچان لی۔

خوجی۔ کو سو کو سو۔ گالیاں دو جس کا خدا برا کرے۔

آزاد۔ افوہ۔ میں تم کو ایسا نہیں جانتا تھا۔

خوجی اپنے دل میں نہایت ہی خوش تھے جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے اور میاں آزاد دل ہی دل میں سوچتے تھے کہ اچھا الو پھنسا۔ یہ معلوم ہی نہ تھا کہ میڈا اسے بنا رہی ہے۔

تھوڑی دیر بعد میڈا کا خط آیا۔ آدمی نے آن کر خوجی کو دیا اور کہا آپ کے نام ہے آزاد بولے جناب خواجہ صاحب ہم کو تو ذرا خط دکھائیے۔

خوجی۔ بس بس چلیے الگ ہٹیے۔

آزاد۔ لاؤ ہم پڑھ دیں تم سے بھلا کیا پڑھا جائے گا۔

خوجی۔ (حامل خط سے) تم باہر ٹھہرو۔
حامل خط بہت اچھا۔
خوجی۔ (آزاد سے) عجب آدمی ہیں آپ۔ میں نے تو ایسا آدمی ہی نہیں دیکھا۔ صریح دیکھتے ہیں کہ میڈا کا نوکر جو خط لایا ہے وہ کھڑا سن رہا ہے اور کہنے لگے تم سے بھلا کیا پڑھا جائے گا بڑے عالم کے وہ بن کے آئے ہیں وہاں سے۔ لاحول ولا قوۃ۔
آزاد۔ اچھا اب تو دکھا دو۔
خوجی نے خط کو تین بار چوما اور میاں آزاد کو دے دیا۔ آزاد نے پڑھا تو یوں لکھا تھا "میرے پیارے جوان تمہاری ایک ایک ادا نے میرے دل میں جگہ کر لی ہے تمہارا سرو سا قد اور تمہاری سارس کی سی گردن اور بیل کے سے گول گول دیدے اور بندر کی سی حرکتیں جب یاد آتی ہیں۔ تو میں اچھل اچھل پڑتی ہوں۔ اب یہ بتاؤ کہ آج کس وقت آؤ گے۔ ایسا نہ ہو کہ نہ آؤ۔ یہ خط اپنے دوست آزاد کو نہ دکھانا۔ مگر تمہیں اسی کے سر کی قسم جس کو تم سب سے زیادہ چاہتے ہو کہ اس خط کو گن کر سو بار چوم لینا اور وعدے پر آنا ضرور آنا"۔
میاں آزاد نے یہ خط پڑھ کر خواجہ بدیع صاحب کو سنایا تو از بس مسرور ہوئے
خوجی۔ افسوس ہے کہ تم کو سب حالات معلوم ہو گئے مگر اس پری چہرہ سے نہ کہہ دینا۔
آزاد۔ ضرور کہوں اور بالضرور کہوں۔
خوجی۔ (ہاتھ مل کر) ارے غضب بڑی بری ہوئی۔
آزاد۔ میں تو جا کر شکایت کروں گا کہ ہم سے کیوں مخفی رکھا واہ کیا دل لگی ہے۔
خوجی۔ (سر پیٹ کر) لاحول لاحول۔ لعنت بکار شیطان۔
آزاد۔ میں ابھی ابھی ایک چٹھی بھیجتا ہوں۔ آپ گھبرائیے نہیں۔
خوجی۔ ارے ہائے افسوس اور مجھ سے کہتے ہو کہ آپ گھبرائیے نہیں۔
آزاد۔ بھائی سنو، ہم کو تو حسد ہوتا ہے۔
خوجی۔ پھر چاہے جو ہو نے جائیے کہہ دیجیے۔ وہ ہم پر عاشق ہم اس کے عاشق زار تم ایسے ہزار لگی لپٹی باتیں کریں۔ ہو گا کیا لے توبہ آپ کی حقیقت ہی کیا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔
آزاد اپنے دل میں خوب ہی ہنسے مگر خواجہ بدیع صاحب کو شک کی جگہ یقین بلکہ

یہی ایمان و دین تھا کہ میڈا کی ہم پر جان جاتی ہے آزاد اور بھی پر چک دیتے جاتے تھے۔

آزاد۔ یار اب تمھارے ساتھ نہ رہیں گے۔

خوجی۔ وجہ۔

آزاد۔ بس سمجھ گئے ہم اب ساتھ نہ ہوگا۔

خوجی۔ آخر وجہ بتائیے۔

آزاد۔ غضب خدا کا میڈا اسی ماہ رو اور ہمارے سامنے تمھارا عشق ظاہر کرے۔

خوجی۔ (کھلکھلا کر ہنس پڑے) ہا ہا ہا۔ اب سمجھے ہم جوان ہی ایسے ہیں۔ اس کو کوئی کیا کرے۔ لیکن تم اگر خلاف ہو گئے تو واللہ میں میڈا سے بات تک نہ کروں۔ مجھ کو جان تلک سے زیادہ تم عزیز ہو۔ قسم خدا کی اب دنیا میں تمھارے سوا اور کوئی میرا مربی اور سرپرست نہیں ہے۔ باپ دادا مربی آقا جو کچھ ہو تم ہو۔ بس فقط تم اور کوئی نہیں۔ اور ہم تو اب بوڑھے ہوئے یہ بھی اس پری چہرہ کی عنایت ہے کہ ہم پر اور یہ کرم۔ مگر ہم ہاں اس میں شک نہیں کہ ہم کلّے ٹھلّے کے گبھرو جوان ہیں۔

آزاد۔ یہ تو میں خود جانتا ہوں۔

خوجی۔ ہاں بس اس میں کوئی شک کرے وہ کافر۔

آزاد۔ ہر کہ شک آرد۔

خوجی۔ سگ است۔

آزاد۔ مگر ایسا تو کبھی کہ ہاتھ تک چوم لیا۔ واہ وا۔

خوجی۔ (اکڑ کر) اجی اسکندریہ میں تم نہ تھے وہاں بھی ایک گراں ڈیل اور خوب رو عورت ہم پر عاشق ہو گئی تھی مگر خرابی کیا تھی نہ ہم اس کی بات سمجھیں نہ وہ ہماری سمجھ سکے اشاروں سے البتہ خوب باتیں ہوئیں۔

خوجی نے میاں آزاد سے پوچھا کیوں میاں بھلا فارسی میں خط لکھیں تو کیسا۔ آزاد نے کہا فارسی یہاں کوئی کیا جانے بھلا۔ اردو میں لکھو تو سب سمجھ جائیں خوجی نے میڈا کے نام خط کا جواب اس طرح بھیجا۔

عزیز از جان۔ سعادت نشان نور چشمی روشن لقا میڈا کو بعد سلام و نیاز کے گلدستوں کے یہ واضح ہو جائے کہ تمھارا نیاز نامہ مورخہ تاریخ آج کا واسطے اس کے کہ میں آؤں گا یا نہیں۔ بیان کروں میں نے پایا مژدۂ پیغام لایا۔

تیرے گدا کے مشامِ جاں میں طمع کی بو بھی نہیں گئی ہے
بری ہے تو میہماں سے دامن پہ گرد چھو بھی نہیں گئی ہے

خط میں نے بغور پڑھا فائدہ بخشا اچھا لکھا ہے بقول صفدر ؎

ستم سہتے ہیں نیم جاں کیسے کیسے — وہ لیتے ہیں روز امتحاں کیسے کیسے

میں وقتِ مقررہ کے پہلے ہی آؤں گا تم پر جان دیتا ہوں ہر روز صبح کو اٹھ کر نام لیتا ہوں۔ برسوں کا عاشق ہوں۔"

خوجی۔ کیوں بھئی گُل دستے کی فارسی کیا ہے۔

آزاد۔ پھلہتی۔

خوجی۔ یہ تو آگرے کے ایک محلے کا نام ہے۔

آزاد۔ اجی۔ گُل۔ پھول۔ دستہ۔ ہتی۔

خوجی۔ ہم پھلہتا۔ لکھیں گے دستی تھوڑا ہی ہے کچھ۔

آزاد۔ ہاں ہاں ہاں ہم ہی بھولے تھے۔

خوجی۔ او ہو ہو ہو۔ خوب یاد آیا۔ خدا گواہ ہے کانسل کے نام وہ خط لکھا کہ باید و شاید اور سرخی یہ تھی پھڑکتی ہوئی۔

اے قبائے بادشاہی راست بر بالائے تو
مصرعٔ ثانی حذف یاد نیست والائے تو

آزاد۔ ایں پیچ مچ لکھ ہی دیا۔

خوجی۔ دَن سے ایک عرضی داغ ہی تو دی۔

میاں خوجی دو سطریں لکھتے تھے اور دس منٹ تک ٹہلتے تھے دو سطریں لکھیں اور اٹھ کر اکڑنے لگے۔ آدمی نے دیکھا کہ حضرت کے مزاج کے تحمل بیڑہ ہی نہیں بڑھ کر کہا صاحب جواب دیجیے گا یا جاؤں۔ خوجی نے کہا ہوں ہوں جانا کیسا بیٹھ! پھر یوں لکھنا شروع کیا۔

مدتیں ہو گئیں کہ غم سے دل دوچار ہے تیر پار ہے آرزو دار اور تمنا مند ہوں کہ از راہِ کرم مہربانی کر کے اجازت دیجیے کہ آج ہی سانچق لے آؤں۔ ڈھول نقارہ اور گگرہ گگڑ جھیر جھیر کی صدا بلند ہو پھر کیا پوچھنا ہے۔ بڑی دل لگی ہو۔ واللہ۔ اگر اجازت دو تو دولھا بن کر آؤں۔ اور تم کو بیاہ لے جاؤں مگر شرط یہ کہ بعد خرچ کرنے

کے اس قدر رقم کے میں مطلب کو اپنے پہنچوں۔ آگے جو رائے ہو بندہ رائے کا ہوں

بندہ صلاح کا ہوں اور باقی کچھ نہیں۔

لیا جو ایک دل اس نے تو دو دیے بوسے   ہزار شکر یہ سودا بہت گراں نہ رہا"

خواجہ صاحب نے خط لکھ کر مس میڈوا کے آدمی کو دیا اور اکڑ کر آزاد سے کہا کیوں قبلہ کہیے۔ اب بولیے۔ ہونہہ سمجھے تھے کہ بس ایک ہم بڑے خوب رو جوان ہیں۔ اجی فضلنا بعضکم علی بعض۔ اس نے بھی دیکھا کہ سرخ و سفید اور رنگین مزاج اور شگفتہ جبیں آدمی ہے بشرے سے بانک پن برستا ہے اب اس کو چھوڑ کے اور کس کے ساتھ شادی کروں چلیے تڑ سے خط لکھ بھیجا۔ آزاد نے کہا۔ اس میں کیا فرق ہے آپ ایک جوان رعنا اور زیبا اندام ہیں بھلا آپ پر نہ کیوں کر ریجھتی۔ اور آپ پر نہ ریجھتی تو بھلا کس پر ریجھتی۔ مگر خط تو گھٹوالو۔ میاں خلیفہ کو بلاؤ خوجی نے فوراً حکم دیا کہ جاؤ ایک آدمی حجام کو بلا لاؤ۔ حجام آیا خط بننے لگا۔

خوجی (گال پر ہاتھ رکھ کر) گھوٹو گھوٹو ابھی گھوٹے جاؤ، ابھی کھونٹی باقی ہے خوب گھوٹو۔

حجام نے پھر استرہ پھیرا۔ خواجہ صاحب نے جھلا کر کہا تم کچھ بھی نہیں جانتے۔ کھونٹی کیوں رہ گئی چلو گھوٹو۔

آزاد۔ گھوٹو نہ بھئی۔

حجام۔ تو حضور کب تک گھوٹا کروں۔

خوجی۔ دونی مزدوری دیں گے ہم۔

حجام۔ مانا مگر کوئی حد بھی ہے۔

خوجی۔ تم کو اس سے کیا مطلب۔

حجام۔ پیر و مرشد خون نکلنے لگے گا۔

آزاد۔ اور اچھا ہے لوگ کہیں گے نوشہ کے چہرے سے خون برستا ہے۔

خوجی۔ ہاں واللہ خوب سوجھے گھوٹو۔

حجام۔ (کسبت سنبھال کر) اب کسی اور نائی سے گھٹوائیے۔

آزاد۔ اچھا پٹے تو کترتے جاؤ۔

خوجی - پر قینچ کردو۔

حجام نے جھلا کر آدھے بال کتر ڈالے ایک طرف کی آدھی مونچھ اڑا دی داڑھی کے سفید سفید بال بدستور رہنے دیئے الغرض چار ابرو کا صفایا کر دیا۔ خوجی ایک تو یوں ہی بڑے حسین تھے۔ حجام نے کتر کتر کے اور بھی ٹھیک بنایا۔

آزاد - خواجہ صاحب کے اور تو کل عضو بدن سانچے کے ڈھلے ہیں مگر ناک ذرا بے ڈول ہے۔ ہے کہ نہیں۔

خوجی - چلیے بس رہنے دیجیے۔

حجام - ہاں ہے تو بے ڈول کہیے کتر دوں ذرا سی ناک بھی۔

خوجی نے جو آیئنے میں اپنی صورت دیکھی تو مونچھ نہیں۔ لنڈورے بنے ہوئے ہیں۔ جھلا کر کہا او گیدی یہ کیا کیا۔ میاں خلیفہ ہوا ہو گئے کہ کہیں خواجہ صاحب مار بیٹھیں جھلّے آدمی تو ہیں ہی۔

آزاد - کیوں کیوں خفا کیوں ہو بھئی۔

خوجی - دیکھتے ہیں آپ کیا قطع بنائی ہے نہ ہوئی قرولی واللہ آنتوں کا ڈھیر ہوتا سامنے اور آپ نے بھی نہ روکا۔

آزاد - آپ کو تو ہے خبط۔ بندہ خبطی نہیں۔

خوجی - کیوں خبط کیسا۔ پہلے اول جلول کترے اور آپنے ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم پر عمل کیا۔ واہ سبحان اللہ یہ تو دی مثل ہوئی کہ۔

آزاد نے کہا میں سچ کہتا ہوں آپ اس وقت انتہا کے حسین معلوم ہوتے ہیں۔

اور وہم کی دوا تو لقمان کے پاس بھی نہ تھی۔

خوجی - کیوں صاحب سہرے کی تو فکر کیجیے۔

آزاد - ہاں ہاں گھبراتے کیوں ہو۔

خوجی - ہم کو یاد آتا ہے کہ نوشہ کے سامنے چھوٹے چھوٹے لڑکے غزلیں پڑھتے ہیں دو ایک لونڈے کرایے پر منگوا لیجیے تو ان کو غزلیں رٹا دیں۔

آزاد - بہت خوب یہ تو عمدہ تجویز ہے واللہ۔

دو لونڈے بارہ برس کے کرایے پر منگوالیے گئے اور میاں خوجی ان کو غزلیں

بر زبان یاد کرانے لگے ایک غزل تو میاں آزاد نے یہ بتائی۔

لاحول ولاقوہ یہ کون بشر ہے
سب صورتِ لنگور فقط دُم کی کسر ہے

خوجی۔ چلیے بس اب دل لگی رہنے دیجیے ہونہ اچھے ملے۔

آزاد۔ اچھا اور غزل لکھوائے دیتے ہیں۔

فغاں ہے آہ ہے نالہ ہے بے قراری ہے
فراقِ یار میں حالت عجب ہماری ہے

خوجی۔ واہ شادی کو اس شعر سے کیا واسطہ۔

آزاد۔ اچھا صاحب یہ غزل یاد کرا دیجیے۔

کہا تھا بلبل سے حال میں نے ترے ستم کا بہت چھپا کر
یہ کس نے ان کو خبر سنائی کہ ہنس پڑے پھول کھلکھلا کر
مرے جنازے کو ناحق احباب ان کے کوچے میں لے کے آئے
نگاہِ حسرت سے دیکھتے ہیں وہ رخ سے پردہ اٹھا اٹھا کر

خوجی۔ واہ جنازے کو شادی سے کیا تعلق ہے بھلا۔

آزاد۔ اوپر والا شعر پسند ہے مطلع۔

خوجی۔ ہاں ہنسنا اور کھلکھلانا ایسے لفظ ہوں تو کیا پوچھنا۔

آزاد۔ اچھا سنیے اور سنیے۔

پری رُو آدمی کا دل نہ ہو کس طرح دیوانہ
تری بھکی ہیں باتیں اور تری چالیں ہیں مستانہ
سر مُو فرق کچھ اس میں نہیں تشبیہ کامل ہے
کسی زلفِ پریشاں کا دلِ صد چاک ہے شانہ
بدلتا ہے مرا دل، رنگ کیا کیا عشق بازی میں
کبھی بلبل ہے گلشن میں کبھی محفل میں پروانہ

اور کسی قسم کے شعر مطلوب ہوں تو کوئی لالہ ڈھونڈھیے مگر یہاں کہاں۔

خوجی نے یہ غزل لکھ لی اور دونوں لونڈوں کو رٹانے لگے دو گھنٹے کے بعد پوچھا کہو کیا یاد کیا۔ پہلا شعر تو پڑھو۔ ایک نے یوں پڑھا۔

پری رو ہو نہ ہو طرح ادا نہ   ترا ہٹک چاہیں آستانہ

خوجی۔ (جھلا کر) لاحول الاحول۔ دوسرے سے تم پڑھو۔

دوسرا۔ بہت اکڑ کر۔

پری رُو نہ ماو ما دیلو شانہ   بہک بات اور مست مردانہ

خوجی - واہ من چہ فش ام - برادر فلاں من بسیار فش ست۔

آزاد - یار یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔

خوجی - کچھ پوچھو نہ بھئی - لاحول ولا قوۃ - رٹاتے رٹاتے ناک میں دم آگیا مگر کتے کی دم بارہ برس زمین میں گاڑی ٹیڑھی ہی نکلی۔

آزاد - توبہ توبہ۔

خوجی - ہاں خوب یاد آیا - آپ ذرا باجے والوں کی تو فکر کیجیے ہاتھی گھوڑا ہوا دار فنس پالکی، جھنڈی بردار - چوب دار نوبت والے شہنائی کے بغیر شادی کیسی مگر ہمارے لیے جو گھوڑا منگوائیے گا ذرا شائستہ ہو گو رسالداری اور کمیدانی کی حالت میں برسوں گھوڑے پر سوار ہوئے ہیں۔ مگر اب ربط نہیں ہے۔

آزاد - دیکھیے سب فکر ہوئی جاتی ہے بھلا گھوڑا نہ ملے خچر ہو تو کیسا۔

خوجی - واہ آپ نے بھی مجھے کوئی گدھا مقرر کیا ہے۔

آزاد - تو حضرت دریافت کر لینے میں کیا ہرج ہے۔

میاں آزاد نے ہرمز جی سے کہا کہ یہ شخص مسخرہ ہے مگر سمجھتا ہے کہ مجھ سے بڑھ کر حسین اور وجیہ کوئی دنیا میں نہیں پیدا ہوا مس میڈا کے بیاہ کا شوق چرایا ہے۔ میں نے میڈا سے کہہ دیا تھا کہ ان کو ذرا بناؤ۔ وہ تو آپ جانتے ہیں ایک ہی شوخ طبع ہے ان کا ہاتھ چوم لیا۔ بس پھر کیا تھا تب سے اینڈتے پھرتے ہیں اب سنیے کہ میڈا نے گھر سے آپ کے نام ایک خط بھیجا کہ میرے ساتھ شادی منظور ہو تو آج شام کو آؤ۔ نائی کو بلا کر خط بنوایا ہے۔ ذرا قطع چل کر دیکھ لیجیے۔ اب کہتے ہیں جس طرح ہندوستان میں برات نکلتی ہے اسی طرح یہاں بھی ہاتھی اور گھوڑے اور باجے لے کر میڈا کو بیاہنے جائیں گے

ہرمز جی - آپ کہہ دیجیے کہ یہاں بالکل شرع کے مطابق شادی ہوتی ہے۔

آزاد - چلیے آپ کی ...

ہرمز جی - اچھا مگر مجھ سے ہنسی نہ ضبط ہو سکے گی۔

میاں آزاد نے ہنسا کر کہا کہ ہرمز جی صاحب کہتے ہیں یہاں شرع کے مطابق شادی ہوتی ہے۔ باجا بجا کے نہیں جاتے ہرمز جی نے کہا مبارک میڈم سی حسین عورت واقعی آپ ہی کے قابل ہے جیسی وہ خوش رو ہے ویسے ہی خوش قطع آپ بھی ہیں

مگر باجا لے کر جائیے گا تو لوگ یہاں ہنسیں گے ہاں ایک بات ہو سکتی ہے۔ پھول کے برتن دس پانچ آدمیوں کو دے دیجیے بانس کی کھپاچ سے وہ بجاتے جائیں۔ آواز کی آواز باجے کا باجا۔

خوجی نے اس رائے کو بہت پسند کیا۔

خوجی - میاں آزاد کی رائے لیجیے۔

آزاد - بجا ہے۔

خوجی - بندوبست کیجیے پھر اب وقت تھوڑا ہے اور سواری کی کیا فکر کیجیے گا۔

ہرمز جی - ہمارے نزدیک تو پیدل جائیے یا جس طرح یہاں امرا جاتے ہیں اس طرح جائیے مگر آپ شاید پسند نہ کریں آدمی کی گود ہیں۔

خوجی - منظور۔ مگر ہم کو اٹھا سکے گا کوئی۔

آزاد - یہی تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔

ہرمز جی - ہم اس کا بندوبست کر دیں گے آپ گھبرائیے نہیں۔

خوجی - اجی تو پھر اب کب بندوبست کیجیے گا۔ ایسا نہ ہو وقت پر پھر جگت ہنسائی ہو بعد میں۔

ہرمز جی - کوئی جنازہ اٹھانے والوں میں سے دو ایک ہٹے کٹے آدمیوں کو لے آؤ۔ مگر خوب مضبوط ہوں۔ بڑی دیر تک یہی گفتگو رہی دو گھڑی دن رہے ہوٹل سے خوجی کی برات چلی۔ تین مزدور پھول کے برتن کو لکڑی سے بجاتے جاتے ہیں دو لونڈے آگے پیچھے ساتھ خوجی ایک مزدور کی گود میں گیروے کپڑے پہنے ہوئے سر پر سیاہ پگڑی اور سہرا لٹکا ہوا۔ راہ میں جس طرف نکل جاتے ہیں لوگ انگلیاں اٹھاتے ہیں قہقہے پر قہقہہ لگاتے ہیں۔ خوجی اکڑے بیٹھے ہیں اور دل ہی دل میں سوچتے ہیں کہ لوگ ہمیں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ایسا وجیہ جوان کبھی کسی نے کاہے کو دیکھا تھا لونڈے

سے پوچھا کہو غزل یاد ہے ہاں کہو بڑی رو آدمی بولو۔ اب وہ بولیں تو کیا بولیں۔ بولیں نہ تب جب کچھ سمجھیں۔ میاں خوجی نے ان کو خوب للکارا۔ مگر ان کے کان پر جوں بھی نہیں رینگی۔

خوجی۔ اہاہا۔ ارے رے رے، لاحول ولا قوۃ روک لو۔ روک دو۔ برات روک لو۔ پنشانے والے کہاں ہیں۔ ہائیں کوئی بولتا ہی نہیں پردیس میں بھی انسان پر کیا مصیبت پڑتی ہے۔ افسوس صد افسوس۔ افسوس۔ اب میں دولھا بن کر رہوں یا انتظام کروں یا جلوس کا بندوبست کروں۔ کروں تو کیا کروں۔ یہ دونوں گیدی نرے جانگلو نکلے توبہ ہی بھلی۔

پھر یاد آیا کہ نشان کا ہاتھی تو ہے ہی نہیں اتنے میں ایک جمائی آئی ارے ہو ہو افیم پینا بھول گئے مارے خوشی کے یاد ہی نہ رہا کہ افیم ابھی نہیں کھائی ہے اب کیا کیا جائے۔

پھر یاد آیا کہ قرولی تو پاس ہے ہی نہیں۔ اف غضب ہو گیا۔ حکم دیا کہ لوٹا دو برات۔ چلو ہرمز جی کی کوٹھی میں چلیے۔ برات ہرمز جی کی کوٹھی میں داخل ہوئی۔

آزاد۔ یہ کیوں واپس کیوں آئے۔ بولو بھائی۔

خوجی۔ کیا بولیں میاں۔

قیس و فرہاد جو اس عہد میں زندہ ہوتے
پیتے دھو دھو کے مرے سنگ لحد کے تعویذ

آزاد۔ سبحان اللہ شعر تو ایسے حسب حال پڑھ دیتے ہو کہ جی خوش ہو جاتا ہے مگر بے نیل و مرام واپس آنے کی وجہ تو بتاؤ۔ آخر یہ ہوا کیا۔

خوجی۔ نشان کا ہاتھی تو تھا ہی نہیں۔

آزاد۔ بس اس وجہ سے واپس آئے۔

خوجی۔ قرولی تو پاس تھی نہیں۔

آزاد۔ عجب آدمی ہو بھئی۔ آپ جنگ کے میدان میں جاتے ہیں یا شادی کرنے پھر قرولی سے کیا واسطہ۔

خوجی۔ جس میں بانکے معلوم ہوں۔

آزاد۔ واہ کہنے لگے بانکے معلوم ہوں۔

خوجی۔ ہاتھی منگوائیے۔

آزاد۔ بھائی یہاں ہاتھی کہاں۔ یہ بھی ہندوستان ہے کچھ۔ ہاں ایک بات ہو سکتی ہے کہ خچر پر ایک جھنڈی رکھوا دیں۔ یا تم خود ہی ایک جھنڈی ہاتھ میں لے لو۔

خوجی۔ کیا مصیبت ہے بھئی۔ نوشہ بھی ہمیں بنیں۔ انتظام بھی ہمیں کریں۔ لاحول ولا قوۃ۔

اتنے میں مس میڈا بھی آگئیں۔ آزاد نے کہا لو وہ تو خود ہی یہاں آگئیں میڈا نے ہنستے ہوئے کہا ہم نے ان کو بازار میں دیکھا تھا ایک مزدور کی گود میں بڑے اکڑے ہوئے بیٹھے تھے اور خدا جانے کون چیز دو ایک آدمی بجاتے جاتے تھے۔ خوجی نے جھک کر میڈا کو سلام کیا۔ اور مسکرا کے میڈا نے سلام کا جواب دیا اور کہا واہ آپ خوب آئے۔ آزاد نے خوجی کو میڈا کا مطلب سمجھا دیا۔

خوجی۔ کمال خفیف ہوا۔ انتہا کی خفت ہے اس وقت وجہ یہ ہوئی کہ جب برات آدھی دور نکل گئی تو یاد آیا کہ ہاتھی نہیں ہے پھر دس قدم پر جمائی آئی۔ یاد آیا کہ افیم نہیں کھائی ہے اور تھوڑی دور چلا تھا کہ قرولی یاد آئی۔ لہٰذا اثنائے راہ سے واپس آیا۔ اب آپ فرمائیے کیا رائے ہے آپ کی۔

میڈا۔ اب اس وقت تو جانے دیجیے کل سمجھا جائے گا۔

میڈا نے کہا چلیے اس کمرے میں، ہمیں کچھ کہنا ہے خوجی کی باچھیں کھل گئیں۔

میاں آزاد کی طرف بڑے غرور سے دیکھا اور میڈا کے ساتھ کمرے میں گئے۔ میڈا نے کمرے میں داخل ہوتے ہی تڑ سے چپت دی اور پھرتی کے ساتھ کمرے سے باہر تھی۔ خوجی نے ٹوپی اٹھائی اور سوچے کہ بے ڈھب سامنا ہے اچھے گھر بیعانہ دیا۔ ابھی سے کھوپڑی سہلانے لگیں مگر کچھ مضائقہ نہیں سمجھا جائے گا۔ باہر تشریف لائے۔

آزاد۔ کہو کیا کہا۔

خوجی۔ ایک بوسہ لیا، اور طرارہ بھرا تو کمرے کے باہر تھی۔

آزاد۔ بڑے خوش قسمت ہو۔

خوجی۔ (ایک مونچھ پر تاؤ دے کر) ہیں ہی ہم، نہیں تو یوں ہی۔

آزاد۔ تم نے بھی بوسہ لیا۔

خوجی۔ لینے کو تھا مگر وہ شوخی کے ساتھ چل دی۔

آزاد۔ اس میں شک نہیں کہ یہ عورت پری ہے حورِ جنت واللہ حورِ بہشتی مگر میں نے تو پہلے ہی شادی سے انکار کیا تھا۔

خوجی۔ اگر آپ نے یہ کلمہ اب دوہرایا تو قرولی بھونک کر خود مر جاؤں گا۔ اتفاق سے ایک بے جا بات زبان سے نکل گئی۔

چیست ہندو یا مسلماں کوزہ یک کوزہ گر
گرچہ کوزہ دو شمار آید ولیکن گِل یکیست

آزاد۔ لے اب تمہارا قصور معاف کر دیا۔ ایسا برجستہ شعر تم نے پڑھ دیا حسبِ حال کہ جی خوش ہوگیا۔ جاؤ قصور معاف کیا۔ سلام کرو۔

میڈا نے خوجی سے کہا چلو باہر چاندنی میں سیر کریں۔ خوجی نے کہا چلیے۔ میاں آزاد کو بھی ساتھ لیا۔ اور تینوں سیرِ چمن کرنے لگے میڈا نے کہا۔ آپ کا نام ہم بھول گئے۔ خوجی بولے خواجہ بدیع صاحب میرا نام ہے۔

میڈا۔ یہاں ایک فرانسیسی افسر ہے (روشفا) وہ مجھے عرصے سے چاہتا ہے پہلے تم اس سے لڑو۔ پھر ہمارے ساتھ شادی ہو۔

ایک مرتبہ میاں آزاد نے عمداً اور قصداً کہا ارے میاں خوجی ذرا ایک بات تو سنو خوجی کے غصے کا پارہ ایک سو بیس درجے پر تھا۔

خوجی پر خدا کرے آسمان پھٹ پڑے۔ خوجی مردک ہے کون موے خوجی۔ اسی دم خوجی گدھے سور کا جنازہ نکلے۔ خوجی مردود کی ایسی تیسی۔ اب خموش ہوئے۔ معشوق کے سامنے رنگ پھینکا کرتے ہو۔ خوجی خوجی۔ ماں باپ نے خواجہ بدیع نام رکھا یاروں دوستوں نے خواجہ صاحب خواجہ صاحب کہا۔ آپ خوجی بنائے دیتے ہیں۔

آزاد۔ معاف کیجیے۔

خوجی۔ بھنک گیا۔ پھنک گیا۔ از سر تا پا بھونک دیا خوجی کہہ کر۔ معافی کے خواہاں ہونا جلے کو اور جلانا۔

آزاد۔ اچھا پھر اب تو معاف کرو۔

خوجی۔ اور کروں گا کیا۔ آخر معاف کرنے کے سوا اور کیا ہے رنگ پھیکا کر دیا۔ میڈا نے کہا کہیے پھر اس افسر سے کس دن لڑائی ہو گی۔ خوجی نے کہا ہم حاضر

ہیں ۔ پچاس افسروں سے جنگ کرنے پر آمادہ ہیں ۔ ہم کمیدانی کر چکے ہیں رسالدار رہ چکے ہیں دگلے والی پلٹن نے وہ نام کیا کہ بایدو شاید ۔ ایسی لڑی ایسا لڑی کہ واہ ہے ۔ اور ہم نے دگلے والی پلٹن کی وہ رسالداری کی کہ دھوم ہے ۔ کوئی پلٹن ایسی تھی ۔ اختری نادری جنگی افسر جیسے وہ تھے ویسے ہم تھے دونوں فوجی افسر جب لڑیں گے تو خوب لڑیں گے ۔ مگر شرط یہ ہے کہ میاں آزاد ہم کو ایک قرولی خرید دیں ۔

میاں آزاد اور مس میڈا اور رہرمزجی نے باہم مشورہ کیا اور مشورہ کر کے خوجی سے کہا کہ کل صبح کو آپ تیار رہیے گا ۔ خواجہ صاحب نے کہا اجی ہم اب تیار ہیں ۔ سویرے مُنہ اندھیرے میاں خوجی اٹھے ۔ منہ ہاتھ دھویا ۔ جوڑی کے کئی ہاتھ ہلائے کوئی تین چار ۔ جی اور نہیں تو کیا ۔ سینکیا پہلوان ہیں کپڑے پہن کر لیس ہو رہے ۔ تھوڑی دیر میں مس میڈا ناز و انداز کے ساتھ اٹھلاتی ہوئی آئیں اور خوجی کی طرف دیکھ کر مسکرائیں ۔

خوجی ۔ واہ رے میں معشوق نے دیکھا اور باچھیں کھل گئیں ۔

آزاد نے ایک آدمی کو حکم دیا کہ عبیداللہ اس کمرے میں بیٹھے ہیں ذرا ان کو بلاؤ ۔ عبیداللہ ایک مشہور و معروف ترکی پہلوان تھے ۔ جیسے ہی وہ سامنے آئے اور میاں آزاد نے کہا کہ لیجیے آپ کے رقیب یہی ہیں خوجی کے ہوش اڑ گئے یا الٰہی یہ ڈھوکا ڈھو دنیا بھر کے آدمیوں سے دو مٹھی اونچا ۔ اس سے عہدہ برآ ہونا محال ہے آج ذلیل ہوئے ۔ مگر خیر شاید ڈپٹ میں آجائے ۔ ترکی پہلوان نے جو سکھا یا پڑھایا ہوا تھا قہر آلود نظر ڈالی تو خوجی کے رہے سہے حواس اور بھی غائب ہو گئے ۔ دل ہی دل میں سوچنے لگے کہ آج ہڈی پسلی ٹوٹی ۔ یہ تو کچا ہی کھا جائے گا ایک چپت دے تو ہم زمین میں دھنس جائیں ۔ مقابلہ اس سے کون کرے گا بھلا ۔ ترکی پہلوان نے پھر ان کی طرف قہر کی نظر سے دیکھا ۔ خوجی مارے ڈر کے ذرا تھوڑی دور ہٹ بیٹھے مس میڈا نے کہا آپ تو ابھی سے ڈرنے لگے خوجی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک دفعہ بیٹھ گئے اور کہا ۔ یاروذرا ڈاکٹر کو بلاؤ ۔ اس طرح کا درد ہو رہا ہے کہ کچھ نہ پوچھو ایک دفعہ جب ہم دگلے والی پلٹن میں نوکر تھے جب بھی ہوا تھا اور اب بھی ہو رہا ہے ۔ مگر مر گئے تو چلے ۔ ع ۔

بماری جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

افسوس یہ ہے کہ ہم اس وقت اپنی پھکیتی اور پہلوانی کے جوہر نہ دکھا سکے واللہ ہے اٹھا کے پٹخنی دیتا تو توبہ ہی بھلی۔

اتنے میں ترکی پہلوان نے ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکا دیا تو خوجی کرسی پر سے دس قدم کے فاصلے پر جا گرے اور پینترے بدل کر کہا او گیدی نہ ہوئی قرولی ورنہ ڈھیر کر دیتا۔

آخر کار اس بات پر فیصلہ ہوا کہ خوجی کا درد رفع ہو جائے تو پھر کسی روز زور آزمائی ہوگی۔

ناشاد دولہا

اخاہ میاں خواجہ بدیع الزماں ہیں۔ آیئے حضرت مزاج مقطع ماشاءاللہ کیا رُخ رُوخ نور برس رہا ہے۔ ع

سب صورتِ لنگور فقط دم کی کسر ہے

قد و قامت پر نظر ڈالیے تو ڈیڑھ انچ مگر سمجھتے ہیں یہی کہ ہم گراں ڈیل جوان ہیں۔

بہ ہیکل قوی چوں تناور درخت

کوئی عضوِ بدن عنایتِ ایزدی سے سڈول نہیں کوئی کل درست نہیں۔ آنکھیں بڑی کاڑ دیدہ۔ ایک ابرو صفاچٹ۔

میاں خوجی ہرمز جی بھائی کی گاڑی پر سوار ہو کر مس روز کی طرف گئے گیل باغ پر فضا میں ٹہل رہی تھی۔ ان سب پری زادوں سے ہرمز جی نے ان کو ملا دیا تھا اور یہ سب ان کو بناتی تھیں۔ خوجی گاڑی سے اترے اور گیل کو بندگی عرض کر کے یوں ہمکلام ہوئے۔

خوجی۔ مس روز کجاست کجا رفت کجا بود؟

گیل۔ (مسکرا کر) ہم نہیں سمجھتے۔

خوجی۔ من بدیع برمی گویید اما بعد از شکوک اللہ۔

گیل - (اشارے سے) بیٹھو۔

خوجی - من بدیریع میرود - برائے ملاقات معشوقۂ خودکہ پری پیکری ست۔

گیل نے ایک ترکی باغبان سے کہا کہ ان کو سمجھا دو کہو مس روز اور مس میڈا ہوا کھانے گئیں ہیں۔ آپ بیٹھیے آتی ہوں گی۔ باغبان نے کہا بیٹھو آویں۔ دونوں گیا باہر۔

خوجی - تم ہندوستان سے آئے ہو۔

باغبان - آں - (ہاں) کلکتہ گیا دو برس۔ بس چلے۔

خوجی - ان سے کہہ دینا ہم جاتے ہیں ہمارے مکان پر خط لکھوا کر بھیج دیں۔

باغبان - کہدیں گے ہم کیوں اچا۔ (اچھا)

خوجی نے مس گیل سے ہاتھ ملایا اور گاڑی پر سوار ہو کر روانہ ہوئے ادھر ہرمزجی کو جو دل لگی سوجھی تو انھوں نے مس گیل اور مس میڈا سے کہا۔ کل ہم خوجی کی برات نکلوائیں گے تینوں میں باہم خوب مشورہ ہوا تنے میں خوجی آن پہنچے ہرمزجی نے کہا۔ لو تمھاری شادی کی فکر ہو گئی مس روز راضی ہیں کل برات لے کر آؤ چاندی ہے چین کرو۔

خانساماں بلوایا گیا تاکہ خواجہ صاحب گفتگو سمجھتے جائیں۔

خوجی - خدا کرے ذمہ دار جنگ وغیرہ بھی خود برات میں رونق افروز ہوں۔

ہرمزجی - کل امرائے عظام اس نادر روزگار برات کو اگر بہ چشم خود ملاحظہ فرمائیں گے۔

خوجی - واللہ تو پھر بندوبست کریجیے۔

میڈا - ہاتھی کا ملنا محال ہے اور اونٹ خواجہ صاحب کو ناپسند کا واک اور کیڈا جانور ہے نہ۔

ہرمزجی - یہ کیوں؟

خوجی - اجی ایک روز میں چلا جاتا تھا سامنے سے ایک شتربان آتا تھا باتوں باتوں میں بگڑ گیا۔ میں نے کہا مارے قرولیوں کے چندھیا دوں گا اس نے ہنس کر کہا۔ بیدھا تو نہیں ہے۔ بس میں لپکا۔ اب لاکھ لاکھ تدبیر کرتا ہوں۔ اس تک ہاتھ نہیں پہنچتا۔ تب سے میں نے اس جانور پر لاحول بھیجا۔

ہرمز جی - گھوڑا شریر ہوتا ہے اور بیل گدھا واہیات جانور ہیں خچر کی رائے بہتر ہے۔
خوجی - خوب سوجھی استاد۔ خچر تو امیروں کی سواری میں رہتا ہے۔ عمدہ خچر کی جوڑی ہزار سے تو کم کو نہ آئے گی۔ مگر یار طبلے پر تھاپ ضرور رہو۔
ہرمز جی - یہاں شادی بیاہ میں آدمی کا ناچ بالکل ممنوع ہے۔ اے ہے جو کہیں کوئی عورت ناچے تو ستم ہی ہو جائے۔
خوجی - اچھا پھر کسی بیل سے ناچ کا تو نام ہو جائے۔
ہرمز جی - اس کی تدبیر یوں کیجیے کہ کسی ریچھ یا بندر نچانے والے کو بلا لیجیے کم خرچ اور لطف کا لطف تین بندر والے کافی ہیں۔
خوجی - حضرت تین چار نہیں۔ پانچ فال مبارک ہے۔
ہرمز جی - خیر وہ پانچ سہی۔
خوجی - مگر وہ ہر شخص سے کہہ دیا کریں کہ صرف راہ گیروں کے خوش کرنے کو تماشا دکھاتے ہیں تاکہ دولہا انعام دیں اور برات کی طرف سے علیحدہ انتظام ہوا ہے اور عروس کے گھر انواع واقسام کا ناچ رنگ ہوتا رہے گا۔ جب لوگ باہر شن جلیں گے کہ یہ منجانب دولہا ہے تو اندر کون تحقیقات کرنے بیٹھے گا کہ کس کی طرف سے ناچ ہے۔ خرچیں وہ اور نام یاروں کا۔ کہیں یار لوگ سوچنے والے ہیں بھلا۔
ہرمز جی - اہو ہو بھئی واللہ کیا سوجھی ہے۔ باقی رہی روشنی مشعل لے جانا باعث الزام۔ شمع دان ولمپ دھکے میں ٹوٹ جائے گا۔ پھر دس پانچ آدمی بڑے بڑے چراغوں میں تیل بھر کر ماش کے پتلے جلاتے لے چلیں تو کیسا۔
خوجی - ابھی یہاں ایسا سمجھنے والا کون ہوگا۔ لوگ غور کریں گے تو سمجھ جائیں گے کہ ریچھ اور بندر والے رات کو تماشا دکھانے کے لیے روشنی ساتھ لیے پھرتے ہیں۔

دوسرے دن قریب شام سب سامان فراہم ہوا۔ خوجی سج سجا کر سوار ہونے لگے۔

ہرمز جی - اس قرولی نے تو اور بھی آپ کو اونچی بنا دیا۔
خوجی - (خوشی میں آن کر یہ شعر پڑھنے لگے۔)

گر ڈنڈ کنم گنبد گردوں لرزد
اور اٹھا بیٹھ کنم تخت فریدوں لرزد

ہرمزجی۔ (مسکرا کر) شادی مبارک ہو۔

خوجی۔ براتِ عاشقاں بر شاخ آہو اس کو مت سمجھو

چلے ہیں بیاہنے سسرال کو اب تک کنوارے ہم

بدیع الزماں کی جورو کی شادی ہے۔

ہرمزجی جوڑی پر سوار ہو کر میڈا کے یہاں پہنچے۔

میڈا۔ (ہنس کر) اور برات۔

ہرمزجی۔ چل چکی ہے ذرا آج قطع مبارک دیکھیے گا۔

میڈا۔ تو چلیے ہم سب مل کر لب سڑک بارہ دری میں بیٹھیں۔

ہرمزجی اور میڈا اور مس روز سب مل کر بارہ دری میں بیٹھے اور چار ملازم دروازے پر کھڑے ہو گئے۔

برات چلی۔ آگے نشان کا خچر۔ پیچھے ریچھ اور بندر۔ اس کے بعد دس پانچ آدمی روشنی لیے ہوئے۔ کہیں لڑکے تالیاں بجاتے ہیں بے فکرے مُنہ آتے ہیں۔

ہرمزجی اور خوجی میں پہلے سے مشورہ ہو چکا تھا کہ برات میں باجے کے عوض تالیاں بجیں اور خچر پر برات کا نشان ہو۔ اور طالب علم بھی ساتھ ہوں پانچ سات طلبہ جن کو فارسی اردو کے اشعار کئی دن سے رٹا دیے تھے اور دس بارہ نوکر اغل بغل چلے جاتے تھے۔ بیچ میں خوجی اکڑے ہوئے بیٹھے ہیں۔ چوبی قرولی سنبھالتے گیروے رنگ کی پوشاک۔ بیاہ پگڑی اوپر پھولوں کا سہرا۔ افیون کی ڈبیا کمر میں بار بار ٹٹولتے جاتے تھے۔ ٹٹو کی دم اور پیشانی سرخ اور تمام بدن پر نیلے نیلے رنگ کے گول گول داغ۔ خاصے ہولی کے سوانگ بنے تھے۔ رات تھی چاندنی خوجی کی صورت دیکھ کر لڑکے بے اختیار ہنستے تھے۔ جدھر سواری جاتی تھی اس طوفانِ بے تمیزی کو دیکھ کر لوگ قہقہے لگاتے تھے۔ خوجی نے چونک کر کہا کیا ہے بھئی۔

لڑکے۔ جس گل زمین سے آپ کی سواری مثل بادِ بہاری گذرتی ہے جس محلے سے آپ کی ٹٹوی نکلتی ہے وہ زعفران زار ہو جاتا ہے۔

خوجی۔ یہ تو میں پہلے ہی سمجھتا تھا ایسی مہذب برات یہاں والوں نے کہاں دیکھی ہوگی۔

ایک تماشائی۔ (ہرمزجی کے ملازم سے) کیوں بھئی یہ کیا رنگ ہے۔

ملازم۔ یہ بونا مسخرہ بہروپیا ہے۔
تماشائی۔ بندی۔ واہ رے بہروپیے۔

خوجی۔ او ملعون بہروپیے خبردار۔ اس وقت میرے ہاتھ میں قرولی ہے (ملازم سے) بھئی ہوشیار ہو رہنا بہروپیا آپہنچا۔
سواری کا ٹٹو نہایت سست اور مریل تھا۔ بغیر مار کھائے تو دان چلے اڑھائی کوس۔ خوجی اس کی پیٹھ پر اچھل اچھل کر ایڑ لگاتے جاتے تھے۔ اور لوگ پھبتیوں پر پھبتیاں سناتے جاتے تھے۔ لڑکوں سے کہتے جاتے تھے خبردار غزل بھولنے نہ پائے او باجے والے زور سے بجا۔ مشعلچی مل کے قدم بہ قدم چلو۔ بھائی دیکھو نامعقول نشان کا خچر بہت بڑھ گیا۔ برات چوک میں داخل ہوئی۔
ہرمز جی۔ (مئیڈا سے) لیجیے برات آپہنچی۔ یہ نشان کا خچر سامنے آرہا ہے۔
مس روز ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ گئیں۔
گیل۔ ریچھ اور بندر کیسے؟
ہرمز جی۔ یہ ناچنے کے لیے آئے ہیں۔
مس روز۔ ایں ناچنے کا بھی سامان ہے۔
ہرمز جی۔ کیا کچھ کمیدان صاحب ہیں کر باتیں۔
اتنے میں خوجی نمودار ہوئے ملازموں نے بھیڑ کو اغل بغل ہٹا دیا۔ خوجی کی صورت نظر آتے ہی مس روز مس مئیڈا اور مس گیل اور ہرمز جی ہنستے ہنستے بے تاب ہو گئے۔
مئیڈا۔ ٹٹو کو تو آپ نے خوب ہی رنگ دیا۔
ہرمز جی۔ ایسے رنگیلے سجیلے جوان سفید ٹٹو پر سوار ہوں بھلا۔
مس روز۔ اور ان کی کمر میں یہ کیا ہے۔
ہرمز جی۔ کمر سے لکڑی کی قرولی لگی ہے دیا سلائی والی ٹین کی ڈبیا بجائے جیب گھڑی ہے۔
مس روز۔ اور یہ لڑکے تماشائی ہیں نا۔
ہرمز جی۔ جی نہیں۔ مدرسے کے طلبہ ہیں غزل خوانی ہو گی فوجِ طفلاں مفت۔

اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ اس مقام پر جو لوگوں نے گھیرا اور تالیاں بجا بجا کر اس زور سے قہقہے لگائے تو خوجی کا ٹٹو بیٹھ گیا۔

خوجی - او جانگلو - او مسخرے ہنستے کیا ہو - جلد کوئی تدبیر بتاؤ ورنہ مارے قرولیوں کے بولا دوں گا اس وقت تمام زمانے کی نظر مجھ دولہا پر پڑتی ہوگی -

ملازم - میں اس گھوڑے کی عادت خوب جانتا ہوں یہ بغیر ایک چابک کھائے اٹھنے والا نہیں -

خوجی - یہاں مصلحت کرتے ہو یا کسی تدبیر سے ٹٹو کو مناتے ہو -

ایک دل لگی باز نے شڑاپ شڑاپ چابک جمانے شروع کیے اتفاق سے خوجی پر بھی ایک چابک پڑ گیا -

خوجی - اوہ اوہ او نامعقول یہ کیا کیا تو نے -

دل لگی باز - تعمیلِ حکم -

خوجی - تو گھوڑے کو مارتا تھا یا مجھ کو، خیر اب بھی کوئی تدبیر کرو کم بختو -

ملازم - تدبیر یہی ہے کہ آپ اتر پڑیئے -

ملازم نے ٹٹو کو مار کر اٹھایا - خوجی پھر سوار ہوئے چلے ایک پاؤں رکاب پر رکھ کر دوسرا اٹھایا ہی تھا کہ ٹٹو چلنے لگا - خوجی اراراکر دھم سے زمین پر آرہے پگڑی یہ گری قرولی وہ گری ڈبیا ایک طرف ٹٹو ایک طرف -

خوجی - او گیدی نامعقول بہروپیے - اچھا دیدہ خواہد شد - اس وقت ذرا عجلت میں ہوں

دل لگی باز - اٹھیے اور پھرتی سے سوار ہو جیے - گھوڑے پر سے گرنا شہ سواروں ہی کا کام ہے - جسے گھوڑا نصیب نہیں وہ کیا گرے گا -

خوجی - یہ بات ہی ہے مگر بڑی خیریت گذری کہ میں گھوڑے پر نہ گرا ورنہ میرے بوجھ سے تو اس کا کام ہی تمام ہو جاتا -

تماشائی - بجا ارشاد ہوا -

خوجی نے پھر سر پر پگڑی رکھی قرولی کمر سے لگائی اور ایک لڑکے سے پوچھا آئینہ تو یہاں نہ ہوگا - تمھارے پاس -

لڑکا - ضرور -

خوجی - پھر سے پوشاک سجی ہے ذرا آئینہ تو دیکھ لیتے -

لڑکا - نہ آئینہ ملے تو پانی میں منہ دیکھ لیجیے -

خوجی نے کہا ہاں ہاں ایک ملازم سے ایک گلاس پانی تو جلد کہیں سے مانگ لینا - ایک ٹھٹھول آدمی نے گلاس دیا مگر پانی ندارد - خوجی افیم کی پینک میں تو تھے

ہی دیکھ کر کہا سب لیس ہے معاملہ۔ دو چار قدم چل کر خوجی کو یاد آیا کہ اس روز کی سکونت دریافت ہی نہیں کی چلا اٹھے یار و غضب ہو گیا۔ تھم جاؤ۔ جلوس روک لو۔

ملازم ۔ خیریت تو ہے۔

خوجی ۔ ہر مزجی بڑے خراب آدمی ہیں مجکو مکان کا پتہ تک نہیں بتایا۔ مگر تم جانتے ہو گے۔

ملازم ۔ کون مکان ۔ کیسا مکان ۔

خوجی ۔ وہی جی جہاں چلنا ہے۔

ملازم ۔ مجکو کیا معلوم جدھر کہیے چلوں ۔

خوجی ۔ مجھے تو کثرتِ کار سے فرصت نہ ملی مگر تم لوگ عجیب شخص ہو برات چلی اور عروس کے مکان کا پتہ تک نہ دریافت کیا غضب ہی کر دیا۔

ملازم ۔ خیر تو نام بتائیے دریافت کر لیا جائے۔

خوجی ۔ ارے بھئی دولہا کو دلہن کا نام نہ لینا چاہیے۔ اٹکل سے چلے چلو۔ اسی طرف تو ہے میری سسرال۔ تو پھر کیوں نہیں چلے چلتے۔

ملازم ۔ یا الٰہی کچھ نام تو بتائیے۔

خوجی ۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ اچھا پھر دریافت ہی کر لو پری سبز کوہ قاف کی پورا نام ہم نہ لیں گے۔

ملازم ۔ (ایک آدمی سے) اجی سبز پری کہاں رہتی ہیں۔

آدمی ۔ پرستان میں۔

خوجی ۔ دریں چہ شک۔ آج وہاں وہ تیاریاں ہوئی ہیں کہ پرستان بھی مات ہے مگر پوچھ لو کس طرف جائیں۔

ایک طرف چار سنار دکان پر بیٹھے ہوئے تھے ملازم نے پوچھا کہ کوئی پری یہاں رہتی ہے۔ ایک سنار نے کہا مجھے اور تو معلوم نہیں مگر شہر باہر پورب کی طرف جو ایک تالاب اور بڑا سا درخت ہے وہاں پر سال ایک درویش ٹکے تھے ان کے پاس ایک پری تھی۔

ملازم ۔ لیجیے پتہ مل گیا چلیے۔

خوجی دس بیس قدم چلے ہوں گے کہ مٹیڈا کی کوٹھی کا تالاب یاد آیا۔ چلا اٹھے خاہ یار و اس تالاب کی سجاوٹ آج قابل دید ہو گی۔ طلسمات کا نقشہ نمایاں ہو گا۔

طلسمات کا۔

ملازم۔ پھر چلیے کدھر۔

خوجی۔ اب خواہ مخواہ کہلایا ہی چاہتے ہو تو سنو۔ ہم اپنی عروس چار دہ سالہ کو ہمیشہ میئڈا کی کوٹھی میں دیکھا کیے ہیں وہیں برات چلے۔

ملازم۔ تو آپ نے پہلے ہی کیوں نہ بتا دیا۔ اب تک برات پہنچ گئی ہوتی۔ میئڈا صاحب تو نہایت مشہور آدمی ہیں چوک کے متصل کوٹھی ہے۔

خوجی۔ پھر اور نہیں کیا۔ کچھ ایسے ویسے کے گھر ہم شادی کرنے جاتے ہیں بھلا۔

وڈ صاحب نامے ملک اسپین کے ایک ملک التجار کی کوٹھی قسطنطنیہ میں تھی۔ بڑے مالدار آدمی تھے ایک مرتبہ کسی انگریز دوست سے انھوں نے اسپین کے آرمیڈا نامی مشہور جہاز کے بیڑے کی بہت تعریف کی۔ دوست نے ہنس کر جواب دیا کہ وہاں میئڈا صاحب کو مگر بھاگتے راہ نہ ملی تب سے از راہ مذاق ان کو میئڈا صاحب کہتے تھے بعد چندے وہ کوٹھی عوام میں میئڈا صاحب کی کوٹھی کے نام سے مشہور ہو گئی۔ میئڈا صاحب نہایت ترش اور سرکہ جبیں آدمی تھے۔ ان کے دو جوان لڑکے تھے دونوں کا بیاہ ٹھہرا ہوا تھا مہینوں سے تیاریاں ہوتی تھیں۔ احباب دور دور سے بلائے گئے تھے۔ اتفاق سے ان کی میم علیل ہو کر چار دن میں چل بسیں۔ تیسرے دن ایک لڑکا علیل ہوا۔ لاکھ لاکھ تدبیر کی مگر بے سود تین ہی دن بعد یکے بعد دیگرے دونوں چل بسے۔ میئڈا صاحب کے نام سے برات انھیں کی کوٹھی پر چلی۔ مس روز کا ملازم سب حال سن رہا تھا اس نے آن کر ان سے کل کیفیت بیان کر دی۔

مس روز۔ ایں گل دیگر شگفت۔

ہرمز جی۔ پھر آپ کیوں کمیدان صاحب کو دق کرتی ہیں کہلا بھیجیے کہ برات لوٹ آئے۔

گیل۔ غضب ہو گیا۔ وہاں اس ہفتے میں کئی حادثے ہوئے ہیں۔

ہرمز جی۔ (نوکر سے) ذرا وڈ صاحب کے آدمی کو سمجھا دو وہ کہہ دے گا کہ یہ بہروپیا بیاہ کی خبر سن کر آیا ہے۔ حادثے کا حال اس کو معلوم نہیں۔ ورنہ بچا کی جان پر بن آئے گی۔

برات کوٹھی کے پھاٹک پر پہنچ کر ذرا اڑ گئی۔

حادثے کے دوسرے روز آٹھ بجے شب کو صاحب نہایت ملول ہو رہے تھے کہ کانوں میں شور اور غل کی آواز آئی نیند اچٹ گئی۔ پوچھا کہ یہ کیسا غل ہے۔ آدمی نے باہر

سپاہیوں سے کہا۔ دیکھو کون غل مچاتا ہے خوب پیٹو بدمعاش کو۔ دو تین آدمی پھاٹک سے برآمد ہوئے۔

خوجی۔ واہ وا رے آپ کے یہاں کی امارت وانتظام کب سے برات کھڑی ہے۔ دروازے پر روشنی تک ندارد۔

وہ لوگ بڑے بگڑے۔ ایک نے کہا ابھی گردن ناپو اس مردک کی اور خوب پیٹو مردود کو۔

خوجی۔ (سمجھ گئے کہ گالیاں دیں) او گیدی یہ گالیاں کیسی۔

صاحب کے آدمی نے غصے میں آکر۔ سائیس کو ایک ٹھوکر ماری وہ گر پڑا۔ خوجی کے سر پر ایک چپت رسید کی۔ تو پگڑی وہ جا کر گری دوسرے نے ایک ڈنڈا لگایا۔ ٹٹو کے پانو میں لگا وہ بیٹھ گیا۔ اب لگی خوجی کے سر پر چپت بازی ہونے۔

خوجی۔ نہ بھائی ایسی دل لگی نہ کرو۔ (پھر بگڑ کر) کچھ کم بختی تو نہیں آئی تم سب کی۔ دیر ہوتی جاتی ہے۔ اور اندر خبر نہیں کرتے۔ مالک سنیں گے تو نکال ہی کے چھوڑیں گے تم سب کو۔

دس پانچ آدمی اور کھڑ بڑ کرتے اندر سے نکل آئے۔ ریچھ اور بندر نچانے والوں پر بے بھاؤ کی پڑیں۔ چراغ والے چراغ پھینک کر بھاگنے لگے اور لڑکے منتشر ہو گئے۔

اتنے میں ہرمزجی کے نوکر نے کہہ دیا کہ یہ بہروپیا بیاہ کی خبر سن کر انعام کے لالچ سے آیا تھا حادثے کا حال اس کو نہیں معلوم۔ معاف کرو۔

آدمی۔ تجکو معلوم نہیں کہ صاحب آج بدحواس ہیں اور مارے رنج کے ان کی جنون کی سی کیفیت ہو رہی ہے۔

خانساماں نے اس کا مطلب بتایا۔

آدمی۔ آج تمھارا خون ہوگا یہاں۔

خوجی۔ زہے نصیب جو معشوق کے کوچے میں جان جائے۔

ایک آدمی نے خوجی پر بھی دو ایک لگا دیں۔ دوسرے نے دس پانچ لٹھ ٹٹو پر جڑے ٹٹو ہنہناتا ہوا بھاگا۔ اور خوجی اپنا سا منھ لے کر ہرمزجی کی کوٹھی کو واپس آئے۔

اب سنیے کہ ادھر تو میدان کارزار میں میاں آزاد کے لب زخم چٹخارے بھر رہے تھے اور ادھر خواجہ بدیع الزماں شادی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اب ناظرین دنگ ہوں گے کہ خاک شادی کا خاکہ تو اڑا چکے۔ اب یہ شادی کیسی۔ خواجہ صاحب رسیا اور رنگیلے تو تھے ہی خوب رو اور نوخیز عورت پر نظر پڑی اور ریشہ خطمی ہو گئے مارے وحشت کے ہانپتے کانپتے دم پھول گیا مس روز کے ساتھ شادی کا شوق چرایا تو یاران سر پل نے کھوپڑی پلپلی کر دی۔ سرا میں ایک معشوق پری زاد سرو قد رشکِ شمشاد پر دل آیا۔ تو اس نے گود میں اٹھا کر شہر بھر ہنڈایا۔ اب ایک اور پری پیکر رشکِ قمر پر حضرت بدیع الزماں ریجھے۔ مس میڈا اور ہرمز جی بھائی اور کل احباب خوش مذاق سے اکڑ کر کہا آج خواجہ صاحب پر ایک اور پری مرنے لگی۔ صورت دیکھتے ہی محبت کا دم بھرنے لگے۔ انھوں نے کہا سلامتی سے آپ خوش رو جوان ہی ایسے ہیں کیوں نہ ہو خواجہ صاحب تمام قسطنطنیہ میں آپ کی خوب صورتی کی دھوم ہے جو دیکھتا ہے عش عش کر جاتا ہے۔ ایک رئیس زادی نے کل میرے نام خط بھیجا ہے کہ آپ کی کوٹھی میں وہ گرول ڈیل آدمی کون ٹکے ہیں بھئی تم ذرا سمجھ بوجھ کے بازار میں نکلا کرو۔ خواجہ صاحب اور بھی ریشہ خطمی ہو گئے۔ اکڑ کر کہا۔ اب خدا ہم کو نظر بد سے بچائے جدھر نکل جاتے ہیں لوگ خواہ مخواہ گھورتے ہیں۔ حسن بھی کیا شے ہے۔ خدا کی امانت ہے ہرمز جی بھائی سے پوچھا کیوں صاحب وہ رئیس زادی جو ہم پر جان دیتی ہیں ان کا مکان کہاں ہے دور تو نہیں ہے۔

ہرمز جی۔ اب کیوں، شادی مرگ نہ ہو جائے گا۔ پہلے انھوں نے خط بھیجا اور کہا کہ خدا راہمیں اس جوان قوس ابرو کے نام سے اطلاع دو۔ اور کوئی تدبیر ایسی کرو کہ ہم ان سے باتیں کر سکیں۔ پھر خود دوڑی آئیں۔ کہا وہ کڑیل جوان کہاں ہیں۔ دل و جان سے عاشق ہے۔ پری ہے پری۔

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

خوجی۔ پھر آپ کو کیا۔ اللہ رے حسد! کچھ ٹھکانا ہے! سنیے مشفق خدا اپنے سب بندوں پر یکساں مہربان ہے کسی کو دولت دی کسی کو صاحب اولاد کیا کسی کو علم کی دولت بخشی کسی کو زر عطا کیا۔ ہم کو دولتِ حسن عطا کی۔ اللہ میاں کی دین ہے اس میں کسی کے باپ کا اجارہ نہیں۔ مگر ہم غریبوں کو اس قدر حسن دیا تو کیا۔ یہ حسن شہزادیوں بادشاہ زادیوں

کے قابل تھا نہ کہ مردوں کے لایق۔

ہرمز جی ۔ خواجہ صاحب جو کہیں آپ عورت ہوتے تو معاذ اللہ ستم ہی کرتے ہزاروں خون ہو جاتے ۔ تلواریں چلتیں خون کی ندیاں بہتیں اور ہم کو تو یقین واثق ہے کہ دو ایک ملکوں میں آپ کے سبب جنگ چھڑ جاتی ۔ لاکھوں کی جان پر بن آتی ۔ خوب ہوا کہ آپ عورت نہیں ہوئے ۔

خوجی ۔ اب اس دکھڑے سے کیا مطلب ہمیں اس پری کا صنم خانہ بتاؤ ۔

ہرمز جی ۔ ہم آپ کی گفتگو نہیں سمجھے ذرا سمجھ کر کہیے صاف صاف ۔

خوجی ۔ اس خانساماں کو بلوائیے تو سمجھاتا جائے یہ ذرا نازک معاملہ ہے ایسا نہ ہو کہ ہم کچھ کہیں آپ کچھ سمجھیں یوں میں ان نہ پٹے گی

اے عشق قطع کردہ رہِ سلسبیل را ۔ از ما سلام شوق رساں جبرئیل را

راوی ۔ اہو ہو ہو بعد مدت ایک برجستہ اور فی البدیہ شعر سبحان گیہاں خواجہ بدیع الزماں صاحب کی زبانِ مبارک سے سننے میں آیا گفتگو سے کس قدر چسپاں ہے کہ گویا شاعر نے اسی موقع کے لیے یہ شعر موزوں کیا تھا ۔

ہرمز جی ۔ اور ہم جو نہیں بلوا دیں تو کیسی ہو ۔ مشکور ہو یا نہیں ۔

خوجی ۔ کیا خوب نیکی اور پوچھ پوچھ ۔ پوچھ خاصے رہے پھر بلوا دیجیے ۔

ہمنشیں جب مرے ایام بھلے آئیں گے ۔ بن بلائے وہ مرے گھر میں چلے آئیں گے

ہرمز جی اور مس میڈا نے باہم مشورہ کیا کہ دل لگی دیکھنے کے لیے کسی عورت کو بلوانا چاہیے ۔ ہرمز جی نے خواجہ صاحب سے کہا حضرت آپ ذرا سج دھج بنا کے بیٹھیے تو ہم پری پیکر بلوائیں دیکھتے ہی جان نہ قربان کر دو تو سہی ۔

خواجہ ۔ ہاں تو کیا ہم سے بھی زیادہ حسین ہے ۔ اللہ اللہ !!

ہرمز جی ۔ کچھ آپ سے گھٹ کے بھی ہے حور کا بچہ ہے ۔

خواجہ ۔ اور ہم بھی تو حور کے بچے ہیں ۔ ہیں یا نہیں ۔

خواجہ بدیع الزماں نے ہرمز جی سے کئی سوال کیے ۔

سوال ۔ پہلے تو ہمیں یہ بتائیے کہ سن و سال کیا ہے ۔ ٹھیک ٹھیک کہنا ۔

ہرمز جی ۔ سن و سال ابھی سن کیا ہے یہی کوئی پچاس برس کا ۔

خوجی ۔ اے ہے بس ابھی اٹھتی جوانی ہے ۔ پچاس برس کی چھوکری ہے ابھی نام

خدا اٹھتی جوانی ہے۔

خدا زبہت، ناداں درا دسن تو کرے
ستم کے تو بھی ہو قابل خدا وہ دن تو کرے

کیوں صاحب عمر تو معلوم ہوئی۔ اب یہ فرمائیے کہ قطع شریف کیا ہے۔

ہرمز جی۔ ہر عضو بدن سانچے کا ڈھلا ہوا۔ ہر رگ وپے میں آبنوس کوٹ کوٹ کر بھرا ہے اور چہرے پر وہ رنگ و روغن ہے کہ جلتے بلتے توے پر تیل پڑے تو بھی اس قدر نہ چمکے۔

خوجی۔ اہو ہو ہو یہ چمک دمک۔ اچھا نزاکت کا کیا عالم ہے۔

ہرمز جی۔ بس یہ نہ پوچھیے۔ نزاکت کا یہ عالم ہے کہ ویلر گھوڑے پر اگر سوار ہو تو اس کی کمر لچک جائے۔ بہتر جگہ سے بل کھائے۔

خوجی۔ اہا ہا۔ بس ایسی ہی جورو تو ہم چاہتے ہیں اور کیا۔

کمر تک جو زلفِ چلیپا گئی   یہاں وہ کمر لاکھ بل کھا گئی

ویلر گھوڑے تک کی کمر لچک جائے یہ نزاکت کا عالم ہے۔ !!! نازنینی کا خاتمہ ہے۔ حسین تو ہم بھی ہیں مگر اس درجہ نازک بدن نہیں خدا نے چاہا تو اتوار ہی میں شادی ہو جائے، ہم بھی خوب صورت وہ بھی خوب صورت پھر شادی میں طرفین سے عذر کس کو ہو سکتا ہے۔ جس دن دم توڑوں گا اپنے نازک بدن نازنین نازک کمر معشوق کی طرف مخاطب ہو کر یہ شعر ضرور پڑھوں گا۔

ڈال دے سایہ اپنے آنچل کا   ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

مسٹر بیڈا۔ اگر ہماری دعوت نہ کی تو ہم شادی نہ ہونے دیں گے۔

خوجی۔ ارے ہے لاحول ولا قوۃ۔ کلمۂ نفی زبان سے نہ نکالو (نہ) تو منحوس لفظ ہے یہ کہو کہ خدا کرے ہنسی خوشی بیاہ ہو جائے۔

ہرمز جی۔ ناک کی تعریف کروں تو لوٹ پوٹ ہو جاؤ۔

خوجی۔ اجی ناک گئی ایسی تیسی میں کل سراپا کی تعریف کرو۔

ہرمز جی۔ اچھا یوں ہی۔ کان لمبے لمبے۔ ہندوستان کے ہاتھی کے کانوں کے برابر اور بلند اقبالی کی یہ کیفیت کہ اونچا سنتی ہیں قوتِ سامعہ بے بہرہ ہے اور آنکھ تو ایسی

دیکھی ہی نہیں - ایک ایک ماشے کی آنکھ ذرا ذرا سی جس وقت ہنستی ہے آنکھیں بند ہو جاتی ہیں - یہی معلوم ہوتا ہے کہ آنکھ ہی نہیں ہے - یہ کمال حسن ہے کہ آنکھ موجود ہو اور پھر بالکل مفقود اور جو ذرا غصہ آیا تو گاؤ دیدہ - پلکیں ندارد - آنکھوں کا جوبن اس سے اور دوبالا ہو گیا اور بھوؤں کی یہ کیفیت ہے کہ ایک طرف بالکل صفا چٹ - یہ بہت مشکل ہے اور دوسری طرف دو چار بال - آنکھ چھوٹی - بھوئیں ندارد - پلک کا پتہ ہی نہیں - گال پھولے پھولے جیسے نان پاؤ - یا خمیری روٹی یا ہوائی تکیہ اور رخساروں پر اس قدر رحنیت ہے کہ بیان سے باہر - جسم از سرتا پا جیسے تمباکو کا پنڈا آبنوس کا کندا - کالا کالا منہ سفید سفید دانت بعینہ جیسے تمباکو کے پنڈے ہر ٹیاں کوڑیاں جمی ہوں - پانوں ذرا ذرا سے کوئی آدھ آدھ گز کے لعبتان چینی ایسے چھوٹے چھوٹے اور ننھے منے پانوں دیکھ لیں تو شرما جائیں - بازار میں اگر جوتا پہننے جائے تو اپنے پانوں کا جوتا نہ پایئے - آدھ آدھ گز کے ذرا ذرا سے کسی کے پانوں ہوں گے - قد سر سے بھی زیادہ لمبا -

اگر بوسہ لینے کو جی چاہے تو درخت پر چڑھ جایئے یا اونٹ پر سوار ہو کر بوسہ لے کوئی ڈھائی انچ کے قریب قد زیبا ہو گا -

راوی - یہاں پر جلمہ کھا گئے یہ ہجو ملیح تھی - ڈھائی انچ کا قد اللہ اللہ سرو اور تاڑ دونوں کی اصل وحقیقت نہیں -

خوجی - مزاج کی تعریف تو کیجیے - مزاج کیسا ہے رعونت تو نہیں ہے -

ہرمز جی - میں ادھوری بات نہیں کرتا - پہلے سراپا کی صفت سن لیجیے ٹانگیں ایسی سڈول کہ واہ جی واہ ایک ٹانگ سے دوسری ٹانگ کوئی دو فٹ لمبی چلنے کے وقت آتو کرتی چلتی ہے -

خواجہ صاحب اس دل ربا طناز کے حسن وجمال کی تعریف سن کر عاشقِ زار ہو گئے ہزار جان سے نثار ہو گئے -

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد　　　بسا کیں دولت از گفتار خیزد

ہرمز جی بھائی نے کہا ساری خدائی میں جو عورت آپ نے دیکھی ہو گی دونوں پانو زمین میں برابر پڑتے ہوں گے - مگر اس کی چال مستانہ کی شان ہی اور ہے ایک

پانوں اونچا ایک پانوں نیچا پڑتا ہے ایسی چال کسی معشوق کی کاہے کو ہوگی اور سب حسن ایک طرف خرامِ ناز ایک طرف۔ کبک اور تدرو کا نام ہی مشہور ہو گیا۔ یہ اونچا نیچا پانوں طیور کا کیوں کر پڑ سکتا ہے اور جب اونچا نیچا پانوں پڑتا ہے تو وہ

تن جاتی ہے ہائے ستم وائے ستم چال کیا اظہارِ رمزِ نشیب و فرازِ عالم ہے۔

خوجی۔ ہونہہ۔ اس حسد سے خدا سمجھے۔ کہنے لگے ہائے ستم۔ وائے ستم۔ وہ پانوں چاہے جیسا پڑے آپ کو کیا۔ وہ ہماری ہم اس کے آپ ہوتے کون ہیں آپ سے مطلب ہی کیا ہے۔ ہرمز جی نے اقرار کیا کہ دو گھنٹے میں ہم رشکِ قمر کو بلوالیں گے خوجی بازار میں چلے تو خوب تنتے اکڑتے بررتے ہوئے۔

خوجی دل میں خوش کہ دورویہ عورتوں مردوں کی ہم پر نظر پڑتی ہوگی۔

چلتے چلتے ایک کوٹھی میں داخل ہوئے وہاں دو فرانسیسی لیڈیاں کچھ اسباب خرید رہی تھیں۔ حضرت بھی قریب جا کر ڈٹ کے کھڑے ہوئے۔

ایک لیڈی۔ (فرانسیسی زبان میں) تم یہاں کیوں کھڑے ہو گئے۔

سوداگر۔ (ترکی زبان میں) یہاں پر کھڑے ہونے کی کیا ضرورت ہے ادھر ادھر اسباب دیکھیے تمام کوٹھی بھری ہوئی ہے۔ سمجھے کہ نہیں سمجھے۔

خوجی۔ کچھ کچھ سمجھے کچھ کچھ نہیں سمجھے۔ اچھی طرح بیان کرو۔

سوداگر۔ یہ کیا وجہ ہے کہ جہاں معزز لیڈیاں کھڑی ہیں وہاں آپ جا کر کھڑے ہو گئے نہ کوئی شے خریدتے ہو نہ اسباب دیکھتے ہو۔ انھیں کا منہ تک رہے ہو اب ہٹتے ہو کہ کچھ اور فکر کروں۔

خوجی۔ ابے ہم ان کا منہ تاکتے ہیں یا وہ ہمارا منہ تاکتی ہیں بے وقوف پاگل آدمی۔ ہمارا سا کڑیل جوان کوئی دکھادے تو دے۔ دو گھنٹے میں ہرمز جی کی کوٹھی میں آ تو ایسی پری دکھادوں کہ آنکھیں کھل جائیں۔ وہ ہاتھ جوڑ کے کہے گی کہ ہمارے ساتھ شادی کر لو ہم کہیں گے ہرگز نہیں۔ وہ محبت کرے گی ہم معشوق بن جائیں گے۔ وہ جھڑکیاں سہے گی اور کہے گی میں عاشقِ زار ہوں دل دادہ نرگسِ بیمار ہوں ہم کہیں گے (نہیں نہیں)، وہ گلے میں ہاتھ ڈالے گی، ہم کہیں گے الگ الگ نہیں نہیں۔ تب وہ یہ شعر پڑھے گی ؎

کالی سہی ادا سہی چیں بر جبیں سہی
یہ سب سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی

سوداگر سمجھا کہ پاگل ہے آدمیوں سے کہا اس کو یہاں سے ٹہلاؤ۔ اس پر ان دونوں لیڈیوں میں سے ایک بتِ عربدہ جو نہایت شوخی کے ساتھ مسکرائی تو خوجی سمجھے ہماری ادا اس کو دل و جان سے بھائی اور بھی اکڑ گئے۔ اکڑے ہی تھے کہ پیچھے سے ایک آدمی نے مشکیں کس لیں دوسرے نے گردنا بتایا۔ خوب پٹے۔

خوجی۔ او گیدی او بہروپیے۔ اچھا بچہ چچا بنا کے چھوڑوں تو سہی۔ اگر جواں مرد ہے تو آجا سامنے بمصر کے پہلوانوں کو تو ہم نے پٹخنی بتائی تو کیا ہے۔

سوداگر۔ اس کو باہر لے جاؤ کوئی شیشہ نہ توڑ ڈالے۔

خوجی۔ قسم ہے اپنے مرید کی اگر اس وقت قرولی ہوتی تو اتنی بھونکتا کہ تکے تکے اڑا دیتا۔ سر یہ گرتا دھڑ وہ گرتا۔ ایک فیر میں کام تمام کر دیتا گیدا نیاں کی ہیں بھاڑ نہیں جھونکا کیے ہیں۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری

اس پر لیڈی نے قہقہہ لگایا۔ زبان تو اس کی سمجھ ہی میں نہیں آئی۔ مگر ان کے قد و قامت خط و خال اور چال ڈھال اور طرزِ بیان پر بڑی ہنسی آئی۔ دوسری بڈی کی طرف اشارہ کیا کہ یہ دیوانہ اس وقت کیا اچھل کود رہا ہے خوجی نے اس لیڈی کی طرف دیکھ کر اشارہ کیا۔ چہ خوش چرا نہ باشد۔ ع

رخ میری طرف نظر کہیں اور
ہے کونسی یہ وضع بھلا سوچیے تو آپ باتیں ادھر کو کیجیے ادھر آنکھ ماریے

آدمیوں نے دھکے دے کر ان کو باہر نکالا۔ دروازے پر کھڑے ہو کر انھوں نے غل مچایا بھلا بے گیدی بھلا۔ سمجھا جائے گا۔ بچہ فرانس کی لیڈیاں جو ہم ایسے کڑیل جوان کو دیکھ مسکرائیں تو حسد کی آگ بھڑکنے لگی۔

کوئی دو گھنٹے کے بعد خواجہ صاحب مٹر گشت کر کے ہرمز جی کی کوٹھی پر شاداں و فرحاں پہنچے۔ دیکھا ہرمز جی باغ میں نہار ہے ہیں قریب جا کر کہا۔ ایہا الہرمز جی۔ آج دو کو اور گھائل کیا۔ فرانس کی دو پریاں ایک کوٹھی میں اٹھلا رہی تھیں خواجہ بدیع بھی دن سے داخل ہوئے تو ڈورے ڈالنے لگیں۔ استاد خدا نظرِ بد سے بچائے جو دیکھتا ہے ریجھا جاتا ہے۔ حسن اس کو کہتے ہیں۔ یہ حسن خداداد ہے۔

اتنے میں ایک گاڑی آئی ہرمزجی نے کہا لو وہ آگئیں۔ مگر افسوس ہے کہ آج آپ نے سنگار نہیں کیا۔ اب نکھر کے آؤ خوجی تن کے کرسی پر بیٹھے اور باوازِ بلند اس مصرع کو ترجمانِ دل کیا گو میاں مٹھو بنے مگر شاعری میں تعلی بھی جائز رہے۔ حالانکہ یہ تعلی نہ تھی۔

برآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روے زیبالا

گاڑی سے ایک بھدی دیولی ڈھنگی بوڑھی عورت اتری۔ ٹھلی تو ایک پانوں عرش بریں پر۔ دوسرا تحت الثریٰ میں۔ خوجی نے اس دیولی کو دیکھا تو کھڑے ہو گئے۔ ہرمزجی نے کرسی پر بٹھایا مٹیڈا نے خوجی سے کہا۔ (لیجیے اب باتیں کیجیے) خوجی کچھ یوں ہی سا مطلب سمجھے۔

خوجی۔ ہرمزجی بھائی۔ انھوں نے بھی کہا نہ کہ ان کو غور سے دیکھو ان سے کہہ دیجیے کہ دیکھیے پاپوش ہم معشوق ہیں کچھ عاشق تھوڑا ہی ہیں یہ باتیں کریں ہم۔ ن۔ خ۔ معاملے کی بات ہے کہ نہیں۔

مٹیڈا۔ بھلا تم حسین ہو یا یہ حسین ہیں سچ سچ کہنا ہاں۔

خوجی۔ اس میں کہنا سننا کیا ہے۔ حسین ہم اور یہ دونوں ہیں مگر فرق یہ ہے کہ یہ عورت ہے پری زاد۔ ہم مرد ہے ہیں دیو زاد۔ ٹرخ ٹرخ نور دونوں کے رُخِ زیبا سے برس رہا ہے وہ آفتاب ہم مہتاب۔ مگر ان کی نزاکت ستم ہے ہم اس قدر نازک بدن نہیں ہیں۔

ہرمزجی۔ ہاتھ تو ملاؤ آخر باتیں کرو گے یا نہ کرو گے۔ ہاں ہاں باتیں شروع ہوں۔

خوجی نے کہا ہمیں کیا غرض ہے جسے غرض ہو ہاتھ ملائے۔ وہ عورت سکھائی پڑھائی تو تھی ہی اشارہ پاتے ہی خوجی کی ناک اس زور سے پکڑی کہ ان کا دم نکلنے لگا۔ جب دس بارہ سکنڈ کے بعد ناک چھوڑی تو خوجی دس قدم پیچھے ہٹ گئے۔ ناک سرخ بیر بہوٹی بنی ہوئی۔

مٹیڈا اور ہرمزجی منہ پھیر کر ہنسنے لگے۔ وہ عورت بھی کسی قدر مسکرائی۔

خوجی۔ (بگڑ کر) واہ اچھا غمزہ ہے ناک ہی پکڑ کے مل ڈالی۔

ہرمزجی۔ ایں چپ ایسا نہ کہنا۔ ثابت قدم رہو تمھاری طاقت آزمائی ہے ڈٹے بیٹھے رہو ورنہ معاملہ بگڑ جائے گا۔ یہی موقع ہے۔

خوجی - واہ طاقت کی ایک ہی کہی - خدا کرے مصر والا پہلوان آجائے - تو پھر ان کو ہماری طاقت کا اندازہ ہو - ہرمزجی صاحب ایسا پہلوان تھا کہ بس میں کیا کہوں - ادھر دیکھو یہ پنچہ! ہاتھ دکھا کر) یہ کلا ٹھلا۔

اتنے میں وہ دیوتی اٹھی اور خوجی کے دونوں کان پکڑ کر اس زور سے ہلایا کہ آنتیں تک ہل گئیں - دو تین بار اس زور سے جھٹکے دیئے کہ خوجی کے پنتھر بگڑ گئے - خواجہ بدیع الزماں کی جان پر بن گئی - مگر ہرمزجی نے پٹی پڑھادی تھی کہ طاقت آزمائی ہے قہر درویش بر جانِ درویش پچپکے ہو رہے لیکن نیم جاں ہانپنے لگے ناک میں دم۔

ہرمزجی - اب شادی کی تاریخ مقرر کی جائے - کل پرسوں نرسوں۔

خوجی - پرسوں - مگر یہ تو نازک ایسی ہیں کہ ہمیں ڈر معلوم ہوتا ہے - انتہا سے زیادہ نازک بدن ہیں - ہڈیاں ہی ہڈیاں ہیں - گوشت ندارد۔

گفتگو ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ اس عورت نے خوجی کو اٹھالیا اور ایک روش میں پٹک کر ٹانگ رکھ دی تو دم نکلنے لگا - بس نزاکت کا خاتمہ ہے - اللہ رے نازکی۔

خوشی اور رنج

اِدھر ترکانِ تہمتن لشکر شکن، اور اُدھر روس کے جوانانِ جنگ جو میدانِ نبرد میں بادلِ سرد و آہِ پر درد پڑے آنکھیں مانگتے تھے دونوں فوجیں ضربتِ شمشیر آب دار سے سخت مجروح ہوئی تھیں - شام سے آدھی رات تک اس درجہ طاقت اور ہوش و حواس نہ تھے کہ ہل سکیں - کوئی بے ہوش پڑا تھا کوئی سسک رہا تھا - کوئی مرغِ بسمل کی طرح تڑپتا تھا مارے زخموں کے بدن رنگین اور دشتِ ستم لالہ زار تھا ہر فرد بشر اجل سے دوچار تھا جب عروسِ شب کی زلف تا بہ کمر پہنچی تو۔

مہِ روشن از تیرہ شب تافتہ — چو آئینہ روشنی یافتہ
دو لشکر بہ یک جا گروہ آمدند — شدند از خصومت ستوہ آمدند

زخمیوں نے العطش العطش کی آواز بلند کی - جن لوگوں نے کم زخم کھائے تھے وہ مشکیزوں اور ابریقوں میں پانی لائے - ڈاکٹروں نے زخمیوں کی مرہم پٹی کی

فکر کی۔ اس درجہ ہڑبونگ تھا کہ روسی اور رومی میں ذرا فرق نہیں معلوم ہوتا تھا۔ روسیوں نے رومیوں کو پانی پلایا۔ ترکوں کے مشکیزے آبِ سرد سے بھرے ہوئے رومی زخمیوں کے حصے میں آئے۔ ترکی جراحوں نے مجروحینِ روسی کا علاج کیا۔ روسی ڈاکٹروں نے ترکوں کا ہاتھ بٹایا۔ دو تین گھنٹے کے بعد روسی اپنے مورچے پر گئے، رومی اپنے مورچے پر زخمی ڈولیوں میں لد کے آئے۔

آزاد پاشا زخموں کے سبب سے سخت مصیبت میں تھے آٹھ روز تک اِن کی حالت ردی رہی۔ یہاں تک کہ ایک دن ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ اس حالتِ نومیدی میں آزاد نے حسن آرا کے نام ایک نامۂ منظوم لکھا۔ جس کے حرف حرف سے حسرت اور مایوسی ٹپکتی ہے لفافہ بند کیا۔ اور بہ صد خشوع و خضوع ایک افسر سے کہا کہ مہربانی کر کے یہ خط اسی وقت روانہ کر دیجیے مگر خدا مسبب الاسباب ہے پندرہ دن کے عرصے میں آزاد پاشا کے زخم بھر گئے، اور بیسویں روز پھر مورچے پر گئے۔ آزاد پاشا کی بسالت کا روز ایک نیا ثبوت ملتا تھا۔ جس روز ان کے زخموں میں جراح کاملِ فن نے ٹانکے لگائے کسی کو امید نہ تھی کہ آزاد اس سختی کو برداشت کر سکیں گے مگر واہ رے آزاد اف تک نہ کی۔ جراح کا ہاتھ کانپنے لگا۔ تو آزاد پاشا نے مسکرا کر کہا۔ ایں۔ عمر بھر یہ پیشہ کرتے رہے اور زخموں کو دیکھ کر ڈرتے ہو۔ یہ تو تمغائے جوان مردی ہے ہمیں دیکھیے کس جواں مردی کے ساتھ لڑے اور زخم کھائے تم سے ٹانکے نہیں لگائے جاتے۔ جس وقت یہ کلمہ آزاد شیر دل کی زبان سے نکلا۔ حاضرین نے نعرۂ توصیف بلند کیا اور سپہ سالار عساکر سلطانی نے پیٹھ ٹھوک کر کہا شاباش ع آفریں باد بریں ہمتِ مردانۂ تو۔ ع ایں کار از تو آید مرداں چنیں کنند۔ سپہ سالار نے حضور وزیرِ جنگ کو بھی اس اشجع افسر کی جرأت سے اطلاع بخشی۔ اور وزیرِ جنگ نے بہ طیب خاطر پروانۂ خوش نودی عطا فرمایا جو آزاد پاشا کی تعریف و توصیف سے مملو تھا۔

اب سنیے کہ ایک روز روس کے یلانِ آزمودہ کار اور ترکی کی فوج جرار صف باندھ کر مقابل میں کھڑی ہوئی۔ رومی جانب میمنہ روسی جانب میسرہ، دونوں لشکروں کے جوانانِ کشورِ آشوب تلے ہوئے کہ شمشیرِ ہمدردی کے جوہر دکھائیں۔ اِدھر روس کی فوج سے۔

دہل کوب شد بر دہل خشم ناک　　　برآورد فریاد از آب و خاک

روسی نوجوانانِ لشکر شکن فوجی باجا سنتے ہی ست ہو گئے اور ادھر فوجِ روم سے صدائے زنگ آنے لگی۔

زغریدں کوس خالی دماغ　　　ہمی لرزہ افتاد در کوہ و راغ

دائیں دائیں کی آواز سے کوہ و ہاموں میں زلزلہ پڑ گیا۔ دودِ اتواپ اژدر دہان سے کائنات الجو میں ابرِ سیہ چھا گیا۔ توپوں پر بتی پڑتی تھی فوج جان پر کھیل کر لڑتی تھی۔ دم کے دم میں ہزاروں گل رخاں گل بدن کفن پوش ہوئے بے شمار مردانِ کارزار صنمِ اجل سے ہم آغوش ہوئے۔ ہر درا کی صدائے مست سے آواز نکلتی تھی کہ ہاں غازیانِ سکندر شاہ بڑھے ہوئے۔ ہاں شیرانِ نیستانِ وغا قدم جمے رہیں رکاب ظفر انتساب سے حمیت گرم، ہم عنانی ہے فوج ظفر موج نمک پروردہ حضرتِ سلطانی ہے سروں کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ دھوئیں سے گھٹا ٹوپ اندھیر اچھایا ہوا تھا لوگوں سے دم بھر مہلت نہیں ملتی تھی۔ وہ گولا آیا۔ وہ راکب گرا اور پشتِ مرکب خالی نظر آنے لگی۔ دوسرا گولا آیا پھٹا تو بیس ٹکڑے۔ ایک ایک ٹکڑے نے دس دس کے ٹکڑے کیے۔ اس وقت صدہا خوش رُو اور خوش خو نوجوانوں کی جان گئی۔ ایک نوخیز جونیر افسر ایک معزز ترکی تاجر کا لڑکا تھا۔ والدین سے لڑ جھگڑ کر شریکِ نبرد ہوا تھا تاجر بوڑھا آدمی پیر فرتوت ایک ہی لڑکا حسن میں بے نظیر۔ فصیح و خوش تقریر عین عنفوانِ شباب چندے آفتاب چندے مہتاب شادی کو دو ہی مہینے ہوئے تھے کہ عروس اجل سے ہمکنار ہوا۔ دو میدانوں میں پالا جیت چکا تھا مگر جنگ دوسر دلیرد۔ اب کی ایسا پھنسا کہ ایک گولے نے کام ہی تمام کر دیا۔ پشت توسن سے گرا تو اللہ اکبر اللہ اکبر کے سوا اور کوئی کلمہ زبان سے نہ نکلا۔ اور اس بے کلی اور بے کسی کی حالت میں دم توڑا۔ آزاد کے قریب ایک سوار کہ سمند وغا پسند تھا۔ یہ بے چارہ اندھی اور لنجی بیوی کو ایک خادمہ کے سپرد کر کے جان دینے کے لیے میدان میں آیا تھا۔ آفریں صد آفریں۔ گولے کا ایک ٹکڑا لگا تو دہم سے گرا قضا نے مہیب شکل دکھائی تو سوار اجل رسیدہ کو اپنی لنجی اور اندھی بیوی یاد آئی۔ سوچا کہ اب وہ بے چاری مصیبت کی ماری کیا کرے گی۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گی۔ اس قابل بھی نہیں کہ بھیک مانگ کھائے یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مرغِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ایک گولہ

نداز پیرانہ سالی کے عالم میں سرکاری نوکری قبول کر کے اس غرضِ خاص سے آیا تھا کہ روس کی فوج میں تاک کر گولے اتارے چن چن کے افسروں کو مارے ساری خدائی میں اس پیر مرد کا بجز ایک پانزدہ سالہ دخترِ زہرہ جبیں کے اور کوئی عزیز کوئی رشتے دار نہ تھا۔ جس وقت پیر مرد نے عزمِ جنگ کے لیکر ہمت چست باندھی۔ لڑکی نے دامن پکڑ لیا اور کہا ہم نہ جانے دیں گے؛

گو بوڑھا گولہ انداز اپنے فن میں یکتا اور عدیم السیم تھا نہایت دانائی اور بخردی کے ساتھ گولے اتار رہا، تھا۔ دفعتہً پیکِ اجل لبیک کہتا ہوا سر بر آن کھڑا ہوا ایک روسی گولہ انداز نے ایسا تیر بہ ہدف نشانہ لگایا کہ پیر مرد کا دھڑ اڑ کر پچاس قدم پر گرا اور ٹانگیں کٹ کر توپ کے پاس گریں "افسوس پیر مرد کے مرنے کا غم نہیں۔ مگر حسرت یہ ہے کہ اس بے چاری پدری پیکر پر کیا گزری ہوگی پیر مرد نے تو وہ کارِ نمایاں کیا جو یادگار رہے مگر اس بے چاری کی خدا جانے کیا نوبت ہوئی ہوگی۔

روسیوں کی طرف بھی صدہا آدمیوں کا سر خاک و خون میں غلطاں۔ پچاسوں لڑکے یتیم ہو گئے۔ سیکڑوں پری تمثال عورتوں کو سہاگ کے عوض سوگ نصیب ہوا۔ والدین کی زندگی تلخ ہو گئی۔ ہزارہا آدمیوں کی تمناؤں کا خون ہوا۔ آخر کار ترکوں نے بہ سرکردگی پیہ سالار جنگ آزما روس کی فوج کو دو جانب سے گھیر لیا۔ تیسری سمت ایک دریائے ذخار موجزن تھا اور چوتھی طرف ایک لق و دق جنگل۔ جب دو طرف سے باڑھ پڑنے لگی تو روسی فوج کی کمرِ ہمت ٹوٹ گئی۔ تھوڑی دیر تک یلاں نامور نے خوب مقابلہ کیا مگر جب دیکھا کہ ترکی فوج یورش کرتی چلی آتی ہے اور روسی سپاہ مجبور ہو کر پیچھے ہٹتی جاتی ہے تو مقابلے کو خلافِ مصلحت سمجھ کر یہ صلح فرار پائی کہ جنگل کے رخ بھاگیں۔ چند سواروں کو ترکانِ خوں خوار کے مقابلے کے لیے چھوڑ کر فوجِ روسیہ نے جنگل کی راہ لی۔ اب سنیے کہ ترکوں نے دو پلٹنیں پہلے ہی سے بھیج دی تھیں۔ تھوڑی دور تک فوجِ روس گئی تھی کہ ترکوں نے جو کمیں گاہ اور جھاڑیوں کی آڑ میں چھپے تھے باڑھ ماری روسی گھبرا اٹھے۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے اب سوچے کہ غنیم لے بھی چال چلا۔ نہایت سراسیمگی اور بدحواسی کے ساتھ پلٹے تو یہاں ان کے معدودے چند سواروں کا قلع قمع ہو گیا تھا۔ اور فوجِ ترکی ان کے تعاقب کے لیے جاتی تھی ادھر وہ دونوں پلٹنیں بھی سیلِ عظیم کی طرح پلٹیں۔ روسیوں کی مہ

کیفیت تھی کہ جیسے بتیس دانتوں میں زبان کوچہ ہائے گریز بند ہو گئے ترکوں نے بھون ڈالا۔ آخر کار روس کی فوج نے پناہ مانگی اور قریب ڈھائی سو سواروں اور پیادوں کے گرفتار ہو گئے جن میں بائیس افسر تھے۔

اس جنگ عظیم میں بھی آزاد پاشا نے بڑے بڑے کارِ نمایاں کیے جنگل میں بھی انھیں کی تجویز کے مطابق دو پلٹنیں بھیجی گئی تھیں۔ کئی افسروں کی رائے اس کے خلاف تھی مگر آزاد نے دلایل قاطع و براہین ساطع سے ان سب کو معقول کر دیا۔ جس وقت روسی چند سواروں کو مقابلہ ترک کے لیے چھوڑ کر جنگل کی سمت گئے تھے آزاد ہی کی صلاح سے تین سو سوار جانبِ دریائے زخار بھیجے گئے تھے تاکہ جنگل کے شمال کی طرف فوج غنیم بھاگے تو یہ تین سو سوار اس کا مقابلہ کریں اور تینوں طرف سے غنیم بھاگے تو یہ تین سو سوار اس کا مقابلہ کریں اور تین طرف سے غنیم کو گھیر لیں۔ روسیوں نے جب دیکھا کہ دو طرف ترکوں کی فوج محاصرہ کیے ہوئے ہے۔ اور جنگل بھی خالی نہیں ہے تو شمال کی سمت سے حسب پیشین گوئی آزاد پاشا بھاگنا چاہا وہاں سواران ترک کے پرے دیکھ کر رہے سہے حواس اور بھی غائب ہو گئے۔ الغرض اس جنگ میں آزاد پاشا کی صلاح اور دور اندیشی سے ترکوں نے غنیم کو شکستِ فاش دی، سپہ سالار نے وزیر جنگ کو اس فتح کی خبر دی۔ اور لکھا کہ اس محاصرہ اور مجادلہ میں آزاد پاشا کی دور اندیشی سے ہم کو بڑا فایدہ پہنچا۔ جب جنگ سے نجات ملی اور ترکوں نے کمر کھولی تو نقارۂ فتح و فیروزی بلند ہوا۔

علم بر کش اے آفتابِ بلند　　خراماں شو اے ابر مشکیں پرند
بنال اے دلِ رعد چوں کوس شاہ　　بخند اے لبِ برق چوں صبح گاہ

تین دن تک اس لشکر نصرت اثر نے دم لیا غنیم نے ایسی شکست پاکر پھر مقابلہ نہ کیا چوتھے روز آزاد پاشا کے نام حضور وزیر جنگ کا ایک اور پروانہ خوشنودی پہنچا جس کی رو سے یہ دسٹییر کیولری افسر مقرر ہوئے شام کو آزاد پاشا کے نام ایک خط آیا جس پر ہندوستان کی مہریں تھیں۔ دیکھا تو حسن آرا کے دستخط نہ پائے متحیر ہوئے کہ یا الٰہی کس کا خط ہے کھولا تو ذیل کی عبارت نظر سے گزری۔

نامہ بنام نامی حضرت آزاد پاشا

کیوں میاں کچھ بسنت کی بھی خبر ہے ٹرکی میں بیٹھے بھاڑ جھونکا کرو۔ خبردار
اب اس طرف آنے کا رخ نہ کرنا۔ مگر واللہ کتنے سیدھے سادھے مسلمان ہو تین پانچ
تو آتی ہی نہیں ایک چھوکری نے انگلیوں پر نچایا۔ ایسا بنایا کہ عمر بھر نہ بھولو گے ہات
ترے کی ایسے مزے میں آئے کہ ٹرکی چڑھ دوڑے بھلا سلف سے آج تک کسی دوشیزۂ
عفیفہ نے بھی یہ اقرار کیا تھا کہ میاں فلاں شخص تم مور چھپر جاؤ تو ہم نکاح پڑھوائیں۔
بھائی جان تم نے گہرا چکما کھایا کہ اب کسی کو منہ دکھانے کے لایق نہیں رہے۔
اور اگر غیرت دار ہو تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرو جا کے ارے لاحول۔ میاں یہاں ایک
نیا گل کھلا۔ لکھوں تو ابھی سر پیٹنے لگو۔ ایک روز تدرو اوج صباحت بدر منیر
سپہر وجاہت حسن آرا بیگم کو شوق چرایا کہ بستی کے باہر سوار ہو کر گاڑی پر ہوا کھائیں
مغلانی اور چہری ساتھ ہوئیں۔ سپہر آرا بیگم اور جہاں آرا بیگم اور دو ایک اور ہمجولیاں
سوار ہوئیں بستی کے باہر پہنچیں تو ایک مقام پر نیا گل کھلا۔ دو سفید پوش بھی سڑک پر
چلے جاتے تھے اور بگھیاں آہستہ آہستہ جاتی تھیں تو ان دونوں رہرووں میں باتیں
ہونے لگیں۔

بیمار۔ حضرت کوئی شعر حسب حال کہیے مگر حسرت یار ضرور ہو۔
فگار۔ حسب حال بھی ہو اور حسرت یار بھی ہو بسم اللہ۔ سنیے۔

رات دن اٹھتے چلے جاتے ہیں احباب و عزیز
اے فلک روز کہاں تک کوئی ماتم میں رہے

بیمار۔ آپ بھی واللہ نرے بے تکے ہی رہے یہ حسب حال شعر پڑھا۔
فگار۔ جی ہاں حسب حال آپ کو دنیا و ما فیہا کی خبر ہی نہیں۔ آزاد سا جوان جہان
سے اٹھ گیا۔ ٹرکی میں ایک گولہ عین آزاد کے سر پر پھٹا پس اسی دم جان تن سے نکل
گئی عجب خوش رو جوان تھا یہ دیکھیے آزاد کی تصویر ہے تو سن تیز گام یہ گرا ہے اور
آزاد یہ موئے پڑے ہیں اور گولہ یہ پھٹا ہے ہائے کس بے کسی میں اس خوب رو
جوان نے جان دی۔ اتنا سننا تھا کہ حسن آرا گاڑی سے کود پڑی تصویر دیکھی تو غش

آگیا۔ دو تین مہینے تک سوگ نشین رہی اس کے بعد ایک بگڑے دل نے ٹانچا پہلے ڈورے ڈالے پھر پیغام بھیجا چلیے چٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہو گیا۔ شہر میں خبر گرم ہے کہ۔ رح پس ماندہ کا پیش خیمہ آیا۔ اب آپ پہاڑوں سے سر ٹکرائیے اور دشت میں بستر جمائیے ہندوستان میں آنے کا نام نہ لیجئے میاں اگر عشق صادق ہوتا تو حسن آرا کو ہرگز یقین نہ آتا مگر عشق خام تھا پھسل گئی۔

میں نے آج ایک اخبار میں تمہاری تعریف پڑھی تو خوب رویا۔ ہائے افسوس آزاد تو جنگلوں اور بیابانوں اور میدانوں میں سر ٹکراتے پھریں۔ اور اوپر والے مزے میں رہیں اب حسن آرا کے عشق و نکاح سے ہاتھ دھوئیے۔ وہاں ہی کوئی فکر معقول کر لو۔ حسن آرا اب ایک جوان طناز کے بس میں ہے۔

بیماریٔ فراق میں مرنا ہی خوب ہے ۔۔۔ کیوں رنجِ انتظارِ مسیحا اٹھائیے

آزاد کے خرمنِ دل پر عین فرطِ طرب میں بجلی گری خط پڑھتے ہی دھم سے زمین پر گر پڑے تو بے ہوش۔

تمہاری تیغ کا منہ چڑھ کے لے لیا بوسہ
کبھی نہ آپ سے ہم دب کے بانکپن میں رہے

الٰہی خیر کیجو۔ آج میدانِ کارزار میں پریوں کا بے طور جھرمٹ ہے جو ہے رگِ گل یوسف جمال رنگیں ادا پری تمثال آتشیں رو آئینہ زانو۔ مگر ان سب حورانِ بہشتی میں ایک فتنۂ دورانِ آفت جہان ناتوان پردۂ عالم ہے کہ مجنوں اور وامق لیلیٰ اور عذرا کی طرف رخ نہ کرتے ارنی گوئے اوج طور تک اس بہشتی رو کا دم بھرتے۔

اب سنیے کہ دریا کے قریب روسیوں کو شکست دے کر آزاد پاشا قلعۂ معلّیٰ میں آئے لشکریوں نے فرطِ طرب سے نعرے بلند کیے ٹوپیاں اچھالیں لیکن دوسرے روز اِدھر۔

سپیدہ چو سر بر زد از باختر ۔۔۔ سیاہی بخاور فرو برد سر

اِدھر رزم گاہ میں کوس جنگ زبانِ حال سے کہنے لگا کہ ہانِ شیرانِ بیشۂ

دغا بیبھر پڑو۔ آمنے سامنے دونوں فوجیں پرے جمائے آراستہ ہوئیں۔ روس کے انجینیروں نے راتوں رات پل بنالیا اور سحر کاذب کے وقت کل فوج عبور کر آئی۔ طلایہ کے سواروں نے قلعہ میں خبر پہنچائی تو ترکانِ صف شکن، روئیں تن چلتوں میں لیس ہو کر قلعے سے میدان میں آئے۔ ادھر ترکوں کے کاہے سُم گھوڑے عربی نژاد۔ اُدھر روسیوں کے افراس لیلی جمال پری زاد۔ یہ بوئے گل کی طرح اڑ کے منزلوں کی خبر لائیں۔ وہ خیال کی مانند دم کے دم میں راہ دور دراز طے کر جائیں یہ چالاک خرام وہ سبک گام اُدھر ان کی سبک عنانی اِدھر ان کی برقِ جولانی میدان میں عجب ہیبت ناک تماشا دکھاتی تھیں۔ عبرت کے ساتھ صولت توام نظر آتی تھی۔

حسنِ اتفاق سے ایک مرتبہ فوجِ روس میں کسی شیر شکار جولان گل عذار نے توسنِ صبا رفتار کو میدانِ کارزار میں اس خوبی کے ساتھ چکایا کہ سمندِ سربلند برچھوں اچھلنے لگا۔ مرکبِ لاغر میاں، راکب آفتِ دوراں گھوڑا مشکی از سرتاپا سیاہ، سوارِ سرخ و سفید، غیرتِ مہر و ماہ۔ وہ ظلمات یہ آبِ حیات، یہی معلوم ہوتا تھا کہ کمیتِ ابرو پیکر طرارے بھر کے ثور فلک کو ٹاپیں مارے گا۔ ہنگامِ وغا بیل ازدحام پر جھپٹے تو وہ بھی چنگھاڑ کے بھاگے

اتری تھی اک پری فرسِ تند خو پہ تھا — سرعت بھری ہوئی تھی رگوں میں لہو نہ تھا

ایک روسی نے عروسِ زاہد فریب آتش زن کالائے شکیب کو مخاطب کر کے کہا آج آزاد پاشا سے کہ نام برآوردہ ترکی افسر جرار صف شکن آزمودہ کار فنونِ سپہ گری کا مسلم الثبوت استاد جواں مرد پری زاد ہے۔ مقابلہ کرنا پڑے گا۔ شیر کو ٹوکنا آساں نہیں ہے ع

جب ٹوکتے ہیں آتا ہے تب غیظ شیر کو

اس بانکی دوشیزہ نے تن کر کہا اوہ کیا پرواہ ہے کیا غم ہے دیکھا جائے گا۔ وہ ترکی ہے تو ہم ترکی فگن ہیں وہ پولاد پوش تو ہم روئیں تن ہیں اگر اس شمشیر الماس رنگ سے آزاد پاشا کا سر نہ اڑایا تو کچھ کام نہ کیا۔

اللہ اللہ کیا شانِ کبریائی ہے۔ نادان زنِ نوجوان نازک کمر پری پیکر اور دعوا تو دیکھیے کہ آزاد سے شیر دل شیر مرد کے نیچا دکھانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ شمشیر الماس رنگ سے تو آزاد چرکا کھا چکے۔ ہاں تیغ ابرو کام تمام کر دے تو عجب نہیں۔

خنجر فولاد کی کیا ضرورت ہے۔ ع ابرو کے اشارے سے کرو چور۔ صبح کا سماں یلیو تسبیح خواں۔ عنادل مست و تر زباں گل شگفتہ رُو اور خنداں۔ غنچے چٹک رہے تھے خود رو پھول مہک رہے تھے۔ آزاد جدھر نگاہ دوڑاتے تھے نئے نئے قسم کے اشجار نظر آتے تھے دفعتہً فوجِ روس سے دھننا کی آواز مہیب آئی۔ اور ادھر ترکوں نے بندوق چھتیائی۔ توپوں پر بتی پڑی گولہ اندازوں نے صفائی دکھائی۔ ہر فیر پر آزاد پاشا جناب باری سے بہ صد عجز و الحاح دعا مانگتے تھے کہ خداوند اور سب روسیہ پر ہماری فوج آفت ڈھائے مگر اس دل بر دل رُبا عروسِ شیریں ادا پر آنچ نہ آئے۔

اتنے میں ایک گولا آزاد کے سرنگ نقرہ خنگ کی تھوتھنی کے قریب پھٹا گھوڑا بے قرار ہو کر ہٹا تو دوسرا گولا آیا۔ آزاد نے خوب ران پٹری جمائی اور پھرتی کے ساتھ گولی پر گولی چلائی۔ معرکہ رستخیز خوب گرم تھا۔ اس اثنا میں روسیوں نے ایک حصۂ فوج کو سامنے کی ڈھالو پہاڑی پر تعینات کر دیا۔ اور ہلکی ہلکی توپیں بھی ان کے ساتھ بھیجیں۔ ترکوں کو اس کی ذرا بھی خبر نہ ہوئی۔ خواجہ بدیع الزماں صاحب دور سے ایک اونچے درخت کی شاخ پر بیٹھے جنگ کا رنگ دیکھ رہے تھے روس کے سواروں کو جو اس پہاڑی پر جاتے دیکھا تو انھوں نے کفن پھاڑ کر غل مچایا۔ ہوشیار، ہوشیار پالا روس کے ہاتھ رہے گا۔ پہاڑ پر فوج چڑھ گئی۔ یارو کچھ خبر بھی ہے۔ ہائے اس وقت اگر توڑے دار بندوق ہوتی تو پرے کے پرے صاف کر دیتا۔

بجا ہے توڑے دار بندوق تو اس جنگ میں بڑی کام آئے۔ فوج غنیم معاً شکست پائے۔ ایسی دوزخ شرار بندوقیں کسی نے یورپ میں کاہے کو دیکھی تھیں جب خوجی نے دیکھا کہ ترک بالکل غافل ہیں تو درخت سے جھٹ پٹ اترے اور دوڑ کر ترکوں کو خبر دی۔ پہلے کسی کو اس مسخرے بونے کی بات کا یقین نہ آیا مگر بہ نظرِ احتیاط دوربین سے دیکھا تو دس پانچ ٹوپیاں نظر آئیں ارے غضب بپا ہو گا جس وقت اتنے اونچے ٹیلے سے باڑھ ماریں گے خدا جانے کیا غضب بپا ہو گا آناً فاناً میں کسی کا پتا نہ چلے گا۔ مشورہ ہوتا ہی تھا کہ توپ کا گولا پہاڑی سے اتار اگیا۔ ترکوں نے دیکھا اب کوچۂ گریز بالکل مسدود ہے مگر بہ کمالِ جواں مردی قدم جمائے اور گولے پر گولے چلنے لگے۔ اتنے میں روس کے دو سوار بہ طور قاصد آئے آن کر منجانب سپہ سالار

بیان کیا کہ ہماری فوج کا ایک حصہ کوہ پر داخل ہو گیا اور وہاں سے اس نے گولے برسانے شروع کیے ہیں اگر جان عزیز رکھتے ہو تو عقل سے کام او ہتھیار رکھ دو۔ ورنہ ہم بات کرتے کل فوج کا ستیاناس کر دیں گے۔ ترکوں نے کہا ہم لڑیں گے اور جان دیں گے۔ مگر ہتھیار ہرگز نہ رکھیں گے۔ ع یا قسمت یا نصیب یا بخت۔

جاں نثاروں اور جان بازوں کو جان سے کیا سروکار ہے جان دینا افتخار ہے۔

افسر اعلیٰ نے فوج کو مخاطب کر کے کہا۔ اب ہم سب ایک دوسرے سے رخصت ہوتے ہیں سچے پکے ترکی اس وقت غنیم کو پشت نہ دکھائیں گے۔ جان نثار کر دیں گے مر جائیں گے۔ ترکوں کے دل شیر ہو گئے اور جس طرح شیر غرین چوٹ کھا کر بپھر پڑتا ہے اسی طرح ترکی لشکر کے جرار آدمی جان پر کھیل کر لڑنے لگے، آدھ گھنٹے کے عرصے میں ترکوں نے شمشیر براں میان سے نکال کر دھاوا کر دیا۔ روسی اس زعم میں تھے کہ اب ہم نے پالا جیت لیا مگر ترکوں کا شمشیر برہنہ لے کر اس جرأت کے ساتھ آگے بڑھنا تھا کہ روسی کانپ اٹھے اچھے اچھے مورخوں اور بڑے بڑے جنرلوں کا قول فیصل ہے کہ بحر میدان نبرد کی طغیانی اور توپ تفنگ کی ایسی آتش فشانی کے دست بہ دست مقابلے پر جانا ترکوں ہی کا کام تھا۔ روسیوں نے غنیم کی یورش دیکھ کر بڑی مستعدی اور سرگرمی سے گولیاں چلائیں ترکوں کی یہ کیفیت کہ سامنے کے پیادے اور سوار باڑھ میں بھن گئے تو دوسرے نے حملہ کیا تیسری صف دھاوا کر کے دراتی ہو لی گئی۔ اب سنیے کہ جو لوگ پہاڑی پر چڑھ گئے تھے انھوں نے یہ حال دیکھ کر اوپر سے گولیاں ماریں۔ مگر گولی بارود کا چٹکیوں میں خاتمہ ہو گیا۔ روسیوں نے بھی تلوار لی اور طرفین سے نپا شپ چلنے لگی۔ اس عرصے میں آزاد پاشا نے دیکھا کہ ایک فرس بزرگ پر ایک عروس نوخیز رشک گل چہرہ کان فرنگ بہ صد شان برنائی سوار ہے کمر سے تلوار لٹکتی ہے ہاتھ میں خنجر آب دار ہے۔

نوجوانان رزم نے اس پری کو دیکھ کر کہا ؎

پھر آج سامنا ہے کسی ماہِ عید کا　　تارا چمک گیا مرے بخت سعید کا

گھوڑے کا ادھر ادھر جھپٹنا اور زرہ میں کمر کا نازک ادائی سے ڈپٹنا ان کو ایسا

بھایا کہ جنگ میں شریک ہونا بالائے طاق اس گل نودمیدہ و چمن خوبی میوۂ نورسیدہ باغ محبوبی آب و رنگ گلشن رعنائی تذرو اوج بہر دل آیا قیامت آئی حسن صبیح نے ستم ڈھایا۔ وہ چشم جادو کہ سحر بابل جس کے سامنے گرد ہو جائے جمال میں کے مقابلے میں یوسف مصری کی گرم بازاری سرد ہو جائے۔

آزاد پاشا نے از سرتا پا نظر ڈالی تو دل میں سوچے کہ ابھی نام خدا سترھواں اٹھارھواں سال ہے کان حسن و جمال ہے ابھی اس قابل ہے کہ دست سیمیں اور عذار رنگیں کے بوسے لے حوران بہشتی کو دور ہی سے سلام کرکے اس کافر بد کیش کی پرستش کرے یہ اور میدان جنگ بار خدایا اس مردم آزار ستم گار کو گزند سے بچا۔ ہائے ہائے ایسا نہ ہو کہ کسی شقی کا ہاتھ اس عربدہ جو سراپا جادو پر پڑے ایک افسر نے ان کی کیفیت دیکھ کر کہا آزاد ذرا سمند عشق کی باگ روکے ہوئے پھسل نہ جانا۔ عاشقی معشوقی کا وقت نہیں ہے ترکوں کی عزت پر بن آئی ہے۔ یہی وقت جاں بازی و نبرد آزمائی ہے مرد ہو یا عورت جوان ہو یا پیر فوج غنیم میں جو ہے ہمارے خون کا پیاسا ہے۔

آزاد نے کہا لاکھ سنبھالتا ہوں مگر دل ہاتھ سے جاتا ہے اللہ رے حسن۔

غضب کی چیز ہے یہ حسن انساں لاکھ بچتا ہے
مگر دل کھنچ ہی جاتا ہے طبیعت آہی جاتی ہے

اس نگار تند خو ناوک نگاہ ترش رو نے آزاد کو دیکھ کر کہا۔

سنبھل کے رکھیو قدم راہ عشق میں مجنوں
کہ اس دیار میں سودا برہنہ پا بھی ہے

یہ کہہ کر سیف اصفہانی ایک دم چمکائی۔ اور توسن زبان کو میدان بیاں میں ہنکا کر یہ کیا۔

یہ کہہ کر گھوڑا بڑھایا۔ اور ایک ترکی سوار پر ایسا تلا ہوا ہاتھ لگایا کہ دست چپ تڑ سے اڑ گیا اور خون کے شراٹے بہنے لگے پھر گھوڑا بڑھا کر آزاد کے گھوڑے کی طرف بڑھی تھی کہ آزاد نے تلوار کو چوم لیا۔

ترکوں نے نعرہ مارا اور آزاد نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

طفلیِ ناکردہ کار درصفِ مرداں مزن　　　پردہ نشینی ہنوز معرکہ تازی مکن

ترکوں نے اس زور سے نعرہ مارا کہ آواز بازگشت سے کوسوں تک میدانِ جنگ گونجنے لگا۔ مگر روسیوں کا رنگ فق ہوگیا۔ مس کلیرسا نے جھلا کر گھوڑے کو پھیرا اور پھیر کر چاہا کہ آزاد کو ضرب شمشیر سے دو نیم کرے مگر جیسے ہی ہاتھ اٹھایا آزاد پاشا نے فرس صرصر تگ کو آگے بڑھایا اور تلوار کو اپنی شمشیر پر روک کر بائیں ہاتھ سے اس پری چہرہ کے گال پر ہاتھ پھیرا تو ترکوں نے بڑی زور سے نعرہ مارا اور روسی جھینپ گئے۔ کلیرسا بھی کسی قدر لجائیں کہ ہزاروں آدمی کی جماعت میں اس ترک زن کرنے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ چہرہ مارے غصے کے تمتمانے لگا۔ طرفین کے آدمی دار و گیر سے تھک کر جانب رہے تھے آزاد اور مس کلیرسا کے داؤں پیچ دیکھ کر لڑنا بھڑنا چھوڑا۔ شمشیر زنی اور گولا اندازی سے منہ موڑا۔ کبھی آزاد جھپٹ کر جاتے تھے اور شمشیر دکھا کر گھوڑے کو دو قدم واپس لاتے تھے کبھی وہ تندخو جھلا جھلا کر توسنِ برق دم کو ایڑ لگاتی تھی چوٹ پر چوٹ آتی تھی مگر آزاد کی یہ کیفیت کہ چھ چوٹیں تلوار پر روکیں کچھ خالی دیں۔ ہوا تک نہ چھو سکی۔ اس پرکالۂ آتش نے دو ترکی سواروں کو مجروح کیا ایک کو قتل کیا۔ آزاد محو صورت مجنوں وار اس لیلیٰ وش کے عاشقِ زار تھے گو بر سرِ پیکار تھے مگر اس قوسِ ابرو پر ہاتھ نہیں اٹھتا تھا ایک مرتبہ غچا دے کر اس زنِ شمشیر افگن نے معاً ایسا ہاتھ جمایا کہ اگر کوئی ناواقف ہوتا تو گردن تن سے معاً جدا ہو جاتی۔ لاش زمین پر پھڑکتی نظر آتی مگر آزاد نے اس طرح بچایا کہ ہاتھ بالکل خالی گیا لیکن ہنوز اچھی طرح سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ اس عاشق کش کی شمشیر دو پیکر نے کمیت خوش خرام کا آدھا کان اڑا دیا اس پر روسیوں نے تالیاں بجائیں اور اظہارِ خوشی کیا۔ گھوڑے کا کان اڑانا تھا کہ کمر بل کرنے لگی۔ اس وقت کمر کا لچکنا اور بھی ستم ڈھاتا تھا آزاد کا دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ مس کلیرسا اور آزاد کی آنکھیں چار ہوئیں تو تیر نگاہ ان کے کلیجے سے پار ہوگیا۔ ایک ایک رونگٹا عاشقِ نرگسِ بیمار ہوگیا اشارہ کرکے کہا آگے آؤ بڑے آدمی ہو تو قدم پیچھے نہ ہٹاؤ اس اشارے نے ان کو اور بھی مار ڈالا۔

یار کرتا ہے اشارے سیکڑوں ہوتے ہیں قتل　　　چلتی ہے تلوار گویا جنبشِ ابرو نہیں

یہ باتیں اور اشارے ہو ہی رہے تھے کہ یکایک اس کافر مردم آزار نے

بھنڈارے کا ہاتھ لگانا چاہا۔ قریب ہی تھا کہ بھنڈارہ کھل جائے مگر آزاد ہنوٹ کے استاد آہنی کسرت کی مشق چڑھی ہوئی فوراً تلوار پر تلوار روکی اور اس قدر قریب پہنچ گئے کہ تڑ سے اس گل عذار کے گورے گورے پیارے پیارے گال چوم لیے اور گھوڑا اٹھایا تو دس قدم کے فاصلے پر تھے اس چھینا جھپٹی میں اس کج کلاہ غیرتِ ماہ کی بانکی ٹوپی سر سے گر پڑی اور جوڑی جو کھلی تھی اس دھینگا مشتی میں کھل کر ادھر ادھر مارِ خوں خوار کی طرح لہرانے لگی۔ گورے گورے لو سپارے پیارے مکھڑے اور لب کھل کے اس جوبن کو اس طرح شب رنگ و عنبر افشاں نے اور بھی دوبالا کر دیا

زلفِ سیاہ اور رخِ انور لیلۃ القدر اور آفتابِ محشر ع۔

قدرت کی ہے بہار اِدھر شب۔ اُدھر سحر

اس بوسہ بازی اور خوش اندازی پر روسیوں تک نے قہقہہ لگایا۔ میدانِ جنگ کو کشتِ زعفران بنایا۔ آزاد نے مسکرا کر کہا ؎

آئے ہیں وہ کھینچ کر تلوار بہرِ امتحاں جوہر اپنے تو بھی دکھلا ہمتِ مردانہ آج

جب اس خاتونِ شیریں حرکات نے دیکھا کہ آزاد پاشا نے ایک چوٹ بھی نہیں کھائی بلکہ ایک بار تلوار کا بوسہ منہ چڑھ کے لے لیا دوسری مرتبہ گالوں پر ہاتھ پھیرا تیسری مرتبہ رخسارِ رعنا چوم لیے تو کمال خفیف ہوئی اور اس خفت نے رگِ حمیت کو ایسا جوش زن کیا کہ آؤ دیکھا نہ تاؤ گھوڑے کو آزاد کے گھوڑے سے بھڑا کر تلوار چمکا چمکا کر سر اور چاکی اور پالٹ اور جنیو اور کڑک اور باہرہ اور طمانچہ اور انی ایک چوٹ نہ چھوڑی ہاتھ گھمایا اور جمایا دم لینا دشوار کر دیا مگر واہ رے آزاد اس استقلال کے ساتھ ہنس ہنس کر چوٹیں بچائیں کہ ناظرین دنگ رہ گئے آخر کار ان کے فرسِ بادرفتار کی گردن پر ایسا تلا ہوا ہاتھ لگایا کہ گردن کٹ کر وہ گری۔ آزاد فوراً کودے کودتے ہی ایک سوار نے اپنا گھوڑا خالی کر دیا اور چشم زدن میں یہ گھوڑے کی پیٹھ پر آ کر اس دل ربا نازنین کے مقابلے کو بڑھے اس عرصے میں اس خوں خوار نے دو ترکوں کو مجروح کر دیا۔ آزاد پر تلوار لگانے کو تھی کہ انھوں نے پھر تلوار پر تلوار روکی اور ہنوٹ کے پیچ سے ہاتھ اور بازو کو اس طرح باندھا کہ تلوار اس بتِ پندار کے دستِ نازک سے چھوٹ پڑی۔ تلوار کے چھوٹتے ہی گلوئے رنگیں میں ہاتھ ڈال کر پیشانی نورانی کا بوسہ لیا تو گھوڑا ران سے نکل گیا۔

اب سنیے کہ وہ سرمایۂ ناز نیں اپنے مشکی گھوڑے پر ران پٹری جمائے بیٹھی ہے اور آزاد اس کے گلے میں ہاتھ ڈالے نصف لٹکتے ہیں۔ نصف جسم گھوڑے کے پٹھے پر اور ان کا گھوڑا بیس قدم پر کھڑا ہنہنا رہا ہے اس کیفیت سے اس یکہ تاز میدان خوب روئی نے گھوڑے کو پھیر کر ایڑ لگائی اور مہمیز کا اشارا پایا تو گھوڑا فوجِ قلب روس کی طرف بگٹٹ بھاگا آزاد کچھ لٹکتے کچھ سنبھلتے ساتھ ساتھ چلے جاتے ہیں روسیوں نے ٹوپیاں اٹھا اٹھا کر تین بار نعرہ مارا ترکی دنگ کہ یہ کیا غضب ہوگیا۔ خوجی نے درخت کی شاخ سے پھر غل مچایا۔ ارے یارو کیا دیکھ رہے ہو غضب ہوگیا حسن آرا کا پیارا امیڈا کی آنکھ کا تارا گرفتار ہوا جاتا ہے۔

ترکوں کی طرف سے ایک سوار بھی بیچ بچاؤ کرتا نظر نہیں آتا ہے چھ ترکی بدفعات بڑھے کہ آزاد کو واپس لائیں کمند شیر بند زلفا کے دام سے بچائیں مگر روسیوں نے ان سب کو وہیں ٹھنڈا کر دیا۔ آزاد کے واپس آنے کی امید منقطع ہوگئی تو گولہ چلنے لگا۔ خوجی درخت سے پکارتے جاتے تھے کہ ہاں میرے شیر ایک اور ایک خواجہ بدیع کی طرف سے۔ اب ابروئے مشک بوکا۔ اب لی بنا گوش صفا کوش کا۔ اب کی چشم شہلا کا۔ اب کی رخسارِ زیبا کا۔

خوجی بھی دھر لیے گئے

آزاد پاشا تو نا طوزہ ماہ سیماس کلیرسا کے مشکی گھوڑے پر سوار ہو کر چاہ زنخداں اور لبِ لعل شکر خا و ربنا گوش کو چومتے ہوئے فوجِ روس کی طرف جاتے تھے ادھر خواجہ بدیع الزماں درخت ہی سے غل مچاتے تھے کہ ایک اور ایک ہماری طرف سے۔ ایک گردن کا بوسہ ہاں ایک اور لے شاباش ہے۔ واہ استاد۔ واہ میاں آزاد یا ادھر اس خاتونِ مہ لقا کا فرس تند خو نظر سے اوجھل ہوا ادھر ترکوں اور روسیوں میں گولہ چلنے لگا۔ خوجی نے افیم لڑبیا سے نکالی۔ وہاں پانی کہاں ایک آدمی سے جو درخت کے نیچے بیٹھا کچھ کھا رہا تھا آپ نے کہا۔ بھائی جان ذری سا پانی تو پلا دو۔ اس نے اوپر دیکھا تو ایک بونا عجیب الخلقت آدمی۔ کہا تم کون ہو جی۔ خوجی نے کہا یار دو ذرا افیم گھولیں گے۔ اب دل لگی دیکھیے کہ وہ فرانسیسی زبان میں گفتگو کرتا ہے اور یہ

اردو میں جواب دیتے ہیں۔ ع

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

خوجی ۔ افیم گھولیں گے میاں ۔ ذرا سا پانی دے ڈالو بھائی۔

فرانسیسی ۔ واہ کیا قطع شریف ہے پہاڑ پر نہ جا کے بیٹھو۔

خوجی ۔ بھئی واہ رے ہندوستان ۔ واللہ اس فصل میں جا بجا سبیلوں پر پانی ملتا ہے کیوڑا بسا ہوا ۔ ہندو پوسالے بٹھاتے ہیں مسلمان کہتے ہیں ۔ ع

پانی پیو سبیل یہ نذرِ حسین ہے

فرانسیسی ۔ اب کہیں اوپر سے نہ گر پڑنا ۔ درخت پر چڑھے ہیں بے وقوف۔

خوجی ۔ (اشارے سے) ارے میاں پانی! پانی آب بیار۔

فرانسیسی ۔ ہم تمہاری گفتگو نہیں سمجھتے تم چپ رہو ۔ بکو نہ بہت ۔

خوجی ۔ اب اترنا پڑا ہمیں ابے گیدی ذرا سا پانی کیوں نہیں دے جاتا ۔ کیا پاؤں کی منہدی گھس جائے گی ۔ چلو لاؤ۔

فرانسیسی نے ان کی بات کا جواب نہ دیا اور بدستور روٹی کھانے لگا تو خوجی نے اوپر سے پتے پھینکے اس پر فرانسیسی نے جھلا کر کہا بچہ کیوں شامت آئی ہے درخت پر چڑھ کر ایسے گھونسے لگاؤں گا کہ شرارت سب نکل جائے گی ۔ خوجی نے اوپر سے ایک شاخ توڑ کے پھینکی فرانسیسی جھلایا اور کمر باندھ کر اتنے ڈھیلے مارے کہ خواجہ بدیع الزماں کی کھوپڑی ہی جانتی ہوگی ۔

خوجی ۔ ابے او گیدی ۔ اٹھوں پھر ۔ ہائے نہ ہوئی قرولی افسوس ۔

فرانسیسی ۔ اب آج بے قتل کیے ہوئے نہ رہوں گا ۔ اترا اور میں نے قتل کر ڈالا ۔

خوجی ۔ لانا قرولی لاؤ قرولی ارے کوئی ہے لاؤ قرولی ۔

راوی ۔ جی ان گیدڑ بھبکیوں میں وہ آچکا ۔ قرولی حضور میاں ہی میں رکھیں اب کھوپڑی چھلنی ہونے دیں ۔

خوجی ۔ ارے میاں کوئی ہے لانا قرولا کوئی ہے !!!

راوی ۔ حاضر حضور ۔ اب تک تو قرولی کی یاد تھی ۔ مگر اب قرولا یاد آیا ۔ قرولا کل مول منگوائیے مگر اس وقت کھوپڑی بچائیے ۔

اتنے میں ایک ترکی نے خوجی کو دیکھ کر فرانسیسی کو سمجھا دیا تھوڑی دیر کے

بعد خواجہ صاحب درخت پر سے اترے۔ پانی لیا۔ افیم گھولی۔ چسکی لگائی اور پھر درخت پر جا بیٹھے اور ایک موٹے ٹہنے پر بیٹھے تو پینک آئی۔

خوجی بھی قید ہوئے

اب سنیے کہ خواجہ بدیع الزماں روسی فوج میں قید ہوئے اور آزاد کے مصنوعی باپ بنے تو ان کی توقیر و تعظیم ہونے لگی۔ ان کے ہمدرد ترکی قیدی ہر دم خدمت گزاری کے لیے مستعد رہتے تھے۔ ایک روز روس کے ایک میجر نے ان کی انوکھی قطع اور نرالی وضع اور ماشے ماشے بھر کے ہاتھ پاؤں جو دیکھے تو جی چاہا کہ ان سے باتیں کریں۔ ایک ترکی کو جو فارسی داں تھا مترجم مقرر کر کے خواجہ بدیع الزماں صاحب سے باتیں ہونے لگیں۔

خوجی۔ حضور کی کمال مہربانی ہے کہ آزاد پاشا کے پدر بزرگ وار سے ملے۔

میجر۔ او آپ آزاد پاشا کا بوڑھا باپ ہے یہ کہیے۔

خوجی۔ باپ تو کیا ہوں مگر خیر ع جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں۔ مصیبت کا مارا خواجہ بدیعا بے چارہ شش و پنج سے دو بہ دو ہے پنجے میں پڑے تو چھکے چھوٹے۔

راوی۔ خواجہ کون۔ خواجہ بدیعا۔ یہ انوکھا نام سننے میں آج تک نہیں آیا۔ خواجہ صاحب نے جو یہ مصرعہ پڑھ دیا۔ ع

جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

تو تن گئے غرور کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے سوچ کہ یہ روسی افسر بھی ہماری قابلیت کا قائل ہو گیا ہو گا۔ واہ رے گوکھے اور تو اور یہ خواجہ بدیعا کی ایک ہی کہی۔ خواجہ بدیع نہیں خواجہ بدیعا۔ اثنائے گفتگو میں روسی افسر نے پوچھا۔ آپ بھی کسی لڑائی میں کبھی شریک ہوئے تھے۔ خوجی آگ ہو گئے جھلا کر جواب دیا۔ فوج کے افسر اور ایسے کوڑھ مغز۔ آج ہی دیکھنے میں آئے۔ ہمارا گینڈا ہی گواہی دیتا ہے جی کہ ہم فوج کے جوان ہیں گینڈے سے نہیں پہنچانتے۔ اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے پہلوانوں کے پیر ہیں استاد نامور۔

بارہا من گفتہ ام اے سروراں   پہلوانم پہلوانم پہلواں

اس کا ترجمہ کیا گیا تو روسی میجر نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کو خلل دماغ ضرور ہے واہی تباہی بک رہا ہے۔

خوجی۔ دگلے والی پلٹن کے رسالدار تھے اختری پلٹن کے کمیدان۔ ہم سے پوچھتے ہیں کہ کوئی لڑائی دیکھی ہے۔ دیکھی ہے؟ شریک ہونے کا ذکر ہی نہیں۔ اجی حضرت یہاں وہ وہ لڑائیاں دیکھی ہیں کہ انسان کی بھوک پیاس بند ہو جائے۔

خواجہ بدیع سے اور حضور پوچھیں کہ کیوں کبھی جنگ بھی دیکھی ہے۔ ہزار لکھ کرور پدم سنکھ سمجھے جنگ!!!

میجر۔ آپ گولی چلا سکتے ہیں نشانہ کبھی لگایا ہے۔

خوجی۔ اجی حضرت اب فصد کھلوائیے گولی چلائی یا نہیں چلائی مگر سامنے ہو جائیے تو توبہ ہی بھلی۔ ہم وہ گل چلے ہیں مشفق۔

بوتل کی کاگ زور میں توبہ کو لے اڑی
ہم گل چلوں کے ہاتھ کی گولی رکی نہیں

ایک مرتبہ ایک کتے سے اور ہم سے لاگ ڈانٹ ہو گئی خدا کی قسم ہم سے گیارہ بارہ قدم کے فاصلے پر کتا کھڑا تھا دھر کے داغتا ہوں تو پوں پوں کرتا ہوا کتا بھاگ کھڑا ہوا۔

راوی۔ ایں واہ بھئی گل چلے کیوں نہ ہو۔ گیارہ قدم پر کتا ہو اور گولی خالی جائے۔ لے لاحول۔ بس بس کمیدانی دیکھ لی۔ کس غرور کے ساتھ آپ فرماتے ہیں کہ گیارہ قدم پر کتا تھا گولی جو چلائی تو پوں پوں کرتا بھاگا۔ ماشاء اللہ کیا قادر اندازی ہے۔

میجر۔ او آپ بڑا گل چلا ہے۔ خوب گولی چلائی کہ کتا پوں پوں کرتا بھاگا۔

خوجی۔ (موچھوں پر تاؤ دے کر) اب کیا ہے عین شباب کے عالم میں ہم کو دیکھنا واہ رے ہم۔ جب جوانی ہو گی حضور جی۔

راوی۔ ایں لے سبحان اللہ ابھی شباب کے عالم میں حضور پر پرزے نکالیں گے یا الٰہی۔ تو ابھی کوئی تیرھواں چودھواں سال ہو گا۔ اس خبط پر خدا کی مار۔ بھوں تک سفید ہو چلی۔ ابھی آپ کو یہ امید ہے کہ جوانی از سر نو عود کر آئے گی۔ واللہ اس فقرے نے پھڑکا دیا۔ ماشاء اللہ ـــ ابھی اس قدر کم سن ہیں کہ عنفوان شباب بھی نہیں ہے۔

میجر نے ان کی گپ اور بے تکی باتیں سن کر حکم دیا کہ ایک دونالی بندوق لاؤ تب

تو خواجہ صاحب چکرائے۔ سوچے کہ سات پیڑھیوں تک کسی نے بندوق چلائی نہیں۔ ہم کو تو یاد ہی نہیں آتا کہ بندوق کبھی عمر بھر چھوئی بھی ہو۔ اتنا تو جانتے ہیں کہ بندوق میں گز ہوتا ہے اور قرابین میں گز نہیں ہوتا۔ اور تپنچہ بندوق سے بڑا ہوتا ہے۔

راوی۔ ع پڑیں پتھر سمجھ پر ایسی تم سمجھے تو کیا سمجھے۔ واہ میاں کیدان۔

میجر۔ اڑتی چڑیا پر نشانہ لگا سکتے ہو خطا تو نہ کرے گا نشانہ۔

خوجی۔ (اپنے دل میں) اجی یہاں بیٹھی چڑیا پر تو نشانہ پڑ ہی نہیں سکتا اڑتی چڑیا کیسی۔ (کڑک کر) اجی آسمان تک کے جانوروں کو بھون ڈالوں۔

میجر۔ اچھا بندوق آتی ہے دیکھیں آپ کی لیاقت قادر اندازی۔

خوجی۔ تاک کر نشانہ لگاؤں تو درخت کی پتیاں گرا دوں فوراً۔

میجر۔ اس تقریر سے بھی سمجھ گیا کہ گاؤدی اور ناواقف آدمی ہے مگر گپ اڑانے کا بادشاہ ہے۔ بندوق سامنے رکھ دی۔ اور کہا لیجیے بندوق حاضر ہے۔

خوجی۔ آسمان کی طرف نظر کر کے کمال دل جمعی کے ساتھ ٹہلنے لگے اور یہ شعر پڑھنے لگے۔

نہ ایک دن ربطِ جسم و جاں ہے نہ پاس یہ دولت و حشم ہے
فنا فنا ہے فنا فنا ہے عدم عدم ہے عدم عدم ہے

میجر۔ ایں بوکھلا گیا۔ اجی حضرت بندوق حاضر ہے نشانہ لگائیے۔

خوجی۔ زمین کو خوب زور سے ٹھوکر دے کر بہ آواز بلند۔

نہ بھولوں گا شبِ وصلت میں بوسہ مانگنا اپنا
لجا کر مسکرا کر منہ چھپانا ان کا آنچل سے

راوی۔ ہو دھن کے پکے۔ آنچل کی فکر جانے دیجیے بندوق موجود ہے اٹھائیے۔

میجر۔ اجی حضرت ہم آپ سے کہتے ہیں او گانے والے ایں واہ ہے۔

میجر کے بیان کا ٹھیک ٹھیک ترجمہ فارسی میں خوجی سنتے جاتے تھے مگر بندوق کے خوف کے سبب سے دیوانے بن گئے واہ رے استاد۔

میجر نے بہ آوازِ بلند کہا اب بندوق لیتے ہو یا اسی بندوق سے تم کو نشانہ بناؤں۔ (مسکرا کر) بولو جھٹ پٹ۔

خوجی۔ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر آہستہ آہستہ۔

عشق اک کافر بد کیش پری زاد کو ہے ۔۔۔ تابِ نظارہ کہاں اس دلِ ناشاد کو ہے

راوی۔ سبحان اللہ۔ کس درجہ مضمون خیز شعر ہے ناشاد کو ہے پری زاد کو ہے۔

خوجی۔ (مترجم سے) بابائے ما شنو من مثل زنبیل عمرو عیار ہستم۔ کہ ہمہ دانی اور گولی داغیدن استاد جنگ کردم بے بدل۔

بڑی دیر تک دل لگی رہی۔ سپجر خواجہ صاحب کے تمسخر سے اس قدر خوش ہوا کہ پہرے والوں کو حکم دیا کہ ان پر بہت سختی نہ کرنا۔ شب کو خواجہ بدیع سوچے کہ اب بھاگنے کی تدبیر ضرور سوچنی چاہیے ورنہ جنگ ختم ہو جائے گی اور ہم ادھر کے رہیں گے نہ اُدھر کے آخر آزاد کے قید ہو جانے سے ان کو سخت رنج تھا۔ مگر کہہ بر درویش بر جانِ درویش، ادھر اپنی جان کے لالے پڑے تھے۔ آدھی رات کے وقت اٹھے اور دعا مانگنے لگے یا خدایا معبودیا قہار یا جبار۔ آج رات کو خواجہ بدیع اس قیدِ فرنگ سے نجات پائے ترکوں کا لشکر نظر آئے خواجہ بدیع غل مچائے کہ۔ (آن پہنچے۔ خواجہ بدیع الزماں آن پہنچے) اور خدایا آزاد سے بھی ملاقات کرائے۔ یہ دعا مانگ کر بہت روئے اور کہا۔

تو گفتی ہر آں کس کہ در رنج و تاب ۔۔۔ دعائے کند من کنم مستجاب

خوجی بے اختیار رو دیئے ہائے اب وہ دن کہاں نصیب ہوں گے کہ نوابوں کے دربار میں گپ اڑا رہے ہوں۔ رفقا اور مصاحبین ہم پر ادھر ہم ان پر منہ آ رہے ہوں وہ دل لگی وہ چہل وہ فقرہ بازی اب نصیب ہو چکی۔ ہائے افسوس کس مزے سے کٹی جاتی تھی اور کس لطف سے گنڈیریاں چوس چوس کر کھاتے تھے۔ کوئی کھٹیاں خریدتا ہے۔ کوئی کتارا چمکاتا ہے کوئی پونڈے والے سے گلخپ کرتا ہے شور و غل کی یہ کیفیت ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ کھیروں کی بھن بھن ایک طرف چھلکوں کا انبار دوسری طرف۔ کوئی عورت چانڈو خانے میں آئی تو اور بھی چہل کی گرم بازی ہوئی۔ مگر خدا چاہتا ہے تو ہم بھی ایک غل مچاتے ہوں گے کہ (آن پہنچے آن پہنچے خواجہ بدیع الزماں صاحب آن پہنچے۔ ع۔ بے دل نیم ہنوز ببینم چہ می شود۔ اللہ بس باقی ہوس۔ یا خدا ترکوں کا لشکر سامنے ہو اور ہم دور سے آن پہنچنے کی صدا بلند کریں اور رنگ رلیاں منائیں۔

راوی۔ آن پہنچے آن پہنچے یہ صدا خواجہ صاحب کو ذلیل کرے گی۔ لینے کے دینے پڑ

جائیں گے۔

دو بجے کے وقت خوجی نے افیم گھولی اور چسکی لگائی۔ تہ برتہ جمائی۔ اتفاق سے ان کی نظر ایک چھوٹے سے ٹٹو پر پڑی سوچے کہ گھوڑے پہلام سے سوار نہ ہوا جائے گا۔ یہ ٹٹو ہمارے لیے موزوں ہے۔ چپکے سے اٹھے اور بغور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ قدم بڑھانے ہی کو تھے کہ کان میں آواز آئی (اچھیں) ارے ہت ترے کی چھینکنے والے کی ناک کاٹوں کمبخت۔

قسمت تو دیکھنا ذرا ٹوٹی کہاں کمند دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

بیٹھ گئے تھوڑی دیر کے بعد پھر اٹھے۔ اٹھے ہی تھے کہ پھر چھینک پڑی۔

خوجی۔ (اپنے دل میں) خدا سمجھے اس مردود سے خدا سمجھے ایسا بدمعاش آدمی تو ہم نے آج تک دیکھا ہی نہیں۔ نابکار نالائق۔ اب جانے والے اور اٹھنے والے دونوں کی ایسی تیسی مگر اس مردک کی ناک کاٹے بغیر مجھے چین نہیں آتا۔

پھر اٹھے ایک قدم بڑھایا اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر دوسرا قدم بڑھایا اور بغلیں جھانکنے لگے۔ تیسرا قدم بڑھا اور تھر تھر کانپنے لگے۔ یا خدا مدد دے۔ یا خدا بچائیو۔ مناجات وردِ زبان۔

اتنے میں پھر چھینک پڑی اور خوجی جھلا کر کوسنے لگے یا خدا اس بدنصیب کا ابھی ابھی دم نکل جائے۔ ہائے اس وقت قرولی ہوتی تو بڑا کام دیتی۔ فوراً جا کے ناک پر رکھ دیتا اور صاف نلوہ اڑا لیتا۔ بس ایسے شریر کی یہی سزا ہے کہ ناک کاٹ ڈالے۔ یہ سوچ کر کر بیٹھ تپچھے کی چھینک کا خیال نہ کرنا چاہیے حضرت خواجہ بدیع صاحب آگے بڑھے اور خدا خدا کر کے یابو کے قریب گئے۔ گردن پر ہاتھ پھیر کر کہا غازی مرد۔ کہیں دغا نہ دینا۔ مانا کہ تم چھوٹے موٹے ٹٹو ہو اور خواجہ بدیع کا بوجھ تم سے نہ اٹھ سکے گا مگر کچھ پرواہ نہیں ہمت مرداں مددِ خدا۔ یابو کو کھولا اور ننگی بیٹھ پر سوار ہوئے پھر اترے رسی پڑی تھی اس کی لگام بنائی۔ سوار ہوئے اور آہستہ آہستہ پو قدمے جانے لگے۔ بدن کانپ رہا تھا۔ جب کوئی سو قدم کے فاصلے پر نکل گئے تو جان میں جان آئی۔

خوجی کی رہائی

میاں خواجہ بدیع الزماں ترکوں کی فوج میں پہنچ کر ہنکارنے لگے ہم نے یوں روسیوں سے مقابلہ کیا اور یوں نیچا دکھایا اور یہ کیا اور وہ کیا ترکوں نے بڑے شوق سے ان کی روایت سنی تو حضرت نے یوں بیان کیا۔

بر ضمیر منیر صاحبان ترک تخمیر واضح و لائح باد رفارسی کی ٹانگ توڑنے لگے کہ بیچ ان ایام فرخندہ و خستہ فرجام کے کہ کامرانی کی شاہد امنگ جوانی اور شادمانی کی صنم ترنگ بادۂ ارغوانی میں مست ہے گزر من بدیع خواجہ بدیعا کا بیچ ایک فوجِ روس کے ہوا۔

گزر کردم بہ فوجِ روس پیہم — نمودم قلبِ فوجِ شاں چو درہم

راوی۔ اس طبیعت داری کے صدقے۔ کیا برجستہ شعر موزوں کیا ہے۔

ترک۔ اب شاعری کو رہنے دیجیے حال کہیے ان اشعار کا ترجمہ کرنا آسان نہیں ان جہلا کو سمجھائے گا کون؟ صاف صاف کہیے۔

خوجی۔ وہاں دیکھا کہ مردمانِ بسیار دربسیار جوق جوق جمع انبوہ کثیر لگا ئیں ور سب مست الست پہلوانِ جری دلاور صف شکن برق فگن تین دن اور تین رات اوپر ایک شجر ارفع کے ٹہنیاں اس کی زمیں دوز تھیں اور پھنگیاں اس کی حیرت سوز تھیں من خواجہ بدیع نے بسیرا لیا (بھولے من خواجہ بدیع نہیں۔ من خواجہ بدیعا) خیر اتفاقِ وقت سے وہاں ایک روسی کا گزر ہوا مجھ سے اور اس سے تکرار ہونے لگی تب میں نے کہا کہ اگر دعویٰ ہو تو اتر آؤں لڑوں اور کچا کھا جاؤں اتنے میں دیکھا کہ

سایہ فگن خیمہ از ہر کنار — ہر طرفِ دشت، چو ابر بہار

سردرانِ روسی موجود ہیں میں نے درخت سبز بخت سے اتر کر لنگوٹ کسا اور خدا کا نام لے کر خم ٹھوک کے کشتی شروع کر دی۔ داؤں بیچ میں روسی برق تھا۔

راوی۔ اور حضور تو داؤں پیچ میں برق ہیں ہی دریں چہ شک!

خوجی ۔ اور ہاتھ پانوں ایسے کہ کیا کہوں میرے ہاتھ پانوں سے بھی بڑے ۔
راوی ۔ ایں ۔ اجی نہیں حضرت ۔ ہم نہ مانیں گے آپ کے ہاتھ پانوں سے بڑے بڑے ہاتھ پانوں تو دیو کے بھی نہ ہوں گے ۔ حضور کے مزاج میں انکسار بہت ہے اور یہی دلیل کمال ہے ۔ بھلا آپ سے بڑے بڑے ہاتھ پانوں کیا ہوں گے ۔

خوجی نے کہا بس جوں ہی اس نے چٹ پر ہاتھ ڈالا اور میں نے ہاتھ باندھ لیا ۔ ہاتھ جو باندھا تو چکر گھنی کھا گیا دھر کے زور کرتا ہوں تو ہاتھ کھٹ سے الگ ۔
راوی ۔ اے سبحان اللہ ۔ ہاں ہاتھ ہی توڑ ڈالیے گا آپ کے مزاج میں غریب آزاری بہت ہے کجا آپ کجا وہ ۔ بھلا کوئی مقابلہ ہو سکتا ہے لے تو بہ کیا مجال ۔ استغفر اللہ ۔
خوجی ۔ بس پھر دوسرا آیا میں نے گردن پکڑی اور آنٹی دی ۔ دھم سے گرا تیسرا آیا چپت جمائی اور پکڑ لایا ۔ چوتھا آیا لکان کی اور دھم سے گرا دیا ۔ پانچواں آیا اور میں نے کچا چبایا ۔ ہات تیرے گیدی کی ۔ دے قرولی ۔ دے قرولی مار کے کچومر نکال دیا ۔
راوی ۔ پھر وہی غریب آزاری ۔ پھر وہی مردم آزاری یہ واہیات بات ہے ۔
خوجی ۔ کئی سوار اور ریلا نام دار اور توپوں وغیرہ کے گولہ انداز آئے مگر میں نے سب کو پٹخنی بتائی آخر کار کوئی ستر آدمی مل کے چلے ۔
راوی ۔ بس ستر ہی ۔ اے لاحول ۔ غلط ستر آدمیوں کو آپ پیس کے دھر دیتے کم سے کم کوئی دو سو تو ضرور رہے ہوں گے ۔ ستر سے بھلا کیا ہو سکتا ہے ۔ سو تک کو تو آپ چٹنی کر کے دھر دیں ۔
خوجی ۔ بس صاحب من خواجہ بدیعا کو مع قرولی کے قید کر دیا لیکن عزت کے ساتھ آدمی اور نوکر اور چاکر اور اسباب اور کھانا اور دانا اور پانی اور سب کچھ وغیرہ وغیرہ موجود ۔
راوی ۔ اور گھانس ۔ بگڑ نہ جائیے گا ۔ دانے کے ساتھ گھانس ضرور ہے ۔
خوجی ۔ شاباش تو بندہ درگاہ وہیں رہے ۔ سحر کاذب کے وقت قرولی لے کر غل مچایا کہ آ جائے جس کو مقابلہ کرنا ہو ۔ من بدیعا چلتے ہیں بس کوئی پھر دوگڑ دوڑ دوڑ کے نکل پڑا ۔ لینا لینا ارے میں نے کہا کس کا لینا اور کہاں کا لینا ۔ آجا ۔ آجا ۔ مقابلہ پر آ ۔ محمدی قسم ہے اس روز کی ۔ جو جوں بھی کسی نے کی ہو ۔ اے ہے سب ڈر گئے دو دو کر کر

آدمی۔ کچھ ٹھکانا ہے ایں خیال تو کیجیے۔ جی کوئی دو ہزار جیالے روسی تو جھپٹے مگر من خواجہ بدیع کی یہ کیفیت تھی کہ لکڑی ٹیکی اور آدھ میل پر ہو رہا۔

راوی۔ بس۔ آدھ ہی میل تو اس میں آپ ابھی کچھ چنے ہیں مگر آپ انکسار کرتے ہیں لکڑی ٹیک کر کم سے کم دو کوس کی تو آپ خبر لاتے ہوں گے۔ بچے مرتے جاتے ہیں بھوتوں کو ذرا بخار تک نہیں آتا۔ کیا اندھیر ہے۔

خواجہ صاحب کو ترکوں نے مل کر خوب الو بنایا صاف صاف بتاؤ کہاں پھنسے تھے کیونکر بچ آئے۔ فوج روس کی کہاں ہے اب ان کا قصد کیا ہے کتنے آدمیوں کی جماعت ہے آپ نے یہ جواب دیا۔

سوال۔ قید کس جگہ پر ہوئے تھے بیان کرو اور راجر پاؤ۔

جواب۔ قید ایک مقام پر ہوئے تھے روس نے قید کیا تھا۔

سوال۔ بچے کیونکر۔ اس کے اسباب بیان کرو۔

جواب۔ بزورِ قرولی شعلہ بار و بزورِ شمشیر جوہر دار بزورِ افیون و نشہ تل بزور لکار کر ڈپٹائے خواجہ بدیع الزماں۔

سوال۔ فوج روس کہاں ہے۔

جواب۔ فوج روس وہیں ہے جہاں ہم چھوڑ کر آئے تھے۔

سوال۔ اب روسیوں کا قصد کیا ہے۔

جواب۔ قصد یہی ہے کہ جنگ کریں لڑیں کٹ مریں۔

سوال۔ کتنے آدمیوں کی جماعت ہے تخمینہ بتاؤ۔

جواب۔ کبوتر بازی سے ہمیشہ نفرت رہی۔ تڑ سے گن لیتا کہ کتنے آدمی ہیں اس مرض کا طوطا کبھی نہیں پالا۔ صرف دو کرور۔

آدمی اور جوان۔ جوان آدمی خاصے ہٹے کٹے ہم سے آن کر بھڑ پڑے تھے مگر ہم نے رہائی پائی۔ لکڑی ٹیکی اور راہ لی۔ یہ آئے وہ آئے۔ دن تڑ کھٹ۔

ترک سمجھ گئے کہ زا انگو ہے۔ کہا تمھارا چھوٹنا اور قید ہونا جینا اور مرنا سب یکساں ہے۔ رہا ہونا چاہیے تھا آزاد کو رہا ہوئے حضرت دو کرور روسی زورِ قرولی ادھر یہ اور وہ جو بکتا ہے خرافات ہی بکتا ہے خواجہ صاحب نے پھر وہی بڑا ق ہانک لگائی۔ مار لیا مار لیا۔ آن پہنچے آن پہنچے ہم سے ایک روسی بڑے دھوے

سے لڑنے آیا تھا اور آزاد کو ایک پری پکڑے گئی۔

یہ کیفیت ہوئی کہ الامان۔ اور وہ حسن کہ حسن دان. جس طرح فردوسی نے شاہنامے میں محمود کی تعریف کی اسی طرح کوئی شاعر ہماری بھی تعریف کرے گا۔ وہ شاہنامہ ہے یہ بدیع نامہ ہوگا۔

آزاد کی روپوشی

درخت کے سایے میں ایک بونا امیروں کا کھلونا اکڑ کر کھڑا ہے اور ادھر اُدھر دیکھ کر مسکرا رہا ہے ہمارے ناظرین اس گیدی کو سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ کون ہے اگر ہمارے پاس فرولی ہوتی تو بھونک دیتے۔ ہات ترے گیدی کی مردود آج بونا بن کے آیا ہے اور ہم پہلے ہی سمجھ گئے تھے کہ بہروپیا ہے ناظرین کو اس قدر ضرور یاد ہوگا کہ آزاد کو گرفتار کر کے مس کلیر سا اس مقام پر لائیں جہاں سوار تھے اس کے بعد کا حال اب سنیے۔ خوجی نے جو آزاد کی گرفتاری کی خبر پائی تو تلملانے لگے۔ سواروں نے ان کو رہا کر دیا۔ ان کو اس وقت خوجی کی گرفتاری کا خیال نہ تھا۔ جب خود آزاد دل گئے تو خوجی کس کھیت کی مولی ہیں۔ جب سوار آزاد کو گرفتار کر لائے تو خوجی روتے سر پیٹتے ہوئے ان کے دیکھنے کو گئے تو کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ یہ بے محل ہنسی کیسی۔ خوجی نے غور سے دیکھا تو آزاد کا پتہ نہیں سمجھے کہ ان لوگوں نے غچا کھایا کسی بے گناہ کو آزاد کے دھوکے میں پکڑ لائے۔ فرط حیرت سے ادھر اُدھر بغلیں بجاتے تھے۔ مارے خوشی کے جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے۔ ایک بار مس میڈا کے قریب جا کر کہا اچھا جھانسا دیا۔ کلیر سا کے کان میں کہا۔ ان جانگلو گیدیوں کو خوب بنایا الو ہی رہے۔ مگر خواجہ بدیع معا پہچان گیا تھا کہ یہ شدنی ہے آزاد اور کسی کے پنجے میں پھنسے۔ توبہ توبہ کر دروں میں بند نہیں رہے حضرت۔

کلیر سا اور میڈا نے سواران سے کہا کہ ہم جاتے ہیں تم ان کو قید رکھو کل تحقیقات کی جائے گی۔ سوار اس کو لے کر راہی ہوئے۔ ادھر کلیر سا اور میڈا نے پولینڈ کی شہزادی کے ہاں جا کر کل کیفیت بیان کی۔ اور خواجہ صاحب

نے جناب باری کا شکریہ ادا کیا۔

خوجی۔ ع شکر شکر ہزار شکر شکر۔ اوہ اوہ میری تو روح فنا ہو گئی تھی کہ یار و آزاد پاشا ایسا جرار و کرار اور گرفتار بہ دستِ سوارانِ نابکار شود۔ مولا خدائے ما شنوائی نمودہ گرفتار کردہ رارہا ساخت۔

شہزادی۔ یہ آخر ہوا کیا۔ یہ کس نے کہا کہ آزاد یہی ہیں۔

کلیرسا۔ خدا جانے مگر ہمیں حیرت ہے تو یہ کہ اتنے آدمی بھیجے ایک نے بھی نہیں کہا کہ آزاد اس مکان میں ہیں اب یہ دریافت کرنا چاہیے کہ آزاد کہاں ہیں۔

میڈا۔ ہم نے خود جاکے دیکھا مگر وہ نہ ملے اسی سبب سے تو مجھے خیال تھا کہ بےچارے دھرے نہ گئے ہوں۔ بارے صد شکر کہ بچ گئے ورنہ بڑی مصیبت میں پڑتے

خوجی۔ اچھی دل لگی ہوئی۔ کرے کوئی دھرا شیطان ڈالا جائے یا تو خدا جانے کہاں سے پھانسا ہے۔ اور لطف یہ کہ بولتا تک نہیں گویا سچ مچ کے آزاد پاشا ہیں تو وجہ کیا اس میں کچھ ہے۔ پوچھیے فرمایئے وہ کیا ہے۔

واقف جو ہم نہیں ہیں اس بزم میں کسی سے

ہیں کیا غریب بیٹھے چپ چاپ اجنبی سے

کلیرسا۔ دو چار آدمی ادھر ادھر بھیج دو۔ کہ آزاد کا حال تو معلوم ہو جائے۔ وجہ کیا کہ اب تک کچھ سننے میں نہیں آیا کہ کہاں گئے کہاں نہیں گئے۔ شہزادی نے فوراً آدمی دوڑائے خواجہ صاحب بھی جانے کو تھے مگر مس میڈا نے کہا آپ یہیں رہیے آپ کا جانا کچھ ٹھیک نہیں ہے خدا جانے کیا بک اٹھو۔ خوجی بہت بگڑے فرمایا گو تم سے دل لگی کا رشتہ ہے کیا معنی کہ تم مس روز کے سبب سے ہماری سالی ہو مگر یہ موقع دل لگی کا نہیں بے موقع بات نہ کرنی چاہیے۔

کلیرسا۔ تم داڑھی منڈوالو بالکل صفاچٹ جس میں کوئی پہچان نہ سکے کہ کون ہو۔

خوجی اوہو ہو خوب کہی۔

داڑھی کے منڈانے کو اندر سے جو فرمایا زاہد نے کہا اچھا جو کچھ ہو رضا ہی کی

میڈا۔ مجھے رہ رہ کے ہنسی آتی ہے کہ اس اجنبی کو اچھا پھانسا۔

خوجی۔ خوب دھر اگیا گیدی۔ اب بچہ جی کو معلوم ہوگی ہم تو جانتے ہیں ذرا سیر کے

لیے دیکھیے کیا دل لگی ہوتی ہے منہ چڑھاؤں گا۔

کلیرسا۔ کوئی آدمی واپس آیا یا نہیں۔ نہ آیا ہو۔ تو دو چار اور روانہ کرو اور کہو جہاں ہوں پتہ لگائیں۔

اب سنیے کہ خواجہ بدیع صاحب عقلمند تو تھا سے زیادہ تھے سوچ کر مس مٹیڈا کی آنکھ چوکے تو ہم آزاد کی تلاش کے لیے باہر نکلیں ۔ اردو میں بہ آوازِ بلند اپنے دل سے باتیں کرنے لگے ۔ بھئی واللہ دن سے نکل جاؤں گا۔ آنکھ چوکی اور پگڑی غائب۔ بندہ درگاہ کچھ ایسے ویسے تو ہیں نہیں کہ دھر لیے جائیں اور پھر خدا کے فضل سے یہ بات بھی ہے کہ پہلوان ہیں مصر کے پہلوانوں کی کشتی نکالی

من آنم کہ اسپانِ شہ پرورم بخدمت دریں مرغزار اندرم

ایک روز کی دل لگی سنیے۔ کہ ایں جانب ایک گھوڑے پر سوار گومتی کے کنارے کنارے جاتے تھے اور گھوڑا اس طرح اڑتا تھا جیسے اڑن کھٹولا۔ یہ چمکا وہ بھڑکا۔ پری کہوں دلہن کہوں۔ چڑیا کہوں گرد کہوں۔ کیا کہوں۔

راوی - اور تو اور چڑیا اور گرد کی ایک ہی کہی۔

بس حضرت سلامت بادشاہ کی نظر پڑی اور گھوڑا ہوا کی طرح جاتا تھا۔

جو نکلے جیم منہ سے چین میں تو لام لندن میں سوار ان سے ذرا چل کر کے دیکھے ان کی جوانی

یہ گھوڑے کیا ہیں پرندے ہیں پرندے ہیں

بس جناب والا اتنے میں یہ ہوا کہ بادشاہ نے ہم کو سلام کیا۔

راوی۔ بجا ارشاد فرمایا۔ میں بھی دیکھ رہا تھا بہت جھک کر سلام کیا تھا مگر حضور نے جواب دیا نہیں بلکہ بد دماغ ہو گئے۔ سچ ہے گاہے بہ سلامے برنجند وگاہے بہ دشنامے خلعت دہند۔

ہر کہ شاہ آں کند کہ او گوید حیف باشد کہ جز نکو گوید

نہ کہو گے ہم نے بھی ٹک ملا دیا نہیں تو۔

خواجہ صاحب نے فرمایا کہ بس حضرت خدا آپ کا بھلا کرے ہم نے جواب دیا مگر مسکراتے ہوئے پھر بادشاہ سے ہم سے باتیں ہونے لگیں۔

بادشاہ - اجی حضرت اب تو آپ کے مزاج ہی نہیں ملتے۔

بدیعا۔ اس کے کیا معنے آخر جو تم نے طعنہ دیا (اب) آپ کے مزاج ہی نہیں ملتے تو اس اب کے کیا معنی اور ہمارے دماغ ملتے کب تھے۔

راوی۔ صحیح ہے دماغ میں تو ابتدا سے فتور تھا۔

خوجی۔ بس حضرت سلامت بندے نے ڈپٹ کے جواب دیا تو بادشاہ یوں بولے فدوی گفت گو غور سے سنیے گا۔ ہاں سننے کے قابل ہے۔

بادشاہ۔ ارے یار تم تو بگڑ ہی جاتے ہو۔

بدیعا۔ بدیعا یار۔ یار چہ معنی دارد۔ یار کون ہے۔ ہم ایسوں سے یارانہ نہیں رکھتے جن کے قول و فعل ایک نہیں۔ قولِ مرداں جان دارد۔

بادشاہ۔ اخاہ میں اب سمجھا۔ یہ کہیے بھائی تم سے یہی وعدہ تھا کہ ڈھائی گھڑی کی سلطنت دیں گے وہ وعدہ پورا کیے دیتے ہیں۔ بادشاہ تم ہی سہی۔

راوی۔ کیا ہولی کے دن تھے یا شطرنج کا دیوانہ بادشاہ بنایا۔

بدیعا۔ ہم بادشاہی کو لے کر کیا کریں گے۔

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

بادشاہ۔ اچھا ایک کام کرو۔ ہم سے کچھ جرمانہ لو۔

بدیعا۔ ہاں یہ بات مانی۔ تم منادی کرا دو کہ جس وقت خواجہ بدیع الزماں بدیع کی سواری نکلے اس وقت کوئی بیٹھا نہ رہے سب کھڑے ہو کر آداب بجا لائیں۔ اور اس کے علاوہ اور شرطیں بھی ہیں صبح کو ہر فرد بشر بآواز کہے۔

بسم اللہ الرحمان الرحیم ہنگا گر پا پائی اور گستی کرا فیم۔

جو شخص افیم نہ پیتا ہو وہ نوکری نہ پائے اور جو افیم پی کر پینک سے بری رہتا ہو وہ نوکری پائے مگر ترقی ندارد اور جو افیون نہ کھائے وہ قید کر دیا جائے اور افیمیوں کے قبلہ گاہ حضرت چانڈو باز متبرک اور مقدس سمجھے جائیں چلیے ما بخیر و شما بہ سلامت۔

تیسری شرط بڑی کڑی ہے جی ہاں حضرت بادشاہ بولے بھائی خدا کے لیے کہو تو کڑی اور سخت جو کچھ ہو ہم مان لیں گے۔ جرمانہ دیں گے۔ ہم نے کہا۔

جو پہلوان اس شہر میں ہے پہلے ہم سے خم ٹھوک کے لڑے گا۔ اٹھاؤں اور گد سے پھینکوں اٹھاؤں اور دن سے دے ماروں اٹھاؤں اور دوں گدا۔ حضرت سلامت ایں جانب استادوں کے استاد نامی پہلوان ہیں ایسے ویسے نہیں۔

بادشاہ کی سنیے ڈرتے ڈرتے کہا۔ بھائی جان ذرا ذرا سے تو تمہارے ہاتھ پانوٗں ہیں۔ ننھا سا قد۔ ہڈیاں پسلیاں نکلی ہوئیں کوئی پھونک مارے تو اڑ جاؤ۔ اور دعویٰ یہ کہ پہلوان سے لڑوں گا۔ اتنا کہنا تھا کہ بندہ آگ ہو گیا۔ بس اسی دم گھوڑے کو درخت سے باندھا اور کپڑے اتار کر خم ٹھوک کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ہل من مبارز۔

مس میڈا۔ پھر کشتی ہوئی یا نہیں ہوئی۔ تم نے کشتی نکالی ضرور ہوگی۔ وہ تو ہاتھ پانوں ہی کہے دیتے ہیں۔

خوجی۔ اب ایک بات کہوں تو خفا ہو جاؤ۔ پانوں کی بات تو ایسی ہے کہ حضور کی ہمشیرہ جان رکھ گئیں بس اب منہ نہ کھلوائیے گا۔

خیر خم ٹھوک کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ نے کہا وزیر کو بلاؤ۔ وزیر سے کہا کہ اس دم پہلوانوں کو جمع کرو۔ اور بندے نے خم ٹھوک کے ٹہلنا شروع کیا۔ وزیر نے دیوان کو بلایا ان سے کہا کہ پہلوانوں کو بلاؤ۔

الغرض شتر سوار اور سانڈنی سوار ہرکارے روانہ ہوئے اور بندہ درگاہ نے خم ٹھوک کر کہا۔ آئے جس کا جی چاہے۔

بادشاہ نے کہا خواجہ صاحب کمیدانی کے بھروسے نہ رہیے گا۔ کمیدانی رکھی رہے گی۔ رسالداری اور کمیدانی کو پہلوانی سے کیا واسطہ؟ پہلوانی اور شے ہے کمیدانی اور شے ہے۔

اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ دو سو آدمیوں کا غول چلا آتا ہے ایک سے ایک بڑھ کر جو تھا بیل بنا ہوا۔ معلوم ہوا کہ نورا پہلوان اور اس کے پٹھے آتے ہیں۔ خم ٹھونک کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

خواجہ صاحب کی باتیں سننے سے مس میڈا اور پولینڈ کی شہزادی اور مس کلیریسا کا غم غلط ہو گیا ورنہ آزاد کی جدائی سخت شاق گزر رہی تھی۔ اتنے میں خواجہ

صاحب نے فرمایا کہ بندہ درگاہ چٹ لنگوٹ تو باندھے تھے ہی۔ ایک دفعہ ہی خم ٹھونک کے من بدیع اس پہلوان کے سامنے کھڑا ہو گیا میرا بدن چور۔ دیکھنے میں کچھ بھی نہیں۔ مگر اکھاڑے میں کھڑا ہوا اور بدن پھول کے کپا ہو گیا اور بالکل بعینہٖ گُل ڈانگ (بل ڈاگ کی خرابی ہے گل ڈانگ) بس حضور پھر تو یہ کیفیت تھی کہ دو سو آدمی ایک طرف اور بندہ درگاہ ایک پینی دو کلاہ دوسری جانب۔

پہلوان۔ استاد ہم سے لڑنے کا بوتا ہے کیوں لڑو گے۔

بدیعا۔ پٹھے تو کیا لڑے گا مگر دعوی نہیں کرتے ہم تو ایک بات جانتے ہیں خم ٹھونک کے بدیع کے سامنے آ تو جائیں۔

پہلوان۔ خم ٹھونکنا کیا معنی بدوو ایک روز۔

بدیعا۔ ایک روز ایک روز کی ماں گھوڑے ملتی ہے ابھی ابھی۔ اسی بالو میں چٹ پٹ کی ٹھہرے۔ آئیے بس آئیے۔

پہلوان گینڈا بنا ہوا کہنے لگا۔ اچھا بس آؤ۔ آؤ کا لفظ سننا تھا کہ اس جانب نے خم ٹھونک کے پینترا بدلا۔ دیکھتا ہوں تو پہلوان نہ دار دکھیں پتا ہی نہیں۔ ہات تیرے گیدی کی دم میں نمدا۔ آنکھوں میں دھول کانوں میں گرما گرم پانی منہ میں خاک۔ کیوں بچہ پھر مردوں کا مقابلہ کرو گے۔

ہم رستمِ داستاں ہیں سن لو　　ہم تم سب پہلواں ہیں سن لو

ایک شاگرد نے آن کر کہا۔ پہلے ہم سے کشتی لڑ لو پھر مقابلہ کرنا۔ استاد سے لڑنا دل لگی نہیں ہے پہلے ہم سے مقابلہ کیجیے پھر کسی اور سے مقابلہ کا دعوی کیجیے گا۔ میں نے خم ٹھونک کے کہا آئیے آپ ہی سے سہی اس وقت ہاتھ کھجلاتا ہے۔ اس نے برجستہ جواب دیا۔ ہاتھ تو کھجلاتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سر بھی کھجلانے لگے۔

راوی۔ خوب کہی۔ واللہ اچھی پھبتی کہی۔

بدیعا۔ کیا سر۔ ہاں اچھا آجاؤ۔ اپنے ساتھی کو بھی لا۔ اور مقابلہ کر دیکھیں تو کیا کر لیتا ہے۔

آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اٹھا کے مارا تو چاروں شانے چت۔ دوسرا آیا۔ اس کو بھی پٹخنی دی۔ تیسرا آیا اس کو بھی اٹھا یا کے دے مارا۔ چوتھا آیا اور لگا چین چپڑ کرنے۔ بس نے قلاجنگ کے پیچ پر اس کو بھی اڑایا۔ العرض پچپن آدمیوں

کو لڑایا۔

راوی۔ جھوٹے کو افیم کی مار۔ جھوٹے پر چانڈو بازوں کی پھٹکار۔ جھوٹے پر ٹھنڈے پانی کے دو سو گھڑے۔ کہو بیش باد۔

خوجی۔ بس جناب پھر تو وہ پہلوان بلا کی طرح آیا۔ ہاتھ ملاتے ہی غلام نے زمین پر منہ کے بل گرایا۔ وہ مارا۔ مگر سنبھلا اور اس زور سے گردن پکڑی کہ توبہ ہی بھلی۔ میں نے بیچ کیا تو گردن چھوٹ گئی۔ اور پہلوان کی امید کی کمر ٹوٹ گئی۔ پھر چھپٹا میں نے دستی کی اور دون سے پیٹھ پر آنٹی دی اور تڑسے زمین پر لایا سواری کس دی۔ پہلوان ہانپ گیا اور میں نے کہا ہار گیا ہے۔

مئیڈا۔ پھر تو وہ سامنے نہ آیا ہو گا۔ ڈر گیا۔

کلیرسا۔ بڑے پہلوان ہیں ابھی ایک عورت کو بلاتی ہوں تو پھر پہلوانی رکھی رہتی ہے بلواؤں پھر

خوجی۔ ایک شرط ہے۔ جبشن نہ ہو۔ بوا زعفران کی بہن نہ ہو۔ اور ع۔ ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختہ۔

کیا چیز بھلا قصر فریدوں مرے آگے
کانپے ہے پڑا گنبدِ گردوں مرے آگے

میرے آگے پہلوان اکھاڑے میں آئے تو مار ڈالوں۔ مگر بعض اوقات رحم آجاتا ہے یہ ہماری بدبختی ہے۔

مس کلیرسا نے ایک موٹی تازی ہٹی کٹی دیولی کو اشارہ کیا کہ ان کو اٹھا کے دے مار خوجی خم ٹھونک کے اکڑ رہے تھے کہ وہ عورت ان کے قریب آن کھڑی ہوئی کہا کیا خم ٹھونکتے ہوا ابھی کہو تو ایسی پٹخنی دوں کہ یاد کرو۔ بڑے پہلوان بنے ہیں۔ خوجی بگڑے ہی تھے کہ اس نے ایک چپوٹا جمایا۔ اور دونوں ہاتھ پکڑ کر ایک گدا دیا اور اٹھا کے پھینکا تو دم سے زمین پر۔ اس نے ان کو معًا الٹ دیا اور کہا بس

اب نہ اٹھنا بہت خم ٹھونک ٹھونک کے شیخی بگھارتے تھے اب بولو بچہ پھر خم ٹھوکو گے؟ ہات تیرے گیدی کی۔

خوجی۔ اللہ جانتا ہے عورت سمجھ کر چھوڑ دیا۔ ورنہ ایسا دق کرتا اور اس طرح پٹخنی بتاتا کہ واہ رے میں اور واہ رے میں۔ واللہ چھٹی کا دودھ یاد کرتی۔

خوجی خم ٹھونک کر ادھر ادھر دیکھتے تھے کہ جتنی پریاں یہاں جمع ہیں سب ہم کو اس وقت۔ گھور رہی ہوں گی۔ مگر جبشن نے وہ چٹخنی بتائی کہ ساری شیخی نکل گئی۔ بڑی کرکری ہوئی۔ مگر بے حیا کی بلا دور۔ ان کو اس سے کیا واسطہ۔ جبشن کی طرف دیکھ کر کہا مردار تو تو بوا زعفران کی بھی نانی ہے وہ تو خیر میاں کے دھوکے میں تھی۔ اور تو بے میاں بنے ہوئے بگڑ کھڑی ہوئی۔ پولینڈ کی شہزادی نے کہا مزاج شریف کہیے اب پھر خم ٹھونکیے گا۔ اے لعنتِ خدا، پہلوانوں سے تم کیا پکڑ لڑو گے جب ایک عورت تک کا مقابلہ نہ کر سکے مگر زبان البتہ کترنی کی طرح چلتی ہے باقی خیر صلاح۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ شہزادی صاحب آپ سمجھیں نہیں ع۔ ناز براں کن کہ خریدارِ تست۔ یہ ہم پر ریجھ گئی ہیں اور ہم ان پر ریجھے ہیں۔ تو یہ نخرے کیا ہی چاہیں۔ ان کے ن خ ہم نہیں گے اور ہمارے چونچلوں کی یہ داد دیں گی ابھی کیا ہے ابھی تو ہمارا سر ہوگا ان کا جوتا۔ ہماری ناک ان کی چھری۔ ہمارے دانت ان کے پتھر اور یہ ادنیٰ ادنیٰ سی باتیں ہیں۔

مرغِ سحر کو چاہیے کہ عشق پروانے سے سیکھے کہ اس جلے ہوئے کی جان گئی آواز تک نہ نکالی یہ مدعی ہیچ طلب اس کی کہ بے خبر ہیں کہ اس کی جس کو خبر ہوئی اس کی پھر نہیں آئی۔ مطلب یہ کہ عشق صادق ہونا چاہیے اور پختہ مغز۔ جنوں ورنہ عشق ہیچ ہے۔

کیا خوب لڑکپن یاد آگیا گویا گلستاں کا سبق پڑھ رہے ہیں۔

میڈا - ابھی تک آزاد کا حال نہ معلوم ہوا کہ کہاں ہیں۔

خوجی۔ کچھ گھبرانے کی بات نہیں ہے وہ کہیں محفوظ مقام پر ہوں گے آدمی کائیاں ہیں اور ہم نے اکثر اس کو پیچ بھی سکھائے ہیں۔

میڈا - ہاں تو شاگرد آپ ہی کے ہیں خدا خیر کرے۔

خوجی - شاگرد۔ شاگرد کیسے میرا لڑکا ہے صاحب۔

خواجہ صاحب نے کہا ایں جانب پھر ایسے پہلوان اور خلقی پھیت ہیں کہ ایک ایک پور میں پیچ ہے صرف انگلی کے دو سو پیچ معلوم ہیں اور ان سب کے توڑ۔ ایک ایک پیچ کے دو دو توڑ اور ہر توڑ کا نوٹر۔ جس روز من بدیعا تولد ہوا اس روز تولد گاہ میں ایک شیر کی صورت دیوار پر از خود بن گئی۔ لوگوں نے کہا یہ بدیعا شیر مرد

ہوگا۔ چنانچہ ویسے ہی این جانب ہوے۔ مس کلیر سا نے کہا اس میں کیا شک ہے۔ شیر نہیں تو بکری کی صورت البتہ بن گئی ہو گی۔ خوجی کے اس فقرے پر ہمیں ایک مثل یاد آئی کہ ایک زمیں دار اپنے دروازے پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ اُدھر سے ایک بھدڑی کا گزر ہوا۔ ساعت بچارے زمیں دار آدمی تھا ضعیف الاعتقاد۔ بھدڑی کو بلایا تعظیم کی عزت کے ساتھ بٹھایا۔ دروازے پر زمیں داریاں آن کر بیٹھیں۔ کھری اور عورتیں بھی (ٹھیں) زمیں دار نے اپنے لڑکے کو بلایا اور بھدڑی سے کہا۔ مہاراج اس کا ہاتھ تو دیکھو بھدڑی نے ہاتھ دیکھا اور کہا آہا ہا ہا۔ یہ تو بڑا بھاگوان ہے چاروں کونوں میں نام کرے گا اور ہاتھی کی سواری پھیل نشیں (فیل نشیں) ہوگا۔ اتنا سننا تھا کہ زمین دار نے سر پیٹ لیا عورتوں کو سخت تعجب ہوا۔ کہ یہ بے محل سر کوبی یعنی چہ۔ اس کو کمال خوش ہونا چاہیے تھا کہ اس کا فرزند دلبند فیل نشیں اور صاحب عزت و تمکیں ہوگا۔ مگر خوشی کے عوض اس کو رنج ہے یہ سر پیٹ رہا ہے۔ زمیں دار کی جورو نے ڈانٹ بتائی اور اپنی زبان میں کہا تم کچھ سڑی تو نہیں ہوگئے ہو ہاتھی کی سواری نصیب سے ہوتی ہے زمیں دار بولا ہائے ہائے یہی تو افسوس ہے کہ یہ سارا دلڑکے کی طرف اشارہ کرکے، پھیل نشیں کیا ہوئی یو سار چوکٹا ہوئی (یعنی یہ سار فیل نشیں تو کیا ہوگا۔ یہ چرکٹا ہوگا) اس پر عورتوں نے قہقہہ لگایا کہ فیل نشینی تو زمیں دار نے قائم رکھی مگر امارت کے عوض چرکٹے کی اچھی سوجھی۔ اسی طرح حضرت خوجی کے تولد کے وقت شیر کی تصویر دیوار پر بن گئی تھی۔ اس سے مطلب یہ تھا کہ ہر در و دیوار سے ان کو شیر ہی نظر آئیں گے۔ اور تو خیر یہ تولدگاہ کی اچھی کہی۔

اتنے میں ایک خادمہ نے کہا حضور میاں آزاد بہ آرام ایک ایسے محفوظ مقام پر ہیں جہاں پرندہ تک پر نہیں مار سکتا۔ آپ مطمئن رہیے مجھے سبز پوش نے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ جس مکان میں آزاد تھے اس کے دروازے پر بھی دس سواروں کا پہرا بیٹھا تھا لہذا سبز پوش خادمہ ان کو کوٹھے پر سے دوسرے کوٹھے پر لے گئی اور وہاں سے دوسرے محفوظ مکان میں جگہ دی اس خبر سے مس میڈا اور مس کلیر سا کی جان میں جان آئی۔ اور پولینڈ کی شہزادی کی باچھیں کھل گئیں۔ مگر خوجی چنداں خوش نہ ہوئے کلیر سا نے اس کا سبب دریافت کیا تو خواجہ صاحب نے منہ بنا کر فرمایا۔

آپ ابھی کم سن ہیں۔ دنیا کے نشیب و فراز سے آپ کو کیا واسطہ۔ یہ کوئی خوشی کی بات تھوڑا ہی ہے میاں آزاد ہیں عاشق تن آدمی اور وہ سبز پوش آدمی خادمہ ایک ہی چمکو اور معشوق مزاج ہے خدا کی پناہ ایک آزاد اور دس معشوق۔ میں سوچتا ہوں کہ آخر یہ کر بس گے کیا۔ اللہ رکھی پری چہرہ سفید دلائی میں بغیر زیور کے ایسا نکھر لی ہے کہ صل علی۔ ایک بولی ٹھٹی کی شوخ اور چنچل بیگم چھلاوا ہے۔ قیامت کبریٰ ہے دوش بہ دوش ہے۔ دو ہوئیں۔ اختر النسا اور زیب النسا دونوں آفت جان بلائے درماں۔

زاہد صد سالہ تک سجدہ کرنے لگتے اور عشق کا دم بھرنے لگتے ہیں۔ چار ہوئیں۔ اب آگے چلیے۔ حسن آرا بیگم کا حال اظہر من الشمس ہے ان کے حسن و جمال کی تعریف تحصیل لاحاصل ہے۔ پانچ ہوئیں۔ اور لیجیے مس میڈا۔ وہ بانکی ادا اور تیکھی چتون کہ برسوں ملایک اس تمنا میں رہیں کہ ایک دفعہ نور کا جھمکڑا دیکھیں۔ چھ خوش اور چلیے پولینڈ کی شہزادی ماہ لقا رنگیں ادا قوس ابرو، عنبر مو، رشک حور و دراز قصور۔ سات ہوئیں اور خدا جانے کون کون ہے یہ سبزہ پوش آٹھویں ہوئیں یا الٰہی سننے سے ہوش اڑتے ہیں۔ خوجی کا بیان کسی قدر صحیح تھا۔ سبز پوش کو آزاد کی ایک ایک ادا دل میں بھائی تھی۔ بار بار نظر غلط انداز ڈالتی تھی۔ آزاد بھی سمجھ گئے کہ اس پری وش کا ہم پر دل آیا ہے خواہ مخواہ ان کو بھی کسی قدر محبت ہوا ہی چاہیے اور نوجوان حسین۔ خوش قطع۔ خوش وضع۔ خوش پوش۔ معنبر و معطر بات چیت ہنسی مذاق میں طاق، دل ربائی میں شہرہ آفاق۔ یوں تو ہر عضو بدن سانچے کا ڈھلا تھا مگر کمر اور آنکھیں غضب کی تھیں۔ جادو نگاہ اور انتہا کی نازک کمر۔ میاں آزاد قسمت کے بڑے دھنی تھے۔ رو پوش بھی ہوئے تو ایک معشوق کے ذریعے سے۔ سبز پوش نے کہا۔ آزاد پاشا ایک بات کہنے کو ہوں اگر اجازت دو اور برا نہ مانو تو کہوں۔ آزاد نے کہا میں بے سنے ہوئے تاڑ گیا کہو تو بے سنے ہی جواب بھی دے دوں۔ سبز پوش لجا کر بولی۔ حضور ہم غریب آدمی اور خادمہ مگر دل کو کیا کریں۔ آزاد پاشا نے کہا تم صاف صاف بیان کرو۔

سبز پوش۔ صاف صاف کہتے شرم آتی ہے۔ صرف اس قدر عرض ہے کہ خفیہ طور پر ہم سے نکاح ہو۔ میں اپنی عزت کو عزیز رکھتی ہوں مگر ایک پادری صاحب ایسے ہیں کہ

وہ بلا تامل نکاح کرا دیں گے۔

آزاد۔ سنو تمہارے حسن اور عنوانِ شباب اور چمک دمک اور خوش ادائی میں ذرا شک نہیں۔ مگر پولینڈ کی شہزادی پر کھل جائے تو کیا ہو ستم بپا ہو یا نہیں۔ بس یہی خیال ہے ورنہ ہمیں اصلا عذر نہیں۔ تم غور کر لو۔

راوی۔ آزاد کو سبز پوش کی عجلت اور بے قراری اور خیال نکاح پر بڑی ہنسی آئی مگر مہذب آدمی تھے ٹکا سا جواب دینا خلاف عقل سمجھے لہٰذا بہ عنوانِ مناسب بات ٹال دی۔

سبز پوش۔ خیر آپ کو اختیار ہے۔ خدا گواہ ہے کہ میں نے اپنی حیا کی آنکھ پر پٹی کھلی تھی، تب یہ بات کہی تھی۔ مگر اب تم قسم کھاؤ کہ کسی سے بیان نہ کروں گا۔ اگر بیان کیا تو زہر کھا لوں گی۔

آزاد۔ معاذ اللہ۔ بیان کیا کرتے ہیں کوئی اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے تم کو کوئی بے حیا نہ کہے گا۔

سبز پوش سمجھی کہ اگر آزاد کو پولینڈ کی شہزادی کے ہاں لے گئی تو یہ موقع نہ ملے گا۔ یہاں خیمے میں رہنے سے شاید راست پر آئے اور نکاح ہو جائے۔ مگر جب معلوم ہوا کہ مس کلیرسا اور مس میڈا اور شہزادی آزاد کی مفارقت سے کمال بے قرار ہیں تو آدمی کی زبانی کہلا بھیجا کہ کچھ فکر نہ کرنا آزاد بخیریت ہیں میں انھیں جسم کا آرام دیتی ہوں۔

اب اِدھر کا حال سنیے۔ وہی جنشن جس نے میاں خواجہ بدیع الزماں کو پٹخنی بتائی تھی۔ ان کے قریب آکے بیٹھی۔ خوجی اس کی صورت دیکھتے ہی جل بھن کر خاک ہو گئے اور کسی قدر پیچھے ہٹے۔ اور وہ آگے بڑھی یہ پھر پیچھے ہٹے وہ بھی ساتھ ساتھ ہی کھسکی تو جھلا کر ٹوپی اتار کے کھوپڑی پر دو ہتھڑ لگانا شروع کیا تو آدھ گھنٹے تک پیٹا کیے۔

میڈا۔ ہنس کر یہ خوب بات ہے بڑے مرد و دے بنے ہو جب جانیں کہ ان کو یہاں سے ہٹا دو۔ ایک عورت تک سے مقابلہ نہیں کر سکتا اور دعویٰ یہ کہ ہم پہلوان ہیں۔

کلبیرسا۔ جاؤ بس دیکھ لی پہلوانی۔ پہلوان بن کے آئے ہیں۔

خوجی۔ عورت سے کون بولے کوئی پہلوان ہوتا تو سمجھ لیتے اس کو اگر پٹخنی دی تو کیا اور نہ دی تو کیا۔ اگر گر گئے تو بدنام ہوئے اور دے مارا تو لوگ ہنسیں گے کہ واہ ایک عورت تک کا مقابلہ نہ کر سکے۔ کس برتے پر تتا پانی۔ اور عورت بھی کچھ ایسی کراری نہیں ہے۔

کلبیرسا۔ تم اس قابل ہو کہ دریا میں ڈبو دے۔

خوجی۔ خیر آپ کی بلا سے۔ قرس کوچہ کا جب فوجِ غنیم کو ڈپٹا تھا تو کلیجے ہل ہل جاتے تھے تیغِ دوسری یوں چلتی تھی جیسے بجلی۔ یہ چمکی وہ چمکی۔ یہ آئی وہ آئی۔ تلوار کیا اجل تھی۔

وہ حبشن ان کے اور بھی قریب آئی اور قریب آن کر میاں خوجی کے کان پکڑ کر ہلائے تب تو خوجی آگ ہو گئے۔ کہا چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے اس جانب اب ایک نہ مانیں گے اور ضرور لڑیں گے۔

ہر کارے کہ ہمت بستہ گردد   اگر خارے بود گل دستہ گردد

مئیڈرا۔ کیا لڑائی پر آمادہ ہو۔ اب بھی نہ ہو تو افسوس ہے۔

خوجی۔ لڑوں اور بیچ کھیت لڑوں یہ تو اب ہاری مانتی ہے نہ جیتی۔ کسی کی سنتی ہی نہیں ہے، افسوس تو یہی ہے میں جس قدر طرح دیتا ہوں اسی قدر اور بڑھی آتی ہے اب خواجہ بدیع نے بھی آستینیں الٹ دیں۔ آخر کروں کیا مانتی ہی نہیں ہاری نہ ہارنے نہ جیتی۔ خم ٹھونک کے بندہ آن پہنچا۔

تحمل کی بھی کوئی حد ہے یا کوئی انتہا ہی نہیں۔ جب تلوار کو میان سے نکالا اور فوجِ عدو پر لپکا تو پھر یہ کیفیت تھی۔

بجھ بجھ گئیں صفوں پہ صفیں زہ جہاں چلی   چمکی تو اس طرف ادھر آئی وہاں چلی

دونوں طرف کی فوج پکاری کہاں چلی

اس نے کہا یہاں وہ پکارا وہاں چلی

منہ کس طرف ہے تیغ زنوں کو خبر نہ تھی

سر گر رہے تھے اور تنوں کو خبر نہ تھی

یہ خواجہ بدیع کی شمشیرِ براں کا زور و شور تھا اور یہ حبشن مقابلہ کرے۔ یہ کہہ کر خواجہ صاحب نے کپڑے اتارے اور سامنے آن کھڑے ہوئے کہا خم ٹھونک

کے آ۔ او حبشن زادی خم ٹھونک کے سامنے آ۔

بد ہاتھ میں شکست وظفر نیک ہاتھ میں
ہاتھ اُڑ کے جا پڑا کئی ہاتھ ایک ہاتھ میں

ایسا لگاؤں ہاتھ کہ تو بھی یاد کرے ہائے نہ ہوئی قرولی۔

حبشن ۔ اب خم ٹھونک چکے۔ یا کل تک خم ہی ٹھوکا کرو گے۔

خوجی ۔ اسی خم ٹھونکنے سے اچھی اچھی جوڑوں کو اٹھا اٹھا کے دے مارا ہے جی اس کی آواز جہاں تک جائے وہاں تک شیر ہو تو وہ بھی تھرا جائے یہ خم نہیں جادو ہے۔ چھلاوا ہے چھلاوا۔

حبشن ۔ پھر اب میں گردن لوں آن کے۔

خوجی ۔ (جھپٹ کر سنبھل سنبھل کر گردن میں ہاتھ ڈال کر) بول۔

حبشن ۔ آخاہ بڑے شہ زور ہو۔ کچھ ٹھکانہ ہے۔

خوجی ۔ ہات تیرے کی کہتے تھے کہ ہمارا بدن چور ہے۔ نہ مانا اچھا نہ مانو پھر اس سے کیا کہوں۔

حبشن نے اپنی گردن چھوڑائی اور اُن کی گردن زور سے پکڑی۔

خوجی ۔ او بدبخت گردن تو چھوڑ۔ ارے گردن چھوڑ۔ خدا کا واسطہ خدا سمجھے دیکھو میں بولتا نہیں ہوں ورنہ اب تک کھا جاتا کہ کچا کھا جانے والوں میں ہوں ۔ ایسا ویسا نہیں ہوں۔ مگر ذرا گردن چھوڑ دے تو اشعارِ مردانہ پڑھ لوں۔ جس میں جرأت آجائے۔

راوی ۔ اشعارِ مردانہ سے آپ کو کیا سروکار۔

خواجہ صاحب اشعارِ مردانہ زبان پر لائے گردن چھوڑ دی گئی۔

بعد اس کے ندا دی پئے تشنی نحس قدم کو ۔ چمکار کے روکا فرسِ تیز قدم کو
للکار نے بیبک کہا بادشاہِ امم کو ۔ او بے خبر آسامنے کچھ کہنا ہے ہم کو

استادہ ہوا خسرو جمہور کے آگے
ناری نے قیام آ کے کیا نور کے آگے

یہ اشعار پڑھ کے حضرت خواجہ بدیع الزماں نے کہا ہے اب آسامنے اتنا کہنا تھا کہ حبشن نے پھر گردن پکڑ لی ۔ خوجی نے جھلّا کر چانٹا رسید کیا۔ حبشن نے اسی

دم ان کو پٹخنی دی اور اوپر بیٹھ گئی اس پر بڑا قہقہہ پڑا خوجی قروی بھول گئے۔ بھیگی بلی بنے دبے پڑے ہیں جبش نے کان گوشی کی اور کان گوشی کے بعد اٹھی۔

خوجی۔ لاحول ولاقوۃ۔ کیا اتفاق ہوا اپنے زعم میں آپ آرہا۔ لڑائی چاہیے تھی ٹنگڑی دے بیٹھا ہاتھ اور اسی پیچ پر ایک دفعہ مار کھا چکا ہوں۔

کلیرسا۔ اب بھی ٹراؤ گے کیوں۔ اب پھر بڑھ بڑھ کے باتیں بناؤ گے پہلوان سے لڑنا دل لگی بازی نہیں ہے جب تم عورت سے ہار گے تو پہلوان سے کیا کھا کے لڑو گے۔

خوجی۔ آپ پھبتی کے اصول سے واقف ہوتیں تو ایسا ہرگز نہ کہتیں۔ آپ کو معلوم ہی نہیں کہ پیچ کیا شے ہے اپنے زعم میں* انسان خود گر پڑے تو کوئی کیا کرے۔ چلتے چلتے آدمی نہیں گر پڑتا ہے۔ پھر اس سے کہیں پہلوانی میں حرف آتا ہے، ہم نے تو بڑے بڑے ملکوں کے نامی گرامی پہلوانوں کی کشتی نکالی ہے۔ کسی سے دب کے نہیں رہے ہیں مصر کے ایک ہوٹل میں پہلوان ہم سے بھڑا۔ مارا چاروں شانے چت اور شامی کا حال تو بیان ہی کر چکے کہ کیسے کیسے کار نمایاں کیے۔

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ یاد رکھو فسانہ ہیں ہم لوگ

دوسرے روز مس کلیرسا نے تحقیقات کر کے حکم دیا کہ آزاد مصنوعی بہ حراست سواران روس فوراً روانہ میدان جنگ ہو۔ چنانچہ ویسا ہی ہوا۔ یہ بے چارہ مصیبت کا مارا سخت پریشان اور مبتلائے بلا ہوا۔ اور سب جنجال میں اچھا پھنسا اور مفت میں دھرا گیا۔ جب سوار چلے گئے تو خوجی شہزادی کے ہاں آئے خوجی نے کہا۔

شادی ہو گل فام مبارک ہووے عیش و عشرت کا سرانجام مبارک ہووے

اب مزے مزے سے شادی ہوگی سواروں کو انھوں نے نکال دیا مگر وہ اچھا الو بنا لاحول ولاقوۃ۔ کرتو کر نہیں خدا کے غضب سے ڈر۔ لینے میں نہ دینے میں مفت میں ہی پھنس گیا۔ رائے قرار پائی کہ دوسرے روز میاں آزاد کا نکاح ہو اور اسی دن جشن منعقد ہو اب دوسرے روز کی تیاری قابل دید ہوگی بلکہ دید ہوگی نہ شنید ہوگی، دولہا دلھن چندے آفتاب چندے مہتاب خدا مبارک کرے۔

آزاد کا شادی سے انکار اور عزم کارزار

مس کلیبر سا نے مس میڈا سے مشورہ لیا۔ میڈا تو چاہتی تھیں کہ اس گورکھ دھندے سے آزاد نجات پائیں۔ دل میں بکمال خوش ہوئیں۔ مگر مسرت ظاہر نہ کی تا کہ مس کلیبر سا اپنے دل میں یہ نہ سمجھیں کہ صرف اپنے فائدے کے لیے آزاد کو رائے دی۔

کلیبر سا۔ بہن آزاد تو بپھرے ہوئے ہیں کہ میدان جنگ میں ضرور جائیں گے ہار ہی مانتے ہیں نہ جیتی۔ اب تم سمجھاؤ۔

میڈا۔ اگر ہماری رائے لو تو ان کو بے شک میدان جنگ میں جانا چاہیے سپاہی آدمی ہیں ایسے ویسے نہیں ہیں۔ سپاہی کے لیے سب سے زیادہ فخر اسی میں ہے کہ وہ معرکے سے منہ نہ موڑے وہ سپاہی ایسا جو کسی پر رتبے اور اپنے کام کو ترک کر دے۔

کلیبر سا۔ مگر دفعتاً چلے جانا بھی تو وضع کے خلاف ہے۔

میڈا۔ اور جو روسیوں نے گرفتار کر لیا اور کیا تم جانتی ہو کہ یہ خبر چھپی رہے گی، ہرگز نہیں مدعٔ نہاں کے مانند آں رازے کزو سازند محفلہا۔ یہ باتیں کہیں پوشیدہ رہ سکتی ہیں لے توبہ۔

کلیبر سا۔ پھر چلو چل کے شہزادی سے کہیں وہ کہتی ہیں جب لڑائی ختم ہو گی تو ہم ان کو بھی اپنے پاس بلا لیں گے۔

میڈا۔ اچھا تو ہے اب لڑائی کا خاتمہ بھی ہے۔

کلیبر سا۔ تو پھر شہزادی سے پہلے تم کہو گی یا پہلے میں کہوں۔

میڈا۔ تم ہی چھیڑو پھر میں تمھاری مدد کروں گی۔

مس کلیبر سا نے شہزادی کو علیحدہ بلوایا اور کہا بہن دیکھو دوسرے تیسرے دن صیغۂ جنگ سے گوئندے اور مخبر اور سوار آزاد کی تلاش میں بھیجے جاتے ہیں اور ایک نہ ایک دن آزاد گرفتار ہو جائیں گے۔ خوجی نے بہت سی باتیں کہہ دی ہیں۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ ان کو کسی طرف بھگا دو۔ جب جنگ کا چراغ گل ہو جائے تو پھر بلا لینا۔ ورنہ اگر یہاں رہے تو دو چار روز کے بعد عمر بھر کے لیے جدا ہوں گے اور فوراً قید

کر لیے جائیں گے اگر آزاد کو دل و جان سے چاہتی ہو تو بہتر یہی ہے کہ اب ان کو آزاد ہی کر دو۔ ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ اس بھونڈی محبت سے ان کی جان جائے گی اور تمھاری عظمت و شوکت اور امارت و ریاست خاک میں مل جائے گی اور پھر افسوس اور حسرت کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

شہزادی کے دل پر اس تقریر نے بڑا اثر کیا۔ تھوڑی دیر تک سوچا۔ آخر کار مس کلیرسا کی رائے سے اتفاق کیا۔ اس وقت شہزادی کی عجب حالت تھی چشم خوں چکاں سینہ بریاں۔ کلیجہ دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ مجبوری کا عالم تھا آزاد پاشا بلوائے گئے۔

شہزادی۔ آزاد۔ تخلیے میں تم سے کچھ کہنا ہے چلو۔

آزاد۔ خدا خیر کرے اس وقت تم اس قدر اداس کیوں ہو۔

شہزادی۔ (رو کر) خدا کو منظور نہیں کہ میں خوش و خرم رہوں۔

آزاد کو شہزادی ایک کمرے میں لے گئیں۔ سب دروازے بند کر دیے گئے۔ گلے میں ہاتھ ڈال کر خوب روئیں۔ آزاد کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ دونوں عاشق و معشوق بڑی دیر تک رویا کیے آخر کار آزاد نے روئے زیبا کا بوسہ لے کر کہا۔ جانِ من میری ہرگز خواہش نہیں کہ میں دھوکا دوں۔ میں سپاہی آدمی اور شریف زادہ ہوں اور اس کے علاوہ مجھے خوب معلوم ہے کہ تم میری عاشقِ زار ہو۔ تم سے صاف صاف کہتا ہوں کہ اگر میں یہاں رہا تو تمھارے اور میرے دونوں کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ میں اب تم سے رخصت لوں اور تمھیں خدا کے سپرد کروں۔ مگر میں تم سے اقرار کرتا ہوں کہ اگر حیاتِ مستعار باقی ہے تو تم اور میں پھر یک جا ہوں گے اس میں ہرگز ہرگز فرق نہ پڑے گا۔

شہزادی (گلے لگا کر) پیارے آزاد۔ اب تم مجھے زندہ نہ پاؤ گے کیا تمھیں امید ہے کہ تمھاری جدائی میرا دل برداشت کر لے گا۔

آزاد۔ (زار زار رو کر) ہائے کیا اتفاق ہے افسوس۔

شہزادی۔ (آہ سرد بھر کر) تمھارا اس میں کچھ قصور نہیں۔ یہ سب میرے دل کا قصور ہے مگر اب تو جو ہو وہ ہو۔

آزاد۔ خدا مالک ہے ہم نے کل امور خدا ہی پر چھوڑے۔

شہزادی۔ چھوڑا نہیں جاتا۔ اب تمھاری رائے پر منحصر ہے۔
من نہ گویم کہ ایں مکن آں کن مصلحت بیں و کار آساں کن
مگر یاد رکھنا بھول نہ جانا۔ لونڈی سمجھنا۔

یہ فقرہ کہہ کر شہزادی بہت روئی اور غش آگیا۔ آزاد نے خواصوں کو آواز دی، اپنے زانو پر سر رکھا اس ظہیر سا اور رس مقدڑا کو چپکے سے بلوایا۔ پانی چھڑکا ۔ لخلخہ سنگھایا تو تھوڑی دیر میں ہوش آیا۔ شہزادی سے آہستہ سے کہا آزاد یہ تو پہلی منزل ہے۔ تمھارے جانے کے بعد اس سے بھی زیادہ بری نوبت ہوگی مگر جو کچھ خواستہ خدا ہے مشیت ایزدی میں کیا چارہ۔ سوچتی کیا تھی ہو گیا۔

آزاد ۔ خوجی گرفتار ہو گئے ہیں دیکھیے اس بے چارے کا کیا حشر ہوتا ہے۔ سیدھا آدمی ہے ایسا نہ ہو قبول دے مگر اس سے ایسی امید نہیں ہے۔ آئندہ جو مرضی خدا ہے چارہ ہی کیا ہے۔

شہزادی۔ میں دل سے دعا مانگتی ہوں کہ میرے آزاد پر آنچ نہ آنے پائے۔ یا خدا میری دعا قبول کرے۔ آمین۔

یہ کہہ کر شہزادی اٹھی۔ اور تھوڑی دیر میں ایک چھوٹا سا ڈبا لائی۔ نشانی ہے آزاد نے لے کر سر پر رکھا آنکھوں سے لگایا اور کئی بار چوما۔ آزاد پاشا کے سفر کی تیاریاں ہونے لگیں۔ خواصوں نے اسباب باندھا۔ مشورہ ہوا کہ راتوں رات بھاگیں۔ چنانچہ پانچ پانچ کوس پر گھوڑوں کی ڈاک بٹھا دی گئی۔ ایک آزاد پاشا کے واسطے دوسرا شہزادی کے ایک خدمت گار کے لیے کوشش بلیغ کی گئی کہ صبح تک دریا کے پار داخل ہو جائیں۔ خوجی کی نسبت اس عرصے میں مختلف خبریں آئیں۔ ایک مرتبہ سنا کہ خواجہ صاحب کو وہ روسی اپنے ساتھ لے گئے پھر ایک شخص نے اس کی تردید کی پھر معلوم ہوا کہ روسیوں نے بازار والوں سے ان کا حال دریافت کیا

آخر کار معتبر خبر پائی کہ دس روسی ادھر اُدھر آزاد کی تلاش میں گئے تھے اور قریب سو کے ایک مقامِ خاص پر ٹکے ہیں۔

جنگ روم و روس کا نتیجہ جو کچھ ہوگا ابھی سے ظاہر ہے پلونا کی شکست غضب کی شکست ہے مگر اس معرکہ عظیم میں آزاد پاشا نے وہ کار نمایاں کیا جو ادر کسی جنرل

روم یا سپہ سالار روس سے نہ ہو سکا۔ آفریں۔ اول تو بلونا پر اس قدر فوج قلیل لے جانا۔ پھر سُرخ رو ہو کر فوج کو بچانا یہ بھی لیا گم تھا۔ لہ صرف اُنھی پر مصالحت نہ کیا زخم کھا کر اُس شجاعت سے پلونا کے باہر آئے اور اس بہادری سے محاصرے کو توڑا کہ جس قدر زیادہ تعریف کیجیے کم ہے۔ حضور سلطان عالم و عالمیان نے بھی کمال قدر دانی کی جو شایان سلاطین ثریا جاہ ہے۔

سپہ سالار روس گو گرفتار ہو گئے مگر بہادری کے ساتھ لڑ کر گرفتار ہوئے اس سے یہ امر ظاہر ہے کہ ان کے مزاج میں اطاعت اور فرمانبرداری اپنے شاہ کی اور حب الوطنی بہ نسبت مارشل بزین کے زیادہ تھی۔ بلا سے کچھ فوج قید ہو گئی۔ مگر جہاں تک ممکن تھا وہ کوشش سے باز نہیں آئے۔ حقیقت میں یہ خیالات سپاہیانہ ہیں۔ اور سپہ گری کی شان یہی ہے۔ اس لیے کہ صرف زبان سے سپہ گری نہیں بلکہ دل اور ہتھیار سے ہے۔ جب انھوں نے بڑھ کر جنگ کی تو اس کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے بزدلی سے بڑھ کر جنگ کی یا تو یہ کہ بغیر سوچے سمجھے اندھوں کی طرح جنگ کی۔ کیونکہ موقع اور محل بھی تھا یہ کوئی بے وقوفی کی بات نہیں ہے اگر یہ نہ کرتے تو پھر کیا کرتے اور اس تھوڑے موقعے میں انھوں نے اپنی ناموری حاصل کرنے میں کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی یہ بات ثابت ہے کہ جب کسی معرکۂ جنگ میں فوج محصور ہو جائے تو ممکن ہے کہ محاصرہ توڑ کر اور جنگ کر کے فوج نکل سکے بعض کی رائے ہے کہ محصور فوج بہ حیثیت مجموعی یکجا ہوتی ہے اور اس حالت میں وہ یکبارگی جس طرف قصد کرے محاصرہ توڑ کر نکل سکتی ہے اب قواعد کے بدل جانے سے اس کی بھی صورت دگرگوں ہو گئی۔ اب تو احتمال ہے کہ اگر فوج محصور ایک طرف بڑھنے کا قصد کرے تو دو طرف سے اس پر گولہ اندازی ہو سکتی ہے جس کیفیت سے کہ شاہزادہ فریڈرک چارلس نے مارشل بزین کا مقام میڈس میں محصور ہو جانا بیان کیا اسی طرح سپہ سالار روم کی فوج گھر گئی مگر آزادی کی شجاعت کے صدقے۔ جب شاہزادہ بیروسن کے میڈس میں مارشل بزین کو گھیر لیا تو لوگ کہتے تھے کہ مارشل بزین کی فوج زیادہ ہے انھوں نے کیوں محاصرہ کیا۔ مگر انھوں نے جواب دیا کہ یہ بات درست ہے مگر مارشل بزین کی وہ کیفیت تھی کہ جیسے کوئی شخص غار میں سے سر

نکال کر باہر نکلنا چاہتا ہو۔ تو باہر سے اس کے اوپر ڈنڈے مارے چنانچہ مارشل اسی طرح نکلنا چاہتے تھے اور میں باہر سے ڈنڈے مارتا تھا یہی حالت سپہ سالار کی ہوئی تھی۔ مگر انھوں نے اس نازک حالت میں یہ ترکیب کر لی تھی کہ تین طرف سے حملہ کیا تھا نہ ایک ہی جانب سے۔

خیر اس ذکر کو جانے دیجیے اب سنیے کہ جس روز آزاد پاشا داخل قسطنطنیہ ہوئے تو سب سے پہلے یہ بخطار است ہرمز جی بھائی کی کوٹھی پر آئے۔ یہاں گھوڑے سے اترے ہی تھے کہ یہ آواز ان کے کان میں آئی (بھلا گیدی۔ جاتا کہاں ہے۔ نکلوں قرولی) آزاد نے کہا۔ (جانے دینا۔ جانے دینا) آزاد کی آواز سن کر خوجی بے قرار ہو گئے۔ کمرے سے باہر آئے اور آتے ہی قدموں پر ٹوپی رکھ کر کہا۔ خدا گواہ ہے۔ اس وقت جو مانگتا وہ مل جاتا ابھی کہتا تھا کہ خدا کرے آزاد آ جائیں خدا نے منہ مانگی مراد دی۔

آزاد۔ میڈا کہاں ہیں۔

خوجی۔ آ گئیں اپنے گھر پر خوش و خرم ہیں۔

آزاد۔ الحمد للہ الحمد للہ اور بھی کوئی ہے ساتھ۔

خوجی۔ ہاں مگر اس پر نظر نہ ڈالیے گا۔ اپن جانب کے ڈورے پڑتے ہیں۔

آزاد۔ واللہ یہ کیسے۔

خوجی۔ ہم تو پہلے ہی سمجھ گئے کہ آزاد بھاوج بھی تجویز کر لائے۔

ہوا ہے یار جو سیر چمن میں ساتھ اپنے
کبھی گل کی طرف دیکھا ہے گاہے روئے خنداں کو

آزاد۔ او ہو ہو مدت کے بعد برجستہ شعر آپ سے سنا۔

خوجی۔ اب یہاں سے چلو بھائی۔

آزاد۔ اس پری کے ساتھ شادی تو کر لو۔

خوجی۔ اجی شادی جہاز پر ہو رہے گی۔

آزاد۔ ہرمز جی بھائی کو اطلاع دو اور بلاؤ۔

خواجہ بدیعا دوڑ کر ہرمز جی کو لائے۔ ہرمز جی اور آزاد گلے ملے۔ فوراً آدمی بھیجا

گیا کہ مس میڈا اور مس کلیریسا کو اطلاع دی جائے یہ مژدہ روح افزا سنتے ہی دونوں پریاں اچھل پڑیں اور گھوڑوں پر سوار ہو کر چلیں آزاد کو دیکھا تو اُدھر اُن کی اِدھر ان کی باچھیں کھل گئیں۔ مس کلیریسا سے مصافحہ کیا میڈا کو دیکھ کر فرط طرب سے آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔

میڈا۔ شکر خدا ہزار شکر خدا۔

کلیریسا۔ یہ کس کو امید تھی کہ آزاد صحیح وسالم آئیں گے۔

میڈا۔ خدا نے بڑا فضل کیا۔ یہاں تمہاری بڑی دھوم ہے۔ ہر صبح کو اخباروں میں تمہاری تعریف پڑھتی ہوں بڑا نام پیدا کیا۔

ہرمز جی۔ جنگ کا حال تو مفصل بیان کیجیے۔

آزاد۔ ایک طومار ہے۔ دفتر ہے گو تعلّی کی لینا میری وضع کے خلاف ہے مگر صحیح عرض کرتا ہوں کہ اتنے افسروں میں آپ کے خادم کا نقطۂ مقابل ایک بھی نہ تھا ہاں عطوفت پاشا اور اپیلٹن پاشا البتہ بڑے سپاہی ہیں اور سپہ سالار نے بھی کار نمایاں کیا جس وقت گرفتار ہو کر حضرت زار کے روبرو لوگ ان کو لے گئے اس وقت جتنے افسران فوجی زار کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے سب اٹھ کھڑے ہوئے اور سب نے ان کی توقیر و تعظیم کی اور نعرہ بلند کیا شاباش پاشا شاباش مرحبا مرحبا ع

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

ہرمز جی۔ یہ شکست بھی بہ منزلۂ فتح ہے۔

آزاد۔ اس میں کیا فرق ہے۔ مگر اب روسیوں کو کوئی روک نہیں سکتا۔

ہرمز جی۔ اب کام تمام ہو گیا۔ صلح ہو جائے گی۔

میڈا۔ گو ترکوں نے شکست پائی مگر تم تو فتح یاب ہوئے۔

ہرمز جی۔ انھوں نے ایک چاندی بیوی پائی ایک چاند سی بیوی ہندوستان میں ان کی چاندی ہے۔ چین ہی چین لکھنا ہے۔

آزاد۔ دل لگی نہیں ہے ریاض کیا ہے جان لڑائی ہے۔

خوجی۔ ہونھ۔ ہرمز جی کو ابھی بسنت کی خبر ہی نہیں ہے۔

ہرمز جی۔ پھر آج تو جلسہ ہو۔

شرابِ سُرخ کا ساغر چلے ساقی لب جو پر
چمن سرسبز ہے بارانِ رحمت کے تفضل نے

میڈم ۔ آج ہم تمھارے ساتھ ناچیں گے۔

آزاد ۔ معقول رقص کی تعلیم میں نے نہیں پائی ہے۔

کلیسا ۔ ہم تو سکھا دیں گے۔

خوجی ۔ این چہ گفت گو کردہ شدہ ایں کہ رسمش میم سین زیر سین و کاف لام رے بے سین الف ہست از شما چرا سخن ہائے التفات می نماید بگوئید و تو رو برو۔

آزاد ۔ لو بھئی اب تو خوب فارسی بولنے لگے۔

خوجی ۔ بولتے آپ ہوں گے اور (اب تو چہ معنی دارد) اچھی کب نہیں بولتے تھے۔

آزاد ۔ تو مس کلیسا آپ کے پسند آ گئیں۔

خوجی ۔ واللہ اس قابل ہے کہ ہر صبح کو اس کا سجدہ کرے۔

زلفِ دوتا بسیار مثل مار ست و سیاہ است و بلا ہست۔

خدا محفوظ رکھے دل کو اس افعیِ کاکل سے
نہیں ممکن سلامت چھوٹنا موذی کے چنگل سے

آزاد ۔ یار ہم سے تم سے اب نہ بنے گی۔ بس بگڑ جائے گی۔ اگر تم ڈورے ڈالو گے تو ہماری دال نہ گلے گی۔

خوجی ۔ تم ایک ہی استاد ہو۔

آزاد ۔ مجھے بھی وہ گر یاد ہیں کہ۔

خوجی ۔ (سر پیٹ کر) ارے غضب بھئی کہیں چھپانا نہیں جس طرح مس روز کے یہاں چھپایا تھا۔

آزاد ۔ بلم بردار اور ہمارا مقابلہ۔

خوجی ۔ (پھر سر پیٹ کر) ہائے ستم والے ستم، تمھاری سحر بیانی اور بھی ستم کرے گی۔ بھائی خدا معاف کرے۔

تو وہ اعجاز بیاں ہے کہ تری محفل میں شرم سے صورتِ مریم ہے مسیحا خاموش

آزاد ۔ مس کلیسا ۔ خواجہ صاحب سے واقف ہو۔

خوجی۔ (آزاد کے منہ پر ہاتھ رکھ کر) چپ چپ۔

خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

آزاد - اچھا جاؤ۔ چھوڑ دیا کیا یاد کرو گے۔؟

خوجی - لاحول ولا قوۃ۔ بات پیٹ میں نہیں پچتی۔

- مس میڈا اِس درجہ محظوظ و مسرور تھیں کہ جامے میں پھولے نہیں سماتی تھیں۔ باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ باتیں کرتے اس کمرے سے دوسرے کمرے میں گئیں اور وہاں آزاد کو بلایا۔ آزاد نے جاتے ہی لب لعل شکر کا بوسہ لیا اور مس میڈا نے اس بوسے کا جواب دیا۔ اس کے بعد دیر تک ملاوس و کنار رہا۔ خوجی اِدھر مس کلیرسا سے محبّت والفت کی باتیں کرتے تھے۔

خوجی۔ ہمارا قاعدہ ہے کہ خوب صورت عورت دیکھی اور ریجھ گئے۔

کلیرسا - یہ قاعدہ ایک دن جوتے کھلوائے گا۔

خوجی - بہت خاصے بس اب رنگ جم گیا۔

مس کلیرسا - تم خدمت گار ہو کے ہم سے مقابلہ کرتے ہو۔

خوجی - جانِ من! غلام خدمت گار نہیں آزاد جیسا ہی بدبخت کا لڑکا ہے۔ میرا نام اس لڑکے نے روشن کیا۔

تین دن تک آزاد پاشا قسطنطنیہ میں رہے مگر جب انھوں دیکھا کہ طور بے طور ہو گیا۔ اور سلطانِ معظم کا ان کے ساتھ بہ کمال اعزاز و ملاطفت پیش آنا کل ارا کین کے دلوں کا نشتر ہو گیا تو انھوں نے یہی مناسب جانا کہ اب اعادۂ وطن ہی اولیٰ ہے آخر ۲۱ دسمبر سنہ ۱۸۷۷ کو مع خواجہ بدیعا اور مس میڈا اور مس کلیرسا جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہندوستان ہوئے۔

اسکندریہ میں قیام

اسکندریہ میں آزاد پاشا کئی روز تک فروکش رہے وجہ یہ کہ ہیضے کے سبب سے جہازوں کی آمد و رفت بند ہو گئی تھی قطعی حکم تھا کہ اسکندریہ سے بحر۔ تاجروں نے سی کا جہاز نہ جانے پائے اور وہ بھی اس حالت میں جب ڈاکٹر سارٹیفکیٹ دے کہ اس جہاز

کے جانے سے چنداں نقصان متصور نہیں ہے عدن سے بھی آمد و رفت بند تھی، اسکندریہ اور عدن دونوں مقاموں پر ہیضے کی بڑی شکایت تھی۔ آزاد پاشا بے چارے نے مجبور ہو کر یہاں پر قیام کیا مگر سوچے کہ بغیر دل بستگی کے اس ملک بیگانہ میں دل نہ بہلے گا! اور دل بستگی کے لیے خوجی کافی تھے مس میڈا اور مس کلیریسا نے آزاد سے کہا کہ ان کو کسی طرح بنانا چاہیے۔

آزاد ۔ اجی خواجہ صاحب اب تو یہاں سے رہائی کچھ دن مشکل ہے

خوجی ۔ شکر بھیجو شکر بھیجو کہ بچ کے چلے آئے ناشکری نہ کرو۔

آزاد ۔ مگر یار تم نے وہاں نام نہ کیا افسوس کی بات ہے۔

خوجی ۔ بہ جا۔ درست۔ ہونہو کہنے لگے تم نے نام نہ کیا۔ ہم نے نہیں کیا تو کیا تم نے نام کیا حلوا خوردن را روے باید یہ منہ کھائے چولائی۔

آزاد ۔ سر منڈاتے ہی کہیں اولے نہ پڑنے لگیں۔

خوجی ۔ مگر غرور کی ہر بار آپ کیوں لیتے ہیں آپ نے کیا کیا آخر۔ کچھ معلوم تو ہو کون گڈھ فتح کیا۔ کون لڑائی لڑے ہاں یہ کیا کہ مس کلیریسا کو چومتے ہوئے چلے گئے۔ آپ تو مس کلیریسا اور مس میڈا اور پولینڈ کی شہزادی اور یہ اور وہ اور ان پر اور ان پر عاشق ہوئے اور یہاں بندہ نواز معرکے لڑے۔ اصل افغانی ہوں بابا پھر مجھ سے لڑکر کوئی کیا کرے گا۔

آزاد ۔ آپ نہیں بوا زعفران پر عاشق ہوئے تھے ؟

میڈا ۔ خواجہ بدیعا۔ اپنے ملک کے کچھ حالات تو ہم سے بیان کرو۔ وہاں کے رؤسا کیسے ہیں امرا کا کیا حال ہے۔

خوجی ۔ رؤسا تباہ۔ امرا خراب۔ پریشان حال۔ ان پر طرہ وہاں کے شوق دنیا سے نرالے ہیں۔ جنگ بازی شوق۔ طرح طرح کے پتنگ بنے گول۔ ماہی جال۔ مانگ دار۔ بھیڑیا۔ طوقیہ۔ خربوزیہ۔ لنگوٹیہ۔ چیپ۔ تکل۔ کنکیا۔ سفید۔ للپنا کلپتا۔ دس دس اشرفی پیچ لڑایا۔ میدان پر میدان ہو گئے۔ یوں ہفتہ وار میدان تو اکثر مقامات پر ہوتے ہیں۔ مگر بارہوں ماس میدان تو کسی نے کم سنا ہوگا اور نی پیچ ایک ایک اشرفی پتنگ باز اپنے فن میں کامل بلکہ اکمل کوئی ڈھیلم لڑانے کا استاد ہے کوئی گھیسٹے ایسی لڑاتا ہے کہ کسی نے نہ لڑائی ہو۔ میاں ولایتی کے جھنڈے گڑے ہوئے ادھر پیچ پڑا ادھر غوطہ دیتے ہی کہا وہ کاٹا۔ لوٹنے والوں کی چاندی تھی ایک ایک دن میں دس دس

سپر لوٹی۔

آزاد۔ کیوں صاحب یہ بڑی خوبی کی بات ہے۔

خوجی۔ ہے ہے۔ تم کیا جانو تم تو کتاب کے کیڑے ہو۔ تم کو ان باتوں سے کیا واسطہ سچ کہنا کبھی پتنگ لڑایا بھی ہے۔

آزاد۔ ہم نے پتنگ کی اتنی قسمیں ہی نہیں سنی تھیں۔

خوجی۔ واہ جانگلو۔ ہونہہ۔ بھلا پیٹا جانتے ہو کسے کہتے ہیں۔

آزاد۔ ہاں مثلاً تم پتنگ اڑا رہے ہو۔ ہم ڈور توڑ لیں۔ اسی کا نام پیٹنا ہے۔ ہے کہ نہیں۔ ہم تو جانتے ہیں اسی کو پیٹا کہتے ہیں۔ کیوں صاحب۔

خوجی۔ شاباش۔ اور بھپکا کسے کہتے ہیں۔

میڈا۔ ہاں ہاں تم اپنا کام کرو۔ اور وہاں کے دولت مند کیا کرتے ہیں کوئی اچھا کام بھی کرتے ہیں یا نہیں۔

خوجی۔ ہاں افیم اور چانڈو کثرت سے پیتے ہیں۔

کھو دیا حسن مدک نے ستم ایجادوں کا
اڑ گیا رنگ دھواں بن کے پری زادوں کا

آزاد۔ اور کبوتر بازی کا حال تو بیان کرو۔

کلیرسا۔ میں سوچتی ہوں کہ ہندوستان چل کے وہاں کی مخدرات اور شریف زادیوں سے رسم بڑھاؤں اور ان کو پڑھاؤں۔

آزاد۔ تم چل کے اردو فارسی سیکھ لو پھر ان کو پڑھاؤ۔

کلیرسا۔ ہم نے سنا ہے کہ ہندوستان کی عورتیں بالکل جاہل ہوتی ہیں اور شہزادیاں تک تعلیم نہیں پاتی ہیں۔ بڑی شرم کی بات ہے۔

آزاد۔ مگر مس حسن آرا کو دیکھو گی تو خوش ہو جاؤ گی۔

کلیرسا۔ ہم تو بے شک خوش ہوں گے مگر خدا جانے وہ ہم کو دیکھ کر خوش ہوتی ہیں یا نہیں۔ اس کا حال تو خدا ہی کو معلوم ہے۔

میڈا۔ نہیں امید نہیں کہ ہم دونوں کو دیکھ کر حسن آرا خوش ہوں وہ تو چاہتی ہوں گی کہ آزاد کی بغل میں بجز ان کے اور کوئی نہ ہو۔ جب ہم تم کو دیکھیں گی تو ان کو کمال رنج ہوگا۔

کلیرسا۔ دتمنک کرا فدری ہوش کی باتیں کرنا۔

میڈڈا ۔ کیوں یہ کیوں۔ اس قدر بگڑتی کیوں ہو۔

کلیرسا۔ بغل میں آزاد کے تم ہوگی۔ اور کسی پر تہمت کیوں تراشتی ہو۔ ہاں کہنے لگیں جب ہم تم کو بغل میں دیکھیں گی۔ ہم سے واسطہ۔

میڈڈا ۔ آخاہ حسن آرا تو حسن آرا میں دیکھتی ہوں تم کو بھی رقابت کی سوجھی۔ اچھا تو ہے جو گندم بو جائے۔

کلیرسا۔ معاف کیجیے میں تمھاری طرح پھسل نہیں پڑتی ہوں۔

میڈڈا ۔ چہ خوش۔ جب انھوں نے کروڑوں بار سر ٹیک کی تب میں نے قبول کیا۔ سو وہ بھی جب سن چکی کہ میدان جنگ میں انھوں نے نام کیا تھا ورنہ ان میں ہے کیا نہ حسین نہ جوان نہ طاقت نہ تربیت یافتہ۔

خوجی ۔ اور ہم۔ ہم کو کیا سمجھتی ہو آخر۔

میڈڈا۔ تم بڑے حسین جوان ہو۔ اور تو اور گراں ڈیل ماشاء اللہ۔

آزاد۔ ہم بھی کسی زمانے میں خواجہ صاحب ہی کے سے گراں ڈیل اور شہ زور تھے مگر اب وہ بات کہاں۔ اب تو موے ہوے بوڑھے آدمی ہیں۔

خوجی۔ (گندے توں کے) اجی ابھی کیا ہے ابھی شباب کے عالم میں ہماری کیفیت دیکھیے گا جب عین جوانی کا عالم ہوگا۔

آزاد ۔ کیوں صاحب قبر میں عین جوانی کا عالم ہوگا۔

خوجی ۔ اجی کیا بکتے ہو۔ ابھی ہمیں شادی کرنی ہے بھائی۔

میڈڈا ۔ تم مس کلیرسا کے ساتھ شادی کرلو۔

کلیرسا۔ آپ کو ہی مبارک رہیں۔

میڈڈا ۔ تمھارا تو آزاد پاشا پر دانت ہے میں سمجھی۔

خوجی ۔ یہ تو نہیں جانتے ہیں قسم کھا کے کہتے ہیں کہ اگر ہمارے ساتھ کا دوسرا خوب صورت جوان کوئی ہو تو ٹانگ کی راہ نکل جائیں۔

حسنِ تو ہمیشہ در فزوں باد　　　　رویت ہمہ سال لالہ گوں باد

یہ شعر ہمارے ہی لیے کہا گیا تھا ہم ایسے ہی ہیں۔

آزاد ۔ اب اسکندریہ میں آپ کی شادی ہو تو خوب بات ہے ورنہ ہم تو دو دو

جائیں اور آپ اکیلے جائیں۔

خوجی۔ اہاہاہا۔ واللہ یہ تو تم نے ایک ہی سنائی بے شک صحیح ہے دریں چہ شک۔ اب ہمیں شادی کی ضرورت واقع ہوئی ہے۔

آزاد۔ مگر کوئی خوب صورت ہو جس پر سب کی نظر پڑے۔

خوجی۔ دآنکھیں نیلی پیلی کر کے) اس کے کیا معنی حضرت۔

آزاد۔ مطلب یہ کہ انتہا سے زیادہ حسین و مہ جبین ہو، پری بھی اس کے مقابلے میں شرمائے۔ حور بھی دیکھے تو جھینپ جائے۔

خوجی۔ اور جس میں حضور کو بھی گھورا گھاری کا موقع ملے۔

درست ہے خداوند۔ چہ خوش چرا نہ باشد۔ کیا مجال۔ خواجہ صاحب سمجھے کہ آزاد نے یہ کلمہ بدی راہ سے کہا بگڑ کر بولے بابا ے من بدیع من را خوب خوب معلوم شد کہ من از شما التفات دارم والا شما از من نہ چہ شود کہ گفتہ است۔

آزاد۔ کیوں صاحب ہم سے اس قدر بدظن ہیں۔

خوجی۔ اجی حضرت جورو کے معاملے میں بندہ کسی سے یارانہ نہیں رکھتا ایسے یار چے کوئی اور ہوتے ہوں گے جی قبلہ ایسے یاران کہیں اور ڈھونڈیے۔ خواجہ صاحب نے مس کلیرسا سے پوشیدہ طور پر کہا واسطے خدا کے ہمارے لیے کوئی ایسی بیوی ڈھونڈھو جو جانِ ہندوستان ہو جس پر ساری خدائی کے شہزادے اور وضع دار لوگ جان دیتے ہوں۔ آزاد کا کھٹکا ہمیں ہے بھی اور نہیں بھی ہے وجہ یہ کہ وہ رخنہ اندازی سے باز نہ آئیں گے یہ ہم خوب سمجھے ہوئے ہیں۔ اس شخص کی عادت میں داخل ہے کہ جو عورت ہم پر عاشق ہوگی اس کو بہکائے گا۔ اس سے تو ہم کو کسی قدر کھٹکا ہے اور یہ جو ہم نے کہا کہ کھٹکا نہیں ہے یہ اس سبب سے کہ جس وقت خواجہ صاحب یعنی ایں جانب کے جمالِ انور کو بی صاحب دیکھیں گی بس پھر آزاد کیا معنی آزاد کے باپ سے بھی کچھ نہ ہو سکے گا۔ مجھے دیکھ کر اس وقت مارے حسد کے جل بھن کر خاک ہو گئے۔

کلیرسا۔ آزاد تمھاری سی جوانی کہاں سے لائیں، ہے کہ نہیں۔

خوجی۔ بس بس خدا تم کو سلامت رکھے اور خدا کرے تم کو میرا سا شوہر ملے اس سے زیادہ اور کیا دعا دوں۔

کلیرسا۔ کچھ سر تو نہیں پھر گیا ہے اور سنیے گا۔
خوجی۔ ہائے غضب ابھی سے عورتیں ہم کو بُرا سمجھنے لگیں مگر ایک ہی انوکھی عورت ہیں جنھوں نے یہ کلمہ کہا ورنہ جو دیکھتی تھی غش غش کرتی تھی ہائے جوانی اور حسن بھی کیا شے ہے مگر یہ سبب کیا کہ تم ہم کو دیکھ کر نہ ریجھیں۔
کلیرسا۔ اپنے اوپر سے تجھ ایسوں کو صدقے کر دوں۔
خوجی۔ اچھا ایک درخواست ہے جان بخشی ہو تو کہوں۔
راوی۔ اس جان بخشی پر ایک بار جوتے کھا چکے تھے مگر اب تک ٹرائے جاتے ہیں اور پھر جان بخشی کا لفظ زبان پر لائے۔
کلیرسا۔ کہو مگر اینڈی بینڈی بات زبان سے نکالی تو تم جانو گے جو منہ پر آیا بک دیا واہ واہ واہ۔
خوجی۔ نہیں ایک بات کہوں یا نہ کہوں۔
کلیرسا۔ کہو کہو کس قسم کی بات ہے ہم بھی تو سنیں۔
خوجی۔ کچھ شادی بیاہ کا ذکر ہے۔
کلیرسا۔ کہیں شامتیں تو نہیں آئی ہیں۔ اور سنیے یہ اور شادی۔
خوجی۔ کیوں کیا ہوا۔ آخر ہم میں کون بات نہیں ہے۔ کچھ معلوم ہوا اندھا ہوں۔ کانا ہوں۔ لولا ہوں۔ لنگڑا ہوں بد قطع ہوں۔ وہ کون سی بات ہے جو ایں جانب میں نہیں مگر تم سے کون کہے۔
کلیرسا۔ حلوا خوردن را روئے باید۔ چلے ہیں ہمارے ساتھ شادی کرنے۔
خوجی۔ آخر عورت مرد کی شادی باہم ہوتی ہے مرد مرد یا عورت عورت کی تو ہوتی نہیں
کلیرسا۔ خدا کی شان۔ ارے کچھ خبط ہے۔
خوجی۔ خبط۔ بجا۔ اب خبط کا حال رُسوں، چینیوں، ہندیوں، مسلمانیوں، مصریوں، ترکنوں، عدن کی عورتوں، بمبئی کی مستورات ان سب سے جا کے پوچھ لو حال معلوم ہو کیا دل لگی ہے۔ ہونہہ! ان کو دنیا بھر کی عورتوں سے بڑھ کر حسین شوہر کا خیال ہے۔ تو خواجہ بدیع کر تم ہی کو بیاہوں۔
کلیرسا۔ کچھ سڑی ہوا ہے خبطی سا معلوم ہوتا ہے۔

اتنے میں آزاد نے پوچھا کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ آج مس کلیرسا اور میاں بدیعا صاحب کھل کھل کے باتیں کر رہے ہیں خدا خیر کرے مس کلیرسا تم ان کے پھیر میں نہ آنا۔ یہ بڑے چالاک آدمی ہیں یہ باتوں باتوں میں عاشق کر لیتے ہیں یہ ان کی شیریں بیانی کا اثر ہے

اثر لبھانے کا پیارے ترے بیان میں ہے
کسی کی آنکھ میں جادو تری زبان میں ہے

عجب جادو بیان آدمی ہے۔ خوجی بولے خیر اب تو تم نے ان سے کہہ ہی دیا اور یہ واقف ہو گئیں ورنہ آج ہی شادی ہوتی اور چین کرتے آج نہیں تو کل سہی۔ کل نہیں پرسوں سہی بے شادی کیے جاؤں گا نہیں۔ در ایں چہ شک

کلیرسا۔ تو اپنے کو اس قابل سمجھنے لگا۔ شانِ خدا۔

خوجی۔ اس قابل کے بھروسے نہ رہنا میں عجب جادو بیان آدمی ہوں اجی حضرت کی آنکھ میں سحر ہے ہماری زبان میں سحر ہے آزاد نے تو بیان کیا ہی ہے وہ بے سمجھے بوجھے ایسا بیان نہ کرتے۔

خواجہ صاحب سحر بیان جادو زبان نے فرمایا کہ مس کلیرسا کو ہم اپنے عقدِ نکاح میں لائیں گے اور مس میڈا آپ کی ہو کے رہیں۔

آزاد۔ سنا مس میڈا کا نام زبان پر نہ لانا۔

کلیرسا۔ اللہ اللہ آپ کی میڈا ایسی پری بن کے آئی ہیں۔

خوجی۔ اجی تم گھبراؤ نہیں مجھے بھی تمغہ ملے گا۔ یہ بڑی جنگ میں نام برآوردہ ہیں بندہ بحری میں نام کرے گا۔

آزاد۔ تو اپنے وقت کے ہم اور آپ سکندر ہیں۔

خوجی۔ سکندر۔ سکندر۔ سکندر کو ہم کیا سمجھتے ہیں۔

آزاد۔ بوا زعفران کی سی عورت ہو تو ضرور بیاہ کر لو۔

خوجی۔ حضرت مس کلیرسا نے اگر منظوری نہ ظاہر کی تو پھر ہم کوئی اور ڈھونڈ لیں گے۔ مگر یہ ان کی غلطی ہے عجب نہیں کہ صبح و شام راہِ راست پر آجائیں۔ خیر خدا حافظ و ناصر ہے اگر خواستہ خدا ہے تو کوئی پری وش حور پیکر بغل میں ہو گی۔

ہم نے ٹھان لی ہے کہ انوکھی بیوی کے ساتھ شادی کریں گے۔ جس عورت میں کوئی نئی بات ہے اس کو بیوی بنائیں تو سبحان اللہ۔ ورنہ بے کار فضول ہے ایسی ہو جس کی صورت دیکھنے سے بھوک پیاس بند ہو جائے۔

آزاد پاشا اور کلیرسا اور میڈا ہوا کھانے گئے مگر خواجہ صاحب بیوی کی تلاش میں علیحدہ تشریف لے گئے۔

راہ میں اتفاق سے آزاد کو ان کے جان پہچان ملے آزاد نے گاڑی روک کر کہا۔ تم یہاں کہاں۔ کہا حضور حج کو گیا تھا وہاں سے ایک قدر دان یہاں لے آیا۔ آزاد نے کہا۔ خوجی بھی یہیں ہیں تمہارے دوست۔ اس قدر سننا تھا کہ وہ بہت ہنسا اور آزاد سے اور اس سے بڑی دیر تک سرگوشی ہو کر ایک بات ہوئی آزاد نے مس میڈا اور مس کلیرسا کو بھی اطلاع دی جب خواجہ صاحب آئے تو ان سے بیان کیا گیا کہ ایک نہایت خوب صورت عورت تم پر جان دیتی ہے ابھی دوشیزہ اور پانزدہ سالہ ہے۔ اور کل ہی شادی ہوگی۔ انھوں نے فوراً منظور کر لیا۔ اور دوسرے ہی روز یہ دل لگی ہوئی کہ ظریفوں کے استاد میاں آزاد نے مس کلیرسا اور مس میڈا کو گاڑی پر بٹھایا۔ اور کوچ بکس پر خواجہ بدیع الزماں صاحب جلوہ افگن ہوئے راہ میں خواجہ صاحب نے کئی آدمیوں کو بگھی پر بٹھلا کر آواز لگائی۔ او جانے والا۔ ہائیٹ ہائیٹ آئی یو فول ہٹ جاؤ۔ اپنے کو بھی الو کی دم فاختہ بنالیا۔ غلبۂ ذکاوت اسے کہتے ہیں ایک مقام پر ایک بہرا گاڑی کے سامنے آگیا۔ یہ غل مچایا ہی کیے اور گاڑی کلے پر پہنچ گئی۔ حضرت بہت ہی بگڑے بھلا بے گیدی بھلا۔ چمپا ہی بنا کے چھوڑوں گا۔ جب اور کچھ بس نہ چلا تو آج جان دینے آیا۔ آزاد نے پوچھا کیا ہے خواجہ صاحب خیر تو ہے۔ کہا اجی حضرت آج میاں بہروپیے بنا بھیس بدل کر گئے ہم گلا پھاڑ پھاڑ کر غل مچا رہے ہیں وہ مردک سنتا ہی نہیں۔ جب بندہ سمجھے کہ ہو نہ ہو بہروپیا ہی ہو۔ گاڑی کے سامنے اڑ جانے سے کیا مطلب ہم سے سنیے آپ سمجھے! بندہ ایک کائیاں چتونوں سے تاڑ گیا کہ آج پہیے کے نیچے کچلنے آیا ہے اِدھر اُدھر لپیٹ جاتا گھوڑے زور میں تو جا ہی رہے تھے پہیا پانوں کے پرخچے اڑا دیتا۔ اب پوچھیے فائدہ۔ وہ ہم سے سنیے فائدہ یہ کہ ٹانگ یا پانوں تو مانگے کا ہے نہیں دو چار یا دس پانچ روز یا تین چار ہفتے میں پانوں اچھا ہو جاتا۔ اور لوٹ پوٹ کے چنگا۔ مگر ہماری گاڑی پکڑ جاتی۔ جی اب پوچھو کہ تم کو کیا

فکر ہے ہم لوگ بھی تو سوار ہیں۔ اس کا جواب ہم سے سنیئے میں تو چھوکریاں بن کے چھوٹ جائیں تم اور ہم۔ اچھا جس کی نظر پڑتی ہمیں پر پڑتی ہے۔ تم کو لوگ خدمت گار سمجھتے۔ ہم رئیس کے دھوکے میں دھر لیے جاتے اور بے بھاؤ کی پڑتیں حضور تو اچھے رہتے ہمارے ساتھ جاتی۔ اللہ نے بچایا مگر میں بھی اتنی قرولیاں بھونکتا کہ کبھی کبھی کو یہ لوگ یاد بھی کرتے۔ جی دل لگی نہیں ہے۔ مگر ع

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت

اتنے میں اتفاق سے دس بارہ دنبے سامنے سے آئے۔ جب دنبے قریب آئے تو حضرت بدیع الزمان نے دنبے والے کو اس تیکھی چتون سے دیکھا کہ گویا کھا ہی جائیں گے۔ اس کی ان کی چار آنکھیں ہوئیں تو خواجہ صاحب اکڑ گئے ان کا نرالا کینڈا دیکھ کر اس کو ہنسی آئی۔ ان میں تاب کہاں کہ کوئی ہنسے اور یہ خاموش رہیں آگ ہو گئے پہلے کوچ مین کو ڈانٹ بتائی۔ روک لے۔ روک لے بے۔ تو نہیں روکے گا۔ دبگڑ کر) اب تو نہیں روکے گا۔ کوئی ہے۔

آزاد۔ خداوندا اب کیا مصیبت پڑی حضور۔ خیر تو ہے۔

خوجی۔ بس اس نامعقول سے کہو کہ باگ روک لے میں اس گستاخ بے ادب کو سزائے مناسب دے آؤں تو بات کروں۔ مردک میرا کینڈا دیکھ کر ہنس دیا۔ کوئی مسخرہ مقرر کیا ہے کانا ہوں کہ اندھا ہوں آخر ہے کیا بات۔

آزاد۔ کون تھا کون خداوند۔ نام تو سنوں میں۔

خوجی۔ اب راہ چلتے کا نام کیا جانوں ہیپے اٹکمریس کوئی نام بتا دوں۔ مجھے دیکھا تو ہنسے آپ۔ خون آنکھوں میں اتر آیا۔

آزاد۔ بھائی جان دیکھ کر جی خوش ہوا ہو گا کہ کیا خوش رو جوان ہے۔

خوجی۔ ارے یار سچ کہا۔ لاحول ولا قوۃ بھئی سچ کہتے ہو۔

آزاد۔ اب بتاؤ ہو گدھے کہ نہیں جو میں نہ سمجھاتا تو پھر۔

خوجی۔ پھر کیا۔ خون بے گناہ برگردن خواجہ بدیع الزماں۔

اتنے میں کوچ مین نے گاڑی روک لی۔ خوجی گھبرا کر کوچ بکس سے اترے تو پائے دان سے دامن اٹکا اور منہ کے بل گرے مگر چوٹ کم آئی جلدی سے جھاڑ پونچھ

کے اٹھ کھڑے ہوئے، اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ آزاد اور ان دونوں پری پیکروں کو بے اختیار ہنسی آئی۔ خوجی نے پہلے تو لبوں پر انگشتِ شہادت رکھ کر آہستہ سے کہا چپ چپ مگر جب انھوں نے اور بھی زور سے ہنسنا شروع کیا تو خوجی سر پیٹنے لگے اور بہت ہی تیکھے ہوئے۔

آزاد - دیکھو پھر وحشت کی لی نہ۔ اور جو دلھن والے دیکھتے ہوں تو کیسی ہو۔ گرد ورد پوچھو۔ ذرا آدمی بنو لاحول ولا قوۃ۔

خوجی - ارے یار گرد ورد تو جھاڑ چکا مگر یہ تو بتاؤ کہ ہتھکنڈے کس کے ہیں بھئی واللہ یہ بہروپیے ہی کا کام تھا میرے دشمنوں کی آنکھوں میں خاک جھونک کے ٹانگ پکڑ کے گھسیٹ لیا۔ اچھا شادی ہو لے پھر بیوی کی صلاح سے مردود کو نیچا ہی دکھاؤں گا۔

پہن کر زرہ رخش پر ہو سوار
چلوں سوئے میداں پئے کارزار

آزاد اور وہ دونوں پریاں گاڑی سے اتریں۔ خوجی کی سسرال کے دروازے پر آئے۔ خواجہ صاحب گاڑی کے اندر بیٹھے رہے۔ جب اندر سے ان کے بلانے کو آدمی بھیجا گیا تو انھوں نے کہا ان سے کہ دو۔

مستم ز غمِ عشقِ تو مستم مستم
دل در طلبِ وصلِ تو بستم بستم

اُن نے اندر جاکے کہ دیا کہ وہ تو کوئی نئی زبان بولتے ہیں ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ آزاد نے ایک پرچے پر یہ عبارت لکھی اور اسی آدمی سے کہا۔ یہ کاغذ جا کے دکھا دو۔

خوجی تم واقعی بلم بردار ہو۔ شریف نہیں۔ اور پاجی پن تو تمھارے بشرے سے ظاہر ہے لے لعنت خدا۔ مردک۔ وہ غیرت حور اس محبت سے آدمی بھیجے اور تو نہ آئے اگر نہ آئے تو حضور کی چیت گاہ پر ایک بال نہ رہے گا اور خود دلھن آن کے تم کو لے جائے گی۔ آزاد"

خواجہ صاحب دو لفظوں پر آگ ہو گئے ایک خوجی دوسرا پاجی۔ رقعہ چاک کر ڈالا اور آدمی سے کہا۔

بے پردگی محشر رسوائی خویشم ‏ ‏ ‏ در پردہ یک خلق تماشائی خویشم

آدمی پھر اپنا سا منہ لے کر واپس آیا۔ آزاد نے اندر سے ایک پھبتی و بنگی۔ بھدی۔ موٹی تازی عورت بھیجی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ گاڑی سے اتارا اور گود میں اٹھا کر اندر لے چلی۔ خوجی سمجھے تھے کہ دلہن ہی ہے۔ اکڑتے ہی تھے کہ اس نے گود میں اٹھا لیا اور جھپ سے مکان کے اندر داخل ہو گئی۔ صحن میں پٹخ کر دے مارا۔ اور اوپر سے دبانے لگی۔ آزاد کوٹھے پر سے یہ کیفیت دیکھتے جاتے تھے۔ کلیر سا سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ اور مس میڈا کے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ خوجی نے بہ آوازِ بلند کہا اماں جان معاف کر دو۔ ایسی شادی پر خدا کی مار۔ بندہ در گزرا۔ واسطے خدا کے چھوڑ دے نیک بخت۔ شادی ہونا تو درکنار بسم اللہ ہی غلط ہو گئی۔ اتنے میں آزاد نے پوچھا کیا ہے بھئی۔ آزاد کی آواز سن کر عورت الگ ہٹ گئی اور خواجہ نے یوں جواب دیا۔

خوجی ۔ کچھ نہیں میاں۔ اختلاط کی باتیں ہو رہی ہیں میاں۔

آزاد ۔ کچھ نہیں۔ اماں جان کا لفظ کسی نے کہا تھا شاید۔

خوجی ۔ واہ وا۔ یہاں اور ہندوستانی کون ہے سوائے آپ کے فرمائیے۔

آزاد ۔ اور آپ۔ آپ کیا خراسانی ہیں یا بدخشانی۔

خوجی ۔ بھائی جان خاموش باش، ہزار بار کہہ دیا کہ ماں کابلی۔ باپ ترکی مسلمان ہوں۔ مگر ولایت زا، نہ کہ ہندی الاصل۔

آزاد ۔ اچھا آ کے دلہن کے پاس بیٹھو۔ وہ کب سے گردن جھکائے بیٹھی ہے بے چاری اور آپ سنوائی ہی نہیں کرتے۔

خوجی ۔ کیا دلہن۔ اور ایں مٹلو کیست من دانستم کہ ہمیں زوجہ بہ آئندہ من بد بلاست۔

آزاد ۔ اجی یہ تو لونڈی ہے اس سے کیا واسطہ صاحب یہاں آئیے۔

خوجی اوپر تشریف لے گئے دیکھا کونے میں دوشالہ اوڑھے ہوئے دلہن بیٹھی ہے مگر گردن زمین دوز ہے۔ قریب جا کر بیٹھے۔ کلیر سا اور میڈا ذرا فاصلے پر تھیں۔ خواجہ صاحب نے ڈون کی لینا شروع کی۔ مس کلیر سا صاحب ہمارے ابا جان بارے کے سادات تھے رضوی اور زیدی اور تقویٰ میں سب سے بڑھے ہوئے اور اماں جان خاص امرائے کابل کی صاحبزادی تھیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں اگر آپ دیکھیں تو ڈر جائیں۔

راوی - تو عورت کیا چڑیل تھی۔ ڈائن تھی۔

خوجی - اچھے اچھے پہلوان نام سننے سے کان پکڑتے تھے یہ کھینچے اور چوڑی کلائی اور سینہ مثل سینۂ شیر اور کمر چیتے کی سی پتلی۔ اور ناک بالکل شلجم اور وہ بھی پھیکا اور آنکھیں خون خوار۔ ایک دفعہ رات کو گھر میں چور آیا اور میں ڈرا بھائی۔ مگر واہ ری اماں جان زندہ ہوں تو خدا بخشے اور اگر خدانہ خواستہ جاں بہ حق تسلیم ہوئیں تو بھی۔

راوی - سبحان اللہ ماں کا حال نہیں معلوم کہ زندہ ہیں یا روانہ باشند۔ خیر اور یہ بھی خوب فرمایا کہ اگر زندہ ہوں تو خدا بخشے۔ بہت ہی خاصے۔ ہاں صاحب چور آیا۔

خوجی - چور کی آہٹ پائی اور اس طرح لپکیں کہ جیسے بلائے بے درماں جاتی ہے اس لعین کو چپڑ غٹو کیا۔

آزاد کو یہ فقرہ سن کر اس قدر ہنسی آئی کہ فرش ہو گئے اور خوجی نے بہ غور دیکھا کہ دلہن کو ہنسی ضبط کرتی تھی مگر بے تاب تھی۔ سوچے کہ ہم سے کوئی بے ضابطگی عمل میں آئی ہے مگر کچھ پرواہ نہیں۔ (اماں جان کی تعریف تو ہو لی۔) فرمایا کہ بس اِدھر انھوں نے چپڑ غٹو کیا اُدھر چور غین بول گیا۔ ہات تیری کی میں نے پکار کے کہا اماں جان جانے نہ پائے میں بھی آن پہنچا۔ اتنے میں ابا جان کی آنکھ کھلی پوچھا کیا ہے میں نے کہا ہے کیا اماں جان سے اور ایک چور سے پکڑ ہو رہی ہے۔ بھئی چور کو انھوں نے گرفتار کر لیا اب میں جاتا ہوں کہ گرفتار کر لوں۔ تو ابا جان کس اطمینان سے کہتے ہیں۔ دبکے پڑے رہو سردی میں، اس نے چور کو بے دم کر کے قتل کر ڈالا ہو گا۔ میں جو جا کے دیکھتا ہوں تو لاش پھڑک رہی ہے تو جناب ہم ایسوں کے لڑکے ہیں۔

آزاد - کچھ ایسے ہو۔ تب ایسے ہو۔ سوروں کے سور ہی ہوتے ہیں۔

خوجی - (ہنس کر) تسلیم۔ مس کلیریسا اس وقت ہماری باتوں پر بہت ہنس رہی ہیں۔ کیا پڑا پایا۔ ابھی ہم ان کی نظروں میں نہیں جچتے۔

آزاد - دلہن آج بہت ہنستی ہیں۔ ہنس مکھ بیوی پائی۔

خوجی - اجی بڑی خرابی یہ ہے (سنبھل کر) اردو تو یہ کیا سمجھی ہو گی۔ مصر کی رہنے والی اردو کیا جانے۔ کیوں صاحب۔

آزاد - آپ بھی بس چونگا ہی رہے۔ ارے بے وقوف اردو سے انھیں کیا تعلق یہ مصری بولتی ہیں اور کچھ تُرکی۔

خوجی - بڑی خرابی یہ ہے کہ یہاں جس گلی کوچے میں نکل جائیے۔ سب کی نظر پڑا چاہے اچھا۔ اور یہ ہوا چاہیں بدظن۔

اس کو میں کیا کروں۔ اگر ان کو سیر دکھانے نہ لے چلوں تو نہیں بنتی، لے چلوں تو نہیں بنتی۔ کہ مبادا کسی بری چھم کی نظر پڑے۔ اور گھور گھور کے دیکھے یہ سمجھیں کہ وجہ خاص ہے اور یہاں فشار بگڑ جائے اور اس سے بڑھ کر خرابی یہ ہے کہ مجھے گھورے بغیر کوئی جوان یا ادھیڑ عورت رہے یہ ممکن نہیں۔ اب فرمائیے کیا کیا جائے کچھ چارا ہے۔

آزاد ۔ ہم سمجھا دیں گے۔ ارے میاں خوجے۔ وہ توبہ توبہ (گالوں پر تھپڑ لگا کر) توبہ وہ بہروپیا بھی یاد ہے۔

خوجی۔ آپ نے نہیں سنا آج دنبے کی شکل بن کے آیا تھا اور پہلے گاڑی کے سامنے آ کے ڈٹ گیا۔ اب میں غل مچا رہا ہوں۔ ہائیٹ ہائیٹ مگر وہ کس کی سنتا ہے۔ توبہ استغفار تو مطلب اس کا میں نے کہا نہ مطلب خاص یہی تھا کہ گاڑی کے تلے پانوں کچل جائیں اور ہم کو دھروا دے کہ انھوں نے میرے پانوں زخمی کیے ۔

آزاد ۔ جی پرائی بدشگونی کے لیے اپنی ناک کٹواتا تھا بھلا۔

خوجی ۔ طبیعت، ایک مرتبہ ہم نے بھی ایسا ہی منصوبہ کیا تھا۔

آزاد ۔ اچھا یعنی ناک کٹوانے کا منصوبہ کیا تھا۔

خوجی ۔ نا صاحب ناک میں مکھی گھس گئی میں نے چاہا کہ بھاڑ میں ناک جھونک دوں جس میں وہیں جل بھن کر راکھ ہو جائے اس پر آزاد نے قہقہہ لگایا اور دلہن بھی ہنسیں۔

آزاد ۔ دلہن منہ بند کیے کیوں بیٹھی ہیں ناک کی تو خیر ہے۔

خوجی ۔ بکتے ہو میاں مگر اب مجھے بھی شک ہو گیا ہے تم لوگ عمدہ زبان میں سمجھا دو بھائی۔

ناک تو دکھا دے۔

مس کلیر سا نے دلہن کو سمجھایا۔ سمجھنے کو تو سمجھی۔ لیکن خدا جانے کس سبب سے دلہن نے تمام چہرے کو بڑی ہوشیاری سے چھپا کر ناک ذرا سی دکھا دی۔

خوجی ۔ صدقے صدقے اس خود بینی کے صدقے۔

آزاد ۔ داد دینا قربان اس ناک کے۔ لوگوں نے تو دردناک بات کہی تھی مگر خدا نے

بچایا۔ ان لوگوں کی آنکھ تو ہے آنکھ کے آگے ناک سوجھے کیا خاک۔ نکٹا جیا برے احوال۔

آزاد۔ بھئی کیا کیا جملے کہے ہیں مانتا ہوں واللہ واہ۔

خوجی۔ تسلیم قدر دانی شرط ہے یار جی چاہتا ہے اس ناک کا ایک بوسہ لوں۔ تم دلوا دو بھائی جان۔

آزاد۔ اچھا جاؤ مگر صرف ناک کا بوسہ لینا خبردار ہوشیار۔

خوجی۔ اور نہیں کیا بے شک فقط ناک کو چوم لوں گا۔

دلہن نے پھر تمام چہرے کو چھپا کر ناک باہر نکالی۔

خوجے نے کہا مس میڈا وکلیرسا گفتن وہ کراز سامنے سے ذرا اس سمت کو (ہٹیدہ روند) آزاد نے کہا۔ اونھ کیا ہے تم بوسہ لو۔ خواجہ صاحب نے چپکے سے دو بوسے لیے تو دلہن بھی ناک کے بوسے کی طالب ہوئی۔ جیسے ہی انھوں نے بڑھائی اس زور سے چکت دی اور یہ تلملاتے ہوئے پیچھے ہٹے۔

آزاد۔ او بے ادب ایں لاحول ولا قوۃ توبہ توبہ۔

خوجی۔ ارے میاں جاؤ بھی یہاں ناک ہی کا صفایا ہو گیا تھا ان کو بے ادبی سوجھی ہے اور سنیے۔

آزاد۔ یار بسم اللہ تو غلط ہوئی۔ پہلے تو گاڑی سے گرے وہ تو کہیے منہ بانہہ اتفاق سے بچ گیا۔ ورنہ کھر بجے پر کھوپڑی پڑتی تو چٹاخا بولتا اور پھوٹ کی طرح کھل جاتی اور پہلا سابقہ جو ان سے پڑا تو ان بی صاحب نے ناک ہی تاکی۔ خدا ہی خیر کرے یار اچھے گھر بیعانہ دیا۔

آزاد۔ واہ نہی کہتے تھے کہ ہم بڑے نیارے اور کائیاں ہیں۔

خوجی۔ کیوں صریح دلہن بوسہ لیا چاہتی ہے کیا انکار کرتے خود دلہن بن جاتے اول تو یہاں کی رسمیں ہی جداگانہ ہیں دلہن کیا بیوہ سی معلوم ہوتی ہے مگر خیر وہ بیوہ ہی سہی باشد کچھ تو لحاظ ہو۔ بوسے کے عوض چکت دے بیٹھی۔

آزاد۔ ارے گاودی یہ غمزے ہیں۔ یہ نخرے کہلاتے ہیں جی۔

خوجی۔ (ہنس کر) واہ رے غمزے۔ غمزے کیا ہیں شتر غمزے ہیں واہ۔

آزاد۔ کیوں بھئی لڑائی پر جانے کا بھی اتفاق ہوا تھا۔ خواجہ صاحب

خوجی۔ ہونہہ کبھی کی ایک ہی کہی مانتا ہوں استاد کیا ننھے بنے جاتے ہیں جانتے تھوڑا ہی ہیں کہ کمیدان تھے۔ شاہی ہیں گل چلے مشہور تھے۔ اب بھی جو چاند ماری ہوئی ہم ہم ہی بیس رہے اور دور کیوں جاؤ۔ دریا پار والی جنگ میں این جانب نے وہ نام پیدا کیا کہ کہو مصر میں دو سو شادیاں کر لوں۔ جناب والا۔

آزاد۔ مس میڈا ہنس رہی ہیں گویا تم جھوٹے ہو بالکل۔

خوجی۔ جناب والد مبرور کو خدا بخشے واللہ وہ گر بتا گئے ہیں کہ ہر مقام پر کام آتے ہیں۔ کئی باتیں بتا گئے ہیں کہ ہر مقام پر کام آتی ہیں۔ ایک تو یہ جب کسی سے لڑائی ہو پہلا وار اپنا کرنا۔ اس میں چاہے دیو ہی کیوں نہ ہو۔ بات کرتے ہی چانٹا دینا ادھر گفتگو شروع ہوئی ادھر تم نے لپیڑ دیا پھر تو وہ چپتیلا ہو گیا اس کا اتنا رعب نہ ہوگا کہ ہاتھ چلائے جیسے چھچھا بٹیر۔

آزاد۔ جی ہاں آپ تو کئی جگہ اس نصیحت پر عمل کر چکے ہیں ایک تو بوا زعفران پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ سچ کتنی بے بھاؤ کی پڑی تھیں۔ دوسرے زبیدہ نے ناک میں دم کر دیا تھا چھیڑتے چھیڑتے ناک بھنکنی کی جھاڑی بن گئی تھی۔ اختر النسا اور زیب النسا کے مکان کے پاس اس کسان نے اچھی خبر لی تھی کہ میاں کو مع ٹٹو کے کانجی ہوس لے جانا پڑا اور آخر میں بہروپیے نے خوب دق کیا اچھے اچھے جھانسے دیئے ان لوگوں سے برتاؤ کرنے میں اپنے والد مبرور کی نصیحت کو بھول گئے۔ اس میں سے ایک آدھ کو مات کرتے چانٹا دیتے تو ہم جانتے۔

خوجی۔ اب میں اپنا سر پیٹ لوں کیا کروں یارو۔ جس جس مقام پر اپنے حلم کے سبب سے ذلیل ہوا تھا ان سب کا ذکر کیا۔ وہ تو کہیے خیریت ہے کہ دلہن اردو نہیں سمجھتی ورنہ نظروں سے گر جاتا۔

اس فقرے پر آزاد مسکرائے اور دلہن ہنسنے لگی تو خواجہ صاحب اکڑ کر فرماتے گیا ہیں واہ رے میں اور واہ رے میری قسمت واللہ وہ ہنس مکھ اور خندہ پیشانی بیوی پائی ہے کہ جی خوش ہو گیا ہر دم ہنستی رہتی ہے اور بے وجہ سمجھتی خاک نہیں۔ مگر ہنس دیتی ہے۔ آزاد نے کہا کہ لطف یہ کہ ہنستی بھی ہے تو عین موقع پر جس مقام پر ہنسنا چاہیے وہاں ہنستی ہے یار بڑی طبیعت دار ہے اور نازک اندام۔ گل فام۔

خوجی اور بھی اکڑ گئے۔ یوں میاں آزاد تم نے دلہن کو اچھی طرح دیکھا بھی ہے بھئی پہلے دیکھ لو آنکھیں دونوں ہوں مگر گاؤ دیدہ نہ ہو۔ گاؤ دیدہ معشوق سے ہمیں نفرت ہے۔

آزاد۔ ایسی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جیسی ہاتھی کی ہوتی ہیں۔

خوجی۔ بس یہی میں چاہتا ہوں۔ وہ معشوق کیا جس کی بڑی بڑی آنکھیں ہوں۔ تعریف یہ ہے کہ ذرا ذرا سی آنکھیں اور ہنسنے کے وقت بالکل ہی بند ہو جائیں۔ مگر یار گلا کیسا ہے اس کی ہم کو بڑی فکر ہے۔

آزاد۔ گلا کیا معنی۔ کیا ہندوستان میں گانے کی تعلیم دو گے لاحول۔

خوجی۔ اے ہے سمجھتے تو ہو ہی نہیں۔ مطلب یہ کہ دراز گردن یا کوتاہ گردن ہے پہلے سمجھ لو پھر اعتراض جڑو۔ یہ نہیں کہ کاتا اور لے دوڑی۔

آزاد۔ گردن اور سر اور دھڑ سب ایک ہے گویا گردن ہے ہی نہیں۔

خوجی۔ یہ کیا تو کیا کوتاہ گردن کی تعریف ہے یا دراز گردن کی۔

آزاد۔ پاگل ہے کون۔ ارے نامعقول کوتاہ گردن تنگ پیشانی حسین عورت کی یہی نشانی محاورات اور مثالیں بھول گئے۔

خوجی۔ محاورے تو کوئی ہم سے سیکھے آپ کیا جانیں۔ مگر از برائے خدا پاگل اور نامعقول اور ایسے ایسے لفظ زبان سے نہ نکالیے گا۔ جی ہاں حضرت میری یہاں کر کری ہوگی۔ اور کیا وارث علی خاں بن کے پاس جا کے زانو سے زانو بھڑا کے بیٹھے ہیں الگ ہٹ۔ اور سنیے بیوی کسی کی پاس کوئی بیٹھے۔

آزاد۔ یہ ڈپٹ اللہ اللہ۔ الگ ہٹ۔ ہٹو بھئی۔ نہیں ہٹ کیوں صاحب اپنی سسرال میں ہماری اتنی بے وقعتی کرتے ہیں آپ۔ اچھا خیر۔ دیکھا جائے گا۔

خوجی۔ آپ تو دل لگی دل لگی میں برا مان جاتے ہیں اور ہماری عادت کم بخت ایسی خراب ہے کہ بے چہل کیے رہتے ہی نہیں۔

آزاد۔ چلو ہو گا۔ کچھ بھئی ایک نئی بات دلہن میں دیکھی پانوں بڑے بڑے بس کوئی خدا جھوٹ نہ بلائے تو میرے پانوں کے برابر ہوں گے۔

خوجی۔ پھر تردد کا کوئی مقام ہے اگر پانوں بڑے نہ ہوتے تو معشوق میں حرف آتا

سنا نہیں سر بڑا گنوار کا اور پانو بڑا سردار کا۔
راوی۔ بجا۔ الٹے پیدا ہوئے تھے کیا اچھا الٹ پھیر ہے۔
آزاد۔ اور قد و قامت کا حال ہی نہ پوچھو۔ تاڑ کے برابر قد ہے۔ آپ کو پاڑ باندھنے کی ضرورت ہوگی۔
خوجی۔ واللہ مجھے اس وقت معلوم ہوگیا کہ آپ بدتمیز آدمی ہیں اور شعر و شاعری سے تو مطلق لگاؤ ہی نہیں ہے۔ معشوق کی کیا تعریف ہے یہ تعریف معشوق کی نہیں ہے کہ بونا ہو یا عورت بولی ہو۔ جب سنیے گا تو سرو قامت رشک شمشاد۔ سنا نہیں۔ سب اس کو سرو باندھے ہیں تو اس کو تاڑ باندھ بوسے ہوس ہے تو گردا اس کے پاڑ باندھ میں دیکھتا ہوں کہ دلہن میں جس قدر حسن کی باتیں ہیں سب کو آپ عیب سمجھتے ہیں۔ ع بریں عقل و دانش بباید گریست
آزاد۔ اچھا یہ کون سا معشوق پن ہے کہ چہرے کی طرف نظر ڈالی اور خواہ مخواہ بوسے لینے کو جی چاہا۔ فرمائیے سچ کہوں میری طبیعت تو ڈانوا ڈول ہو گئی تھی کلیجہ سا کو تو میں نے بہانے سے اس طرف بھیجا اور اس عروس شکر لب کو کئی بار چوما اس نے بھی بوسے لیے۔
خوجی۔ (بگڑ کر) کیا قسم خدا کی قرولی لے کے ابھی ابھی مردود کا کام تمام کر دوں گا۔ یہ گرہست کو ہرجائی پن کیسا۔
آزاد۔ سن تو لو۔ سن تو لو۔
خوجی۔ (تیکھے ہو کے) جی بس سن چکے۔ اس وقت رگ حمیت جوش زن ہے۔ ایسی ویسی کی ایسی تیسی چھتیسی۔ اور کیسی ڈبکی دبکائی بیٹھی ہیں۔ گویا جانتی ہی نہیں ہیں۔ عورت سے نفرت ہوگئی۔
آزاد۔ اب جہاں داد نہیں وہاں فریاد کون کرے۔ کوئی سنے تو سمجھائیں۔ بھائی پہلے اس کو دھوکا تھا کہ آزاد ہی شادی کریں گے اب معلوم ہوا کہ ایک اور صاحب کود پڑے ہیں۔ پھر اس کا کیا قصور تھا۔
خوجی۔ تو بندہ نواز یہ قبل نکاح بوسیدن کا صیغہ گردانا چہ معنی داد د۔ آپ نے کہا معنی بوسم۔ چومتا ہوں۔ میں۔ انھوں نے کہا بوس چوم تو۔ کہیں بھی آج تک

سنا ہے کہ نکاح ہوا ہی نہیں اور بوسہ بازی ہونے لگی۔
آزاد۔ ہر ملکے۔ و ہر رسمے۔ بس یہ اس کا گر ہے۔ دگر ہیچ۔
خوجی۔ اب آپ سے رنج ہو یا نہ ہو۔ یہ دونوں خدا کے فضل سے یہاں موجود ہیں۔ ایک پولینڈ کی شہزادی۔ تین ہوئیں۔ ایک اللہ رکھی چار۔ ایک حسن آرا بیگم سب کی سرتاج پانچ پانچ ہیں کچھ ٹھکانا ہے اور پھر بھی اس پر توجہ ہے۔

خیر تو جناب سنیے لوٹ کا روپیہ آپ کے اس خادم کے پاس بھی ہے اور ہرمز جی بھائی کی کوٹھی میں بھی بہت کچھ پیدا کیا۔ یہاں سے ہندوستان تک بندہ مع اپنے قبایل کے جا سکتا ہے جی کچھ حضور کا دست نگر یا زر خرید غلام یا خانہ زاد نہیں ہوں۔ اور نہ محتاج ہوں۔ اب آپ تو جائیں بندہ ان سے دو دو باتیں کر لے پھر شادی کی رائے پیچھے دی جائے گی۔

آزاد بسم اللہ کہہ کر اٹھتے ہی تھے کہ دلہن نے پانوں سے دامن دبا لیا۔
آزاد۔ اب بتاؤ۔ اٹھنے نہیں دیتیں۔ اب میں کیا کروں۔
خوجی۔ (ڈپٹ کر) چھوڑ دو چھوڑ دو ابھی چھوڑ دو۔
آزاد۔ چھوڑ دو صاحب۔ دیکھو تمھارے میاں خفا ہوتے ہیں۔
خوجی۔ حاشا! بندہ میاں ویاں نہیں بنتا۔ ہم تو شگفتہ خاطر آدمی ہیں اس بے اعتدالی کو یہاں کب جائز رکھنے والے ہیں۔
آزاد۔ ارے یار ایک دفعہ بھی اگر اس کی رسیلی نشیلی انکھڑیاں دیکھ لو تو غلامی کرنے لگو۔ بہت بڑھ بڑھ کے باتیں نہ بناؤ۔ باقی رہی بے اعتدالی بھئی انسان ہی تو ہے اچھی صورت پر کون نہیں ریجھتا۔

فصل گل میں ہاتھ سے جاتا رہا اپنا مزاج
جوشِ سودا باعثِ بے اعتدالی ہو گیا

خوجی۔ تم سے بے طور اختلاط کرتے ہیں یہ معاملہ کیا ہے۔
آزاد ہنسنے لگے۔ اور دلہن نے بھی قہقہہ لگایا۔ تب تو خوجی گھبرائے کہ اب تک تو مسکراتی ہی تھی۔ اب قہقہہ بازی بھی شروع کر دی۔ ایسا نہ ہو رفتہ رفتہ پاپوش کاری کرنے لگیں۔ آزاد نے دست بستہ عرض کیا۔ خداوند نعمت کا قصور معاف ہو۔

خانہ ر د آزاد کا قصور نہیں۔ آپ کی ان کی شادی ہو جائے بس پھر اگر بندہ آنکھ اٹھا کے دیکھے تو گنہ گار۔ قابلِ دار۔ سزا وار۔ خواجہ صاحب اکڑ کر بولے اچھا منظور۔ اس میں عذر نہیں۔ مگر اتنا سمجھا دینا کہ یہ بڑے کڑے خاں ہیں ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتے۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ خواجہ صاحب نے قرولی میان سے نکالی اور ایک کونے کی طرف جھپٹ گے گھٹنا ٹیک کر بیٹھے نگاہ کونے سے لڑی ہوئی اور زبان سے بکتے جاتے ہیں خنگی ر وذی۔ نکل اگر مرد ہے تو نکل موذی۔

خواجہ صاحب نے دلہن کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔ سنو جی صاحب ہم ہیں ناٹی آدمی ہم سے بیانا سو دیوانہ۔ ہمارے ساتھ چلتی ہو تو دو شرطیں ہیں ایک یہ کہ کسی غیر مرد نا محرم کو صورت نہ دکھانا نہ کہ بوسہ بازی۔ معاذ اللہ معاذ اللہ دوسری شرط یہ ہے کہ بندہ خدا کے فضل سے خوب صورت گراں ڈیل جوان ہے اور خیر حسین تو نہیں کہ سکتا (مسکرا کر) مگر اللہ۔ نے ایسی صورت دی ہے کہ ہندوستان سے روم تک دوسرا اس شکل وصورت کا نہیں نظر آیا۔ تو جو کوئی عورت دیکھتی ہے پہروں گھورتی ہے۔ ٹکٹکی بندھ جاتی ہے اس میں تم ٹھہریں ناواقف اور عورت ذات۔ سوتیا ڈاہ بری ہوتی ہے ایسا نہ ہو کہ تم بدظن ہو جاؤ یا کسی عورت سے لڑ پڑو۔ دو باتیں یاد رکھیے گا۔ یہ، بھائی آزاد۔ ذرا ان کو ان کی زبان میں سمجھا دو۔ یار چے۔ آزاد نے ٹوٹی پھوٹی زبان میں کچھ کہا۔ اس کے بعد مس کلیرسا اور مس میڈا باغ میں جا کر ٹہلنے لگیں۔ اور آزاد نے میاں بیوی کے تخلیے کی فکر کی اور کہا خواجہ صاحب آپ اگر ذرا باہر چلے جائیے تو میں سمجھا دوں۔ ایک منٹ کے لیے۔ خوجی بولے جی درست۔ بس بس۔ یہ بھرّے لونڈوں کو دیجیے گا۔ آپ ایسے چھوکرے میری جیب میں پڑے رہتے ہیں۔ اور سنیے کیا الو مقرر کیا ہے یہ فقرے کسی گنوار سے چلیے۔ اب تم جاؤ، ہم ان سے دو باتیں کر لیں۔ مگر قاضی مفتی کوئی تو آئے۔ یہ شادی کیسی۔ نکاح تو ہو لے۔ یا بے نکاح ہی۔ آزاد نے کہا۔ اس قدر بدگمانی پر خدا کی مار۔ ذرا باہر چلے جاؤ۔ اچھا چلو ہم بھی چلتے ہیں۔ ان کی لونڈیاں اور خادمہ اور مشاطہ آن کے بناؤ چناؤ کر کے ان کو بٹھائیں پھر آپ آئیے اگر کچھ بدگمانی ہو تو میں تمھارے ساتھ ہی چلتا ہوں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت دوں۔ خواجہ صاحب نے یہ بات پسند کی آزاد کو لے کر باہر آئے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک عورت نے آن کے خواجہ صاحب سے کہا آپ چلیے اور یہ صاحب (آزاد) باغ میں سیر کریں خوجے کمرے میں داخل ہو کر پلنگ پر دلہن کے پاس بیٹھے خادمہ پلنگ کے پاس کھڑی تھی۔ اس کو اشارہ کر کے کہا باہر چلی جا۔ سب دروازے بند کر لے دلہن سے کہا۔ جانِ من غمدار اب تو برقع اٹھاؤ۔ لِللہ اس قدر نہ ترساؤ۔ زیادہ ترسانا اچھا نہیں۔

صدائے برنخاست۔ یہ سمجھے کہ دلہن ہے شرمیلی پھر کہا جانِ جاں اب حیا و شرم کو بالائے طاق رکھو۔ خدا کے لیے صورت زیبائی دکھاؤ۔ ع

؎ چھپاؤ نہ چھپاؤ رُخِ تاباں ہم سے

دلہن گردن جھکائے ہوئے چپ چاپ بیٹھی رہی۔ خواجہ صاحب اور آگے کھسک کے بیٹھے اور فرمایا کہ نورِ چشمی لختِ جگر عزیزی للہ اس وقت شرم کو بھون کھاؤ۔ ذرا چہرۂ زیبائی کی جھلک دکھاؤ۔ کیوں ترساتی ہو ارے کب لگ ترسائے رکھیو جی۔ ارے کب لگ ترسائے رکھیو جی۔ دو منٹ تک خواجہ صاحب نے علم موسیقی کا خون کیا۔ اپنے نزدیک گویا رجھاتے تھے۔ اے تیری قدرت، جب یوں بھی دلہن نے نہ مانا تو برقع کی طرف ہاتھ لے گئے۔ اس نے ان کا ہاتھ پکڑا تو اب میاں کے چھڑائے نہیں چھوٹتا دھر دھر کے زور کر رہے ہیں۔ مگر ہاتھ گویا دیو کے ہاتھ میں آگیا۔ اب خوشامد کی باتیں کرنے لگے۔ چھوڑ دو پیاری۔ بھلا کسی غریب کے ہاتھ توڑنے سے کیا ملے گا۔

اور یہ تو خوب جانتی ہو کہ میں تو تم سے کبھی زور تو کروں گا نہیں۔ یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ پھر خواہ مخواہ کے لیے کیوں دق کرتی ہو۔ میرا کچھ نہیں بگڑے گا مگر تمہارے ننھے ملائم ملائم ہاتھ دکھ جائیں گے۔

خود گلا کاٹوں اگر خنجر عنایت کیجیے

دیکھیے دکھ جائے گی نازک کلائی آپ کی

دلہن نے ہاتھ چھوڑ دیا تو ان کی جان میں جان آئی۔ دل میں سوچے کہ دلہن کیا دیو زاد ہے یہ تو بھرکس نکال دے گی۔ مگر اس قدر فائدہ ہو گا کہ لوگ شہ زور اور پہلوان کہنے لگیں گے یہ کیا کم ہے۔ آہستہ سے کہا۔ کیوں پیاری ہمارا قصور تو بتاؤ۔ پھر ہمیں ترساتی کیوں ہو۔ حیا ہو چکی اب حیا کب تک رہے گی۔ آخر حیا کی بھی کچھ انتہا ہے یا نہیں لے بس برقع اٹھاؤ۔ بھئی اس ملک کے عجیب عجیب رنگ ہیں معاذ اللہ کا مقام ہے۔ توبہ کر

بند سے توبہ کر بند سے۔ برقع کے پاس ہاتھ لے جانے ہی کو تھے کہ روح فنا ہو گئی۔
جلدی سے ہاتھ ہٹا لیا سر پر رکھ کر کہا پیاری آخر یہ ماجرا کیا ہے منہ سے بولو۔ بت کی طرح
چپ چاپ بیٹھی ہو مگر میں تو اس نازک کمری کا قایل ہوں۔ کتنی ذرا سی کمر ہے ہوا کے جھونکے
سے لچکنے لگے۔ تعریف محال ہے دیوان میں خالی ہی جگہ چھوڑ دی ہم نے

مضمون یہ باندھا ہے تری نازک کمری کا
دیوان میں خالی ہی جگہ چھوڑ دی ہم نے

جی کڑا کر کے خوجی نے برقع ہی پر سے بوسہ لے لیا۔ بوسہ لینا تھا کہ اللہ دے
اور بندہ لے خوجے پلنگ کے نیچے اور دلہن ان کی چھاتی پر چھاپ بیٹھی۔ اور دو تھپڑ
اِدھر اُدھر لگائے مگر چھپھلتے ہوئے ان کا اتنے ہی میں کام تمام ہو گیا۔ دلہن پھر پلنگ
پر جا بیٹھی۔ یہ بھی اٹھے کہا جانی ایک بوسے کے عوض تم نے کچومر نکال ڈالا۔ اب کی بوسہ
کی جرات کی تو جان کے لالے پڑ جائیں گے ایسی بیوی سے در گزرے۔ مگر اب تو
سنگ آمد سخت آمد پھر بھی کڑا کر کے پلنگ پر بیٹھے مگر ذرا پینگ کے قدموں پر ٹوپی
رکھ دی اور کہا اب جان اور عزت اور آبرو اور توقیر سب تمہارے ہاتھ ہے۔ میں
نے کمیدانی کی ہے رسالداری کی ہے گڑھیاں فتح کی ہیں۔ میدان لڑا ہوا ہوں۔
معرکے دیکھے ہیں بہروپیوں کو جھانسے دیے ہیں۔ اس فقرے پر دلہن بے اختیار
ہنس دی خوجے بشاش کہ مار لیا ہے فرمایا۔ وہ ہنسی آئی ناک پر آئی۔ منہ پر آئی۔
آخر کھل کھلا کر ہنس ہی دیں کیوں نہ ہو جانِ من لے اس بات پر گلے لگ جاؤ۔
دلہن نے ہاتھ پھیلائے خوجے گلے ملے تو دلہن نے اس زور سے دبایا کہ قیں
بول گئے چھوڑ دو چھوڑ دو۔ دیکھو چوٹ آجائے گی۔ ناحق اپنی نازک کلائی کی
دشمن ہوئی ہو۔ دیکھو دیکھو چوٹ نہ آجائے کہیں۔

خواجہ صاحب اپنی بد قسمتی پر زار زار روتے تھے کہ بیوی پائی بھی تو اس
درجہ بد مزاج کہ ہاتھ نہیں لگانے دیتی۔ بولتے ہیں تو جواب ندارد۔ ہاتھ بڑھاتے
ہیں تو گدا دیتی ہے۔ ہاتھا پائی میں وہ ان سے بیس، پنجے کلائی میں چوکس۔ ان کی
دال نہیں گلنے پائی۔ اور وہ وار پر وار کرتی جاتی ہے۔ دو بارہ پٹخنی بتائی۔ ایک
مرتبہ ہاتھ مروڑ ڈالا۔ وہ تو بسم اللہ ہی غلط ہو لی تھی۔ پہلے ہی ناک پر چپت دی
وہ تو کہیے خدا نے ناک بچائی۔ ورنہ جہان میں نکو بنتے کہ بیوی کے پاتے ہی ناک
گنوائی۔ خواجہ صاحب سوچے کہ جان پر کھیل کر ایک دفعہ اور کوشش کروں۔ بہت

ہوگا مار ڈالے گی۔ اور کیا کرے گی اٹھ کھڑے ہوئے کپڑے اتارے لنگوٹ کسا اور پینترا بدل کر کھڑے ہوئے پہلے بیوی کو سمجھایا۔ سنو جی صاحب ہم ایک شاہزادے ہیں اور معشوق مزاج۔ تلوار کے دھنی بات کے دھنی۔ ناک پر مکھی بیٹھے قلم تراش سے ناک ہی اڑا دوں۔ سمجھیں اب تک میں دل لگی کرتا تھا تم عورت میں مرد۔ اور عورت بھی کیسی کہ نازک بدن نازک اندام نازنیں۔

راوی۔ آپ کا دل ہی جانتا ہوگا کہ کیسی نازک بدن ہیں۔

خوجی۔ اگر اب کی تم نے گستاخی کی تو میں آگ ہو جاؤں گا۔

راوی۔ اس ڈانٹ ڈپٹ کے صدقے۔ آگ ہو جیے گا تو کیا کیجیے گا۔ جل بھن کے خاک ہو جائیے اب ہم کو یقین ہو گیا کہ آپ کی شامت آگئی ہے ایک مرتبہ بھرکس نکل چکا ہے اب کی جان کی خیریت نظر نہیں آتی ہڈیاں چلبلا رہی ہیں۔ ایسا نہ ہو ہاتھ پاؤں توڑ کے دھر دے۔

خوجی۔ تم نازک عورت ہو اور میں مرد بھی کیسا گراں ڈیل۔ بنوٹیا۔ بنکیت۔ لڑنتیا ابھی کل ہی کی بات ہے کہ ہوٹل کے ایک پہلوان کو دے مارا تو چاروں شانے چت۔

راوی۔ ارے سبحان اللہ۔ کیوں نہ ہو۔ حضور کے گراں ڈیل ہونے میں کیا شک ہے آدمی کیا دیو زاد ہو۔ اللہ رہی کلائی اور اُف رے سینہ فراغ۔

خوجی۔ اب میں پینترا بدل کر کھڑا ہوا اب اگر بے ادبی کی بات بولی تو ستم ہو جائے گا۔ پھر یا تو تم ہی نہیں یا بندہ ہی نہیں۔ یوں تو موم ہوں۔ مگر غصے کے وقت معاذ اللہ فولاد میرے آگے موم سے بدتر۔ تو وجہ کیا۔ جو گرجتا ہے وہ برستا نہیں۔ لے اب برقع اٹھا دو۔ گھونگھٹ الٹو۔ ورنہ خیر نہیں۔ ہے یہ کہیں اونچا تو نہیں سنتی (تالیاں بجا کر) سنتی ہو! برقع اٹھاؤ۔ (اشارے سے) برقع، برقع نقاب الٹو۔

پیمبر میں نہیں یوسف ہوں جانی   رہے موسیٰ سے تیری لن ترانی

واللہ مجھے رحم آتا ہے شب عروسی اور یہ باتیں۔

بی بی آخر کچھ تو منہ سے بولو۔ منہ سے نہ بولو اشارے ہی سے باتیں کرو۔ یا الٰہی یہ شرم اجیرن ہو گئی۔ حیا بھی تو کتنی۔ گنوار پن کی شرم سے ہم عاجز آگئے۔

بیٹھ جاؤ خود، حیا اٹھ جائے گی

اب مجھے اور بھی غصہ آیا۔ ایک بار اور سنبھلئے دیتا ہوں۔

خواجہ صاحب بکا کیے وہاں شنوائی ہی نہ ہوئی۔ آدمی جھلے تو تھے ہی بگڑ کر کہا۔ اب سنبھل اور سمجھ کر قضا کا سامنا ہے یہ پنجۂ بدیع پنجۂ اجل ہے۔

یہ کہہ کر خواجہ صاحب نے پھر پینترا بدلا۔ اور اکڑ کر کھڑے ہوئے مگر کندے تول تول کے رہ جاتے تھے۔ جرات نہیں ہوتی تھی کہ ہاتھ بڑھائیں چوٹ کھائے ہوئے تھے نہ۔ آخر کار جان پر کھیل ہی گئے اور جھپٹ کر دلہن کی گردن میں حلقوم باندھا۔ حلقوم باندھنا تھا کہ دلہن نے ایک ہاتھ سے حلقوم کا توڑ کیا اور دوسرے ہاتھ سے ان کی گردن لی۔ اب خواجہ بدیع الزماں صاحب بدیع تڑپ رہے ہیں دانت پیستے ہیں مگر بے سود۔ گردن نہ چھوٹی نہ چھوٹی۔ تو جھلا کر کاٹ کھایا یار کا ٹنا تھا کہ اس نے زور سے ایک تھپیڑ دیا۔ اور خواجہ بدیع الزماں صاحب بدیع، سابق کمیدان دگلے والی پلٹن کا منہ پھر گیا۔ دانت کٹکٹاتے ریلنا چاہا تو دلہن نے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور گردن اب تک پھنسی ہی ہے مجبور ہو کر کوسنے لگے۔ خدا کرے تیرے ہاتھ ٹوٹیں۔ اللہ کرے بوا زعفران کا اور تیرا مقابلہ ہو جائے یا خدا اس کے دونوں ہاتھ ٹوٹ کے گر پڑیں۔ ہائے اس وقت اگر خداوند کریم ایک منٹ کے لیے زور عطا کرے تو سرمہ بنا ڈالوں اس مردودنی کا۔ کیا خوب غل مچا کر کہا چھوڑ دے بس کر دیا ہے۔ چھوڑ دے۔ ہائے قرولی نہ ہوئی ورنہ دکھا دیتا۔ مگر افسوس قرولی کمرے کے باہر رہ گئی۔ دلہن نے ان کو چھوڑ دیا تو تڑپ کر باہر نکل آئے۔

اب سنیے کہ مس کلیرسا اور میڈا ایک دروازے کی درازوں سے کل کیفیت دیکھ رہی تھیں۔ جب خوجی صاحب باہر نکلے تو انھوں نے یوں گفتگو کی۔

آزاد۔ مبارک باشد۔ کہیے دلہن خوب صورت ہے یا نہیں۔ یار ہو خوش قسمت۔ واہ استاد کیا کہنا ہے۔

خوجی۔ خدا کرے آپ بھی ایسے ہی خوش قسمت ہوں۔ آمین آمین۔

آزاد۔ کیا ارے بھئی کیا بد قطع ہے۔ ہم نے تو بڑی تعریف سنی تھی۔ مگر تم کچھ افسردہ ہو کے آئے ہو۔ اس کا کیا سبب ہے۔

خوجی۔ بھائی جان۔ وہاں تو فوج داری ہو گئی۔ عورت کیا دیونی ہے۔ یہ تو بوا

زعفران کی جوڑی دار ہے واللہ کھومر نکل گیا۔ انتہا کی بدمزاج، چکلت دی۔ دے مارا۔ ہڈیاں پسلیاں چور کر ڈالیں۔ بے دم کر دیا۔ لاحول ولاقوۃ۔ دلہن کیا ڈاین ہے۔

ہندوستان میں آمد آمد اور بزم آرائیاں

آزاد فرخ نہاد کی آمد آمد کی تمام بمبئی میں دھوم مچ گئی۔ اس شب کو بمبئی کے رئیس اعظم پارسی نے جس کے فرزند دلبند کو آزاد نے ڈوبنے سے بچایا تھا ان کو بہ اصرار وانکسار تمام مدعو کیا۔ مکان دلہن کی طرح سجا سجایا تھا۔ جب آزاد اس رئیس کے دولت خانہ، طرب کاشانہ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وفورِ نورِ چراغاں اور جھاڑ کنول ہانڈی کی روشنی سے چکا چوند کا عالم ہے۔ آنکھ نہیں ٹھہرتی۔ جدھر نگاہ جاتی ہے حورانِ بہشتی ہی نظر آتی ہیں۔ جب آزاد بمبئی سے عازمِ روم ہوئے تھے تو اسی عالی مرتبت پارسی نے دعوت کی تھی۔ وہی سامان ان کی نظروں تلے آج بھی پھر گیا۔ وہی پریوں کا دنگل۔ وہی چہل پہل۔ وہی معشوقوں کے جھمگھٹے۔ کوئی اٹکھیلیاں کرتی تھی۔ کوئی نازِ دل رُبا سے قدم دھرتی تھی۔ کوئی فرطِ مسرت سے ہمجولی کو چومتی تھی کوئی صحن میں ابر کی طرح جھومتی تھی۔ اتنے میں محفلِ رقص وسرود آراستہ ہوئی۔ آزاد نے ناچ دیکھا۔ طعامِ لذیذ نوشِ جاں کیا اور تھوڑی دیر کے بعد رخصت ہوئے۔

دوسرے روز میاں آزاد (بمبئی سے) رخصت ہوئے۔ اسٹیشن پر ہزاروں آدمی جوق در جوق جمع تھے۔

ہندوستان آنے پر نواب کے دربار میں استقبال

حضرات ناظرین میاں صف شکن علی شاہ سے خوب واقف ہیں۔ فسانۂ آزاد

جلد اوّل میں اس انوکھے بٹیر کا ذکر خیر درج ہے کہ مصاحبوں نے بھرے دے دے کر نواب صاحب کو خوب تیار کیا اور صف شکن شاہ کی اس درجہ تعریف کی کہ انسان تک سے بڑھا دیا۔

۱۔ اے حضور وہ تو عربی سمجھ سکتا تھا۔

۲۔ حضور غلام نے اس کو وظیفہ پڑھتے دیکھا ہے۔

۳۔ اجی ہر روز صبح شام ڈنڈ پیلتا تھا۔

۴۔ پابندِ صوم و صلوٰۃ تھا جناب والا۔

۵۔ حضور سے اب ذکر کرتا ہوں کہ دس پانچ مرتبہ میں نے افیم پلا دی مگر ذرا نشہ نہ ہوا۔ ہاں انکھڑیاں البتہ لال ہو گئیں تھیں۔

۶۔ پیر و مرشد پچھلے سے حق حق کی آواز کابک سے آیا کرتی تھی حضور کو ہم نے کئی بار جگا کے سنوا دیا تھا۔

۷۔ حضور ایک خوبی ہو تو عرض کروں۔

نواب۔ مجھے تو (ہ) سے عشق ہو گیا تھا جی۔ میں اس کی ایک ایک ادا پر جان دیتا تھا وہ نکیلی چونچ۔ وہ بے تابی سے کاکن چگنا۔ چکھی کھائی۔ اور ڈٹ گیا۔ سیکڑوں معرکوں میں لڑا مگر کورا آیا۔ دو چونچیں ہوئیں اور حریف دم دبا کر بھاگا۔

۸۔ تس پر خداوند منجھولا ہی جنور تھا۔ کیا شان ہے اس کی قربان او ہو ہو ہو۔ بلا کا کس بل تھا۔

نواب۔ (آہ سرد)

اگر دانستم از روزِ ازل داغِ جدائی را　　　نمی کردم بہ دل روشن چراغِ آشنائی را

نواب کے دربارِ دُربار کی تصویر آزاد کی نظروں کے سامنے تھی ان دونوں لعبتان سہی قد سے تذکرہ کیا تو اور بھی قہقہے پڑے۔

جب شہر میں پہنچے تو آزاد کو شوق چرایا کہ جس طرح ممکن ہو نواب صاحب اور ان کے رفقا سے ضرور ملیں۔ مس میڈا اور مس کلیرسا کو (ہوٹل کے) ہوٹل میں چھوڑا اور گاڑی کرایہ کرکے نواب صاحب کے دولت خانے پر آئے۔ ادھر گاڑی سے اترے ادھر خدمت گاروں، دربانوں، سپاہیوں، خواصوں نے غل

مچا یا کہ خداوند محمد آزاد پاشا تشریف لائے ہیں حضور آزاد صاحب آ گئے پیر و مرشد آزاد آئے ہیں ۔ میاں خوجی ہوت لو تمھارے آقا آ گئے ۔ نواب صاحب، رفقا مصاحبین احباب سب کے سب گھبرا کے اٹھ کھڑے ہوئے تو دیکھا کہ آزاد پاشا رپ رپ کرتے ہوئے ترکی فوجی وردی ڈانٹے چلے آتے ہیں ۔ نواب صاحب نے جھپٹ کر مصافحہ کیا اور گلے لپٹ گئے اور یوں ہمکلام ہوئے ۔

نواب ۔ بھائی جان آنکھیں تمھیں ڈھونڈھتی تھیں ۔

آزاد ۔ بحمداللہ کہ یہ سعادت مجھے نصیب ہوئی ۔

نواب ۔ اہا ۔ اب یہ باتیں نہ کرنا ۔ واللہ صاحب ضلع اور صاحب کمشنر تک تمھاری ملاقات کے شائق ہیں ۔

مصاحب ۔ بڑا نام کیا ۔ واللہ کروڑوں آدمی ایک طرف اور حضور ایک طرف سینہ سپر، جان بہ کف لڑے ۔

خوجی ۔ غلام بھی آداب عرض کرتا ہے ۔

آزاد ۔ (ہاتھ ملا کر) واہ خواجہ بدیع الزماں ۔

نواب ۔ کیا ؟ خواجہ کون ؟ بدیع الزماں ۔ بدالزماں کب سے ہوا ۔ خوجی کہیے بجائے ۔ بدیع الزماں !

خوجی ۔ حضور یہاں جانے کون کون ملک دیکھ آئے ہیں ۔

نواب ۔ سنا آپ نے تین تین کرور آدمیوں سے تنہا مقابلہ کیا ۔ بھئی مسیتا بیگ بلا کا آدمی ہے یہ شخص ۔

مسیتا بیگ ۔ خداوند ! اللہ کی دین ہے ۔

غفور ۔ میاں اچھے رہے ہم سے ابھی دواجی نے کہا ۔

نواب ۔ ارے بھئی گنگا جمنی حقہ بھر لا ۔ آپ کے واسطے ۔

آزاد پاشا کو ایسا ویسا نہ سمجھنا میاں مسیتا بیگ ان کی تعریف کمشنر تک کی زبان سے سنی اور سنا آپ سے اور شہنشاہ روس سے بھی ملاقات ہوئی مگر جب وہ ملنے آئے تو آپ اپنی کرسی پر بیٹھے رہے ۔ بھائی جان اب تم نے وہ درجہ حاصل کیا ہے کہ ہم اگر حضور کہیں تو ہمارا فخر ہے بجا شہنشاہ روس کجا ہم ۔

خوجی - خداوند مورچے پر ان کو حضور دیکھتے تو غش کر جاتے جیسے شیر کچھار میں ڈکارتا ہے۔

نواب - (ہنس کر) مردود ہمیشہ گدھا ہی بنا رہے گا۔

خوجی - خیر حضور مالک ہیں جو چاہے سو کہیں۔

نواب - کیوں جناب انھوں نے کوئی کشتی نکالی تھی۔

آزاد - ارے میرے سامنے تو دو چار نہیں دو چار ہزار بار دھپیائے البتہ گئے۔ ورا ایک بوٹے تک نے ان کو اٹھا کے دے مارا تھا اور تو ں نے گدے دیئے تو گز گز بھر زمین سے نیچے گرے۔

مصاحب - (قہقہہ لگا کر) واہ بھئی خوجی واہ۔

رفقا - (ہنس کر) اس وقت تو بھمباڑا پھوٹ گیا۔

آزاد - کیا یہ گپ اڑاتے تھے کہ میں نے کشتیاں نکالیں۔

مصاحب - اے حضور جب سے آئے ہیں ناک میں دم کر دیا گیدی نے۔ بات ہوئی اور نکالوں قرولی - دوں ایک - دے ماروں اٹھا کے۔ منجھولے بٹیر کے برابر تو قد اور اس پر یہ دم خم۔ حضور پرسوں تو کہتے تھے کہ شہر میں ہم نے برابر کے ایک پہلوان کو دم بھر میں آسمان دکھایا۔

آزاد - گھر کی پٹکی اور باسی ساگ - آسمان دکھایا ایک بوٹے تک نے گردن ناپی اور اٹھا کے دے مارا چلے وہاں سے دون کی لینے۔

نواب - اجی یہ ہمیشہ کا جوتی خورہ ہے۔

مصاحبین - (قہقہہ لگا کر) بجا ہے جناب اس میں ذرا شک نہیں۔

اتنے میں نواب صاحب کے یہاں ایک منشی صاحب تشریف لائے۔

نواب - منشی صاحب آپ کو پہچانا۔

منشی - اخاہ - حضور جنرل محمد آزاد پاشا صاحب ہیں۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

حضور بڑا نام پیدا کیا - سبحان اللہ سبحان اللہ۔

آزاد ۔ جناب میں کس لائق ہوں۔ من آنم کہ من دانم ۔
نواب ۔ اجی کمشنر صاحب ان کے مداح ہیں ۔ بس اب اس سے زیادہ اعزاز کیا ہوگا بھئی میرے تو فخر ہیں ۔
منشی ۔ درایں چہ شک بے شک فخرِ قوم ہیں ۔
خوجی ۔ اجی جناب میدانِ کارزار میں آپ دیکھتے تو عش عش کر جاتے گھوڑا دبایا اور لاکھ آدمیوں کے پرے میں کڑکڑاتے ہوئے دن سے موجود ۔
منشی ۔ آپ نے بھی بڑا ساتھ دیا خواجہ صاحب مگر آپ کی بہادری کا کہیں ذکر نہیں سننے میں آیا ہے ۔
خوجی ۔ آپ ایسے اُمیدیوں کو میں کیا سمجھتا ہوں ۔ میں نے وہ وہ کارِ نمایاں کیے ہیں کہ باید و شاید ۔ قرولی ہاتھ میں لی اور صفوں کی صفیں صاف کر دیں ۔
منشی ۔ اب کہیے اب تو آپ نواب صاحب کے ہاں بنے ہیں ۔
خوجی ۔ ڈاگ ہو کر ، بنے ہوں گے آپ ۔ بنتے کوئی اور ہیں ۔ بننا کیا معنی ۔
نواب ۔ بگڑ گئے حضور ۔ بگڑ گئے میاں گیدی خو ۔
خوجی ۔ پیر و مرشد یوں پوچھنا چاہیے تھا کہ اب تو آپ نواب صاحب بہادر کے ہاں پھر اسی عہدے پر ممتاز ہوئے نہ ۔ یہ سب بالائے طاق پوچھا تو کیا پوچھا کہ آپ یہیں بنے ہیں ۔
منشی ۔ اچھا جناب معاف فرمائیے ۔ اب یہ بتائیے کہ آپ کی تنخواہ کیا رہ گئی ۔
خوجی ۔ قسم ہے حضور کے قدموں کی ۔ ملکوں ملکوں گیا اور ہزارہا قسم کے آدمی دیکھے مگر آج تک اس فیشن کا بدتمیز دیکھنے میں نہیں آیا ۔ محض بد سلیقہ مردک پوچھتا کیا ہے کہ آپ کی تنخواہ کیا رہ گئی ہے ۔ صحبت یافتہ لوگ یوں پوچھتے ہیں کہ اب آپ کو ترقی ہوئی یا نہیں ۔
آزاد ۔ واقعی جو باتیں خواجہ صاحب نے دیکھی ہیں وہ کسی اور کو کہاں نصیب ہوئیں ۔
بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے
اور خواجہ صاحب یہ آپ نے بیان کیا تھا کہ مس روز آپ کی عاشقِ زار تھیں ۔
جناب ایک پری ان پر عاشق ہو گئی تھی ۔
خوجی ۔ ایک پری ۔ اہو نہ ایک پری ۔ یوں نہیں کہتے ۔ ہر مقام پر پریاں دل و

جان سے عاشق ہو جاتی تھیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر پری چہم برق دم۔

قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام قیامت کرے جس کو جھک کر سلام

سب سے پہلے تو ہم پر بوا دارے) لاحول (منہ پر تھپڑ لگاکر) لاحول ولا قوۃ۔

آزاد (قہقہہ لگاکر) ہاں ہاں بوا زعفران کہو کہو۔

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

خوجی۔ (ہاتھ جوڑ کر) واسطے خدا کے معاف کرو۔ واللہ کہو ہے ہے غضب ہو گیا۔ یہ ہم نے کیا کہا۔

نواب۔ جناب آزاد صاحب اگر آپ نے اس امر کو مخفی رکھا تو واللہ بڑا رنج ہوگا۔ (ہاتھ باندھ کر) میں بھی دست بستہ عرض کرتا ہوں۔ اب فرمائیے میرا زیادہ خیال ہے یا اس گیدی کا۔

خواجہ صاحب نے کل حاضرین کو مخاطب کر کے جنگ کے حالات کا یوں سماں باندھا۔ کہا جس روز آزاد پاشا اور ہم پلونا کے قلعے میں تھے اس روز کی کارروائی دیکھنے کے قابل تھی۔ مذکور پانچ طرف سے محصور تھا۔

مصاحب۔ جی چار طرف سے محصور ہونا تو مشہور ہے یہ پانچواں کون طرف آپ نے پیدا کیا۔ جو بات کہو گے وہی انوکھی۔

خوجی۔ تم ہو گدھے۔ کسی نے بات کی اور تم نے کاٹ دی۔ یوں نہیں ووں۔ ووں نہیں یوں ایک طرف دریا تھا اور خشکی بھی تھی اگر جنوب کے سمت دریا ہی سے محصور کرتے تو فوج قلعہ خشکی سے نکل جاتی اور اگر صرف خشکی ہی پر قبضہ ہوتا تو دریا کی سمت سے نکل جاتی۔

یہ خرابی تھی مگر تم ایسے گو کھوں کو اس کا کیا حال معلوم۔ کبھی جنگ پر گئے ہو کبھی توپ کی صورت دیکھی ہو کبھی دھواں تک تو دیکھا نہ ہوگا اور چلے ہیں وہاں بڑے کڑیل کے بچے بن کے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

سب گرمیِ نفس کی ہیں اعضا گدازیاں دیکھو نہ زندگی ہے سراپا زبانِ شمع

راوی۔ سبحان اللہ سبحان اللہ عین موقع پر شعر پڑھ دیا۔

خوجی۔ بس قبلہ و کعبہ اب کریں تو کیا کریں ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے کہ یا الٰہی کیا ہوتا ہے اب جائیں تو کدھر سے اور بھاگیں تو کدھر سے۔

نواب ۔ واقعی وقت تو بڑا نازک تھا۔
آزاد ۔ جناب نازک کیا جان کے لالے پڑے تھے۔
خوجی ۔ اور روسیوں کی یہ کیفیت کہ گولے برسا رہے تھے اور ہر طرف آگ برس رہی ہے سب ترکی گھبرائے ہوئے کہ یا الٰہی اب ہوگا کیا۔
پس آزاد پاشا نے مجھ سے کہا کہ بھائی جان اب کیا سوچتے ہو مدد دوگے یا انکار کر جاؤگے۔ میں آگ بھبوکا ہوگیا۔ کہا نکل جانا کیا معنی۔

آں نہ من باشم کہ روز جنگ بینی پشت من آں منم کاندر میان خاک و خوں بینی سرے

آزاد نے کہا پھر نکل نہ جانا۔ میں نے کہا بسم اللہ چل کر دیکھ لو۔
اب اتنے میں قلعے کی دیواریں چھلنی ہوگئیں اور ہر چہار طرف سے گولے برسنے لگے بس آزاد پاشا نے سب فوج محصور سے کہہ دیا کہ اب قلعے کی دیوار توڑ کر ہم لوگ نکلنے والے ہیں یہ کہہ کر مجھ سے کہا کہ تم سب کے مقدمۃ الجیش ہو اور بندہ مسلح ہو کر عربی نژاد ہوا بہادر پر سوار ہوا تو گھوڑے کی یہ کیفیت کہ اڑتا ہوا جاتا تھا۔ اس مقام پر یہ حال تھا کہ

بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

قلعہ کے باہر میری شمشیر خوش غلاف جو چمکی تو دو لاکھ روسیوں کو تہ تیغ کیا۔ دو لاکھ پورے دو لاکھ!
رفیق ۔ اس جھوٹ پر خدا کی مار۔ ارے کم بخت کیوں لطف سخن کھوتا ہے اور سب سچ کہا مگر یہاں پر آن کر منہ کے بھل گر پڑا۔ اے لعنت خدا۔
نواب ۔ واللہ مجھے اب تک لطف آتا تھا مگر اس نے دو لاکھ آدمیوں کا ذکر کر کے کل لطف خاک میں ملا دیا۔
خوجی ۔ اچھا آزاد صاحب سے پوچھیے بیٹھے تو ہیں سامنے۔
نواب ۔ حضرت سچ سچ کہیے گا اور آپ سچ سچ تو ضرور ہی کہیے گا۔ جھوٹ بولنے سے آپ ایسوں کو کیا فائدہ۔ بس فقط اتنا کہیے گا کہ یہ واقعات کہاں تک صحیح ہیں۔
آزاد ۔ جناب والا ۔ پلونا کا جو کچھ حال بیان کیا وہ تو سب صحیح ہے مگر دو لاکھ آدمیوں کا تہ تیغ کرنا میاں خواجہ صاحب کا طغیان زبان ہے اور صاف یہ کہ پلونا کی تو انھوں نے صورت بھی نہیں دیکھی آج تک ۔ تو ان دنوں میں خاص قسطنطنیہ میں تھے۔

اس پر بڑا فرمائشی قہقہہ پڑا اور آواز دیر تک گونجا کی بیگم صاحب نے قہقہے کی آواز سنی تو مہری کو بلا کر کہا جا کر دیکھنا یہ قہقہہ کیا پڑا اس وقت۔

مہری۔ اے حضور وہ آئے ہیں وہ تھے خوب صورت سے آدمی۔

بیگم۔ ادئی تو پہیلیاں بجھواتی ہے۔

مہری۔ سرکار وہ آئے نہیں تھے گورے گورے سے آدمی۔

بیگم۔ غفورن ذرا باہر دریافت کر کہ یہ قہقہہ کس بات پر پڑا۔

غفورن۔ میں عرض کروں حضور نے ابھی شاید نہیں سنا وہ آئے ہیں میاں آزاد حضور نے توچقوں میں سے ان کو دیکھا ہے۔

بیگم۔ آخاہ آزاد آئے یہ مواخوجی جھوٹ ہی بکتا تھا کہ آزاد اب یہاں نہ آئیں گے۔ جا کے خیر و عافیت تو دریافت کرو۔ ہماری طرف سے نہ پوچھنا۔ ہاں کہیں ایسی بات نہ کرنا۔

غفورن۔ واہ حضور کوئی دیوانی ہوں کیا۔ (باہر سے آن کر) حضور صحیح سلامتی سے آئے مجھ سے پوچھنے لگے۔ غفورن اچھی تو ہو۔ میں نے جھک کر سلام کیا اور کہا ہاں۔ حضور اچھی ہوں۔ دعا دیتی ہوں حضور باخیریت سے آئے۔ کہا ہاں۔

بیگم۔ ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔ نواب کہتے تھے کہ آزاد نے اس ملک میں بڑا نام کیا۔ توپ کے منہ لڑے۔ تم نے کبھی توپ دیکھی ہے غفورن۔

غفورن۔ اے اوئی اللہ نہ دکھائے حضور۔

مہری۔ ہم نے دیکھی ہے حضور اور ہم تو روز ہی دیکھتے ہیں۔

بیگم۔ توپ دیکھی ہے تمھارے میاں کسی فرقے میں سواروں کے سائیس ہوں گے توپ نہیں ایک وہ دیکھی ہے۔

مہری۔ حضور یہ سامنے توپ ہی لگی ہے یا کچھ اور۔

راوی۔ ان کے مکان میں منجملہ اور خواصوں کے ایک خواص تھی رحیمن نامی سب خواصوں اور محل کی عورتوں سے موٹی تازی۔ مہری نے جو اس کی طرف اشارہ کیا بیگم صاحب اور غفورن اور خواصیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

رحیمن۔ کیا بڑا پایا بہن غفورن۔

غفورن - آج ایک نئی بات دیکھنے میں آئی ہے بہن۔
رحیمن - ہم کو بھی دکھاؤ۔ آپ ہی آپ لطف اٹھانا کیا معنی ہم بھی دیکھیں کوئی مٹھائی ہے یا کھلونا ہے کیا ہے کیا۔
غفورن - توپ کی توپ اور عورت کی عورت۔
رحیمن - (سمجھ گئی) تمھیں لوگوں نے تو مل کر ہمیں اتنا ڈبلا کر دیا۔
بیگم - لے آگ لگے تیرے اس جھوٹ کو اب اور کیا موٹی ہو لی۔ پھول کے کپّا تو ہو گئی ہے۔
رحیمن - اے ہے سرکار نے اندھیر ہی کر دیا۔ گل کانٹا تو ہو گئی ہوں یہ کہتی ہیں موٹی اور پھول کے کپّا ہوئی ہے۔ برعکس نہند نام زنگی کافور۔
بیگم - یہ قہقہہ کس بات پر پڑا تھا غفورن۔
غفورن - حضور وہ نگوڑا افیمی دون کی لے رہا تھا کہ میں نے یہ کیا اور میں نے وہ کیا۔ نواب صاحب نے پوچھا۔ کیوں آزاد صاحب یہ سچ کہتا ہے۔ انھوں نے کہا یہ وہاں تھے کہاں۔ اس شہر کے قلعے کی صورت تک دیکھی نہیں۔ یوں ڈینگ ہانکنا اور بات ہے بس خوجی تو دانت پیس کر رہ گئے اور ادھر سب کے سب ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ گئے۔
بیگم - آزاد ویسے ہی ہیں یا کچھ جھٹک گئے۔
غفورن: وہ تو اور بھی سرخ و سفید ہو کے آئے ہیں۔
جہری۔ مگر خوجی کو وہاں کی آب و ہوا بھی راس نہ آئی۔
غفورن۔ حضور لڑائی کے وقت ان کی زمین کا کیا حال ہوتا ہوگا۔
بیگم - اے ہے آدمی کانپتے ہوں گے کہ اب کیا ہوتا ہے بڑے سورما کا کام ہے کہ وہاں قدم جما سکے اللہ بچائے۔
غفورن - آزاد کے دل جگرے کو تو دیکھیے بھئی۔ نام خدا کل کے بچے ہیں مگر دل وہ شیر پایا کہ واہ جی واہ۔
جہری۔ حضور سنتے ہیں دو شیروں سے انھوں نے مقابلہ کیا۔
غفورن۔ کیا کچھ جھوٹ بھی ہے اور دونوں کو مارا۔

بیگم - ہاں۔ افوہ۔ تم نے بھی کوئی شیر دیکھا ہے۔
غفورن - ہاں حضور بہتیرے۔ ایک تو شیرنی دیکھی ہے جو نواب صاحب کے کٹہرے میں بند رہتی تھی۔ اور ایک شیر باغ میں دیکھا تھا۔ اس کے لیے مکان بنا تھا اور بڑی حفاظت رہتی تھی۔ مگر حضور دیکھنے میں تو گھوڑے سے بھی چھوٹا جانور اور جو ذرا بھرے تو انسان کے اوسان خطا ہو جائیں۔ ہاتھی کو ایک تھپیڑ میں زمین دکھاتا ہے۔ ادھر تھپیڑ دیا اُدھر کان پکڑ کر زمین پر بٹھا دیا لتنے بڑے جانور کا ڈوہ کا ڈوہ ہے۔ پتا نہیں لگتا آدمی کس گنتی میں ہے یہ آزاد ہی کی طاقت تھی کہ دو دو شیروں کو مار ڈالا۔ اُف ری جواں مردی۔

خوجی نے دیکھا کہ یار لوگ رنگ نہیں جمنے دیتے سوچے کہ آزاد جب تک نہ آئے تھے تب تک تو خیر بعض بعض لوگ مان بھی لیتے تھے مگر جیسے یہ آئے کوئی سنتا ہی نہیں کہ بک کیا رہا ہے اور لطف یہ ہے کہ میں تو آزاد کی تعریف کرتا ہوں اور یہ ذات شریف میرے ہی دشمن ہوئے جاتے ہیں۔ موقع پا کر آزاد کے قدموں پر ٹوپی رکھ دی اور کہا برسوں تمہارا ساتھ دیا ہے دو دو باتیں سن لو۔

آزاد - فرمائیے فرمائیے آپ تو کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں۔
خوجی۔ اب زمانہ سازی تو رہنے دو۔
آزاد۔ میں آپ کا مطلب سمجھ گیا مگر کہاں تک ضبط کروں۔
خوجی - اس دربار میں میرے ذلیل کرنے سے اگر کچھ پائیے تو اختیار ہے آپ کو۔
آزاد۔ لاحول ولاقوۃ آپ بزرگ ہیں۔
خوجی - (سر پیٹ کر) ہائے افسوس۔ عمر بھر ساتھ دیا جان لڑا دی اور اب اس دربار میں جہاں رزق کا سہارا ہے آپ ہم کو الو بناتے ہیں تاکہ روٹیوں سے جائیں۔
آزاد - بھئی اچھا اب تمہاری سی کہیں گے۔
خوجی مجھے رنگ تو باندھنے دو ذرا
آزاد - آپ رنگ جمائیں بندہ تائید کرے گا۔

خواجہ صاحب کا چہرہ گلنار ہو گیا نہایت ہی بشاش کہ اب گپ کے پل باندھ دوں گا اور جب آزاد کی کمک ہوئی پھر کیا پوچھنا ہے نواب صاحب نے مسکرا کر کہا خوجی بھئی یہ کیا سرگوشی ہو رہی ہے کچھ راز و نیاز کی باتیں ہوئی ہیں۔

خوجی ۔ خداوند ملکی معاملات پر بحث ہو رہی تھی۔
نواب ۔ کیا ملکی معاملات کیسے۔
خوجی ۔ حضور میری رائے ہے کہ اس ملک میں بھی ملک نواز یلینڈ کی طرح نہریں جاری ہونی چاہئیں۔ اور آزاد پاشا کی رائے ہے کہ نہروں کے ذریعے سے آب پاشی تو ممکن ہے مگر آب و ہوا خراب ہے۔
میتا ۔ اخاہ تو یہ کہیے کہ آپ شہر کے اندیشے میں دبلے ہیں۔
خوجی ۔ تم کو کھے یہ باتیں کیا جانو۔ پہلے اتنا تو بتاؤ کہ ایک باٹری میں کتنی توپیں ہوتی ہیں۔ چلے وہاں سے جالینوس کی دم بن کے۔
نواب ۔ ہم دیکھتے ہیں گو سڑی ہے مگر باتیں ٹھکانے کی کرتا ہے۔
آزاد ۔ نواب امور میں تو واقعی ان کو دخل ہے۔
غفور ۔ حضور ان کو بڑی بڑی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔
آزاد ۔ صاحب سفر بھی تو اس قدر دور دراز کا تھا۔ کجا ہندوستان کجا روم۔ خیال تو کیجیے۔ مگر جائے تو کچھ سیکھ جائے۔
خوجی ۔ اور کیا ۔ اور نہ کہ ہم ایسے عالم و فاضل۔
مبیر صاحب ۔ کیوں خواجہ صاحب پہاڑ تو آپ نے کثرت سے دیکھے ہوں گے۔
خوجی ۔ ایک دو ۔ کروڑوں ۔ مگر جو لطف ادن ہے اس سے زیادہ لطف اور کہیں نہیں ہو سکتا۔ بلندی کی یہ کیفیت کہ آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔
نواب ۔ بھلا آسمان وہاں سے کس قدر دور رہ جاتا ہے۔
خوجی ۔ حضور کوئی ایک دن کی راہ ۔ مگر زینہ کجا۔
نواب ۔ اور کیوں صاحب وہاں سے تو بہ خوبی معلوم ہوتا ہوگا کہ مینہ کس جگہ سے آتا ہے۔
خوجی ۔ خداوند پہاڑ کی چوٹی پر میں تھا اور مینہ نیچے برس رہا تھا۔ ایک دفعہ ہی نہیں دیکھا۔ بلکہ صدہا بار ہم اوپر سے دیکھ رہے ہیں کہ نیچے مینہ برستا ہے۔ اور جہاں ہم ہیں وہاں کچھ بھی نہیں۔
نواب ۔ کیوں صاحب یہ سچ ہے عجیب بات ہے بھئی۔
آزاد ۔ جی ہاں پہاڑ کے نیچے بارش ہوتی اور ہم پہاڑ پر سے دیکھ رہے ہیں۔

مسینا - اور یہ جو مشہور ہے کہ بادل تالابوں میں پانی پیتے ہیں۔
خوجی - یہ تم ایسے گوکھوں میں مشہور ہوگا۔
نواب - (مسکراکر) بدلا لینے کا اچھا موقع ملا ہے۔
مسینا - خداوند - تمام زمانے میں مشہور ہے کہ بادل پانی پی پی کے اڑتا ہے تو اس کے پروں سے پانی گرتا ہے۔
نواب - بھئی یہ تجربہ کار لوگ ہیں جو بیان کریں وہ صحیح ہے۔
خوجی - اور خداوند دریا کے مخزن ہم نے دیکھے۔
نواب - (زبان دباکر) مخزن دریا کا مخزن۔
خوجی - ہاں خداوند جہاں سے دریا نکلتا ہے عجب مقام ہوتا ہے۔ دریا ڈینوب کا نام آپ نے سنا ہی ہوگا اتنا بڑا دریا ہے کہ سمندر اس کے مقابلے میں شرما جائے اور مخزن جو جا کے دیکھا تو ہوش اڑ گئے حضور اتنا بڑا دخار دریا اور ایک رئیس کے دیوان خانے کے احاطے سے نکلتا ہے۔
میر صاحب - ایں ہمیں یقین نہیں آتا سب غلط ہے۔
خوجی - یہ لوگ واللہ کنوئیں کے مینڈک ہیں۔
نواب - مکان کے احاطے سے جیسے یہ ہمارے مکان کا احاطہ۔
خوجی - بلکہ اس سے بھی چھوٹا حضور خدا کی خدائی ہے اس میں بندے کو کیا دخل ہے بے چارے کوالے توبہ۔

اور خداوند ہم نے ایک مقام پر دیکھا کہ جس قدر شہر ہے سب لب دریا ہی بسا ہے اور صرف ایک قطار ایک صف - اسی میں دکانیں اسی میں کوٹھیاں - اسی میں محل اور ایوان سب اسی میں اور دریا کے اس پار باغ - امیر اور غریب سب دریا کی روانی سے مزے اٹھاتے ہیں اور سامنے باغ لہلہاتے ہیں اور دوسری سمت جنگل اور رمنا اور خداوند استنبول میں ایک جانور خانہ ہے۔
میر صاحب - تم کو تو دھوکے سے کسی نے اس میں بند نہیں کر دیا۔
خوجی - بس ان جانگلوؤں کو اور کچھ نہیں آتا۔
نواب - اجی تم اپنا مطلب کہو - اس جانور خانے میں کوئی نئی بات تھی۔
خوجی - خداوند ایک تو ہم نے بھینسا دیکھا - بھینسا کیا ہاتھی کا پاٹھا تھا اور رنگ

کے اوپر ایک سینگ یہ ارنا بھینسے سے بڑا ہوتا ہے۔ نہایت قوی ہیکل جانور۔ بڑا گراں ڈیل اور طاقت ور اتفاق سے جس مکان میں بند تھا اس کی سلاخوں میں سے تین سلاخیں ٹوٹ گئیں اور وہ جناب سمٹ سمٹا کر نکلا تو معاذاللہ کا مقام ہے بس کچھ نہ پوچھو۔ ہوش اڑ گئے۔ دو ہزار آدمی گدبد ایک کے اوپر دوسرا اور دس پر سو اس طرح گرے کہ بے ہوش کوئی چار پانچ سو آدمی زخمی ہوئے کسی کا ہاتھ ٹوٹا کسی کا منہ ٹوٹا کسی کا سر پھوٹا۔ اور جو بیس آدمی جان سے گئے۔ جب ہم نے یہ کیفیت دیکھی تو سوچا کہ اگر تم بھی بھاگتے ہو تو بڑی ہنسی ہوگی۔ لوگ کہیں گے کہ یہ کمیدانی کیا کرتے تھے ذرا سے ارنا بھینسے کو دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ گو ہزاروں آدمی بھاگے مگر ان میں اور ہم میں فرق تھا۔ خیر قبلہ ایک مرتبہ چھٹ کے جو جاتا ہوں تو گردن ہاتھ میں آئی۔ بس بائیں ہاتھ سے گردن دبائی اور دبوچ کے بیٹھ گیا۔ پھر لاکھ زور مارے اس نے بہت تڑپا مگر کیا مجال ہم نے نہ دیا۔ میں نے جھنجھوڑ ڈالا۔ ذرا گردن ہلائی۔ اور میں نے دبوچا۔ جتنے آدمی کھڑے دور سے تماشا دیکھ رہے تھے سب دنگ ہو گئے کہ واہ رے پہلوان اور چو طرف سے تعریفیں ہونے لگیں۔

۱۔ آدمی کا ہے کو دیو کا بچہ ہے۔

۲۔ شیر بچہ ہے شیر بچہ کمال کیا ہے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔

۳۔ بھائی پہلوان بے قتل کیے نہ چھوڑنا۔

۴۔ وہ کب چھوڑنے والے ہیں۔ اہو ہو ہو۔ ایک جھنجھوڑی بتا۔

۵۔ اللہ اللہ۔ اتنا سا آدمی اور اس ڈوہ کے ڈوہ کو دبائے ہوئے ہے۔

شاباش شاباش۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

جب میں نے دیکھا کہ حریف کا دم ٹوٹ گیا تو بہ آوازِ بلند پکارا۔

کب اپنے منہ سے عاشق شکوۂ بیداد کرتے ہیں
دہانِ غیر سے ہم مثلِ نے فریاد کرتے ہیں
رقم کرتا ہوں جس دم کاٹ تیری تیغِ ابرو کا
گریباں چاک اپنا جامۂ فولاد کرتے ہیں

بس یہ کہ کر میں نے گردن چھوڑ دی اور کہا بھلا ہٹ تو کیا مجال سٹپٹا کے رہ گیا چاہا کہ اٹھے مگر ہمس تک نہ سکا میری طرف دیکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔ لوگوں نے اس قدر غل مچایا کہ توبہ بھلی وہ شور یا خدا۔

۱۔ ارے او پہلوان کیوں سب کی جان کا خواہاں ہوا ہے۔

۲۔ بھائی جان جہاں اس قدر احسان کیا ہے اتنا اور احسان کرو کہ جس طرح ممکن ہو اس بلا کو کٹہرے ہی میں ڈال دو۔

۳۔ ذرا پسھرے تو ستم برپا کر ڈالے۔

۴۔ اب کی ایسا نہ ہو کہ انکیں میاں کو ہضم کر جائے۔

بس اتنا سننا تھا کہ میں نے ایک تھپیڑ لگایا۔ چوندھیا کے تڑ سے گرا۔

مسیتا۔ اس کے کیا معنی۔ تڑ سے گرا۔ آپ کے خوف کے مارے لیٹا تو تھا ہی پھر لیٹے لیٹے کیوں کر گر پڑا۔

خوجی۔ واہی ہو۔ بس حضور میں نے کان پکڑا تو اس طرح ساتھ ہو جیسے بکری۔ اسی کٹہرے میں پھر بند کر دیا۔

نواب۔ کیوں صاحب سچ ہے روایت۔

آزاد۔ میں اس وقت موجود نہ تھا شاید سچ ہی ہو۔

میر صاحب۔ بس بس قلعی کھل گئی۔ غضب خدا کا جھوٹ بھی تو کتنا کہ گردن دبائی اور ہمسنے نہ دیا۔ اس کفر پر تو جی چاہتا ہے کہ اٹھا کے گدا دوں کہ دس گز زمین میں گڑ جائے۔ نامعقول گینڈے سے تو پیچھے لڑے گا پہلے ہم سے تو ہاتھ ملائیے بڑے پہلوان بنے ہیں۔

خوجی۔ قسم ہے خدا کی جو اب کی زبان سے کوئی کلمہ نکلا تو اتنی قرولیاں بھونکوں گا کہ عمر بھر یاد کرے گا۔ تو اپنے دل میں سمجھا کیا ہے یہ سوکھی ہڈیاں لوہے کی سلاخیں ہیں۔

نواب صاحب نے آزاد سے دریافت کیا کہ گو آپ اس وقت وہاں نہ ہوں مگر یہ تو فرمائیے کہ اتنے بڑے جانور سے انسان ضعیف البیان مقابلہ کر سکتا ہے بھلا۔

آزاد تو خوجی سے وعدہ کر چکے تھے ان کا رنگ پھیکا نہ ہونے دیں

گے۔ انھوں نے کہا نواب صاحب بات یہ ہے کہ بعض آدمیوں کو ملکہ حاصل ہے کہ ادھر جانور کو دیکھا ادھر اس کی گردن پکڑی اور شہ رگ کو اس ترکیب سے دبایا کہ پھر جانور کسی مصرف کا نہ رہے اگر خواجہ صاحب کو بھی یہ ترکیب معلوم ہے اور یہ بات سچ ہے تو استعجاب کا مقام نہیں۔

نواب۔ اب ہم کو یقین آگیا۔

مسیتا۔ ہاں خداوند کیا عجب ہے، ہوا ایسا ہی ہو۔

مصاحب۔ حق ہے یہی بات ہے بھائی جان یہی بات ہے۔

میر صاحب۔ اور جب ایک بات کی لم بھی دریافت ہوگئی تو پھر اس میں انکار کرنا کیا معنی۔

نواب۔ کیوں صاحب جنگ میں تو آپ نے خوب نام پیدا کیا ہے یہ بتائیے کہ آپ کے ہاتھ سے کس قدر آدمیوں کا خون ہوا ہوگا۔

خوجی۔ غلام سے پوچھیے۔ انھوں نے کل ملا کر کم سے کم دو کروڑ آدمیوں کو تہ تیغ کیا ہوگا۔

نواب۔ دو کروڑ۔ شاباش شاباش۔

خوجی۔ جب تو روم اور شام اور توران اور ملتان اور ابی سینا اور جرمنی اور آسٹریلیا اور انگلستان اور فرانس میں ان کا نام ہوا۔

نواب صاحب نے کہا "اُفوہ۔ خوجی کو کتنے ملکوں کے نام یاد ہیں۔

آزاد۔ نواب صاحب اب ان کو وہ خوجی نہ سمجھیے۔

خوجی۔ خداوند میں نے ایک دریا پر خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں وہ کام کیا کہ ساری خدائی عش عش کر گئی۔ صرف تن تنہا میں اور ہزاروں آدمیوں کا مقابلہ کیا۔

نواب۔ لاحول ولاقوۃ سب غلط محض غلط۔

مسیتا۔ حضور تین حصے جھوٹ اور ایک حصہ صحیح۔

میر صاحب۔ ہم تو کہتے ہیں سب ڈینگ ہے۔

رفیق۔ اور نہیں تو کیا۔ یہ مضغہ گوشت بلکہ مشت استخواں اور دعویٰ یہ کہ کروڑں آدمیوں سے مقابلہ کریں۔

آزاد۔ نواب صاحب اس بات کی تو ہم بھی گواہی دیتے ہیں کہ اس جنگ میں میں شریک نہ تھا مگر میں نے اخبار میں ان کی تعریف دیکھی تھی اور وہ اخبار میرے

پاس موجود ہے۔

منشی۔ اخاہ۔ خواجہ بدیع الزماں آپ ہی ہیں میں نے ایک اردو اخبار میں اس اس کا ترجمہ دیکھا تھا۔

نواب۔ تو اب ہم کو یقین آ گیا۔ جب جنرل آزاد صاحب نے کہا اور جب دوسرے صاحب نے گواہی دی تو صحیح ہے۔

آزاد۔ وہ موقع ہی ایسا تھا نہ۔

خوجی۔ یہ موقع ہی ایسا تھا بجا ارشاد ہوا۔

آزاد۔ نہیں نہیں۔ بھئی تم نے تو واقعی کارِ نمایاں کیا مگر موقع ایسا اچھا ملا کہ اگر دس کروڑ بھی ہوتے تو ان کے ہاتھ پانوں پھول جاتے یہ آپ کا کام تھا۔

خوجی۔ ان ہاتھ پانوں پر سب کچھ کیا اور پھر بلوہ نکل آئے اور طرہ یہ کہ ہر مقام پر خوباں مہ جبیں عاشق نزار اور یہاں فراقِ یار۔ ہجر کے صدمے غضب ہیں۔

ہجر میں اس گل کے ہر گل کا گریباں چاک ہے
چشمِ نرگس میں ہے آنسو قطرۂ شبنم نہیں

حضور ہم بھی دوسرے رستم ہندی ہیں۔ واللہ۔

آزاد۔ کچھ اور بھی تم نے بیان کیا یا نہیں خواجہ صاحب۔

خوجی۔ حضور نے قطعی ممانعت کر دی تھی۔

نواب۔ کیا کیا کیا ہم سے کچھ چوری کی بات ہے۔

آزاد۔ پیر و مرشد صف شکن علی شاہ وہاں ملے تھے

نواب۔ (بہ آواز بلند) واہ لو صاحبو سنو۔ ارے میرا صف شکن جنگ کے معرکے میں پہنچا۔

مصاحبین۔ (بہ آواز بلند) جزاک اللہ جزاک اللہ واہ رے صف شکن علی شاہ۔

خوجی۔ خداوند اس ڈانٹ ڈپٹ کا بٹیر بھی کم دیکھا ہوگا۔

نواب۔ دیکھا ہی نہیں کم کیسا۔

مصاحبین۔ حق ہے حق ہے واللہ بہت صحیح ہے۔

نواب۔ ارے میاں غفور ذرا گھر میں اطلاع کر دو کہ صف شکن علی شاہ خیریت ہیں معرکہ دارو گیر میں ان کو لوگ دیکھ آئے ہیں۔

غفور۔ سرکار یہ کس نے کہا یہ خوش خبری کس نے سنائی۔
نواب۔ ہمارے مہربان دوست آزاد پاشا نے۔
غفور ڈیوڑھی پر آیا۔ خدمت گار، دربان، چپراسی۔
خواص سب یہاں نواب کی سادگی پر کھلکھلا کھلا کر ہنس رہے تھے۔
خدمت گار۔ ایسا الو کا پٹھا کبھی کہیں نہ دیکھا ہو گا۔
غفور۔ دیکھتے ہو۔ بڑا پاگل ہے واللہ بڑا پاگل۔

چپراسی۔ ابھی دیکھیے تو کیا کیا حاشیے چڑھائے جائیں گے۔
خواص۔ اس میں کیا شک ہے میاں۔ ابھی جنگ میں شریک کیے جائیں گے غفور نے مہری کو بلایا اور کہا جا کے اندر کہہ دو کہ سرکار نے فرمایا ہے کہ ہمارے صف شکن علی شاہ بہ خیریت ہیں اور روم کی جنگ میں لوگوں نے ان کو دیکھا تھا مہری نے اندر جا کے ہنستے ہنستے کہا۔ سرکار مبارک ہو بڑی خوشی کی خبر غفور کے زبانی سننے میں آئی ہے۔

حضور نے کہلا بھیجا ہے کہ ہمارے صف شکن علی شاہ (مسکرا کر) روم کی لڑائی میں ہیں معتبر لوگوں نے دیکھا ہے بیگم صاحب نے سنتے ہی قہقہہ لگایا۔ اور کہا ان موؤں نے پھر نواب کو انگلیوں پر نچانا شروع کیا۔ جا کے کہہ دو کہ ذری ان کو یہاں بھیج دے کہ بیگم صاحب کھڑے کھڑے بلاتی ہیں۔

نواب صاحب کو اطلاع ہوئی کہا ابھی کوئی دو گھڑی میں حاضر ہوتا ہوں۔
آزاد۔ بسم اللہ آپ تشریف لے جائیے سرکار نے یاد کیا ہے خاکسار کی طرف سے آداب عرض کر دیجیے گا۔

نواب صاحب اٹھے مگر اٹھتے ہی پھر بیٹھ گئے اور کچھ سوچ کر کہا۔ حضرت جانے کو تو میں جاتا ہوں مگر وہ دریافت کریں گی کہ مفصل حالات بیان کرو۔ تو میں کیا کہوں گا کچھ حال تو بیان فرمائیے۔
مسینلر۔ حضور اس میں حال کیا پوچھتے ہیں سرکار جنگ پر کوئی مُنہ تاکنے دل لگی دیکھنے تو جاتا نہیں ہے سوائے اس کے کہ لڑے اور مارے اور مرے۔ بس اور عجب نہیں کہ جنگ کا حال سُن سُن کر دل میں جوش پیدا ہوا ہو۔
نواب۔ بھئی کیا بات کہی ہے۔ بس یہی بات ہے۔

خوجی۔ حق ہے پیر و مرشد اس وقت میتا بیگ کو خوب سوجھی ہے۔

میتا۔ اس وقت کیا معنی ہمیشہ ہی خوب سوجھتی ہے۔

آزاد۔ خواجہ صاحب سے اس کا حال دریافت کیجیے خوب واقف ہیں۔

خوجی۔ ساتھ تو سچ پوچھیے تو میرا ہی ان کا بہت بہت رہا۔ ان کی انگریزی وضع سے بہت چکراتے تھے۔

نواب۔ بھلا کسی مورچے پر گئے تھے یا دور ہی سے دعا دیا کیے۔

خوجی۔ خداوند غلام جو عرض کرے گا کسی کو باور نہ آئے گا۔ اور یہ آپ کے پاجی مصاحب مجھے جھوٹا بنائیں گے اور میں جھلاؤں گا مفت کی ٹھائیں ٹھائیں ہو گی۔

نواب۔ کیا مجال خدا کی قسم اب تم میرے رفیقِ خاص ہوئے تم نے جو تجربہ حاصل کیا ہے بھلا دوسرا تمہارا مقابلہ کر سکتا ہے۔

خوجی۔ یہ حضور کے اقبال کا اثر ہے خداوند۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔ کا نقشہ ہے ارذلِ خلائق ہیچ مداں نالائق ردِ خلایق مردود مطرود نامعقول ہوں۔

میں کیا کہوں کہ کون ہوں سودا بقول درد
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

حضور بات یہ ہوئی کہ غلام لبِ چشمۂ سار ایک پیالی میں آہستہ آہستہ افیم گھول رہا تھا کہ بس درخت کی طرف نظر کرتا ہوں تو نور کا عالم یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے یا خدا یہ کیا اسرار ہے غور کر کے دیکھا تو روشنی۔ پہلے تو میں سمجھا چنار کا درخت ہے مگر دم کے دم میں ہمارے حضور صف شکن پھرے آن کر ہاتھ پر بیٹھ گئے۔

نواب۔ شکر خدا ہزار شکر خدا۔ بڑے خوش ہوئے ہو گے۔

خوجی۔ حضور جیسے کروڑوں روپیہ مل گیا۔ دنیا بھر کی اقلیم کے مالک بن بیٹھے حضور کا حال بیان کیا۔ یہاں کا ذکر چھیڑا۔ سرکار کی بے قراری اور فراق میں نصیب دشمناں گریہ وزاری کا حال کہا۔ بس حضور پھر تو یہ کیفیت تھی کہ کسی لڑائی میں غنیم جم ہی سکے۔ جنگ ہوئی اور روسیوں نے توپوں پر بتی لگائی اور ادھر میرے شیر نے کیل ٹھونک دی۔

نواب۔ ایں! اہا اہا اہا واللہ اے میرے صف شکن علی شاہ۔
سیتنا۔ خداوند جانور کیا جادو ہے سحر ہے پرکالۂ آتش ہے۔
خوجی۔ بھلا اس کو کوئی بٹیر کہہ سکتا ہے اور جانور آپ خود ہیں۔ ایسا ثقیل اور سخت اور ناملایم لفظ ان کی شان میں آپ استعمال کرتے ہیں نامعقول!
نواب۔ مسیتا بیگ۔ اگر تم کو اچھی طرح رہنا ہے تو رہو ورنہ اپنے گھر کا رستہ لو اس کے کیا معنے آج کو صف شکن کو جانور بتایا۔ کل کو مجھے جانور کہو گے مصاحب کہ آفا ہو۔
مصاحب۔ خداوند بجا ارشاد ہوا۔ یہ نرے پھوہڑ ہیں۔
مسیتا۔ حضور یوں تو مگر۔
غفور۔ اچھا نواب خاموش ہی رہیے صاحب۔ قصور ہوا۔
خوجی۔ نہیں صریح کمالات کا حال سن چکے مگر تب بھی اپنی ہی سی کہے جائیں گے۔ دوسرا اگر اس وقت جانور کہتا تو گلپھڑے چیر کے دھر دیتا مردک کے۔ نہ ہوئی قرولی۔
راوی۔ واہ خواجہ بدیعا۔ واہ۔ اس فن کے تو بادشاہ ہو۔ جس مصاحب کو چاہو بات کی بات میں نکلوا دو۔ کمال حاصل ہے۔

نواب صاحب اب اس وقت خوجی کا جامہ پہنے ہوئے ہیں ایک مسیتا بیگ پر کیا فرض ہے جس کو کہو نکلوا دیں۔ مگر واہ رے صف شکن للہ زی تیری جرات خواجہ صاحب نے ایک جنگ دریائی کا حال یوں بیان کیا۔ خداوند نعمت خشکی میں تو سب کوئی لڑ سکتے ہیں مگر تری میں لڑنا البتہ کارے دارد۔ سو حضور تری کی جنگ میں صف شکن اور بھی سب سے بڑھ کر رہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ چھوٹا سا دریا تھا اس طرف ہم۔ اس طرف غنیم۔ لب دریا مورچہ بندی ہوگئی اور گولیاں چلنے لگیں۔ دھنتا بس خداوند میں گیا دیکھتا ہوں کہ صف شکن موجود۔ آتے ہی دیکھا آؤ نہ تاؤ ایک کنکری لے کر کچھ پڑھ کر اس زور سے پھینکی کہ ایک توپ پھٹ گئی اور ہزار ٹکڑے ہو گئے۔
نواب۔ ایں واہ۔ واہ کیا کہنا ہے۔ مصرع

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

مسیتا۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔ خداوندا۔ غور کا مقام کہ ایک ذرا سی کنکری کا کن کے
دانے برابر اور توپ کے بہتر ٹکڑے کردیے۔

مصاحب۔ کیا پوچھنا ہے اللہ ری کنکری۔

مسیتا۔ کنکری نہیں تھی وہ۔ وہ خدا جانے کیا تھا۔

خوجی۔ ہونھ! کنکری۔ اب سنیے کہ دوسری کنکری جو پڑھ کے پھینکی تو ایک اور
توپ پھٹی اور بہتر ٹکڑے اور کوئی تین چار ہزار آدمی مجروح اور مقتول ہوئے۔

نواب۔ اس کنکری کو ملاحظہ فرمائیے گا۔ کیا بلا کی کنکری ہے۔
ایں واللہ اللہ، دو سو ٹکڑے توپ کے اور چار ہزار روپی مجروح اور مقتول
خدا کی شان ہے۔ واہ رے میرے صف شکن، ہم نے تیری قدر نہ کی۔

خوجی۔ خداوند چودہ توپیں اڑا دی گئیں اور جتنے آدمی بیٹھے تھے سب تر بتر ہو گئے
کچھ پوچھیے نہ حضور آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا ہوا۔ ایک گولہ بھی پڑا ہوتا
تو لوگ سمجھتے کہ شاید اس گولے میں کچھ مصالح ہی ایسا تھا مگر ذرا سی کنکری تو کسی کو معلوم
بھی نہیں ہوئی۔

نواب۔ اور کیوں کر معلوم ہو ماش کے دانے کے برابر کنکری معلوم کیسے ہو مگر بلا
کنکری تھی کہ توپ کو اڑا دیا اور دو ہزار ٹکڑے کر ڈالے اور ہزار ہا آدمیوں
کی جان لی۔ اللہ رے کنکری کے کمال۔ جادو ہے کہ کنکری ہے۔ واہ بھئی
کوئی جا کے ذرا صف شکن کی کابک تو لاؤ۔

اتنے میں پھر مہری نے آن کر کہا حضور بڑا ضروری کام ہے ابھی بلایا
ہے نواب صاحب خوجی کو لے کر زنان خانے چلے۔ خوجی کی آنکھوں میں
زوبری پٹی باندھی گئی نواب صاحب نے ان کو حکم دیا کہ پہلے ڈیوڑھی میں کھڑے
ہو۔ میں بیگم سے دریافت کروں کو بلاؤں۔ جیسے ہی اندر قدم رکھا بیگم صاحب نے
قہقہہ لگایا۔

نواب۔ ایک تم پر کیا فرض ہے سارا زمانہ آج خوش ہے۔

راوی۔ خوب سمجھے (بریں عقل و دانش بباید گریست)

بیگم۔ صف شکن علی شاہ اب کہاں ہیں۔

نواب - واللہ مجھے یہ حال معلوم ہی نہ تھا کہ جنگ و جدل میں بھی برق ہیں میں تو سمجھتا تھا وہ صرف خانہ جنگیوں میں استاد ہے مگر اس نے تو جا کے توپوں میں کیلیں ٹھوک ٹھوک دیں - اللہ اللہ خدا جانے یہ سب سیکھا کس سے ہے -

بیگم - یہ خدا کی دین ہے سیکھنے سے کہیں ایسی باتیں آتی ہیں -

نواب - واللہ سچ کہتی ہو بیگم صاحب سچ ہے - بیماری اس وقت تم سے جی خوش ہو گیا - اے غضب خدا کا - کجا توپ کجا کیل کجا صف شکن خیال تو کرو ، سبحان اللہ سبحان اللہ -

بیگم - اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو صف شکن کو ہزار پردوں میں چھپا کے رکھتی - کبھی ہوا بھی نہ لگنے دیتی - مگر اب تو جو ہوا سو ہوا -

ہاں خوب یاد آیا سنو وہ تو ابھی جیتے جاگتے ہیں اور تم نے ان کا مزار بنوا دیا یہ کیا -

نواب - واللہ خوب یاد دلایا پیش از مرگ واویلا -

بیگم - یہ تو صریح کوسنا ہوا کسی بے چارے کو -

نواب - کوسنے کے علاوہ اس میں اور یہ بھی ہے فجر کو سیر کرتے ہوئے اس طرف آنکلے اور پڑھے لکھے تو ہیں ہی نظر پڑ گئی کہ مزار پر انوار میاں صف شکن علی شاہ تو اس وقت وہ کہیں گے ماشاء اللہ یہ لوگ میری موت کے ہی خواہاں تھے - کیا چھپاک سے قبر بنوائی ہے اس سے بہتر یہی ہے کہ کھدوا ڈالوں ورنہ بڑی کرکری ہوگی -

نواب صاحب نے بیگم صاحب سے کہا ہمارا پرانا رفیق خواجہ بدیع الزماں جس کو ہم لوگ خوجی خوجی کہتے ہیں جنگ کے میدان میں صف شکن سے ملا تھا - اگر اجازت دو تو یہاں بلوا لوں پھر اس کی زبان سے ان کا حال سنو - دیکھو تو کہتا کیا ہے -

بیگم - اوئی جہنم میں جائے موا - اور سنو اس افیمی کو گھر میں بلائیں گے - واہ ہم ایسا حال سننے سے در گزرے -

نواب - سن تو لو - اول تو بوڑھا - پیٹ میں آنت نہ منہ میں دانت - دوسرے معتبر

تیسرے دوہری دوہری پٹی بندھی ہے اچھا ڈیوڑھی سے کہے۔
بیگم ۔ ہاں اس کا مضائقہ نہیں مگر میں ان موئے لنگاروں خوشامد خوروں کے نام سے جلتی ہوں۔ انھیں کی صحبت میں ان دھاڑوں کو پہنچے۔
نواب ۔ ایں ماشاء اللہ۔
بیگم ۔ اچھا بلاؤ۔ میں سنوں تو صف شکن نے کیا کیا سامان کیے۔
مہری نے باہر جا کر خوجی کو بلایا۔ خواجہ صاحب جھلائے ہوئے چھپر کھٹ پر دراز تھے، کہا جا کے کہہ دو اب ہم وہ خوجی نہیں ہیں جو پہلے تھے۔ آنے والے اور جانے والے اور بلانے والے اور بلوانے والے اور بھیجنے والے اور بھجوانے والے سب کو کچھ کہتا ہوں۔ مہری نے جھلا کر داروغہ کو کہا تم کھڑے دیکھتے کیا ہو۔ داروغہ جی اٹھ کے جہنم واصل نہیں کرتے ہو موئے کو۔ داروغہ نے قریب آن کر آہستہ سے کہا خبردار اب ان کی شان میں ایسا کلمہ زبان سے نہ نکالنا۔ ورنہ حضور بد دماغ ہو جائیں گے اب تو جو کچھ ہیں یہی یہ ہیں۔ مہری نے خوشامد کر کے کہا اے خواجہ صاحب سرکار یاد کرتی ہیں اور تم نہیں چلتے اور حضور بھی بلا رہے ہیں۔ لوگوں نے سمجھایا۔ داروغہ نے خوشامد، آزاد نے فہمایش کی بارے بہ ہزار خرابی خواجہ صاحب ڈیوڑھی میں آئے۔
مہری ۔ حضور خواجہ صاحب ڈیوڑھی میں تشریف رکھتے ہیں۔
خوجی ۔ آداب عرض کرتا ہوں۔ سرکار۔ اب کیا پھر مہربانی کی نظر غریب کے حال پر ہوگی ابھی کچھ انعام باقی ہو تو اب مل جائے۔
بیگم ۔ اگر ذرا بھی جھوٹ بولے گا تو تو جانے گا۔ صف شکن کا حال بیان کر مگر سچا سچا۔ ذرا جھوٹ کا نام نہ ہو خبردار۔
خوجی ۔ واہ ری قسمت ہندوستان سے بمبئی گئے وہاں سب کے سب حضور حضور کرتے تھے عورتیں عاشق مرد غلام بمصر میں ہزارہا عورتیں کمر بستہ حاضر ترکی میں کوہ قاف کی پریاں نقد جان دے کر نثار۔ مس روز نامی ایک مہوش ہزار دا بہ ہزاروں دعا دیتی تھی۔

لگا دل اس بت ناآشنا سے عبث ہم پھر گئے اپنے خدا سے

جب کبھی اس کی یاد میں نیند آتی ہے رات بھر عمدہ عمدہ خواب دیکھا

کرتا ہوں اور جو زلف کی یاد میں آنکھ لگی تو پھر کچھ نہ پوچھو۔

خواب میں اِک نور آتا ہے نظر
یاد میں تیری جو سو جاتے ہیں ہم

بیگم ۔اب بتاؤ یہ پکا افیمی ہوا یا نہیں۔ بھلا کہو اس جھنجھٹ سے ہمیں کیا واسطہ مطلب کی ایک بات نہ کہی۔ واہی تباہی بکنے لگا۔

خوجی۔ حضور ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ پہاڑ کے اوپر تو روسی اور نیچے ہماری فوج اور ہم کو معلوم نہیں کہ روسی موجود ہیں ہم نے دامنِ کوہ میں پڑاؤ کا حکم دیا سپاہیوں اور سواروں نے وردیاں اتاریں اور کھانے پینے کی فکریں ہونے لگیں۔ اب سب بے فکری کے ساتھ انتظام کر رہے ہیں۔

اتنے میں حضور ایک سوار نے چونک کر کہا۔ روسی روسی۔ پہاڑ پر روسی ہے۔ بیڑے بھر میں ہلڑ مچ گیا۔ سب کی نظریں پہاڑ کی چوٹی کی طرف۔ دو چار آدمیوں نے کہا بھئی عجب دل لگی باز آدمی ہیں۔ خواہ مخواہ ڈرواتا۔ روسی یہاں کہاں دو دو بار گرد آوری ہو چکی ہے پہاڑ بالکل صاف ہے اور روسی آتے تو کہاں سے آتے کوئی راہ بھی کھلی ہے یا وہ ادھر ادھر سے کود پڑتے۔ پھر سب کے سب اپنے کاموں میں مصروف ہوئے میں ایک ندی کے پاس بیٹھا افیم گھول رہا تھا۔

بیگم۔ دھنس کر اوہ تو گھٹی میں پڑی تھی افیم کہاں چھوٹتی۔

جہری۔ مرتے دم بھی یہ افیم ہی افیم پکارا کریں گے۔ اُف ری لت

مجبوبن۔ حضور ان کو تو میں نے کئی بار سویرے آگ کے ٹھیکرے کے پاس پڑا ہوا دیکھا ہے۔ دست پناہ ایک ہاتھ میں چلم دوسرے ہاتھ میں توا کہیں اور تمباکو کہیں۔

جہری۔ اور باتیں کیسی تول تول کے کرتے ہیں کہ کوئی جانے بڑے مرد ہیں۔

خوجی۔ باتوں میں اور کام میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

بیگم ۔اچھا ہاں ہاں سچ تو ہے تم اپنی کہانی شروع کرو۔

خوجی۔ میں مرے مرے افیم گھول رہا تھا اور افسر اور سوار اور پیادے سب

اپنے اپنے کام میں مصروف تھے کہ پہاڑ سے تالیوں کی آواز آئی۔ ایں یا الٰہی یہ تالیاں کس نے بجائیں۔ سب کے سب پھر غور سے دیکھنے لگے۔ میں پیالی لبوں تک لے ہی گیا تھا کہ اوپر سے روسیوں نے باڑھ ماری۔ کوئی چار سو بندوقیں ایک ہی دفعہ سر ہوئیں اور آدھے آدمی مجروح و مقتول ہوئے۔ مگر واہ رے میں، خدا گواہ ہے پیالی ہاتھ سے نہ چھوٹی۔ اب سنیے کہ فوراً صف شکن علی شاہ موجود وہ میرے ہاتھ پر بیٹھ کر چونچ کو افیم میں تر کیا اور زور سے چونچ کھولی تو دو قطرے پہاڑ تک کی خبر لائے اور پہاڑ جو پھٹا تو ارارا دھوں اور لطف یہ کہ ادھر کا ایک آدمی ضایع نہیں ہوا۔ بس میں نے صف شکن کا منہ چوم لیا۔ بٹیر کیا خدا جانے وہ کون نایاب شے ہے۔

اب ہم کیا دیکھتے ہیں کہ ہزار ہا روسی مرا پڑا ہوا ہے بندوقیں اور بارود اور گولی ور گولا اور سامان و رسد سب تباہ۔ کجا پہاڑ کجا چوٹی۔ کجا دامانِ کوہ۔ ایک قطرۂ آب واللہ اعلم کیا بات تھی کچھ سمجھ میں نہیں آئی اور لطف یہ کہ ان سے جو ہاتھ جوڑ کر دریافت کیا تو مسکرا کر خاموش ہو رہے۔ میں نے پوچھا کہ اگر تم کو کوئی روسی کبھی گرفتار کر لے جائے تو تم کیا کرو۔ ہنس کر برجستہ جواب دیا۔

ہیں سبک دوش، سدا قیدِ الم سے آزاد ۔ کب گرفتارِ قفس مرغِ نظر ہوتا ہے

بیگم ۔ صف شکن باتیں کس زبان میں کرتے ہیں اسی زبان میں نہ۔

خوجی ۔ حضور ایک زبان ہو تو میں عرض کروں۔ اردو، فارسی، عربی، ترکی، انگریزی ولندیزی اور۔

بیگم (قہقہہ لگا کر) انگریزی تو انگریزی مگر ولندیزی میں بھی بول سکتے ہیں۔ یہ کس ملک کی زبان ہے شاید اسی طرف کوئی ملک ہو گا روس کے آس پاس۔

خوجی ۔ اب حضور سے کون کہے۔

نواب ۔ اب یقین آیا کہ اب بھی نہیں یقین آیا۔ اف ری بدگمانی۔

راوی ۔ اب بھی بیگم صاحب کو یقین نہیں آتا تعجب ہے۔

بیگم ۔ چلو بس چپکے بیٹھے رہو۔ خدا گواہ ہے مجھے رنج ہوتا ہے مگر ان حرام خوروں کے پاس بیٹھ بیٹھ کے تمھیں ہو کیا گیا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا بس ہے کہوں یا اللہ۔

نواب۔ ہائے افسوس غضب کا سامنا ہے آخر یہ سب کے سب تم سے جھوٹ کیوں بولیں گے۔ خوجی کو میں کچھ انعام دیتا ہوں یا کوئی جاگیر لکھ دی ہے اس کے نام کہ بیگم صاحب کو جھوٹی کہانی سنایا کرو۔

خوجی۔ حضور غلام چشم دید کہتا ہے۔

ایک روایت اور سنیے اس کا بھی شاید آپ کو یقین نہ آئے۔ میرے سر پر آن کر بیٹھ گئے اور کہا روسیوں کی فوج میں دھنس پڑو۔ ہوش اڑ گئے کہتا ہوں صاحب ہو کہاں میری جان جائے گی آپ کے نزدیک دل لگی ہے۔ وہ سنتے کس کی ہیں کہا چلو تو تم اور آدھی رات اور گھٹا چھائی ہوئی مجبوراً جانا پڑا۔ مگر مجھ سے کہہ دیا تھا کہ خبردار کسی آدمی کو چھونہ جانا۔ ممکن نہیں کوئی فرد بشر تم کو دیکھ سکے چلا۔ اور حضور سر پر جمے بیٹھے ہیں۔ بس جناب والا پہنچے وہ ہزارہا آدمی۔ فوج ہی تھی۔ دل جمع کوئی گاتا ہے۔ کوئی بجاتا ہے کوئی سوتا ہے۔ کوئی منہ ہاتھ دھوتا ہے مگر ہم سب کو دیکھتے ہیں ہمیں کوئی نہیں دیکھتا۔ بس صف شکن شاہ اصطبل کی طرف لے چلے اور پھدک کے ایک گھوڑے کے گردن پر بیٹھنے لگے جس پر بیٹھے دھم سے گرا بس پر بیٹھے نرہ سے زمین پر لوٹنے لگا۔ میں نے کہا آپ تو میرے سر پر ہیں نہیں۔ اگر کوئی دیکھ لے تو میں کیا کروں میں تو بے موت مرا۔ کہا خاموش رہو نہ بولو۔ حضور باور کیجیے سات ہزار گھوڑے اسی دم دھم دھم کر کے لوٹ گئے۔ واہ ری صفائی اور کمال۔

کیا مری طبع کی روانی ہے — اس کی رفتار کے جو لکھے وصف
گو یہی اپنی بے زبانی ہے — سر کٹائیں گے شمع ساں افسوس

پس پھر آن کے بیٹھے اور چپ چاپ چلے آئے ایک مقام پر کسی روسی کو میری چاپ معلوم ہوئی۔ کہا کون۔ ہم نے جواب نہیں دیا۔ صف شکن نے آہستہ سے کہا جواب نہ دینا۔ تھوڑی دیر کے بعد کہا۔ پیچھے سے جا کے۔ ایک دھپ جمادو دھپ پڑتے ہی ہوش اڑ گئے کون ہے ادھر دیکھا کون ہے بھئی ادھر دیکھا کون ہے بھئی۔ تب تو چکرایا اور مجھے زعم اور ایک دھپ دی۔

جب وہاں سے دور پہنچ گئے تو بڑی ہنسی ہوئی اور باہم ہم سے اور

شاہ صاحب سے باتیں ہونے لگیں۔ بڑے لطف کے آدمی ہیں۔
شاہ صاحب۔ کہو آج کی دل لگی دیکھی۔ کتنے سوار بیکار ہوئے۔
ہم ۔ حضور پورے سات ہزار ایک کم نہ ایک زیادہ۔
شاہ ۔ اور با این ہمہ کہ آج کل سفر کی سختی سے بہت ضعیف ہوں۔
ناتوانی نے بنایا طایر نگہت مجھے   صید وہ ہوں جس پہ صیادوں کا کبھی قابو نہیں
ہم ۔ خداوند آپ کا پایاں قدم لینے کو جی چاہتا ہے۔
شاہ ۔ خاموش رہو۔ تم سیر دیکھنے جاؤ اور کچھ کہو سنو نہیں۔ چلتے چلتے جب تھک جاؤ ہم سے کہہ دو۔
ہم ۔ واہ آپ سے کیوں کہہ دوں۔ آپ کیا کریں گے بھلا۔
شاہ ۔ بھئی مطلب یہ کہ اگر تھک جاؤ تو ہم اتر جائیں جس میں کم تھکو
ہم ۔ (قہقہہ لگا کر) مٹھی بھر کے آپ اور دعویٰ یہ کہ اس بوجھ سے ہم تھک جائیں گے۔ شانِ خدا آپ کیا اور آپ کا بوجھ کیا۔
بس اتنا میرا کہنا تھا کہ خدا جانے اور کیا جادو کیا سحر کیا افسوں پڑھ کر پھونکا کہ میرا قدم اٹھنا محال ہو گیا اب قدم اٹھاتا ہوں تو چلنا دوبھر۔ یا الٰہی کیا کیا جائے کہا حضور اب تو بہت ہی تھک گیا ایک قدم چلنا محال ہے فوراً مجھ پر سے اتر گئے تو یہ معلوم ہوا کہ جیسے دس بیس کہ درمن بوجھ تھا وہ اتر گیا۔
شاہ ۔ کہو بڑے بول کا سر نیچا۔
ہم ۔ ہاں صاحب بڑے بول کا سر نیچا۔ ہزاروں میں کہیں۔
نواب ۔ واللہ مجھے اس قدر باتیں نہیں معلوم تھیں۔ یہ تو نئی نئی باتیں معلوم ہوتی جاتی ہیں واہ رے صف شکن۔
خوجی ۔ غلام نے عرض کیا نہ کہ
ذاتِ او عقل مجسم آمد   رائے او صایب و محکم آمد
نواب ۔ واللہ تو کرامات کے درجے کا ہے۔
خوجی ۔ حضور خدا جانے کس بھیس میں ہے اب سنیے صاحب ایک مندر میں گیا وہاں بھی ملا تھا درخت کی شاخ پران کو دیکھ کر سجدہ کیا جس طرح بتوں کے

سامنے سجدہ کرتا ہے میں نے کہا واہ اب تو جانوروں کا سجدہ کرنے لگے تم۔ کہا جانور تم خود ہو۔ اس کو جو جانور کہے وہ آپ جانور ہے یہ خدا جانے کون ہے تم اندھے ہو کیا جانے ان کی عظمت کا حال کوئی ہم سے پوچھے۔

نواب۔ اللہ اللہ یعنی فقرا تک ان کی عظمت کے قائل ہیں۔

خوجی۔ بس حضور ایک مرتبہ ہی چلتے چلتے چونچ سے مجھے اٹھالیا۔

نواب۔ ایں ارے میاں صف شکن نے میرے صف شکن نے۔ شاباش۔ شاباش واہ رے صف شکن واہ۔ اہو ہو ہو۔

خوجی۔ خداوند میں دھک سے رہ گیا۔ اور اس دن سے پھر تم کا لفظ میں نے استعمال نہیں کیا۔ حضور کے تصدق جو کچھ غلام نے دیکھ ڈالا کسی نے کا ہے کو دیکھا ہوگا۔ عورتیں دیکھیں پریاں۔

بیگم۔ گھر کی پٹکی اور باسی ساگ۔ پریاں نہیں وہ دیکھیں۔

خوجی۔ حضور خیر۔

نواب۔ ذرا سنبھلے ہوئے خوجی ورنہ بگڑ ہی جائے گا۔

خوجی۔ کیا مجال غلام کی۔ کیا طاقت خادم کی مگر حضور ہم کو جو کوئی جھوٹا کہتا ہے تو ہم جل کر خاک ہو جاتے ہیں۔

بیگم صاحب کو نواب صاحب کی تقریر اور سادگی اور خوجی کی بے سروپا کہانی سے نفرت ہوگئی۔ اس وقت تو کچھ نہ کہا بلکہ عمداً اور قصداً صف شکن کی تعریف کی مگر ٹھان لی کہ آج شب کو تخلیے میں آڑے ہاتھوں لوں گی۔ نواب صاحب خوش خوش باہر آئے خوجی سے کہا شاباش واللہ تم نے ایسا سماں باندھ دیا کہ اب بیگم صاحب کو عمر بھر شک نہ ہوگا۔ اور صف شکن کی باتیں یاد کر کر کے عش عش کریں گے۔

آزاد پاشا کی توصیف اور حسن آرا کی آتش شوق

حسن آرا کے دل کی عجب کیفیت تھی ہمجولیاں آن کر مبارک باد دیتی تھیں۔ مغلانیاں کھلائیاں بلائیں لے کر کہتی تھیں۔ اللہ وہ شبھ گھڑی نیک ساعت جلد دکھائے کہ آزاد پاشا سہرا لٹکائے گھوڑے پر سوار دروازے پر کھڑے ہوں۔ خوشی کے

شادیانے بجیں، محفلیں سجیں۔ حسن آرا دل ہی دل میں خوش کہ اللہ نے چاہا تو اسی مہینے میں شاہدِ آرزو سے ہم آغوش ہوں۔ پہلے دو، ہی تین اخبار ملاحظۂ انور سے گزرتے تھے اب اخباروں کی ڈاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اور کوئی دن خالی نہیں جاتا تھا کہ آزاد کی نسبت کوئی خبر یا تعریف یا مضمون اخبار میں نظر سے نہ گزرے۔

اب سنیے کہ اِدھر تو نازک ادا اور بہار النسا باتیں کرنے لگیں۔ اِدھر حسن آرا نے چپکے سے اخبار کھولا اور پڑھنے لگیں۔ جب روح افزا کی نظر پڑی تو اس نے قہقہہ لگایا۔ اور اسی کے ساتھ اور سب نے قہقہہ لگایا تو حسن آرا شرما گئیں۔

نازک۔ یہ بے تابی ہے اللہ ری بے تابیِ دل۔ اونہ ہونہ۔

روح۔ اللہ رے شوق۔ اف ری جلد بازی کچھ ٹھکانا ہے۔

گیتی۔ پھر جس کا دل جس پر آتا ہے اس کا تو یہی حال ہوتا ہے یہ تو بنی بنائی بات اس میں کہنا سننا کیا۔

حسن۔ میں خدا جانے کیا پڑھتی تھی۔

نازک۔ خدا جانے یا ہم جانیں۔ خدا سبھی کچھ جانتا ہے۔

حسن۔ ہمارے خلاف جو کہے گا وہ خود ہی ہنسا جائے گا۔

ہم تو صاف دل، پاک دامن پاک باز، پاک باطن ہیں، ہم سے کوئی لڑ کے کیا کرے گا۔ تم ایک نہیں ہزار کہو ہم کو شرمانے سے کیا واسطہ۔

نازک۔ اے ہے یہ تو ہنسی ہنسی میں رو دیں۔

بہار۔ ہاں اس وقت کچھ مزاج درہم برہم ہے۔

حسن۔ بار بار چھیڑنے کی کیا ضرورت ہے ان کا قاعدہ ہے کہ ہر کسی کو خواہی نہ خواہی چھیڑتی ہیں اور جو کوئی بولے تو ڈھیٹ کہلائے۔ نہ بولے تو بے وقوف بنے لوگ ہنسیں۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔

نازک۔ اس پر تو غالب نے خوب کہا ہے۔

ہے بس کہ کلام میرا مشکل اے دل ۔۔۔ سن سن اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش ۔۔۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

یہ غالب کی رباعی ہے سمجھیں۔ حسن آرا بیگم دہنس کر، خفا اس سبب سے ہوئیں کہ ان کے پڑھنے اور مطالعے میں کیوں ہرج ہوا۔ نہ روح افزا ٹوکتیں نہ کوئی ٹوکتا

نہ ان کا ہرج ہوتا مگر مجھے مفت میں کیوں مطعون کرتی ہو۔ کہے کون خفا مجھ سے ہوتی، الٹی گنگا بہاتی ہو۔ لے واہ بہن واہ۔

بڑی دیر تک سب ہمجولیاں تصویریں دیکھا کیں اور جب ترجمے میں یہ فقرہ نظر سے گزرا کہ آخر کار آزاد پاشا نے بہ آوازِ بلند حسن آرا کا نام لے کر جان پر کھیل کر سر ہی کے ہاتھ لگائے اور روسی لفٹننٹ نے اپنی معشوقۂ مطلوبہ مس کلیبر سا کو یاد کر کے تلوار کے جواب میں اُدھر سے چوٹ کی مگر آزاد کا ہاتھ بھرپور پڑا۔ اور روسی لفٹننٹ کا سر تن سے جُدا ہو گیا۔

حسن۔ (افسوس کر کے) ہائے ہائے یہ بُری سنائی۔

مغلانی۔ پھر یہ تو ہئی ہے جنگ دو سر دارد۔

بہار۔ اس میم کے دل پر سانپ لوٹنے لگے ہوں گے۔

گیتی۔ اس تصویر میں نہیں معلوم ہوتا کہ کہاں پر ہے۔

مغلانی۔ (غور کر کے) اخاہ میں جانتی ہوں یہ ہوں گے۔

آزاد کے سامنے اس طرف یہ لاش جو پڑی ہے یہی ہے۔

حسن۔ ہاں یہی ہو گی یہ دھڑ ہے بے چارے کا یہ سر ہے۔

نازک۔ اس میم کو چاہیے تھا کہ اپنے ہاتھ سے دفناتی اگر بے مروت عورت ہے تو اس وقت کسی اور کے بغل میں ہو گی اور اگر باوفا ہے اور عشق سچا تھا تو اس کی قبر کو اپنا میاں سمجھے گی۔

گیتی۔ (غور سے دیکھ کر) کیوں بہن جب اس میم نے اپنے عاشق زار کی لاش اس تصویر میں دیکھی ہو گی تو ہے ہے کیا جانے دل کا کیا حال ہو گا۔

بہار۔ اب اس خیال کو دل سے بھلا دو رنج ہوتا ہے۔

نازک۔ جب ہم تم کو سننے سے رنج ہوتا ہے تو جس بے چاری پر گزری ہے اس کے دل کا کیا حال ہوتا ہو گا۔ اللہ سب مصیبتوں سے بچائے۔

فصلِ خزاں میں گل کا تو آنا محال ہے ۔۔۔ بجلی ہی کاش آئے مرے آشیاں تلک

اتنے میں ایک مہری نے آن کر عرض کیا۔ سرکار پڑوس میں نواب صاحب کے ہاں پادری صاحب کی میم آئی ہیں وہ جو لڑکیوں کو پڑھاتی ہیں اور کبھی پرچہ کرا آتی ہیں۔ اگر حکم ہو تو ان کو بلا لیں وہ سب پڑھ کر فر فر سنا دیں گی۔ بہار النسا

اور نازک ادا کہ چہری کی صلاح پسند آئی فوراً حکم دیا کہ جا کے اپنے ساتھ ہی لے آؤ۔ خوب تدبیر بتائی۔ چہری نے جا کے نواب صاحب کے ہاں بیگم صاحب سے عرض کیا۔ انھوں نے مس پری سے کہا مس پری وہاں سے رخصت ہو کر چہری کے ساتھ یہاں آئیں۔ بیگمات نے ازسرتاپا نظر ڈالی۔ تپاک کے ساتھ کرسی پر بٹھایا۔ اٹھارہ انیس برس کا سن سرخ و سفید اور ٹمکینی لیے ہوئے گیسو عنبر بو شب رنگ آنکھیں رسیلی۔ بوٹا سا قد لباس صاف اور خوش نما باہم یوں مکالمہ ہونے لگا۔

بہار۔ بڑی تکلیف ہوئی میم صاحب! آپ اردو سمجھتی ہیں۔

آیا۔ حضور مس بابا فارسی پڑھ لیتی ہیں اور اردو خوب بولتی ہیں اردو میں تو مس بابا نے امتحان ہی دیا ہے اور انعام پایا تھا۔

مس۔ ہم اردو بولتے ہیں۔ اور ہم اسی ملک میں پیدا ہوئے کلکتہ میں ہمارا ماں باپ تھا دونوں وہیں مر گیا۔

بہار۔ ذری اس اخبار کا مطلب تو سمجھاتی جائیے۔

گیتی۔ جہاں آزاد پاشا کا ذکر ہو وہ مقام سنائیے گا۔

مس۔ ول آپ لوگ آزاد پاشا کو جانتا ہے گا۔

گیتی۔ جی ہاں، ہم خوب جانتے ہیں اور وہ عنقریب آنے والا ہے کیا آپ آزاد پاشا کو جانتی ہیں۔

مس۔ ول۔ ہندوستان میں تو بیگم صاحب ایسا کوئی نہیں ہے جو ان کو نہ جانتا ہو۔ جو کام انھوں نے کیا وہ اتنی بڑی جنگ میں کسی سے نہیں ہوا۔ بڑا جان باز آدمی ہے۔ اس نے نام کیا ہے پیدا۔ بڑی بڑی جنگ میں اس نے کمانڈ کیا۔ جو افسر کا درجہ کرنل سے چھوٹا وہ کمانڈ نہیں لے سکتا ہاں میجر لے سکتا اور یہ فقط ایک لفٹنٹ ہی تھا اور بیس جگہ کمانڈ لیا اور جس جنگ میں گیا نام کیا۔ لیڈی لوگ آزاد کا تصویر بڑے شوق سے خریدتا۔ فرانس میں آزاد کا بڑا بڑا تصویر بھی اتنے دام کو بکا کہ ہندوستان کے ایک سو روپے کے برابر۔ جو تصویر بڑے آدمی کی لیڈی لوگ نے بنوایا وہ بڑے دام کا ہے اور مس لوگ جن کا شادی نہیں ہوا وہ دو چار ہم سے کہتا تھا کہ آزاد آئے تو اس کے ساتھ شادی کا ڈھنگ ڈالے اور بڑے بڑے افسروں کی لڑکیوں کو دل سے لگی ہے کہ آزاد کے ساتھ شادی ہو۔ کوئی لیڈی اس اسٹیشن میں ایسی نہیں جو آزاد

کے نام سے واقف نہ ہو یا جس نے آزاد کی تصویر نہ دیکھی ہو۔
بہار۔ آزاد کی شادی کسی اور کے ساتھ کیوں کر ہو سکتی ہے۔
مِس ۔ ہاں بے شک۔ وہ تو ایک بیگم سے اقرار کر گئے تھے اب اگر اور کسی کے ساتھ شادی ہو تو بدنامی کی صورت ہے یا نہیں۔ ہم نے تو سب سے کہہ دیا کہ یہ بات مشکل ہے
بہار۔ اور یہ تو سب میں مشہور ہو گیا ہوگا۔
مِس ۔ بے شک (حسن آرا کی طرف) یہ کون ہیں آپ کی۔
بہار۔ یہ ہماری چھوٹی بہن ہیں ان کی شادی ابھی نہیں ہوئی ہے۔
مِس ۔ ہم نے اس طرح کی خوب صورت ہندوستان کی بیبیوں میں کوئی صورت آج تلک نہیں دیکھی بہت اچھی شکل اور رنگ ایسا کہ صاحب لوگوں کی میموں کا کم ہوگا اگر جو آپ ان کو انگریزی کپڑے پہنائیے تو اس اسٹیشن میں شاید دو ہی ایک ایسا ہو میم جو برابری کرے۔
بہار۔ حسن آرا بیگم۔ مس صاحب نے تو تمہاری بڑی تعریف کی۔
مِس ۔ ویل کیا حسن آرا بیگم۔ اسی نام کی ایک بیگم نے تو آزاد کو وہاں بھیجا ہے آپ اس کو جانتی ہیں کوئی۔
نازک۔ وہ بیگم صاحب یہی پرکالۂ آتش ہیں حسن آرا بیگم۔
مِس ۔ اوہ ہم بہت خوش ہیں کہ ہم نے آپ کو دیکھا بیگم صاحب۔
حسن۔ آپ کی عنایت میں تو اپنے کو اس قابل نہیں سمجھتی ہوں۔ تعریف کے لائق آزاد پاشا البتہ ہیں جنھوں نے ایسے ایسے کارنمایاں کیے کہ تمام دنیا ان کی مدح ہے۔
نازک۔ لے اب یاد رکھنا۔ آزاد کا نام لیا اور تعریف کی۔
مِس ۔ ول اس میں کون ڈر ہے یا حیا کا بات کون ہے۔

میاں آزاد داخل شہرِ معشوقہ پری زاد ہوئے

آزاد فرخ نہاد مع ان دونوں مہوشانِ پری زاد کے اس شہر مینو سواد رشک بہشتِ شداد میں شام کے وقت داخل ہوئے جہاں شاہد نازک بدن سیم تن گل گوں قبا حسن آرا بیگم کا پری خانہ عشرت کا شانہ تھا۔ معشوقہ شگفتہ رو، کبیر سا اور ناظورہ مشکیں بو

مس میڈا کو لے کر ہوٹل میں فروکش ہوئے وہ شب ان کے نزدیک غیرتِ شبِ قدر اور رشکِ لیلۃ البدر تھی۔

بات بات پر آزاد کی باچھیں کھلی جاتی تھیں مسرتِ دل کی کیفیت کے اظہار میں زبانِ قلم لال ہے نشاط و انبساط کی گرمیِ بازار کا بیان محال ہے دماغ کنگرۂ عرش پر تھا اللہ اللہ آج خدا نے وہ دن دکھایا کہ بعد قطع منازل منزلِ مقصود پر پہنچے۔ ہند سے اقصائے روس اور مرزبوم روم سے مع الخیر ہندوستان واپس آئے۔ مدت کے بعد جنابِ باری نے شاہدِ آرزو کی صورت دکھائی اور مُنہ مانگی مراد پائی۔ کجا روم کجا ہندوستان کجا رن کی زمین اور جنگ کا میدان کجا حسن آرا کا صنم خانۂ تازہ کن مشامِ جاں۔ سرور بخش روحِ رواں اور ان بتانِ سیمیں ساق یگانۂ آفاق کی میٹھی میٹھی باتیں اور دل ربائی کی خداداد گھاتیں سمندِ طرب پر مہمیز کا کام کرتی تھیں۔ دونوں سیم آب طبع خاتونیں ان کی سچی محبت کا دم بھرتی تھیں۔ کلیرسا کے گیسوئے غالیہ بار سے نسترن و نسترن کی خوش بو آتی تھی۔ تو میڈا کی زلف عنبر بیز سوری و سمن کو شرماتی تھی۔ یہ سرمست خوبی محو ناز وہ نرگسی چشم سراپا انداز یہ گل رخ سیم بر وہ غنچہ دہن حور پیکر۔

ان دونوں نے وفورِ محبت سے آزاد کو چھیڑنا شروع کیا۔

کلیرسا۔ آج بھلا آزاد پاشا کے دماغ کا ہے کو ملیں گے آج تو فلک الافلاک پر دماغ ہوں گے اور کیوں نہ ہو ایک بتِ مہ جبیں ناز آفریں بلائے جان عاشق حزیں سے ہم آغوش ہونے کی اُمید ہے۔

میڈا۔ دیکھتی نہیں ہو بہن۔ کیسی باچھیں کھلی جاتی ہیں بات کی نہیں اور باچھیں کھل گئیں۔ اور بات بھی ایسی ہی ہے ایسا یوسف لقا گلگوں قبا جوان رعنا کبھی ایسی ویسی کو پیار کیوں کرے گا جو دوشیزہ عربدہ کرور دو کرور میں انتخاب ہو اور جس کا حسن لاجواب ہو اس کا چاہنے والا بھی ایسا ہی شیر مرد جوان خوب رو ہونا چاہیے۔

حسن آرا کے حسن گلو سوز و نور عالم افروز کی ادنیٰ تعریف ہے کہ ان سے صنم فریب نوجوان ان پر اس قدر ریجھے کہ جاں بکف معرکۂ دار و گیر میں گئے۔

کلیرسا۔ اس میں تو شک نہیں بہن کروروں میں فرد ہوگی۔

میڈا۔ اس وقت مارے خوشی کے بات کرنا بھی ان کو دوبھر ہے بس یہی جی چاہتا ہوگا کہ ابھی دم اس پری جمم کو زیب آغوش کریں اور یہ شوق و انتظار اور بھی ستم ڈھاتا ہے

اور آتشِ عشق کو بھڑکاتا ہے۔

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک　　آتشِ شوق تیز تر گردد

آزاد ۔ عجب ضغطے میں جان ہے آخر یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ اس وقت کمال مسرت ہے بولوں تو ہنسا جاؤں نہ بولوں تو آوازے کسے جائیں۔

کلیسریا۔ آپ ہی کہیے گا کیا اس میں کچھ جھوٹ بھی ہے کہ آج جو خوشی ہمیں ہے دنیا میں کسی کو کم ہوگی جس معشوق کی خاطر سے خدائی بھر کی خاک چھانی اتنی سختیاں جھیلیں جان کو ہتھیلی پر رکھ کر ہنگامۂ رستخیز میں گئے ۔ آگ میں پھاند پڑے اب اس کے وصل کے مزے لوٹنے کا وقت آیا۔

میڈا ۔ ہم تو ان کے حسن روز افزوں کے تب اور بھی قایل ہو گئے جب پولینڈ کی گل رخسار شہزادی نے ان سے بہ لجاجت وسماجت شادی کی درخواست کی اور طرہ یہ کہ اپنے زعم میں ٹھاٹ پر چڑھا لیا۔ مگر انھوں نے وہاں مطلق قیام نہ کیا۔ ایفائے وعدہ کا خیال ہو تو اتنا ہو۔

آزاد ۔ قولِ مرداں جان دارد۔ وہ انسان کیا جس کو اپنے قول کا خیال نہ ہو۔ اور آزادوں کو سب سے زیادہ ایفائے وعدہ کا خیال رہتا ہے۔ دنیا میں ان کے نزدیک اس سے زیادہ پابندی اور ہو ہی نہیں سکتی۔

گھڑی دو میں مُرلیا باجے گی

گیدیوں کے قبلہ گاہ ۔ پدلوں کے پشت و پناہ۔ گاودیوں کی جان بلکہ روحِ رواں۔ دیوارِ حماقت کے پشتیباں۔ چھٹے پہلوان میاں خواجہ بدیع الزماں صاحب بدیع (آنجہانی) غریق بحر نادانی نہایت حیرانی اور غایت پریشانی سے دل ہی دل میں اس جوانِ رعنا شمائل زیبا خصایل کو بُرا بھلا کہتے اور تیزی کے ساتھ قدم دھرتے۔ ٹھنڈی سانسیں بھرتے شہ گام جانے لگے اور چونکہ ماشاء اللہ ڈنڈپیل جوان اور کامل فن پہلوان تھے یہ کیفیت ہوئی کہ دس قدم چلے اور تیوڑانے لگے اللہ ری طاقت اول تو پستہ قد مانند بھر کا قد۔ دوسرے قطع شریف از بس موزوں ۔ اونٹ کی طرح کوئی کل درست نہیں اس پر طرہ یہ کہ مدت کے بعد ایک چوبی قرولی جو کسی استادِ نجار نے

پیر مرد کو بہ طریق نذر دی تھی زیبِ دست تھی۔ مثل مشہور ہے او چھے کے گھر تیتر باہر رہے کہ بھیتر۔ کبھی دائیں ہاتھ میں لی بازار والوں کی طرف دیکھ کر چمکائی کبھی بائیں ہاتھ میں لی اور اکڑ کے چلنے لگے اب زمین پر قدم ہی نہیں رکھتے۔ دماغ فلک افلاک پر ہے اللہ ری نخوت اور کیوں نہ ہو خدا نے حسن دیا تو گلو سوز۔ نور عطا کیا تو عالم افروز۔ ایک تو گراں ڈیل جوان دوسرے فنِ سپہ گری میں طاق کشتی کے پہلوان بانک پٹے۔ بانے بنوٹ میں مشاق خانہ جنگی میں شہرہ آفاق اور سب صفتوں سے بڑھ کر یہ صفت جناب باری نے عطا کی تھی کہ میدانِ جنگ میں بھاگتوں کے مقدمۃ الجیش سپہ سالار نام دار بنتے تھے کوئی اور بھاگے یا نہ بھاگے یہ سب سے پہلے میدان چھوڑنے کی فکر کرتے تھے اللہ ری بہادری۔ بازار میں اس عجیب الخلقت پر جس کی نظر پڑتی بے اختیار ہنس دیتا تھا کہ واہ۔ ماشاء اللہ کیا قطع ہے اور اس بونے پن پر اکڑنا اور اینڈنا اور تن تن کر چلنا اور شہ گام جانا اور مصنوعی قرولی سے بھیڑ کو ہٹانا اور بھی لطف دیتا تھا۔ فقرہ باز آپ جانیے زمانے بھر کے بے فکرے ان کو شگوفہ ہاتھ آیا جس گلی کوچے کی طرف سے خوجی نکل جاتے تھے لوگ انگلیاں اٹھاتے تھے اور پھبتیوں کے ہرے چلتے جاتے تھے۔

۱۔ ذری سنبھلے ہوئے حضرت دیکھیے کہیں ٹھوکر نہ لگے۔

۲۔ آدمی کیا پیگو کا ٹانگھن ہے۔

۳۔ ہم کو تو چنڈول معلوم ہوتا ہے۔ (قہقہہ لگا کر)

۴۔ کل جگ کے باون اوتار کی زیارت میں سے ہے۔

۵۔ اکڑتے تو بہت جاتے ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی چپت دے قرولی وِرولی کو چھین لے۔

۶۔ ہاتھ پاؤں ماشاء اللہ کتنے سڈول ہیں۔

۷۔ ارے میاں چھمن ذری ادھر تو دیکھو۔ یہ بھیڑیے کے بھٹ سے نکالے گئے ہیں سنا ابھی تک آدمی کی بولی نہیں بول سکتے۔ اِدھر اُدھر واہ ہے۔

خواجہ صاحب کے ہاتھ تو بعد مدت قرولی آئی تھی۔ اور برسوں کی دعائے سحری و نیم شبی کے بعد منہ مانگی مراد پائی تھی۔ فرطِ غرور سے کسی ایسے ویسے کی فقرہ بازی اور زباں درازی کا خیال ہی نہ تھا اور کیوں ہوتا۔ اور پیل دماں کہیں مورِ ضعیف

کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

اتفاق سے خوجی کو اس ہوٹل کا خانساماں اثنائے راہ میں ملا جہاں آزاد فروکش ہوئے تھے۔ اس نے ان کی وحشت دیکھ کر ان کو روکا اور کہا۔ خیر باشد۔ اس وقت کہاں لپکے ہوئے جاتے ہو۔ پسینوں میں تر بتر ہانپتے ہوئے۔ خیر تو ہے خواجہ صاحب! خواجہ صاحب نے جواب نہ دیا صدائے برنخاست وہ سوال کرتا ہے بات پوچھتا ہے یہ قرولی دکھاتے ہیں۔

خانساماں۔ آج تو آپ غریبوں سے بات ہی نہیں کرتے۔

خوجی۔ گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔

خانساماں۔ ایں اس وقت تو خواجہ صاحب مزے میں ہیں۔

خوجی۔ (آگے بڑھ کر) گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔

خانساماں تو ایک ہی دن میں ان کی خو بو وحشیانہ گفتگو اور مجنونانہ حرکات سے واقف ہو گیا تھا سمجھ گیا کہ معمولی وحشت ہے۔

خواجہ صاحب قرولی ہاتھ میں لیے اکڑتے جانے لگے اتنے میں ان کے ایک پرانے شفیق ملے۔

شفیق۔ اخاہ کہو بھئی خوجی۔ اچھے تو رہے صاحب۔

خوجی۔ خوجی مرکھپ گئے۔ ہم تو جناب خواجہ بدیعا صاحب ہیں۔

شفیق۔ اللہ ری وحشت۔ روم و روس ہو آئے مگر اس ایک رنگی کے صدقے کہ گینڈا وہی ہے، ہم تو سمجھے تھے کہ آدمی بن کے آئے ہوں گے۔ مگر وضع دار لوگ کہیں وضع کے خلاف کام کرتے ہیں کیا مجال پابندی وضع مقدم ہے۔

خوجی۔ ہر کس و ناکس سے باتیں کرنا ہماری شان سے بعید ہے۔

شفیق۔ بجا ارشاد ہوا۔ حضور کی شان کا کیا کہنا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں جانے سے اور بھی گاؤدی ہو کے آئے ہو۔

خوجی۔ ہونھ۔ گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔

شفیق۔ بہت ہی خاصے۔ اس تھر کنے کے صدقے۔ ولایت جا کے یہ شوق بھی پیدا ہوا! اب اندر سبھا میں نام لکھوائیے۔ پیرانہ سالی کے لیے اچھا شغل تجویز کر کے آئے ہو۔ از برائے خدا آدمی بنو یہ کیا حماقت ہے بات کا جواب دو۔ ولایت کا کچھ حال بیان

کرو۔ سوال از ریسماں جواب از آسماں۔ ہم کہتے ہیں آم۔ آپ کہتے ہیں املی۔ سوال دیگر جواب دیگر۔ چہ خوش چرا نہ باشد۔

خوجی۔ بس گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔

شفیق۔ دماغ میں خلل ہو گیا ہے اور انسان میں حواس ہی حواس تو ہے اور ہے کیا جہاں حواس میں فتور آیا۔ بس بہائم سے بدتر ہو گیا۔ گو آپ کے مزاج میں جنون کی قابلیت پہلے ہی سے تھی۔ مگر وہاں جا کے حضور خراد پر چڑھ گئے۔

خواجہ بدیع الزماں صاحب کو اپنی قرولی پر ناز تھا ہر کس و ناکس کے منہ لگنا خلاف وضع اور کسر شان سمجھے۔ گرتے پڑتے ہوٹل میں داخل ہوئے۔ اور آزاد کو دیکھتے ہی منہ بنا کے سامنے کھڑے ہوئے۔

آزاد۔ ع۔ خیر مقدم چہ خبر یار کجا راہ کدام۔

خوجی۔ (قرولی کو دائیں ہاتھ سے بائیں میں لے کر) ہونھ۔

آزاد۔ کیا۔ خدا خیر کرے۔ ارے میاں گئے تھے وہاں۔

خوجی۔ (قرولی کو بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ میں لا کر) ہونھ۔

آزاد۔ یا الٰہی کچھ منہ سے بھی تو بولو میاں۔

خوجی۔ گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔

آزاد۔ کیا۔ اس کے معنی کیا۔ جنوں ہو گیا ہے کیا؟

خوجی۔ بس گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔

آزاد۔ حسن آرا بیگم کے ہاں گئے تھے کسی سے ملاقات ہوئی کیا رنگ ڈھنگ ہے تم تو مخبوط الحواس معلوم ہوتے ہو۔

خوجی۔ وہاں نہیں گئے تھے تو کیا جہنم میں گئے تھے۔ نہ جانا کیا معنی۔ جائیں اور میخ کھیت جائیں۔ مگر۔

آزاد۔ اگر مگر کو تو رہنے دو۔ صاف صاف بتاؤ۔

خوجی۔ اس سے زیادہ صاف اور کیا ہو گا۔

آزاد۔ بھائی صاحب ہم نہیں سمجھے۔ اور ہمیں الجھن ہوتی ہے خواہ مخواہ کے لیے طبیعت پریشان کرنے سے کیا فائدہ ہوتا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔

خوجی۔ از رقیباں حذر سے کن بابائے من بدیع۔

آزاد - رقیباں کیا۔ (سرخ ہو کر) یہ بکتا کیا ہے۔

خوجی - بکتا نہیں، سچ کہتا ہوں گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔ گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔

آزاد - (جھلا کر) خوجی اگر صاف صاف نہ بیان کرو گے تو اس وقت بری ٹھہرے گی۔ بس اب تم کو اختیار ہے۔

خوجی - اور الٹے مجھی کو ڈپٹتے ہو میں نے کیا بگاڑا۔

آزاد - وہاں کا مفصل حال کیوں نہیں بیان کرتے۔

خوجی - کیا بیان کروں۔ حسن آرا بیگم سے باتیں ہوئیں۔ گھنٹوں آپ کا ذکرِ خیر رہا۔ اور لیں جانب آپ جانتے ہیں ایک لسان آدمی۔ میں نے جو شاعرانہ تقریر کی تو وہ سماں باندھا کہ حسن آرا بیگم اور اُن کی ہمجولیاں آٹھ آٹھ آنسو روئیں اور پھر ایک لطیفہ ایسا کہہ دیا کہ قہقہے پڑنے لگے۔

مس میڈا اور مس کلیریسا اور پولینڈ کی شہزادی اور کردی اور گیلی اور سبز پوش سب کے عشق کا حال بیان کیا اور آپ کی پاک دامنی کا پورا پورا ثبوت دیا پھر تو کیفیت تھی کہ جتنی بیٹھی تھیں دل میں سب کی یہی خواہش تھی کہ آزاد ہمارے میاں ہوں تو بڑا لطف ہو۔

آزاد - یہ کیا واہیات گفتگو ہے پرائی بہو بیٹی کی نسبت ایسی بات زبان سے نکالنا پاجی پن ہے۔

خوجی - اجی ہم تو باتوں سے اشاروں سے تاڑ لیتے ہیں۔

آزاد - اس وحشت کے صدقے۔ یہ گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔ اس کی خبر نہ نکلی۔ عجیب بے تکے ہو واللہ۔

خوجی - سنتے جائیے۔ میں نے آپ کا مفصل حال بیان کیا تو سب کی سب خوش ہوئیں اور کہنے لگیں کہ رجب علی بیگ سرور اور خواجہ امان سے بھی خواجہ بدیع بڑھ گئے ان کی تقریر سے پھول جھڑتے ہیں۔ صورت تو کسی کی میں نے دیکھی نہیں مگر آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ انتہا کی حسینہ و جمیلہ ہیں اور سب شوخ و شنگ چلبلی۔

اس کے بعد خواجہ صاحب نے منہ بنایا۔ اور بہ کمال فصاحت اور بلاغت اس واقعہ کا حال یوں کہہ سنایا۔ (ناقلان نقل الم و حاکیان حکایتِ غم تابوتِ قرطاس

میں بعض مضمون کو یوں رکھتے ہیں کہ اندریں زمانہ یگانہ رنج کاشانہ میں ایک مردِ خدا عارف باللہ شرافت و نجابت دستگاہ۔ مشہور جہاں سحبانِ گیہاں نامی خواجہ بدیع الزماں کہ شاعر اچھا اور منشی بہت اچھا تھا ایک پری کے باغ میں داخل شدا

آزاد نے جو یہ بے تکی ہانک سنی تو ان کو اور بھی الجھن ہوئی کہا از برائے خدا مختصر طور پر کہو معلوم ہے کہ آپ سرور مغفور سے بھی اس فن میں بڑھ گئے مگر نثاری کی لیاقت کے اظہار کا یہ کون موقع ہے۔

خواجہ صاحب نے بگڑ کر کہا یاروں کی تو یہی تقریر مسلسل ہے جس کا جی چاہے سنے خواہ نہ سنے۔ یہ کہہ کر اپنی کہانی کا سلسلہ یوں شروع کیا۔ اس باغِ رشکِ زاغ پر از مینا و زاغ میں ایک چھپیٹی رنگ نرگسی آنکھوں والی متوالی کہ حسن میں یوسف مصری سے خراج لینے والی تھی چماں چماں خراماں نظر آئی۔ دیکھتے ہی میں نے کہا۔ دہائی فریاد رس الہی۔ حسنِ اتفاق سے لونڈوں نے جو مجھے اس گل بدن پاک دامن پر لٹو دیکھا تو تُک بندی کے ساتھ آوازے کسنے اور پھبتیاں کہنے لگے۔

میں۔ اس حسن کے ظلم سے خداوند کریم کی دہائی۔

لونڈے۔ ڈبیا دیا سلائی۔ ڈبیا دیا سلائی۔

میں۔ فریاد رس الہی۔ یا خدا تیری دہائی۔

لونڈے۔ بس بونے پہلوان کی سچ مچ شامت آئی۔

میں۔ جورِ حسن اور تعدی جمال اور جفائے ادا کی دہائی۔

لونڈے۔ بیٹھے بٹھائے بونے کی شامت آئی قضا نے صورت دکھائی۔ ڈبیا دیا سلائی۔

اس تکرار اور طبیعت داری اور غل کی آواز سے وہ خفتہ چار بالش ناز سراپا انداز بیدار ہو گئی۔

آزاد۔ اس بے تکے پن کے قربان کہاں تو چماں چماں خراماں خراں کہا تھا۔ کہاں خواب ناز کا ذکر ہے۔ واہ۔

خوجی۔ کیا عجیب آدمی ہیں۔ آپ بھی۔ چمن میں خرام کر رہی تھی مگر نرگسِ مستِ من بدبجا کو دیکھتے ہی آنکھ لگ گئی۔ خیر اب سنیے کہ اس نسترن بدن کے جلو میں ہزارہا

پریاں کوہ قاف کی تھیں مگر تھوڑی ہی دیر میں ایک نوجوان کٹار بہ کف سامنے آیا اور مجھے للکارا اپنے زعم میں ایں جانب اپنے آپ ہی گر پڑے۔

آزاد۔ (بہت خفا ہوکر) تمھاری انھی پاجی پن کی باتوں پر ہمیں غصہ آتا ہے بس بھلا دل لگی فقرہ بازی اور رنگ بندی کا یہ کون موقع ہے مگر گیے اس سے جو سمجھے

خوجی۔ اجی جناب صاف صاف یہ ہے کہ حسن آرا بیگم کے ایک اور چاہنے والے پیدا ہو گیئے ہیں اور اُن کی زنان خانے تک رسائی ہے۔ باغ میں بندہ بیٹھا تھا اور باغ کے بنگلے میں حسن آرا بیگم اور ان کی بہنیں اور بیگمات اور خواصیں بس ایک نوجوان سامنے سے نمودار ہوا اور مجھے دیکھتے ہی آگ ہوگیا۔

آزاد۔ کوئی خوب صورت آدمی ہے۔ کم سن ہے۔

خوجی۔ نہایت حسین اور ابھی بالکل کم سن ہے بہت ہو تو پندرہ سولہ برس کا سن ہو اس سے زیادہ نہیں ہے۔

آزاد۔ اور ہاتھ پانوں کیسے ہیں ڈنڈ پیل جوان ہے یا دبلا پتلا وہاں کیا کرنے آیا۔

خوجی۔ بہت ہی نازک اندام پتلی کمر اے بالکل ہی بچہ ہے۔ کاہی بھی نہیں حلوان سمجھیے اس نے کہا بھلا آزاد بے چارے کیا ہیں اور کل ہی کو ان سے کھڑے کھڑے سمجھوں گا۔ میری موجودگی میں حسن آرا بیگم پر کوئی نظر ڈالے کیا طاقت یہ کہہ کر دراتا ہوا بنگلے میں چلا گیا جہاں وہ سب بیٹھی ہوئی تھیں۔

آزاد۔ اس میں کچھ بھید ضرور ہے۔ تمھارے الّو بنانے کے لیے شاید دل لگی کی ہو مگر۔ ہمیں اس کا یقین نہیں آتا۔

خوجی۔ یقین تو ہمیں مرتے دم تک نہ آتا۔ مگر وہاں تو قہقہے پڑ رہے تھے۔ اس نوجوان خوب رو کے دیکھتے ہی بنگلے سے قہقہے کی آوازیں آنے لگیں۔ اور جب میں اپنے زعم میں آرہا تھا تو اور بھی قہقہہ پڑا۔ اس سے تو بھائی جان میں بہت کھٹکا کہ کچھ دال میں کالا کالا ضرور ہے ورنہ نامحرم کو دیکھ کر قہقہہ کیسا۔

خواجہ صاحب نے قسم کھا کر اور آزاد کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ آزاد اس سر کی قسم کھا کر کہتا ہوں خدا اور خدا کا رسول گواہ ہے کہ بنگلے سے بیگمات نے قہقہہ لگایا۔ میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اور مجھے یقین واثق ہوگیا کہ اس حسین جوان کی یہاں بڑی قدر و منزلت ہوتی ہے ورنہ غور تو کیجیے بھلا نامحرم کسی شریف زادی

کے زنانے میں بے دھڑک جا سکتا ہے اور ہاں خوب یاد آیا یہ تو کہنا ہی بھول گیا تھا کہ ان کے پیچھے پیچھے ایک نہایت کم سن اور طرح دار نواب زادی تھیں خوب بنی ٹھنی۔ بڑے ٹھسے سے پہلے تو اس نوجوان کو دیکھ کر بہت ہی اچھلی کودیں اور غل مچایا اور مجھے للکارا کہ تم کیسے مردوے ہو کر ان کو منع نہیں کرتے یہ پرائے زنانے میں کہاں گھس آئے ہیں۔ اور پھر ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر زینے پر لے گئیں وہ بھی بنگلے کی چھت پر داخل ہو گئیں اور اس نوجوان کو بھی ساتھ لیتی گئیں۔

آزاد۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بے سر و پا کہانی کے کیا معنی ہیں اگر ایسا ہوتا تو اب تک تمام ہندوستان میں یہ خبر مشہور ہو جاتی مگر خیر۔ انشاء اللہ فہمیدہ خواہد شد۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی۔

خوجی۔ اور اس نے وعدہ کر لیا ہے کہ آج ضرور آؤں گا اور آزاد کو للکاروں گا۔ کہ اس خیالِ خام سے درگزرو۔ ورنہ تیرے حق میں اچھا نہ ہوگا۔

آزاد۔ خیر آنے دیجیے۔ بہت ہی خوش ہو کے جائیں گے۔

خوجی۔ ہوں گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔

آزاد۔ آخاہ۔ یہ گھڑی دو میں مرلیا باجے گی کا یہ مطلب تھا۔ یہ کہیے مگر اب تک ہم کو یہ سب خواب و خیال ہی معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم۔

خوجی۔ بھائی سنو وہ جوان اور جوان کا ہے کو حلوان تو واقعی ایسا حسین ہے کہ مردوں کا خود جی چاہے کہ اس کے لب شکر خاب کا بوسہ لیں نہ کہ عورتیں۔ ہونٹ واللہ یاقوت رنگ۔ رخسارِ تاباں بوسہ فریب آدمی کیا پری ہے واللہ۔

مے خانۂ او بہ بر قرابہ　　دیوانۂ او بہ ہر خرابہ

اور چال و رفتار کا عالم کچھ نہ پوچھیے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ

زاں غمزہ کہ در خرام کردہ
صد زلزلہ فتنہ دام کردہ

اور زلف مسلسل تو خدا کی قسم بس مرغ دل کی گرفتاری کے لیے زنجیر اور دام سے بھی زیادہ تھی۔ سچ کہتا ہوں اس پرشکن و عنبر بار کا بھی کشتہ ہوں۔

شب بھر تمہاری زلفِ مسلسل کی یاد میں

دو سانپ ہیں کہ سینے پہ لہرائے جاتے ہیں

اب ہم سوچے کہ اگر اس کے عشق کا اظہار کرتے ہیں تو آزاد بگڑ جائیں گے۔ کہ واہ اچھے رہے۔ گئے ہماری معشوقہ پری زاد کا حال دریافت کرنے اور وہاں سے خود چرکا کھاکے آئے بیٹھے بٹھائے فضول عشق کے پھندے میں مرغِ دل خوجی پھنسا ہے۔

راوی۔ اس فصاحت کے قربان واہ خواجہ صاحب واہ۔

آزاد۔ خیر سمجھا جائے گا اب تو ہم کھانا کھانے جاتے ہیں۔

یہ کہکر آزاد اور وہ دونوں گل رخانِ پری زاد طعامِ لذیذ نفیس نوشِ جاں کرنے گئے۔ مگر خواجہ صاحب ہوٹل میں کھانا کھانے کے خلاف تھے ان کا قول تھا کہ جب قسطنطنیہ تک میں نے حتی الوسع ان اُمور کا پرہیز کیا اور عین جنگ کی حالت میں کسی ایسے مقام کا پکا ہوا کھانا نہ کھایا تو اپنے شہر اور اپنے ملک میں آن کے دس آدمیوں میں کیوں مطعون ہوں انھوں نے ایک سرا میں جاکر جو ہوٹل کے ملحق تھی بھٹیاری سے کھانا پکوایا۔ ماش کی دال روٹی اور سالن۔ مگر آپکی وحشت کو ملاحظہ فرمائیے کہ بھٹیاری سے بھی بات بات پر بھی بگڑتے جاتے تھے کہ

گھڑی دو میں مرلیا باجے گی

حسن آرا بیگم کی صلاح سے پیر مرد آزاد کے پاس روانہ کیے گئے تاکہ کل اُمور مفصل بیان کرکے ان کی تشفی کریں۔

پیر مرد آصف الدولہ کے وقت کا درباری لباس زیب بدن کرکے ایک پرانے دقیانوسی میانے پر سوار ہوئے اور ہوٹل میں پہنچ کر اطلاع کرائی آزاد نے جو اس رفیقِ قدیم کو جو خاص باعثِ ملاقات اور ذریعہ رسائی تھا دیکھا تو بڑے تپاک سے استقبال کیا اور مصافحہ کرکے برآمدے میں کرسی پر بٹھایا اور قریب کی کرسی پر خود متمکن ہو کر یوں مکالمہ کرنے لگے۔

آزاد۔ گو دل تو گواہی دیتا تھا کہ خدا ہماری محنت ٹھکانے لگائے گا مگر کبھی کبھی ابرِ مایوسی بھی گلشنِ دل پر چھا جاتا تھا۔

پیر مرد۔ بھائی آزاد۔ وہ کام تم نے کیا ہے کہ دوسرے سے نہ ہو سکتا میں نے

اِس وقت تمھیں کیا دیکھا کہ آنکھوں کو نور سے معمور کر دیا۔

آزاد - اخبار تو آپ کے پڑھنے میں آتا ہوگا۔

پیر مرد - برابر تار بندھا ہوا تھا اور مجھ کو تو سب سے زیادہ فکر تھی کیونکہ میں ہی اِن اُمور کا باعث ہوا تھا۔ جب میں نے تم کو دیکھا تھا تو معاً دل میں کھب گئی کہ یہ رعنا شمائل زیبا خصایل جواں حسن آرا کے قابل ہے حضور اب چاہے آپ انکار کریں مگر یہ سب ہماری ذات سے ہوا ہے اگر ہم اس وقت ڈھیل دیتے تو کچھ بھی نہ ہوتا پرندے کے تو پر جلتے تھے انسان کی کون کہے۔ لوگوں نے کیسے کیسے اڑنگے لگائے رخنہ اندازوں نے کیسی کیسی درانداز یاں کیں مگر میرے سبب سے ایک کی بھی دال نہ گلنے پائی۔ آخر کار حسن آرا بیگم تک رسائی ہوئی بجروں پر سوار ہو کر ہوا کھائی سیر رودبار بھائی۔ دونوں کی بن آئی۔ ایک وہ وقت تھا اور ایک یہ وقت ہے ایک مرتبہ یہاں خبر مشہور ہوگئی تھی کہ آزاد نے نصیب اعدا کسی ہیچ قوم عورت کے ساتھ جو کسی ادنیٰ سے آدمی کی جورو تھی شادی کرلی اور یہاں تک گپ اڑی کہ پہلے آزاد نے اس کے میاں کو سنکھیا دے کر مار ڈالا پھر شادی ہوئی اور خرابی یہ کہ یہ خبر ایک اخبار میں درج ہوئی اور وہ اخبار مفسدہ پردازوں اور رخنہ اندازوں نے جو انتہا کے شقی القلب اور ناخدا ترس ہوتے ہیں کسی ترکیب سے حسن آرا بیگم کے نام بھیجا۔ بس اس مضمون پڑھنا تھا کہ آگ ہوگئیں اور زار زار رونا شروع کیا۔ دن کو چین نہ راتوں کو قرار لب پر فغاں و نالہ۔ آنکھیں اشک بار۔ دیوانہ وار کبھی گھر گل زار میں بادلِ زار پھرتی تھی مگر گھر ویرانہ اور باغ خارستان سے بدتر نظر آتا تھا۔ بس اسی روز وفورِ رنج و قلق سے نوبت بہ ایں جا رسید کہ از بس ضعیف ہوگئیں۔ نشست و برخاست کی طاقت نہ رہی اور آخر کار بات کرنا بھی دو بھر ہوگیا۔ کیفیت رفتہ رفتہ ردی ہوتی گئی حتی کہ ڈاکٹروں حکیموں تک کو صحت میں شک ہوگیا اور ایک روز آنکھیں پھیر دیں اور نصیب اعدا اوپر کے دم بھرنے لگیں۔ سرہانے کہرام مچا ہوا تھا۔ میں باہر اپنے کمرے میں دم بخود پڑا سسکیاں بھر رہا تھا کہ یا خدا یہ کیا ہوا۔ گلِ خنداں پر اتنی جلدی اوس پڑ گئی کھلتے ہی مرجھا گیا۔ بادِ سموم نے غنچۂ دل کو پژمردہ اور چراغِ طمانیت کو افسردہ کر دیا۔

آزاد - ارے غضب یہ نوبتیں پہنچیں۔ الٰہی توبہ۔

پیر مرد - اس دن کا حال کچھ نہ پوچھیے بس ناگفتہ بہ ہے۔
آزاد - یہ کس ذات شریف نے کانٹے بوئے تھے۔
پیر مرد - یہ نہ پوچھیے۔ گزشتہ را صلوٰۃ۔
آزاد - اگر ملیں تو بایاں قدم لوں کہ واہ حضرت واہ۔
پیر مرد - خدا خدا کر کے ڈاکٹروں کی سریع الاثر ادویہ سے اس قدر افاقہ ہوا کہ دفعتاً آنکھ کھول دی اور پانی مانگا تو لوگوں کے دلوں میں ڈھارس ہوئی جان میں جان آئی۔
آزاد - ہم سمجھتے تھے کہ ہماری ہی داستان مصائب بے پایاں سے کوٹ کوٹ کے بھری ہے مگر یہ معلوم ہی نہ تھا کہ ادھر رقیبوں اور حاسدوں نے اپنے نزدیک کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا۔
پیر مرد - آخر کار دو ہی چار روز گزرے ہوں گے کہ اس مضمون دروغ بے فروغ کی قلعی کھل گئی۔ اور حسن آرا کو کامل یقین ہو گیا کہ واقعی بالکل بے سر و پا بات تھی۔
آزاد - شکر خدا ہمیں حیرت ہے کہ حسن آرا کو اس بات کا یقین کیوں کر آیا کہ آزاد سے ایسا فعل ناشائشتہ سرزد ہوتا۔
پیر مرد - طبیعت ہی تو ہے دل میں بھی سمائی۔
آزاد - خیر اس کی شکایت ملاقات کے وقت کی جائے گی۔
پیر مرد - وہ آپ کے میاں خوجی کہاں ہیں ان کو بلوائیے وہ تو نقل محفل ہیں واللہ
آزاد - آپ کے یہاں سے جو آئے تو نہایت برہم اب مجھ سے گفتگو نہیں کرتے نہ کسی بات کا جواب دیتے ہیں ہر سوال کے جواب میں یہی کہتے ہیں کہ دگھڑی دو میں مرلیا باجے گی،
پیر مرد - حضرت وہ تو ایسے بنائے گئے کہ توبہ ہی بھلی۔
کم سنی آپ جانیے ہزار شوخیوں کی ایک شوخی اور پھر آپ ہر خط میں میاں خوجی کی تعریف لکھتے ہی تھے حسن آرا بیگم اور سپہر آرا اور روح افزا اور ان کی سب بہنوں اور ہمجولیوں کو دل لگی ہاتھ آئی۔ اوّل تو ماشاء اللہ ان بزرگوار کی قطع ہی ایسی ہے کہ صورت دیکھتے ہی انسان کو بے اختیار ہنسی آئے۔ آدمی کیا زاعفران زار ہے۔

آزاد ۔ حضرت اس نے تو وہ کہانی سنائی کہ میرے ہوش اڑ گئے اگر سچ ہے تو خدا ہی حافظ ہے مگر خوجی کی بات کا جو یقین کرے اس سے بڑھ کر بے وقوف کوئی نہیں۔

پیر مرد۔ آپ تو خود دانا بینا آدمی ہیں آپ کو سکھانا حکمت بہ لقمان آموختن سے کم نہیں۔ ہوا یہ کہ انھوں نے جو بے تکی افیونیوں کی باتیں شروع کر دیں تو وہ سب سمجھیں کہ پرلے سرے کا احمق چرچرا اور گاودی اور مسخرہ ہے پھر کیا اپنا شگوفہ ہاتھ آیا اور حسن آرا کی دو ہمجولیاں بھی اس وقت وہاں موجود تھیں جانی بیگم اور نازک ادا بیگم یہ دونوں کمال شوخ اور چلبلی ہیں ان میں جانی بیگم نے وہ مذاق کیا کہ خوجی کے آئے حواس غائب ہو گئے کیا دیکھتے ہیں کہ ایک نوجوان کٹار ہاتھ میں لیے اکڑتا ہوا چلا آتا ہے اگر خواجہ صاحب کو ذرا بھی عقل ہوتی تو صورت سے بھی بھانپ لیتے کہ عورت ہے یا مرد اور عورت کا قد و قامت چال ڈھال وضع قطع بھلا کہیں چھپی رہتی ہے مگر ان کو عقل سے تو کوئی بحث ہی نہیں۔ دل پر نقش ہو گیا کہ یہ کوئی جوان نازک اندام ہم سے لڑنے کے لیے آتا ہے۔ ان کے پیچھے پیچھے حسن آرا کی بڑی بہن بہار النسا بھی تھیں اب اگر ذرا بھی عقل سے کام لیتے تو سمجھ جاتے کہ سب دھوکا ہی دھوکا ہے مگر یہ سمجھے کہ بہار النسا کی عدم واقفیت میں وہ مرد خوب رو باغ میں گھس آیا ہے۔ لگے غل مچانے۔

آزاد ۔ لاحول ولا قوۃ۔ تو کیا جانی بیگم مرد کا لباس پہن کر آئی تھیں

پیر مرد۔ جی ہاں۔ لیکن صورت سے صاف معلوم ہوتا تھا۔

آزاد ۔ بس اب میرا شک رفع ہو گیا۔ خوجی بھی عجب کمبخت آدمی ہے مجھ سے آن کی بات ہی نہیں کی۔ جو کچھ ہم پوچھتے ہیں اس کے جواب میں یہی کہتا ہے کہ گھڑی دو میں مر لیا با جے گی، آخر کار جب میں نے للکارا تو یہ کہانی کہی کہ حسن آرا بیگم کے ایک اور چاہنے والے پیدا ہو گئے ہیں۔

پیر مرد۔ لاحول ولا قوۃ عجب خبط الحواس آدمی ہے۔

منگنی اور مانجھا

جب سمدھنیں بیٹھیں، تو گلوریاں دی گیئں۔ اور میراثنوں نے خوب دِل کھول کر گالیاں دینی شروع کیں۔

سپہر آرا۔ (روح افزا سے) یہ کیا خراب رسم ہے۔

روح۔ ہاں اس گالی گلوچ سے ہمیں بھی نفرت ہے۔

سپہر آرا۔ اور گالیاں کھا کے پھر انعام دیں گے۔

روح۔ اے ان کو سمجھا دو کہ بس اب نہ واہیات بکیں۔

نازک۔ واہ وا۔ ریت رسم میں کیا دخل ہے۔

روح۔ بس تمھیں ایسوں کے سبب سے تو یہ باتیں ہوئیں۔

نازک۔ میرا بس چلے تو تم دونوں کو گالیاں دلواؤں۔

روح۔ گنجے کو خدا پنجے نہیں دیتا ہے بہن۔

نازک۔ دکان میں، حسن آرا دیکھو اب کچھ سنیں گی۔

روح۔ ہاں ہاں ضرور میراثنیں سمدھنوں کو گالیاں دیتی ہیں تم ہم کو دو۔

حسن آرا مسکرا کر خاموش ہو رہیں اور ہنسی ضبط کی۔

نازک۔ جب جانیں کہ اس وقت حسن آرا بیگم کچھ کہیں۔

سپہر آرا۔ اب واسطے خدا کے ان کو ہنساؤ نہیں بہن۔!

نازک۔ ہم تو منگنی کے دن کھلکھلا کر ہنسے تھے۔

سپہر۔ تمھارا کیا کہنا۔ تمھاری کل باتیں انوکھی ہیں۔ کوئی ہنسی تھوڑا ہی ہیں اور تم ہنستی ہو تو تعجب ہے۔

روح۔ بھلا پہلے ہی روز میاں سے بولی تھیں۔

نازک۔ کیوں۔ نہ بولنا کیا معنی کیا میاں سے بولنا بھی گناہ ہے کچھ وہ بھی نامحرموں میں ہے کوئی۔

روح۔ مطلب یہ کہ سب کے سامنے بولیں تھی۔

نازک۔ ہاں ہاں سب کے سامنے اِدھر سسرال میں داخل ہوئی اور میاں سے

گفتگو کی وہ جھینپتا تھا مگر مجھے اس کی کچھ پرواہ نہیں میاں تو ہمارے ہیں بولے گا کون۔

روح۔ تو بہن جب ایسا دیدہ دلیر ہونا۔

نازک۔ وہ عورت کیا جو میاں سے بولتے ہوئے شرمائے۔

خیر جب مراثنوں نے گالی دینے سے فراغت پائی تو لڑکے والوں نے انعام دیا۔ اس کے بعد جہاں دلھن بیٹھی تھی وہاں سمدھنیں چڑھاوا لے گئیں۔ دولہا کی بہنوں نے دلھن کو مصری کھلائی۔ جوڑا پہنایا۔ دلھن کو رونمائی دی اور بہت ہی مسرور ہوئیں کہ حسن آرا بیگم اس درجہ حسینہ اور جمیلہ ہیں یہ گردن جھکائے چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ نازک ادا نے کئی بار چھیڑا تاکہ حسن آرا کو ہنسی آئے مگر وہ بالکل بیٹھی رہیں اور جوڑا اور پھولوں کا گہنا پہنایا گیا۔

آزاد پاشا کی والدہ معظمہ اور ان کی بہنوں کو معمولی خوشی سے زیادہ مسرت تھی کیونکہ آزاد کی آزادی سے ان کو یقین نہ تھا کہ وہ اپنی تقریبِ شادی میں بلوائیں گے سب نے دلھن کی تعریف کی اور کہا آزاد ہی کے قابل ہے۔

اس گفتگو اور مذاق کے بعد سمدھنیں رخصت ہوئیں اور اسی روز دلھن کے ہاں سے دولہا کے لیے چڑھاوا بھیجا گیا۔ سات طرے بندھی پھولوں کی چھڑیاں اور پھولوں کے ہار جھوٹی مصری گلوریاں اور یہاں بھی وہی رسمیں ادا ہوئیں۔

دوسرے دن بڑی دھوم دھام اور بلیغ اہتمام سے مانجھے کی تیاری ہوئی جس کو دیکھ کر باوصف پیرانہ سالی پیر فلک کی عقل عاری ہوئی۔ سمدھیانے میں بھی خوجی مہتمم اعلیٰ تھے۔ آں حضرت نے پرانے فیشن کی زربفت کی چکن زیبِ بدن کی۔ دستہ لگا ہوا جیب کٹی۔ موتی قیمتی بیل ٹکی ہوئی سر پر حضور نے ایک بہت بڑا شملہ رکھا۔ گل بدن کا پاجامہ۔ کاندھے پر کشمیر کا سبز رنگ دوشالہ پاؤں میں روپہلی گھیلا جوتا۔ ہاتھ میں سیاہ جریب یہ کپڑے پہن کر اپنے کمرے سے باہر آئے تو لوگوں نے تالیاں بجائیں اور خواجہ صاحب بہت ہی خفا ہو کر بولے یہ ہم پر تالیاں نہیں بجاتے ہو یہ اپنے باپ دادا پر تالیاں بجاتے ہو۔ یہ خاص ان کی وضع ہے ایک صاحب نے ہنستے ہنستے کہا خداوند یہ شملہ تو بہت ہی چھوٹا ہے ذرا اس سے بڑا شملہ سر پر رکھ لیجیے۔ فرمایا سنا نہیں "شملہ بمقدار" مگر علم کی مقدار کا شملہ کس کے گھر سے آئے لہٰذا ہم نے اسی پر قناعت کی لونڈوں اور کم سن لڑکوں نے ان کے منہ پر ہنسنا شروع

کیا اور قریب تھا کہ ایک آدھ لڑکا پگڑی اچھال دے مگر دو چار صاحبوں نے سمجھایا اور ان کو اس حرکت سے باز رکھا۔ خواجہ صاحب قلم دوات کاغذ دست مبارک میں لیے ہوئے جلوس کی فہرست لکھ رہے تھے مگر غلبۂ ذکاوت سے سب الٹا پلٹا فیل کی لیے راس (دو راس فیل بلکہ افیال از مطبخ نواب نوازیش) اے سبحان اللہ اس گدھے پن کو دیکھیے کہ ہاتھی کے لیے راس جو گھوڑے کے لیے لکھتے اور فیل لکھ کر پھر افیال بنایا۔ فیل خانے کے لیے مطبخ لکھنا بھی آپ ہی کا کام ہے۔ نواب کے ہجے کتنے بھیجے لکھے ہیں اور نوازش علی خاں کے لیے "نوازیش" کیا اشارہ بھی ماشاء اللہ کس قدر جامع ہے اب گھوڑے قلمبند کرنے لگے (ہشت عدد اسپ) اے سبحان اللہ دُم کی کسر ہے سانڈنیوں کو عجب ٹھاٹھ سے لکھا۔ (پنج زنجیر بعیران) ہو بہو زنجیر ہاتھی کے عوض اونٹ کے لیے۔ ماشاء اللہ حضرت کی بھی کوئی کل درست نہیں ہے۔ اور سانڈنی کو مونث سمجھ کر بعیران کر دیا۔ واہ رے شتر غمزے ماشاء اللہ۔

ماشاء اللہ خاص برداروں نے کہا حضور ہمیں فہرست پر چڑھائیے مسکرا کر ایک لطیفہ بولے کہ اب آپ گدھے پر چڑھائے جائیں گے۔ اس پر کسی نے ٹیسو کی پھبتی کہی کسی نے کہا تو تو نائی معلوم ہوتا ہے مانگے کے کپڑے پہن کر آیا ہے! کہیں سے انعام ملا ہے مگر جوتا چوری کا ہے۔

خواجہ صاحب نے فہرست کی تمہید میں مد کھینچ کر اتنی سطریں لکھی فہرست (فہرست تعداد (جملہ) جملا اس باب (اسباب) برائے مان جھا (مانجھا) مکرم معظم نواب (نواب) بڑی بیگم صاحب بعافیت باشند کہ در میں فہرست افیال و گھوڑے (ربعیران) و مردمان واتنامیاں (اسامی) ہمہ حسب ذیل درج نموزہ شدہ بودہ است۔ ماشاء اللہ کیا کہنا ہے۔ کیا بات ہے۔ املا درست۔ فقرے چست۔ غلطی سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ آدمی کیا کان صحت ہے۔

اب مانجھے کا سامان گھر آیا پانچ سر کی گنگا جمنی چوکی نہایت خوب صورت بنی ہوئی سات سو کا مرصع لوٹا۔ مرصع جام اور کٹورا۔ چاندی کی سلفچی اور آفتابہ اور لگن نقرئی چنگیر دان اور پاندان لاجی سنار تجربہ کار کے اہتمام میں یہ کل اشیا نہایت صفائی اور آب و تاب کے ساتھ تیار ہوئی تھیں اور اکثر معمر آدمیوں کا قول تھا کہ ہم نے اپنی عمر میں اس گڑھت کی اشیا نہیں دیکھیں سب میں مشہور تھا کہ بڑی بیگم نے

اس شادی میں دل کا حوصلہ خوب نکالا ہے۔ مرصع لوٹا اس مرتبہ لالہ سانول داس نے ایک نئی ترکیب سے بنوایا تھا جس کے دیکھنے کے لیے تمام شہر امنڈ آیا تھا۔ اب پارچہ اور زیور کا حال سنیے۔ کنگنا مرصع مع مروارید۔ دو ہزار کا۔ سونے اور چاندی کے چھلے گننے میں ڈالے گئے پانچ سو گو یاقوت کی انگوٹھی نیمہ جامہ ململ کا بیش بہا بنارسی پٹکا زربفت کا پائجامہ انگرکھا۔ تاج مندیل دو شالہ جیغہ۔ سرپیچ زمرد تیس بار دست بند۔ سات سفید ریشمی رومال۔ جوڑا کشتیوں میں اور پیڑیاں خوانوں میں لگائی گئیں۔ خواجہ صاحب شرف ہر دو طرف کہتے ہوئے اس طرف سے مصروف انتظام تھے اور اس طرح دل سے انتظام میں مشغول کہ کسی کی سنتے ہی نہ تھے اپنے کام میں بالکل محو تھے۔ ہمہ تن مستعد۔

خو۔جی۔ ہاتھیوں کو اس جانب رہنے دو خبردار۔

ایک۔ اجی خواجہ صاحب آداب عرض ہے اجی حضرت۔

خو۔جی۔ ہاتھی اِدھر بڑھاؤ لاؤ جلدی سے فوراً۔

دوسرا۔ یا الہی اے صاحب نواب صاحب کیا پوچھتے ہیں۔

خو۔جی۔ بس اسی لین میں ہاتھی لگاؤ لا کے تم بھی لاؤ۔

لوگ۔ ماشاءاللہ سب کا بھرتا بنائیں گے آپ۔

خو۔جی۔ دیکھو کچھ گڑبڑ نہ ہونے پائے خبردار یارو۔

لوگ۔ خواجہ صاحب چشم بد دور کیا انتظام ہے۔

خو۔جی۔ (مسکرا کر) آداب عرض ہے قدر دانی آپ کی۔

لوگ۔ سبحان اللہ سبحان اللہ واہ جی واہ لے لاحول۔

خو۔جی۔ آگ بھبھوکا ہو کر) کیا کہا اکڑ کر منہ پر کوئی کہے تو دیکھ لیں اتنی قرولیاں بھونکوں کہ یاد کرے۔

لوگ۔ منہ پر نہیں تو کیا پیٹھ پیچھے کہا ہے پھر کہیں۔

خو۔جی۔ اتنی قرولیاں بھونکوں گا کہ یاد کرو گے بچ۔

لوگ۔ حضور سواریاں تو اتروا لیجیے جا کے۔ وہاں۔

خو۔جی۔ سب انتظام ہوا جاتا ہے ابھی دم کے دم میں۔

لوگ۔ مگر آپ کا رعب سب مانتے ہیں جناب خواجہ صاحب۔

خوجی۔ ارے میاں ہم ذرہ بے مقدار ہیں بھائی جان۔

لوگ۔ وہ آپ آزاد سے جنرل کے نوکر ہیں خواجہ صاحب۔

خوجی۔ نوکر۔ ماشاءاللہ دوست یا نوکر۔ ہونھ!!!

لوگ۔ آپ اور آزاد دوست ہیں بجا ارشاد ہوا۔

خوجی۔ بے شک نوکر تو ہم اس رئیس کے ہیں۔

خواجہ صاحب سمجھے کہ سب کے سب میرے مداح ہیں بہت ہی مسرور و محظوظ ہوئے اور اکڑ کر کہنے لگے بابائے من بدیع بندہ فارسی گوید و اردو نہ گوید کہ اردو پوچ است و فارسی بہتر ازاں گفتہ اند۔

اسپِ لاغر میاں بکار آید روزِ میداں نہ گاوِ پرواری

غرض نہایت تزک احتشام اور بڑی دھوم دھام سے مانجھا خانہ طرب کاشانہ میں پہنچا۔ سواریاں اتریں ریت رسم ادا ہوئیں۔ میراثنوں نے سمدھنوں کو گالیاں دیں۔ لتنے میں ایک مغلانی نے کہا حضور اس دھوم سے مانجھا آیا ہے کہ میں کیا بیان کروں۔ دو ہزار خوان سوا سو کشتیاں۔ ساتوں باجے اور نقیب ٹھاٹھ سے کہتا آتا تھا کہ سواری ہے شبراتن بہادر کی بڑھیا یو عمر و دولت کو دور باش۔ ادب۔

اب سنیے کہ میاں آزاد باہر سے بلوائے گئے اور ان سے کہا گیا کہ منڈھے کے نیچے بیٹھیے۔ آزاد تو ان مراسم فضول کے خلاف تھے انھوں نے کہا یہ تو نہ ہونے کا۔ مگر عورتوں نے ایک نہ سنی اور مجبور کر کے ان کو بٹھایا۔ ان کی بھاوج نے کہا یہ روم و روس کی جنگ نہیں ہے بیوی بیاہ کے لانا ہنسی ٹھٹھا نہیں کچھ خبر ہے۔ دولہا زیر شامیانہ اس چوکی پر بٹھائے گئے جو دلھن کے لیے آئی تھی اور اب اصرار ہونے لگا کہ مانجھے کا جوڑا پہنو۔ یہ جھنجھلا اٹھتے تھے مگر عورتیں قہقہے لگاتی تھیں

بھاوج۔ اب چپ چپاتے پہن لو بس یہ لو

آزاد۔ لاحول ولاقوۃ کیا رسم فضول ہے۔

بھاوج۔ ایں لاحول کیا معنی کوئی نظر پڑ گیا۔

آزاد۔ صاحب یہ کوئی پابندیِ شرع ہے۔

بھاوج۔ شرع سے کیا واسطہ۔ ہماری رسم یہی شرع ہے۔
آزاد۔ تو ہم ان مسلمانوں میں نہیں ہیں صاحب۔
بھاوج۔ تم نہیں ہو ہم تو ہیں۔ لے اب پہنتے ہو یا بات کو خواہی نہ خواہی بڑھاؤگے ہم سے جنرلی نہ چلے گی۔
ڈومنی۔ اے حضور جن بڑے بڑے ملاؤں کے بیاہوں میں طبلے پر ہاتھ رکھنے کی اجازت نہیں ہے ان کے یہاں تک تو ڈنکے اور نقارے ہوتے ہیں اور کسی کی کون کہے۔
بیگم۔ بھلا یہ کوئی بات ہے کہ مانجھے کا جوڑا نہ پہنیں گے۔ واہ۔

آزاد نے کہا اچھا خاطر ہے۔ لاؤ ٹوپی دے لوں بس اب آگے خیر صلاح ہے خیر جب انھوں نے کسی کا کہنا نہ مانا تو دلھن کی جھوٹی مصری کھلائی گئی گلوری کھاکر آزاد اٹھنے ہی کو تھے کہ ان کی بہنوں اور بھاوجوں نے ہزاروں قسمیں دیں اور کہا جب مانجھے کا جوڑا نہ پہنو گے چوکی سے اٹھنے نہ پاؤ گے۔ آزاد نے دیر تک ہاتھ جوڑے اور گڑ گڑا گڑ گڑا کر کہا کہ خدارا میرے اوپر رحم کرو۔ بحق محمد و آل محمد۔ مجھے اس زرد جوڑے سے بچاؤ۔ مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔ انگرکھا پایا کنگنا بندھا کل باتیں خاطر خواہ ہوئیں درجہ مجبوری تھا۔

اس کے بعد سمدھنوں کو شربت پلایا کشتیاں نکالی گئیں الائچی چکنی ڈلی گلوریاں آئیں۔ عطر ملا گیا۔ چہل ہونے لگی۔

نیر امنوں نے گالیاں دیں انعام پایا۔

آزاد باہر ڈیوڑھی میں جوڑا اتار کے اور کپڑے بدل کر باہر گئے وہاں ڈل لگی ہونے لگی احباب بے تکلف نے ان سے کہا کیوں حضور اب تو جوڑا زیب بدن تھا وہ چاہے ڈیوڑھی میں اتار دو چاہے باہر مگر پہننا تو پڑا۔ کہتے تھے ماں بہنوں میں رہ کر یہ ہیکڑی نہیں چلتی برسوں سے ماں بہنوں سے علیحدہ تھے جب دیکھو اپنی ہی ضد کرتے تھے اب بتائیے۔

آزاد نے کہا جی ہاں۔ اب اس وقت تو آپ کی چڑھ بنی ہے جو چاہے کہیے اختیار ہے میں تو ہرگز نہ مانتا مگر عورتوں کے اصرار نے مجبور کر دیا اور سب مجھے سوانگ بننا پڑا۔ ایک بذلہ سنج دوست نے جواب دیا۔ یار کیوں ناشکری کرتا ہے۔ ارے مرد خدا حسن آرا سی دلھن کے لیے تو انسان زرد جوڑا کیا معنی اگر اصل

میں سوانگ بنایا جائے تو ہنسی خوشی بنے ہم کو اگر ایسی پری چہرہ عروس، قمر طلعت، سیم بر، حور پیکر ملے تو واللہ کس مردک کو سوانگ بننے میں عذر ہوگا۔ مگر آپ نے عجب طبیعت پائی ہے۔

مانجھے کی تقریب تو بہ خیر و عافیت، ہنسی خوشی ادا ہو گئی۔

تاروں کی چھاؤں میں آزاد کی برات بڑے کر و فر کے ساتھ روانہ اور عازمِ محلِ عشرت منزلِ جانانہ ہوئی۔ جب چوک میں اس عظمتِ شاہانہ اور سطوتِ خسروانہ سے برات آئی تو تماشائیوں نے جو بصد شوق منتظر کھڑے تھے گویا منہ مانگی مراد پائی۔

یوں سواری جو چوک میں آئی
محوِ حیرت ہوئے تماشائی

سب کے آگے نشان کا عرش شکوہ ہاتھی جھومتا ہوا جاتا تھا اور نشانِ عظمت تواماں عجب شان دکھاتا تھا۔ ہاتھی کے سامنے قدم قدم پر آتش بازی کے انار چھوٹتے جاتے تھے جو ضیا میں مہرِ عالم افروز کو شرماتے تھے بو منزلوں دور تھی گندھک مثلِ کبریت احمر کافور تھی۔ ادھر ادھر کمروں پر بارہ بارہ، چودہ چودہ برس کے ریزے نکھر نکھر کے محوِ دیدِ حیرت تھے کہ الٰہی یہ برات ہے یا روزِ عید ایک سے ایک ہم کلام ہو کر کہتی تھی باجی اٹھو نشان کا ہاتھی آتا ہے لے۔ بوا دیکھو ہزارہ چھوٹتا جاتا ہے مہتاب کی روشنی سے ماہِ تاباں کا رنگ فق تھا۔ چرخی کی آن بان سے چرخِ زنگاری کا کلیجہ شق تھا تماشہ بیں اور جوانانِ رنگیں چوک کے کمروں کو تکتے تھے ادھر عباسی عباسی رنگ کا دوپٹا اوڑھے اندازِ دل ربانہ سے کھڑی برات کا جلوس دیکھتی تھی ادھر ہزاروں عاشقانِ زار و کان سے ان کے جوبن کے مزے لوٹتے تھے کوئی کمرہ ایسا نہ تھا جس پر دو چار حورانِ طرح دار سولہ سنگھار کر کے برات دیکھنے نہ آئی ہوں۔

رنڈیاں جا بہ جا جو تھیں استاد
مل کے گانے لگیں مبارکباد

کمرے پھٹے پڑتے تھے۔ تماشائی جگہ کے لیے باہم لڑتے تھے شوقین

آدمیوں نے آدھا چوک کرایے پر لیا تھا اور صرف ایک تہے کے لیے زرِ کثیر دیا تھا، مہاجنوں کے طاؤس دم اور آہو سم گھوڑے زیور سے لدے ہوئے چھم چھم کرتے جھوم جھوم کے شوخی کے ساتھ قدم دھرتے جاتے تھے اِدھر اُدھر سپاہی حفاظت کرتے آتے تھے۔ جس وقت گوروں کا باجا چوک میں پہنچا اور انھوں بینڈ بجائی لوگ سمجھے کہ آسمان سے فرشتے باجا بجاتے اتر آئے وہ مست کر دینے والی آواز وہ صدائے دل کش خوش آئند و دل نواز کبھی تلنگوں کی کمپنیاں رپ رپ کرتی آئیں کبھی جھنڈی برداروں نے رنگ بہ رنگ جھنڈیاں دکھائیں۔ شہنائی نواز نے اِس خوبی و خوش اسلوبی سے شہنائی بجائی کہ میاں غوث تک کی روح وجد میں آئی

اتنے میں دگلے والی پلٹن کے کپتان میاں خواجہ بدیع الزماں صاحب من بدیعا بدیع بالنقابہ نے انتظام شروع کیا۔

خوجی۔ او شہنائی والو منہ نہ پھیلاؤ بہت۔

لوگ۔ آئیے آئیے بس آپ ہی کی کسر تھی۔

خوجی۔ او دائیں طرف کا شہنائی والا بازو۔

لوگ۔ کوئی آپ کی سنتا ہی نہیں خواجہ صاحب بہادر۔

خوجی۔ ہم ان کا بازو توڑے گا۔ میاں بہت منہ نہ پھیلاؤ یہ عیب ہے۔

لوگ۔ خواجہ صاحب کچھ فرمائش تو کیجیے ان سے۔

خوجی۔ اچھا واللہ وہ سماں باندھوں کہ باید و شاید۔

کرجوا میں درد اٹھی۔ کاسے کہوں نندی موری رام۔

کرجوا میں درد اٹھی۔ کاسے کہوں نندی موری رام۔

کرجوا میں درد اٹھی۔ سوتی تھی میں اپنے منڈل میں رے

اچانک چونک پڑی مورے رام کرجوا میں درد اٹھی۔

کیوں کیا چیز ہے خاص بھیرویں اور سنیے۔

جو بنوا ہو چادر نا دینو ناتھ۔ جو بن رت جات سبھیں مکھ۔

مورت رے کدر کوؤ نہ پوچھے بات جو بنوا ہو چادر نا دینو ساتھ

خدا بخشے صنم یہ کہہ کے ان کو یاد کرتے ہیں

یہ مشتِ خاک تیری راہ میں برباد کرتے ہیں

لوگ۔ سبحان اللہ شعر کو اچھی اصلاح دی واللہ۔

خوجی۔ من بدیعا بدیع خالی خولی شاعر نے، نثر ہم میگو بد دور قوالی گوئے سبقت بار بدو ناہید بردہ شدہ ام کہ گفتہ اند علم در سینہ کہ در سفینہ۔

لوگ۔ مگر شہنائی والے اب تک آپ کا علم نہیں مانتے۔

خوجی۔ نا بابا۔ علم تو مانیں۔ اور نہ مانیں تو میں نکال نہ دوں مگر بات اس میں یہ ہے کہ مجبور ہیں ایک شے سے آگاہ ہی نہیں اور واللہ نوشاہ۔ اور ہم آج بہ درجہ اتم خوش اور خرم اور مسرور واکرم ہیں۔

دوجی۔ اے سبحان اللہ قافیہ پیمائی آپ پر ختم ہے۔

خوجی۔ ذرا مجھے آنے میں دیر ہوئی اور سب ابتر۔

لوگ۔ اور خواجہ صاحب آپ گدھے پر سوار نہ ہوئے۔

خوجی۔ من بدیع بدیعا اس قابل بھی نہیں ہے۔

فہیمی۔ واہ رے انکسار حضور کیا عاجزی ہے۔

خوجی۔ من بدیع بدیعا اپنے کو قابلِ تعریف بھی نہیں سمجھتا۔ کیوں کہ ذرہ بے مقدار ہوں۔

اتنے میں ایک شخص نے از راہِ مذاق خواجہ صاحب کے قریب جا کر ذرا گرانے کا اشارہ کیا تو خوجی کسی قدر لڑکھڑائے اور ان کے چیلے افیمی بھائیوں نے اس پر قہر کی نظر ڈالی۔

ایک۔ (اینڈ کر) ارے میاں کیا آنکھوں کے اندھے ہو۔

دوسرا۔ (بگڑ کر) اینٹ کی عینک لگاؤ میاں۔

تیسرا۔ اور جو وہ بھی دھکا دیتے تو کیسی ہوتی۔

چوتھا۔ ہوتی کیسی۔ منہ کے بھل میاں گر رہے ہوتے۔

پانچواں۔ (بگڑ کر) گر رہے ہوتے ہو پھر یہ نہیں کہتے کہ انجر پنجر سب الگ ہو جاتے ہونہہ۔

خوجی۔ ارے بھئی۔ اب اس سے کیا واسطہ ہے ہم کسی سے لڑتے جھگڑتے تھوڑا ہی ہیں مگر ہاں طیش میں آ کر اگر کوئی گیدی ہم سے بولے تو جہاں کا ہے وہیں

پہنچا دیں۔ اتنی قرولیاں بھونکی ہوں کہ یاد کرے۔ اور بدن سے خون کے تڑاٹے بہیں۔

منم رستم داستاں بے گماں
منم بندۂ خواجگانِ جہاں

اور جو لوگ منکسر مزاج ہیں ان کے ساتھ

منم خواجہ خواجہ بدیع الزماں
حقیرِ زماں احقرِ احقراں

لوگ۔ ایک ذرا سے اشارے میں تو آپ نے لڑھکنی کھائی اور زعم یہ کہ رستم داستاں ہیں اور چنیں اور چناں۔ سب زبانی داخلہ۔

ایک طرار عورت نے چوک کے ایک کمرے سے آوازہ کیا (میاں خوجی کہاں ہیں اے یہ مرا بونا ان ننھے ننھے ہاتھ پانوؤں پر اس قدر اتراتا ہے۔ خدا کی شان مرد تو مرد میں عورت ہوں مگر یہ دعوئی ہے کہ اگر ذرا پھونک ماروں تو ستر لڑھکنیاں کھائے) خواجہ صاحب نے کمرے پر نظر کر کے کہا۔ میں تم کو بچہ سمجھتا ہوں واللہ۔ اس پر سامعین نے قہقہہ لگایا اور اس شوخ و طرار نے ان کو انگلیوں پر نچایا۔

اِدھر دلھن کے ہاں اطلاع آئی کہ برات قریب آگئی۔

مغلانی۔ حضور دیکھیے گا کہ کس ٹھسّے کی برات ہے۔

جہری۔ بس یا ولیعہد کی برات تھی یا یہ دیکھنے میں آئی

مغلانی۔ وہ برات تو ہمیں اچھی طرح یاد نہیں ہے۔

مہری۔ اے ہے کیا ننھی بنی جاتی ہیں اے ہے۔

دوا۔ اے ہاں ابھی تو کوئی بارہ ہی برس کی ہیں۔

جہری۔ بلکہ اس سے بھی اور کم ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش اللہ جھوٹ۔ بلائے ملکہ کو گودیوں میں کھلایا ہوگا مگر ولیعہد کی برات نہیں یاد ہے۔

مغلانی۔ اب زبردستی سے قبولوایا چاہتی ہو۔ اللہ جانتا ہے ہم کو یاد نہیں ہے اس میں جھوٹ بولنے سے ہم کو کیا مل جاتا۔

جب آزاد فرخ نہاد کی برات عروس پری زاد غیرت خوباں نوشاد کے ایوان عرش نشاں عظمت توامان کے عالی شان پھاٹک پر پہنچی اس زور کے باجے بجے اور انگریزی باجے نے وہ سماں باندھا کہ برناو پیر سب وجد کرتے تھے گوروں نے اپنا کمال دکھایا اور بھرپور انعام پایا۔ دولہا کو دروازے کے قریب لائے اور دلھن کا حمام کیا ہوا پانی فرس طوطی پر کے سموں کے تلے ڈالا۔ بعد ازاں روغن زرد اور شکر ملا کر گھوڑے کے پائنوں میں لگایا اور نوشاہ ثریا جاہ خاقان کلاہ بہ صد آن بان محل سرا میں آیا۔ دولہا کی دو بہنیں حور وش برق کردار رشک پری رخاں بہ صد انداز معشوقانہ دولہا پر دوپٹے کے آنچل ڈالے ہوئے دولہا کو اندر لائیں۔

دلھن کی طرف سے عورتیں ایک بیڑا ہر قدم پر ڈالتی جاتی تھیں اور یہ کلام زبان پر لاتی تھیں۔ (گلاب پانی۔ گلاب پانی) اس وقت بیگمات عصمت سمات اور مخدرات کا ہجوم اور محل کی چہلیں اور دھوم خوشی کے شادیانے طرب و انبساط ہر سمت افتراع و نشاط ہی کی گرم بازاری تھی کوئی باہم چہل اور دل لگی کرتی تھی کوئی محو دیدار تھی گو کل شہزادیاں والا دودمان اور خاتون عالی خاندان اور مخدرات عفت سمات خصوصاً نوجوان اور شوخ مزاج بانویان قمر طلعت اس نیر پہر سروری اور مہر مشرق نشاں برتری ندرو اوج رعنائی طوطی نوبہار برنائی یعنی نوشاہ ذی جاہ فلک بارگاہ کو بہ صد شوق چھپ چھپ کے پردے سے دیکھتی ہیں۔ مگر ایک کو سب سے زیادہ اشتیاق دید تھا اور اس کے لیے یہ دن بہتر از روز عید تھا۔ یہ پری بہ صد شان دل بری بڑے شوق اور غایت ذوق سے ان جوان رعنا کے حسن عالم افروز پر نظر ڈالتی تھی یہ بلبل شاخسار جمال زہرہ تمثال ہمجولی سے یوں زمزمہ سنج بیاں ہوئی۔

بیگم ۔ بہن اس وقت خوشی اور رنج توام ہیں۔
ہمجولی۔ اے اوئی رنج کا نام نہ لو بہن۔ واہ۔
بیگم۔ سچ کہتے ہیں بہن اس وقت غم و شادی توام ہیں۔
ہمجولی۔ اب وہی باتیں کروگی کہ بڑی بیگم نکلوا دیں۔
بیگم ۔ وہ کیا نکلوا دیں گی میں خود چلی جاتی ہوں۔
ہمجولی۔ اے آخر کچھ تو بیٹھے بٹھائے یہ کیا سوجھی۔

بیگم۔ بہن تم ہمارے دردِ دل کا حال کیا جانو۔
ہمجولی۔ اوئی آخر دردِ دل کا سبب کیا ہے۔
بیگم۔ (آب دیدہ ہو کر) ہمارا قلب اس وقت الٹا جاتا ہے۔
ہمجولی۔ (علیحدہ لے جا کر) بہن ہم جانتے ہیں تم سے اور آزاد سے ملاقات تھی۔ تھا کبھی رسم ضرور۔ ہم ایک نہ مانیں گے۔
بیگم۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتی میرے دل کا کیا حال ہے بس ناگفتہ بہ۔ اب یہاں سے کیا بہانہ کر کے جاؤں۔

ادھر تو یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ ادھر نیا گل کھلا یعنی دو چار کم سن جو اس چمن طبع رنگیں مزاج بلکہ کھلاڑ عورتیں تھیں دولہا کو دیکھا تو دیکھتے ہی ہزار جان سے بلبلِ شیدا کی طرح اس گلِ برخسارِ حسن پر عاشق و فریفتہ ہو گئیں۔ اور یہ خیال کر کے کہ اب تو آزاد کا نکاح حسن آرا کے ساتھ ہو گیا۔ اور موقع نہ رہا از بس بے قرار ہوئیں۔

کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی — کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی
کوئی بلبلائی سی پھرنے لگی — کوئی ضعف کھا کھا کے گرنے لگی
کوئی سر پر رکھ ہاتھ دل گیر ہو — گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو
کسی نے دیئے کھول سنبل سے بال — طمانچوں سے جوں گل کیے سرخ گال
کوئی رکھ کے زیرِ زنخداں چھڑی — رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی

الغرض جب آزاد اندر آئے تو منڈھے کے تلے اس چوکی پر کھڑے کیے گئے جس پر دلھن نہائی تھی۔ دلھن کے پاجامے کا کلاوہ ڈومنیاں لے کر دوڑیں اور دولہا کے گلے میں کلاوہ ڈال کر دونوں سرے لیے اور یہ گانا شروع کیا۔

ہریالا ڈورے ڈامیاں چھوڑائے کوئی آئے۔
ہزار ڈورے ڈامیاں چھوڑائے کوئی آئے۔ چھوڑائے تیری میا چھوڑائے تیری بھینا۔ جسے چاہ گھنیری رہے۔ ڈورے ڈامیاں چھوڑائے کوئی رہے

میراثنیں جب ڈام چکیں تو ان کو زر کثیر انعام دیا ایک ایک ڈومنی نے گوہر مقصود سے جیب و دامن بھر لیا گو انعام پر انعام اور اشرفیوں پر اشرفیاں دی جاتی تھیں۔ مگر میراثنیں کب مانتی تھیں۔ ایک بولی اے حضور آج ہی کا دن تو

جھگڑے کا ہے دوسری نے کہا جب بے جھگڑے نہ ملے نہ۔ تیسری نے جواب دیا۔ اس سے کہیں ہم لوگوں کا پیٹ بھرتا ہے اے آج تو ہم اس قدر زرِ سرخ لیں کہ سات نہیں ساٹھ پیڑھی تک لکھ پتی گڑور پتی بنے رہیں گے۔

اس کے بعد میراثنوں نے دلہن کے ابٹن کا جو مانجھے کے دن سے رکھا ہوا تھا ایک بھیڑ اور ایک شیر بنایا اور چاندی کے چراغ روشن کر کے ڈومنی دولہا کے پاس لے گئی اور کہا کہیے۔ یہ شیر میں بھیڑ۔ دولہا بھیڑ۔ دلہن شیر۔ پہلے تو میاں آزاد خوب ہنسے اور کہا واہ ہم تو نہ کہنے کے۔ مگر وہ کب مانتی تھیں اس وقت کی چہل قابلِ دید تھی۔

آزاد۔ اچھا صاحب ہم شیر وہ بھیڑ بس

ڈومنی۔ اے واہ یہ تو اچھے دولہا آئے کہیں آپ بھیڑ وہ شیر۔

آزاد۔ اچھا صاحب یوں ہی آپ بھیڑ وہ شیر۔

اس پر بڑا فرمائشی قہقہہ پڑا اور عرصے تک سب ہنسا کیں۔

ڈومنی۔ اے حضور کہیے یہ شیر میں بھیڑ۔ یوں کہیے۔

دوسری۔ (آہستہ سے) یہ تو اچھے دولہا ہیں کیا مزے مزے باتیں کر رہے ہیں اے واہ۔

نازک ادا۔ دولہا بڑے فقرے باز معلوم ہوتے ہیں۔

جانی بیگم۔ اور جب جوتی چرائی جائے گی تب کیا کریں گے۔

نازک۔ جب بھی یہی نخرے بازیاں کریں گے۔

جانی۔ چل چکیں نخرے بازیاں۔ کریں گے۔

نازک۔ اور جب غلام بنائے جائیں گے تب کیا کہیں گے۔

جانی۔ ارے یہ کہیں اور ان کے پیر کہیں کسی کی صاحب زادی بیاہ لے جانا کیا دل لگی ہے۔

مبارک۔ معلوم ہو گیا یہ یہاں سے راضی ہو کے جائیں گے۔

نازک۔ ہاں میرے دل کی بات کہی بھیڑ بننے میں یہ نخرے۔

الغرض بہ ہزار دقت آزاد نے کہا (میں بھیڑ اور یہ شیر)

ہمجولیاں باہم چہلیں کرتی تھیں خوشی اور شادمانی کا دم بھرتی تھیں قہقہے پر قہقہے پڑتے تھے کھلی جاتی تھیں۔

اس کے بعد نوشاہ فلک بارگاہ اس مقام عشرت انجام میں گئے جہاں عروس پری رخ نسترن بدن بڑے ٹھسے اور جوبن سے سولہ سنگھار کرکے متمکن تھی آزاد والا نژاد نے کنکھیوں سے ادھر ادھر دیکھا تو نور کا عالم نظر آیا۔

الغرض جب بیچ کے در سے دولہا دلھن کے کمرے میں جو خود دلھن کی طرح سجا سجایا تھا بلائے گئے اور پردے کے پاس وہاں بٹھائے گئے تو دلھن کے داہنے ہاتھ میں تل شکری رکھی گئی۔ اور دولہا کو چٹائی۔ اس دست بوسہ فریب سے جو دولھا نے شکر اور تل کھایا تو آب حیات کا مزہ پایا شکر چاشنی بخش کام جاں۔ رشک آب حیواں۔ تل خال رخسار خوباں پستہ دہاں۔ اسی تل شکری کی آرزو میں آزاد کی روح برسوں سے ترس رہی تھی اور اس کے ذائقۂ جاں بخش کی تمنا میں جنگ کی تلخ کامی بھی تھی۔ دولہا جامے میں پھولے نہیں سماتا تھا اور پردہ حایل کو دیکھ دیکھ کر زیر لب ڈرتے ڈرتے مسکراتا اور زبان حال سے یہ شعر سناتا۔

طالب نظارہ ام پردہ برافگن ز رخ
پیش صف راستاں شعبدہ بازی مکن

آزاد کا دل اس وقت اس قدر بے قرار تھا کہ جی چاہتا تھا کہ پردہ ہٹا کے معشوقۂ گل بدن کا جمال مشاہدہ کریں اور اس حور فریب کے نظارۂ حسن سے آنکھوں کو نور بخشیں۔ عشق کو دعائیں دیتے تھے جس کی بدولت یہ روز سعید نصیب ہوا کہ وصل ناظورہ طاؤس زیب ہو۔

جب سب رسوم فرحت لزوم ادا ہو چکیں۔ تو دولھا کی بہن اسی طرح پر آنچل ڈال کر اس خورشید مشرقستان جلال اور مشرقستان خورشید جمال کو دروازے تک لائیں ادھر نوشہ محفل عشرت منزل میں گیا ادھر ڈومنیوں نے بہ آواز بلند گالیاں سنائیں۔ اب نکاح کی رسم شروع ہوئی قاضی صاحب اندر آئے اور دو گواہوں کو ساتھ لائے اس کے بعد دریافت کیا گیا کہ آزاد پاشا کے ساتھ نکاح منظور ہے الخ۔

دلھن نے فرط حیا سے جواب نہ دیا اور گردن نیوڑھا کر سر جھکا کر چپ چاپ بیٹھی رہی۔

بڑی بیگم۔ اے بیٹی کہو خدا کی۔

روح افزا۔ حسن آرا بولو بہن۔ دیر کیوں کرتی ہو۔
نازک ادا۔ بولو حسن آرا۔ بس تم ہاں کہہ دو۔
جانی بیگم۔ (آہستہ سے) ایسی ہی تو بڑی شرمیلی ہیں۔
نازک ادا۔ اے بیٹی اب کاہے کو دیر لگاتی ہو۔ خواہی نہ خواہی۔
قاضی۔ آپ سمجھائیے ان کی بہنیں سمجھائیں۔
جانی بیگم۔ (آہستہ سے) بجروں پر سیر کر چکیں۔ ہوا کھا چکیں اور اب اس وقت یہ نخرے بگھارتی ہیں۔
نازک ادا۔ از برائے خدا بہن اس وقت نہ شرماؤ انھیں۔
جانی بیگم۔ نہیں اللہ جانتا ہے ہمیں یہ نخرے بازی نہیں بھاتی ایک آنکھ۔ خواہی نہ خواہی اپنے تئیں بنانا۔
بڑی بیگم۔ بیٹی! از برائے خدا کہہ دو سمجھانے ہیں۔
الغرض بڑی کوشش اور اصرار اور فہمایش کے بعد حسن آرا نے نہایت نازک آواز سے (ہوں) کہا۔
بڑی بیگم۔ لیجیے دلھن نے ہنکاری بھری۔
قاضی۔ ہم نے آواز نہیں سنی۔ تم نے سن لیا
بڑی بیگم۔ ہاں ہم نے سن لیا بہت سے گواہ ہیں۔

قاضی نور اللہ صاحب مع گواہوں کے باہر آئے۔
ناچ رنگ موقوف ہوا۔ دولہا کے شملے پر سہرا باندھا خطبہ پڑھا دولہا سے ایجاب وقبول کرایا۔
آزاد۔ جی ہاں قبول کیا۔
قاضی۔ یوں کہیے قبول کیا ہم نے۔
آزاد۔ (مسکرا کر) قبول کیا ہم نے۔
قاضی صاحب تشریف لے گئے اور محفل میں طایفوں نے مل کر مبارک بادی گائی۔

ہمیشہ دل بر سجان مبارک باشد
شربت پلائی کے بعد دولہا رسم کرنے کے لیے اندر بلایا گیا سر پر آنچل ڈالے

ہوئے بہنیں لائیں۔ مسند بیش بہا پر بٹھائے گئے بعد ازاں عروسِ رشک ماہ غیرت مہر یوسف لقا پری چہرہ کو بہنوں نے لاکر اسی مسند پر بٹھایا اس وقت کے جوبن کا حال حیطۂ تحریر سے خارج ہے اور خبر تقریر سے باہر۔ وہ چشمِ جادو۔ اور اس پر سرمے کی تحریر۔ کافر مست کے ہاتھ میں برہنہ شمشیر، رخسار گل نثار زلف چلیپا سیہ مار کفچہ دار۔

گیسوئے دوآسا کمند، اندازِ رسن باز۔ در پردہ جنگ ساز۔ غالیہ رنگ عمر دراز۔ مانگ کے دونوں جانب بال بال موتی پروئے ہوئے۔ معلوم ہوتا تھا فلک پر ستارے درخشاں ہیں مثل کہکشاں یا شب ابر سیاہ میں برق جہندہ شرر فشاں۔ مسی دھڑی کے ساتھ پان کے لکھوٹے نے وہ رنگ جمایا کہ معلوم ہوتا تھا دامنِ شب آج شفق کے ہاتھ آیا۔

دلھن بیٹھنے ہی کو تھی کہ روح افزا اور گیتی آرا نے کہا۔ بہن جوتی تو چھواؤ

دلھن سمٹی سمٹائی سر جھکائے ہوئے خاموش کھڑی رہی۔

جانی ۔ واہ یہ تو خود بھیڑ بن گیئں اس وقت۔

سپہر آرا ۔ حیا مانع ہے آخر حیا بھی تو کوئی شے ہے۔

نازک ۔ اے جوتی شانے پر چھوا دو بہن واہ۔

استانی ۔ اگلے وقتوں میں تو سر پر پڑتی تھی۔

نازک ۔ اس جوتی کا مزہ کوئی مردوں کے دل سے پوچھے۔

جانی ۔ اے جوتی خورے کے جوتی لگا دو بہن۔

جب دلھن نے ذرا جنبش نہ کی تو بہار النسا نے ہاتھ بڑھا کر دلھن کے داہنے پانوں کی جوتی دولہا کے شانے پر چھوا دی میراثنوں نے کہا اب دولہا کا ہاتھ دلھن کی پیٹھ پر رکھوائیے۔ آزاد نے بادلِ شاد معشوقۂ پری زاد کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ ساچق کے دن کا سہاگ پڑا آیا۔ سات سہاگنوں نے چاندی کی کھول میں سرما نا کر کے ایک چھوٹی زرنگار پیالی میں رکھا اور چھیل چھبیلا نگر موتھا کیوڑا گلاب عطر سہاگ اور اشرفیاں رکھ کر دولہا کو دیا۔ دولہا نے صندل کی ٹکیا سے مانگ بھری۔ اس وقت حسن آرا کا رخسار نورانی شعلہ طور تھا اور ہر خطِ پیشانی مشعلِ نور۔ سامنے جماعتِ مطربان خوش گلو۔ شہر کی ڈومنیاں خوب رو غنبر مو گانے میں طاق حسن میں پری

زاد۔ کوئی گاتی تھی کوئی ناچنے کے لیے کھڑی تھی۔ گنگرڈی گویا موتیوں کی لڑی تھی۔ ڈومنیوں نے گانا شروع کیا۔ نگ بیسیوں جو تری پیسوں بھرا کٹورا تجا۔ ہریالے بنے بھرا کٹورا تجا۔ بنرا لاڈلا۔ اے ناداں سب کچھ جانے لاڈلا۔ وحضرت بی بی کی بتیاں جو شو آوے تجا۔

حیدری ڈومنی جو سب سے زیادہ خوب رو تھی اس نے اصرار کیا کہ دولہا دلھن کی طرف مخاطب ہو کر کہیں کہ (تیرا بنرا ہوں گا ری ناداں بنو۔ ڈولی کے ساتھ چلوں گا)

نازک ۔ اور پاپوش بین جھاڑ جھاڑ کے دھروں گا۔

جانی ۔ اور صراحی ہاتھ میں لے چلوں گا اور چاندنی چوک ڈولی کے ساتھ جاؤں گا۔

ڈومنی۔ تیرے بابا کا لیا۔ گھوڑے نخاس میں لیا۔

کھوٹے داموں سے لیا۔ میری ناداں بنو۔ کیسے یہ دونوں لوٹنے میرے آنکھوں سے لگیں۔

آزاد۔ اے کیوں نہیں ضرور کہوں گا۔

نازک۔ اے واہ اچھا رنگ لائے۔

جانی ۔ رنڈیوں کے نخرے بہت سیکھے ہیں۔

راوی۔ اس فقرے پر اس قدر قہقہہ پڑا کہ میاں آزاد گو از بس طرار اور حاضر جواب تھے مگر بہت ہی شرمائے

رخصت کے وقت سپہر آرا اور بڑی بیگم اور روح افزا اور بہار النسا اور اکثر مہمانوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے اور حسن آرا کی آنکھیں بھی پر نم ہو گئی تھیں۔

آزاد فرخ نہاد نے قطع منازل و طے مراحل صد ہا سختیوں و انواع و اقسام کے مصائب کے بعد خدا خدا کر کے یہ روز سعید دیکھا کہ حسن آرا سی حور وش کو بیاہ لائے دولہا دلھن دونوں کا بحر جوش طغیانی پر تھا دونوں فرط طرب سے جامے میں نہیں سماتے تھے باغ باغ ہوئے جاتے تھے وفور نشاط و غایت انبساط سے دونوں کی آنکھیں اشک بار دونوں چشم در راہ انتظار۔ یا خدا کہیں جلد لیلی مشکیں پر شب جلوہ گر ہو۔ سریر عرش پر اجلاس بانوئے قمر ہو آغوش لب ریز گلہائے

مراد۔ ادھر دولہا ادھر عروس پری زاد ہو۔ آزاد پاشا نے حمام کیا اور لباسِ فاخرہ زیب بدن کر کے دیوان خانے میں آئے احباب بذلہ سنج مرنجاں مرنج نے مذاق کرنا شروع کیا عرصۂ دراز تک چہل پہل رہی اور ادھر بارہ دری میں بیگمات شوخ طبع کچھ اور ہی فکر میں تھیں۔

مہ لقا۔ اتنا دق کرنا کہ پانوں پکڑنے کی نوبت آئے۔

گلشن آرا۔ وہ تو خدا ہی نے کہا رات تو ہونے دو۔

مغلانی۔ اے نہیں کاہے کے واسطے عیش میں خلل ڈالے کوئی۔ برسوں پاپڑ بیلے ہیں دولہا نے۔

گلشن آرا۔ تم میں تو بی مغلانی اب گرمی نہیں رہی۔ ہے تم تو سو برس سے کچھ اوپر ہی اوپر ہو گی تم کو ہماری باتوں میں کیا دخل ہے۔

مغلانی۔ دیکھ لیجیے گا جو چھیڑیں گی وہی پچھتائیں گی۔

مہ لقا۔ خیر آپ کی بلا سے ہم بھگت لیں گے۔

بی جان۔ آج کا دن تو دق کرنے کا ہے ہی۔

مہ لقا۔ کسی دروازے کی چول بودی ہو تو دل لگی ہے۔

گلشن آرا۔ کمرے کے دروازے کی کنڈی ڈھیلی رہے مگر یہ اس طرح کارروائی ہو کہ دولہا کانوں کان نہ سننے پائیں ایسا نہ ہو پہلے سے کچھ بندوبست کریں۔

مہ لقا۔ بی مغلانی سے قسم لو کہ کسی سے ذکر نہ کریں۔

اب سنیے کہ محبوبن اور لطیفن شہر کی دو مشاطگانِ پرفن نے جو اس پیشے میں کمال رکھتی تھیں۔ دلہن کو اس لطافت سے سنوار کر کل حاضرین و ناظرین اور کل بیگمات و مخدرات عش عش کرتی تھیں۔ اور اب سب متفق الرائے تھیں کہ جیسے جہاں آفرین نے لفظ کن سے دنیا کو نمودار کیا؟ و ما فیہا کو آشکار کیا حسن آرا کی سی حسینہ و جمیلہ پیدا کر دہ حور نژاد۔ دلکش خوباں نوشاد خلق میں خلق نہیں ہوئی۔

ایک۔ خدا نظر بد سے بچائے۔ کیا شکل و صورت ہے۔

دوسری۔ اللہ رکھے اس حسن کی کوئی دوسری دکھا تو دے ماشاء اللہ ماشاء اللہ۔

تیسری۔ اسی صورت نے تو دولہا کو روم بھیجا تھا۔

چوتھی۔ اس ملک میں تو ان کا جواب نہیں ہے بہن۔

پانچویں۔ مگر اللہ جانتا ہے اگر جواب دینے والا کوئی ہے تو دولہا ہیں مردوں میں و عورتوں میں یہ۔

الغرض دولہا دلھن دونوں کی مرادِ دلی بر آئی یعنی عاملِ روز نے کوچ کی ٹھہرائی۔ جب عروسِ جہاں افروز مہر، خلوت کدہ مغرب اور حجلہ آرام میں متمکن ہوئی خاتون صدر آرای انجمن انجم یعنی ماہِ سراپا رفائے، سریر مینا کار سپہر پر، جلوس فرما کر مسند نورتمامی آفاق پر بٹھائی۔ آزاد فرخ نہاد خلعتِ مملوکانہ خوش قماش سے مخلع اور انواع واقسام کے عطر و خوش بو سے معنبر ہوئے اور ادھر وہ جادو جمال بہری تمثال سحر مثال یعنی عروس زلیخالقاحسن آرا بیگم ہفت آرائش سے مزین حُلّی پیرائش سے مشین ہوئیں کوئی بولی۔ عورت کیا مجسم نور ہے۔ کسی نے کہا بہن یہ تو جنّت کی حور ہے۔ الٰہی یہ رخسار تاباں ہے یا قمر ہے۔ عارضِ جاناں ہے یا نگار خانہ سحر۔

گو دلھن سر جھکائے گردن نیوڑائے بیٹھی تھی مگر اس سکوت میں بھی عجب ادا تھی۔ جانی بیگم نے نازک ادا سے کہا بہن جی چاہتا ہے گلے لپٹ کے سیکڑوں مچھیاں لو۔ پھر جب ہم عورتوں کا یہ حال ہے تو مردوں کا حال ظاہر ہے۔

آزاد دست بہ دعا تھے کہ یا خدا کہیں جلد آفتاب پردۂ خفا میں مُنہ چھپائے عروس ماہ سریر پر جلوہ فرمائے۔ بحرِ طرب وانبساط کا جوش ہو۔ آزاد پاشا محبوب مطلوب سے ہم آغوش ہو۔ شبِ عروسی لکھتے ہوئے قلم کی باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ ہر در و دیوار سے مبارک بادی کی صدائیں آتی ہیں۔

اللہ اللہ آج کیا سماں ہے عرصۂ گیتی رشکِ باغ جناں ہے۔ جوش پر حسنِ بہار صحنِ گلشن قدرتِ پروردگار، گلوں کا جوش، بلبلوں کا خروش، ہوا میں لطافت پھولوں میں طراوت، نہریں جاری، بندوں پر لطافت باری، سبزۂ گل کافور، فیض نامیہ سے عالم معمور، بلبلوں کی صدا معجزۂ عیسوی سے زیادہ۔ پھولوں کی خوش بو جاں بخشنے کو آمادہ، طاؤس نگاریں صحنِ گلشن میں خوش خرام، سبزۂ زمردیں طائرِ روح کے لیے دام۔ دستِ چنار طلب ساغر میں دراز۔ شقایق میں ساقی کا انداز۔ شبنم کے موتیوں سے گوشِ گل کو آرایش۔ بارانِ رحمت سے نباتات کو افزایش۔ نرگس کی آنکھ چشم بد دور، گلاب پر چشم نور علیٰ نور۔ گل کے نازک کرشمے، آب صاف کے

لب ریز چشمے۔ غنچوں کا چٹکنا۔ پھولوں کا مہکنا، آتشِ گل کی گرمی۔ بادِ شمالی کی نرمی، چار طرف عالم تاب۔ دوشِ فلک پر بارانیِ سحاب۔ گل کو وہ ابتہاج کہ جامے میں نہ سمایا۔ لالہ ایسا مست کہ دستار کا ہوش نہ آیا۔ سوسن کی یہ مستی کو کس زبان سے بیاں کروں۔ نرگس کا خمار آنکھوں سے دیکھتے ہیں کیا عیاں کروں۔ شاہدانِ چمن کا نور ماشاء اللہ چشم بد دور خاک میں خاصیتِ اکسیر۔ پانی میں آبِ حیات کی تاثیر۔ آبِ شبنم کا طغیان آتشِ گل کا طوفان۔ بلبلوں کی صفیر اہتزاز بخش پُر تاثیر۔ حوضِ مصفا، آئینۂ قدرت پروردگار، دامن صبا عکسِ ریاحین سے گل زار صورتِ دیوار نے نئے نبور سنبھالے۔ طایر تصویر نے بال و پر نکالے۔ موتیا کی خوش بو سے مُردہ دلوں میں جان آئی شاخ کہنا پھل پھول لائی۔ لطفِ ہوا نے اعجازِ عیسوی دکھایا۔ آہن دلوں کو موم بنایا۔ نرگس کو خدا نظرِ بد سے بچائے۔ سوسن کو زبان پر نہ چڑھائے۔ سورج مکھی آفتاب پر چشمک زن۔ صحنِ چمن اس کے پرتو سے روشن۔ سبزے کے عکس سے کون و مکاں ہرا بھرا۔ نہروں کو دریائے اخضر کہیے تو بجا۔ دیدۂ دامِ صیاد لطافت ہوائے نرگس پر چشمک زن۔ چوبِ قفس نزاکت و نرمی سے رشک افزائے شاخِ یاسمن۔ کاتبِ قدرت نے نرگس کے قلم سے خطِ گل زار لکھا۔ باغبانِ بہار نے نافرمان کو مہرِ داغ لالہ سے مزین کیا۔

عالم میں ایسی شگفتگی آئی کہ دشمنوں کے دل میں گرہ نہ پائی۔ ہر شجر پر گمانِ نخلِ طور، صحنِ گلشن عالمِ نور، مشتاقوں کی زباں پر ارنی کا فسانہ۔ برگِ گل کے لبوں پر لن ترانی کا ترانہ۔ جامِ لالہ بادۂ شبنم سے لب ریز۔ آتشِ گل آتشِ موسیٰ سے تیز۔

کمال پر عروجِ بہار، خزاں کے دل میں حسرت کا خار۔ گناہ گاروں کے نامے دھو گیے، سیہ کار سفید رو ہو گئے۔ زلفِ سنبل کا شہرہ ختن میں۔ گوہرِ شبنم کا چرچا عدن میں۔ زاغِ سیاہ طاؤس گوں۔ بومِ شوم ہمائے ہمایوں۔

ادھر لیلائے شب پر مند شب بزمِ فلک میں جلوہ گستر ہوئی۔ ادھر پیش کاران قانون داں اور خواہانِ باادب نے دولہا دلھن کی یک جائی کا اہتمام کیا عروسِ گل رخسار تذرو رفتار کو کہ بہ ہفت آرایش سے مزین تھی چاندی کی پلنگڑی پر سلایا اور آزاد شیر دل مرد کو بلوایا۔ گل رعنا کو عندلیب شیدا کے سپرد کیا اور اپنا اپنا راستہ لیا۔

جب دو لہا کو تنہائی میں چھوڑا تو حیا و شرم نے مُنہ موڑا۔ ادھر بانو یانِ نوخیز و گل بدن تاک جھانک کرتی تھیں۔ عیش و نشاط کا دم بھرتی تھیں۔ آزاد کو اس وقت نشۂ بادۂ جوش نے ایسا مست کر دیا کہ تاک جھانک کی پروا نہ کی مگر دلھن نے کئی بار آہستہ سے ہاتھ جھٹک کر آنکھوں کے اشارے سے منع کیا کہ عجلت کا نتیجہ پشیمانی ہے۔ ان کا اصرار۔ ان کا انکار۔ ادھر شوق کی افزایش ادھر حیا کی فہمایش۔ دولہا کا بے تابانہ ہاتھ بڑھانا دلھن کا ہاتھ اور مُنہ کے اشارے سے سمجھانا۔

الغرض عجب مزے کی بات تھی۔ زیادہ کیا لکھیں پردے کی بات تھی۔

تولدِ فرزندِ ارجمند آزاد بلند اقبال

چار مہینے تک آزاد فرخ نہاد اور حسن آرا پری زاد نے نہایت عشرت اور غایتِ نشاط سے زندگی بسر کی اور ان کی مسرت کا گلزار رشکِ فرخار مقدم بہار سے شاداب و سیراب رہا۔ دونوں نے عہد کر لیا تھا کہ صدمۂ ہجر کی باتیں زبان پر نہ لائیں گے۔ آزاد پر جو مصیبت میدانِ جنگ میں پڑی تھی۔ اور رنجِ فرقت نے بجلیاں حسن آرا کے دل پر گرائی تھیں اس کے ذکرِ مذکور کی قطعی ممانعت تھی۔ آزاد پاشا کی لوگوں نے اس درجہ قدر کی کہ کئی جلسوں کے میرِ مجلس مقرر کیے گئے اور ایک بار امتحان یونی ورسٹی میں بی اے اور ایم اے کے ممتحن زبانِ فارسی مقرر ہوئے۔

پانچویں مہینے ان کے ہاں نخلِ امید کے بار آور ہونے کا زمانہ آیا۔ ساتویں مہینے گود بھری گئی۔ لال رنگا ہوا دوپٹا اور سبز ریشمی پاجامہ پہنایا۔ سوکھے کپڑے میں میوے اور ترکاریاں کھوپرا اور ناریل باندھ کے بڑی جٹھانی نے حسن آرا کی گود میں پوٹلی دی۔ حسن آرا نے کھڑے ہو کر پیر پیغمبروں کو سلام کیا بعد ازاں بڑی بوڑھیوں کو بندگی کی۔ جب دلھن سلام کر چکی تو پھولوں کا گہنا پہنایا گیا آئینے پر زرد رنگا ہوا کپڑا رکھا اور دودھ سے دیکھا کہ بیٹا ہوگا یا بیٹی۔

مغنی۔ (بوڑھی دائی) دیکھ لینا بیٹا ہوگا۔

پھلنا ان۔ اللہ نے چاہا تو دو بیٹے ہوں چاند سورج کی جوڑ
روح افزا۔ پلوٹھی کی بیٹی ہی بیٹے کے برابر ہوتی ہے
بہار النساء۔ بیٹی کسی اور کے ہاں ہوتی ہوگی۔

تھوڑی دیر کے بعد حسن آرا نے مسی لگائی بناؤ سنگھار کیا۔ سبز کانچ کی سات سات چوڑیاں بڑی بیگم کے حکم سے پہنائیں۔ نویں مہینے خدا کے فضل سے توام لڑکے پیدا ہوئے دائیوں نے میٹھے تیل کے سات چھاپے لگائے۔ زچہ کے کپڑے بدلے گئے چھٹی کے دن ڈومنیاں آئیں۔ اندر باہر خوشیاں منائیں زچہ کو گرم پانی سے نہلایا چوکی بچھی۔ دو پان رکھے گئے۔ زچہ کے پاؤں کے نیچے اشرفیاں رکھیں۔ چوک بھرا گیا ناک میں نتھ پہنائی۔ زچہ کی گود میں بچہ دیا۔ گہنا پہنایا۔ افشاں چنی گئی سر شام زچہ اور بچوں کے سہرا باندھا اور تارے دکھانے چلے صحن میں ایک چوکی بچھی تھی زچہ کی گود میں سموچا ناریل اور ترکاریاں دیں حسن آرا نے سات تارے گنے۔ چاروں طرف کھیلیں پھینکیں۔ چاروں کونوں کو سلام کیا جب حسن آرا کمرے میں آئیں۔ دولہا نے جو پلنگ پر متمکن تھے دلھن کو بیٹھنے نہیں دیا۔ سالیوں سمدھنوں سے بھرپور حق لیا۔ اس کے بعد آزاد پلنگ پر دلھن کے پاس بیٹھے تو حسن آرا نے گود میں بچوں کو دیا۔ تمام شب جلسہ رہا۔

نازک ادا۔ ایک بات تو بھول ہی گئے۔ بچوں کے کان میں اذان نہیں دلوائی۔
روح افزا۔ اماں جان سنیں گی تو ان کو بڑا خیال ہوگا۔
نازک ادا۔ اے اب کسی کو بلوا کے اذان دلوا دو۔
عباسی۔ میں بیگم صاحب کو اطلاع دیے دیتی ہوں۔ جب آزاد پاشا کی والدۂ ماجدہ کو خبر ہوئی فوراً ایک بوڑھے مولوی صاحب کو بلوایا۔ انھوں نے دونوں بچوں کے کانوں میں اذان دی۔ قند کا کوزہ اور چاول اور پانچ اشرفیاں انعام دی گئیں۔
حسن آرا۔ اب پھولوں کا گہنا بڑھایا جائے۔
روح افزا۔ ہاں دریا بھیج دو کسی کے ہاتھ۔

الغرض بڑی چہل پہل رہی۔

ادبیاتِ عالیہ

آبِ حیات .... محمد حسین آزاد
تاریخ ادبِ اُردو .... رام بابو سکسینہ
اُردو شاعری کا مزاج .... ڈاکٹر وزیر آغا
اُردو ادب میں طنز و مزاح .... 〃
اُردو کی کہانی .... ڈاکٹر سہیل بخاری
تنقید کا نیا پس منظر .... پروفیسر جیلانی کامران
نئی نظم کے تقاضے .... 〃
افسانے کا منظر نامہ .... مرزا حامد بیگ
اُردو نثر کے میلانات .... ڈاکٹر وحید قریشی
اصنافِ سخن اور شعری ہیئتیں .... شمیم احمد
حرفِ سرور .... زہرہ معین
ادب اور کلچر .... ڈاکٹر سلیم اختر
نگاہ اور نقطے .... 〃
افسانہ حقیقت سے علامت تک .... 〃
ادب اور لاشعور .... 〃
تنقیدی دبستان .... 〃
ادبی مکالمے .... الطاف احمد قریشی

فسانۂ آزاد (تلخیص) .... رتن ناتھ سرشار
اُردو رباعی .... ڈاکٹر فرمان فتح پوری
اُردو میں قومی شاعری .... ڈاکٹر مظفر عباس
نیم رُخ .... پروفیسر مجتبیٰ حسن
آنکھیں ترستیاں ہیں .... جگن ناتھ آزاد
عجائباتِ فرنگ (سفرنامہ) .... ڈاکٹر مظفر عباس
انیس کے مرثیے (دو جلد) مرتب: صالحہ عابد حسین

اقبالیات: چند اہم کتابیں

اقبال .... فیض احمد فیض
اقبال (خطوط) .... عطیہ بیگم
ملتِ بیضا پر عمرانی نظر (مرتب) ڈاکٹر مظفر عباس
اقبال اور اُن کا فلسفہ .... پروفیسر آل احمد سرور
اقبال کے ملّی افکار .... محمود عاصم
شعریاتِ اقبال .... ڈاکٹر تبسم کاشمیری
اقبال کا ادبی مقام .... ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا
اقبال اور مغربی مفکرین .... جگن ناتھ آزاد
اقبال کا نفسیاتی مطالعہ .... ڈاکٹر سلیم اختر

مکتبہ عالیہ ○ اُردو بازار ○ لاہور